اگست 2021
گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
بانی
معصومہ رسول
www.pklibrary.com
ناہید سلطانہ اختر اور سعدیہ رئیس کی خوب صورت تحریریں
معروف اداکارہ اسما عباس بنیں پاکیزہ کی مہمان

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

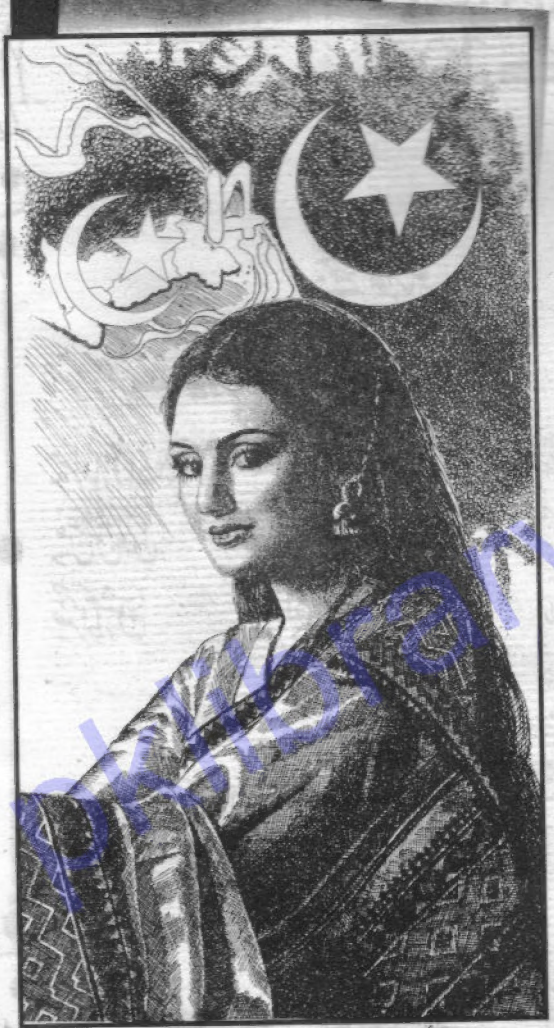

بانی : معراج رسول

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

ماڈل: رابیل فضل

فوٹوگرافی: موسیٰ رضا

میک اپ: روز بیوٹی پارلر

قیمت فی پرچا (پاکستان) 100 روپے

قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زرِ سالانہ (اندرونِ ملک) 1500 روپے ..... جلد: 49 ..... شمارہ 05 ..... اگست 2021ء

pklibrary.com

جشنِ آزادی مبارک

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 07

سلسلے وار ناول

میرا سارا رنگ اتار دو — افشاں آفریدی 10

میں عشق ہوں — نایاب جیلانی 102

صراطِ عشق — دلشاد نسیم 150

ناولٹ

میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں — سعدیہ ہما شیخ 52

میری شناخت گم شدہ — شیریں حیدر 75

نائیکہ — عقیلہ حق 127

مکمل ناول

فنا فی العشق — حمیرا نوشین 174

افسانے

تکمیلِ آرزو — سلمیٰ غزل 47

ڈیرے ساون کے — طیبہ عنصر مغل 69

یہ دل قربان تمہارے — تسلیم شیخ 95

رانا بوتا — قانتہ رابعہ 123

پیاسے رنگ — فرح ریاض چیمہ 143

بیماری کی جڑ — انعم توصیف 147

گرہ — سیما بنت عاصم 165

خصوصی مضامین

شمعِ ہدایت — اختر شجاعت 209

اندازِ نو — بنتِ زیب 216

سروے — شائستہ زریں 225

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

pklibrary.com

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ 08	خوش ذائقہ	شگفتہ یاسمین 247
بہنوں کی محفل	مدیرہ 230	بزم پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں 249
پاکیزہ ڈائری	آمنہ حماد 242	روحانی مشورے	ادارہ 251
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی 245	ہومیو کلینک	254

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313 ,35802552, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

pklibrary.com

تمام ایجنٹ حضرات اور قارئین متوجہ ہوں

ڈائجسٹ کی دنیا کا جگمگاتا آفتاب

اشاعت کا
50 سالہ جشن
طرب

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

خصوصی شمارہ

گولڈن جوبلی نمبر

ستمبر 2021ء کو

منظر عام پر آرہا ہے

ستاروں کی طرح روشن قلم کاروں کی کہکشاں

احمد اقبال، طاہر جاوید مغل، نجمہ مودی، ایچ اقبال، امجد رئیس، پروین زبیر، اسما قادری، روبینہ رشید، عبدالرب بھٹی، غلام قادر و دیگر مصنفین

صفحات 362

قیمت 150 روپے

pklibrary.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجھے کچھ کہنا ہے.....!

قارئینِ عزیز، السلام علیکم!
تمام اہلِ وطن کو جشنِ آزادی مبارک ہو!

ہمارے پیارے وطن کی اساس دو قومی نظریے پر رکھی گئی، علیحدہ سرزمین حاصل کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جہاں برصغیر کے مسلمان پوری مذہبی آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں..... جہاں انہیں کسی قسم کی متعصب و نفرت آمیز نظروں اور امتیازی سلوک کا سامنا نہ ہو۔

الحمدللہ آج ہم اپنے عظیم رہنماؤں خصوصاً قائداعظم محمد علی جناحؒ کی بے مثال جدوجہد، انتھک محنت اور زیرک نگاہی کی بدولت اس آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں..... مگر ہمیں ان ہزاروں، لاکھوں افراد کی قربانیوں کو بھی ہرگز نہیں بھولنا چاہیے جو اس پاک سرزمین کے حصول میں دی گئیں..... اپنے گھر بار، مال و اسباب حتیٰ کہ قریبی رشتوں کی قربانی دینا کوئی معمولی بات نہیں لیکن جب مقصد عظیم ہو، ہدف بلند ہو تو مادی اشیا تو کیا رشتے داریاں تک ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں اور یہی ہمارا دین اسلام ہمیں سکھاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے فرزند کو قربان گاہ لے کر جانا کوئی معمولی امر نہ تھا۔ اللہ کی رضا کے لیے انہوں نے اسے بسر و چشم قبول کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کو رہتی دنیا تک کے لیے یادگار..... سنتِ ابراہیمی کی صورت بنا دیا۔

ایثار و قربانی کا سبق قدم، قدم پر ہمارا مذہب ہمیں سکھاتا ہے۔ یہ صرف انبیاء، اوصیا اور اولیا تک ہی محدود نہیں بلکہ ایک عام مسلمان کو زندگی گزارنے کے لیے اللہ کی رضا کی خاطر اسی سبق پر عمل پیرا ہونا ہے، جبھی ہم فلاح پا سکتے ہیں۔

اللہ پاک ہم سب کے مخلص جذبۂ ایمانی اور حب الوطنی کی لگن کو دوام بخشے..... الٰہی آمین!

مدیرہ

نزہت اصغر

pklibrary.com

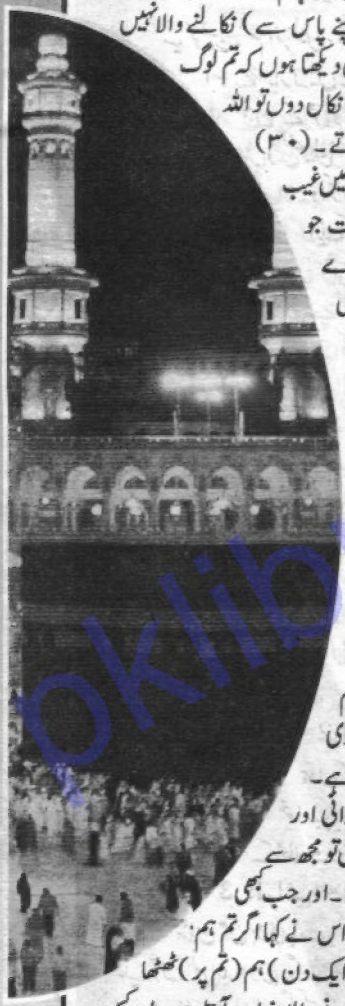

(نوح نے) کہا اے میری قوم کیا تم نے دیکھا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی دلیل پر ہوں۔ اور اس نے اپنے پاس سے مجھے رحمت عنایت کی ہے تو وہ بات تم پر پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ کیا ہم وہ تم پر لازم کر دیں گے جس حال میں کہ تم اس سے کراہت کرنے والے ہو۔ (۲۸) اور اے میری قوم! میں اس پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے، اور میں ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے (اپنے پاس سے) نکالنے والا نہیں ہوں۔ یقیناً وہ سب اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت کرتے ہو۔ (۲۹) اور اے میری قوم! اگر میں انہیں (اپنے پاس سے) نکال دوں تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں میری مدد کون کرے گا۔ پس کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ (۳۰) اور میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں، اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں۔ اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ یقیناً میں فرشتہ ہوں۔ اور نہ ان کی نسبت جو تمہاری نظروں میں حقیر ہیں یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز کوئی بھلائی نہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ کہ ان کے دلوں میں ہے۔ (اگر میں کہوں تو) تب یقیناً میں ناانصافوں میں سے ہو جاؤں گا۔ (۳۱) وہ بولے اے نوح یقیناً تو ہم سے جھگڑا کر چکا ہے۔ پھر تم نے ہم سے بہت ہی جھگڑا کیا۔ پس اگر تو سچوں میں سے ہے تو جس (عذاب) کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے وہ ہم پر لے آ۔ (۳۲) اس نے کہا سوائے اس کے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی تم پر لائے گا اگر اس نے چاہا۔ اور تم اس کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ (۳۳) اور میری نصیحت تمہیں فائدہ نہیں دے گی۔ اگرچہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ تمہیں نصیحت کروں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تمہیں گمراہی پر سزا دے وہ تمہارا پروردگار ہے۔ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ (۳۴) کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے (جھوٹ موٹ) گھڑ لیا ہے۔ کہہ دو کہ میں نے اسے (جھوٹ موٹ) گھڑ لیا ہے تو میرا جرم مجھ پر ہے اور میں بری ہوں اس جرم سے جو تم کرتے ہو۔ (۳۵) اور ہم نے نوح کی طرف وحی بھیجی کہ یقیناً تمہاری قوم میں سے ہرگز کوئی ایمان نہیں لائے گا، سوائے اس کے جو ایمان لا چکا ہے۔ پس جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے تم غمگین نہ ہو۔ (۳۶) اور تو ہماری زیرِ نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے بارے میں تو مجھ سے بات نہ کر۔ یقیناً وہ غرق کر دیے جائیں گے۔ (۳۷) اور وہ کشتی کو بنانے لگا۔ اور جب کبھی اس کی قوم کے سردار اس کے پاس سے گزرتے تو اس سے ٹھٹھا مخول کرتے اس نے کہا اگر تم ہم سے ٹھٹھا مخول کرتے ہو تو جس طرح تم ہم سے ٹھٹھا مخول کرتے ہو، اسی طرح (ایک دن) ہم (تم پر) ٹھٹھا مخول کریں گے۔ (۳۸) پھر عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے۔ اور کس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے (۳۹)

(سورۂ ھود ۱۱ پارہ ۱۲ آیات ۲۸ تا ۳۹)

oklibrary.com

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مَنْ شَرَّفَہُ اللہ ﷺ

سید کونین، ختم المرسلین، افضل الانبیا، رحمت العالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا حسیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔
جس کے معنی ومفہوم، بڑے حسب نسب والے، بڑے خاندانی کے ہیں۔

ا۔ تفصیل مفہوم:

ا۔ دائرۃ المعارف کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ نسب کی ایک، ایک کڑی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلہ پیدائش مربوط ہے۔ نجابت و شرافت، عزت و نیکی کا پیکر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد اور امہات یعنی والدہ ماجدہ، نانیاں، دادیاں نہایت پاکباز اور باوقار خواتین تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سارا سلسلہ نسب محترم اور نامور بزرگوں پر مشتمل ہے۔ وہ سب کے سب سردار اور قائد تھے اور معاشرے میں بڑی معزز اور مؤقر حیثیت رکھتے تھے۔ شرافت نسبی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتیازی خصوصیت ہے۔

۲۔ ابن ہشام نے کہا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسب ونسب کے لحاظ سے والد کی طرف سے بھی اور والدہ کی طرف سے بھی تمام اولاد آدم میں افضل واشرف تھے۔

1۔ القرآن: ترجمہ: اور قسم ہے باپ (ابراہیم) کی اور اس کی اولاد کی (کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم ہو)
(سورۂ بلد آیت۔ ۳) (بحوالہ کنز الایمان)

2۔ الحدیث: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں تم کو اپنے امر کی ابتدا بتلاتا ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا ہوں اور حضرت عیسیٰؑ کی بشارت ہوں اور اپنی والدہ کا خواب ہوں کہ جب میں پیدا ہوا انہوں نے دیکھا کہ ایک نور ان سے نکلا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔ (مشکوۃ)

3۔ الرائے: حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔ آپؐ کی شان میں بڑی بات بائبل مقدس میں لکھی ہوئی ہے کہ اس قوم کی بزرگی ہے جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوں گے۔ حضرت اسحٰق کی نسل سے یسوع مسیح پیدا ہوں گے۔ (ریویند جارج)

4۔ الفضائل: اگر کسی کو دشمن کی طرف سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو وہ نماز فجر اور عشا کی ادائیگی کے بعد بلاناغہ آٹھ دن بکثرت اس اسم پاک سیدنا حسیب کو پڑھ کر بارگاہ الٰہی میں دعا مانگے۔ ان شاء اللہ ہر طرح کے نقصان سے محفوظ رہے گا۔
(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس)

pklibrary.com

سلسلے وار ناول

آخری قسط

میرا سارا زنگ اتار دو

افشاں آفریدی

یہ دنیا دار العمل ہے، جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔ جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا نہ بھلا وا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر...

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے
زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے
عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

pklibrary.com

pklibrary.com

''یہ سب کیا ہو گیا اماں۔ میری ردا کا گھر کیوں بکھر گیا۔''

آصف نے تیسری طلاق بھیج کر اپنا اور ردا کا رشتہ مکمل طور پر توڑ ڈالا تھا۔ اور یہ غم ایسا تھا جس نے شیرازی ولا کے ہر مکین کو متاثر کیا۔ ردا بھی اپنے کمرے میں بند تھی۔ پانچواں دن تھا اس سانحے کو۔ سائرہ پورا، پورا دن کمرے میں بند رہتیں۔ جب بھی دادی ان کے کمرے میں آتیں، وہ یہی باتیں کر کے رونے لگتیں۔ آج دادی انہیں کمرے سے باہر لانے میں بمشکل کامیاب ہو سکی تھیں۔ ان کے اس طرح دلگیر لہجے میں فریاد کرنے سے دادی کا دل تڑپ سا گیا۔ بیٹے اور بہو سے زیادہ ردا کے خاموش اظہار نے انہیں مضمحل کر رکھا تھا۔ دُرِ مکنون دوڑ کر ان کے لیے پانی لے آئی۔

''صبر کرو بیٹا۔ اللہ کی مصلحتیں بس وہی جانتا ہے۔'' دادی خود غم سے ادھ موئی تھیں۔ آبدیدہ سی بہو کو سمجھانے لگیں۔

''نہیں اماں، یہ سب میری غلطی کا نتیجہ ہے۔ آپ نے کتنے پیار سے مانگا تھا ردا کو عکرمہ کے لیے۔ مگر میں نے ردا کے کہنے میں آ کر انکار کر دیا۔ اسی نافرمانی کی سزا ملی ہے مجھے۔ سچ کہتے ہیں سیانے، بزرگوں کے فیصلوں میں برکت ہوتی ہے۔ اے کاش میں یہ سب پہلے جان جاتی۔'' پھوٹ، پھوٹ کر روتی سائرہ بیگم کے اعتراف نے اماں کے دل کو جیسے مٹھی میں جکڑ ڈالا۔

''ایسا مت سوچو سائرہ بیٹا۔ حوصلہ کرو۔ ردا کی خاطر ہی خود کو سنبھالو۔'' دُرِ مکنون کے سامنے ایک بار پھر اس بات کا تذکرہ دادی کی نظروں کو جھکا گیا۔ وہ درِ مکنون سے نظر نہ ملا سکیں۔

''اب میری بچی کا کیا ہو گا اماں۔''

''اللہ بہت بڑا کارساز ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی سبب بنائے گا۔ دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ ان شاء اللہ ردا کو بہت اچھا جیون ساتھی ملے گا۔ دیکھنا اللہ بہترین نصیب بنائے گا اس کا۔'' دادی کا مشفق لہجہ یقین بھرا تھا۔

''میری بیٹی کو نہ جانے کس حاسد کی نظر لگ گئی اماں۔ جو اس کے حصے کی خوشیاں کسی اور کو مل گئیں۔'' سائرہ کا انداز شکووں بھرا تھا۔ دُرِ مکنون پر تشکمگین نظریں ڈال کر وہ ساس سے مخاطب تھیں۔

''نصیب سے زیادہ اور وقت سے پہلے کسی کو کچھ نہیں ملتا بیٹا۔ انسان سے اس کی خوشیاں کوئی نہیں چھین سکتا۔ ہمارے دکھ اور ہماری خوشیاں رب العالمین کی تقسیم ہیں سائرہ بیٹا۔''

''نصیب اپنی جگہ اٹل حقیقت سہی مگر کوشش تو بندے کو بھی کرنی پڑتی ہے اماں۔ تقدیر میں لکھا رزق بھی انسان کو کمانے پر ہی حاصل ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ میری بیٹی کے حصے کی خوشیاں کہاں ہیں اور آپ دیکھیے گا میں وہ تمام خوشیاں ایک دن اس کے قدموں میں لا ڈالوں گی۔'' رخساروں پر بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے سائرہ نے گویا دل ہی دل میں کوئی عزم مصمم باندھا۔

''یا ذن اللہ، ان شاء اللہ۔'' سائرہ کے ہٹ دھرم انداز پر دادی نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''مگر یہ سب کرنے کے لیے خود کو سنبھالو بیٹا۔ ردا کی طرف دیکھو۔ اسے ہم سب کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ تمہاری ضرورت ہے۔ تم اگر اس طرح ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھو گی تو ردا اور مظفر میاں کو کون سنبھالے گا؟'' دادی نے شفقت سے بہو کو سمجھایا تو وہ آہستگی سے سر ہلا کر اٹھیں اور ردا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

دادی نے دُرِ مکنون کی طرف دیکھا جو لب بھینچے سر جھکائے کھڑی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

''سائرہ ابھی پریشان ہیں۔ اولاد کا دکھ بہت جانگسل ہوتا ہے بیٹا، تم ان کی باتوں کو دل پر مت لینا۔'' دادی نادم سی اسے سمجھانے لگیں تو اس نے کوشش کر کے اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجائی۔

''میں جانتی ہوں دادی۔ آپ فکر مت کریں۔'' کہنے کو تو اس نے دادی سے کہہ دیا کہ وہ فکر نہ کریں۔ مگر اپنے دل سے فکر کو جھٹکنا اس قدر آسان بھی نہ تھا۔ وہ واقعی فکر مند ہو گئی تھی۔ سائرہ کے تیور کچھ کر گزرنے والے تھے۔

''اور جو وہ کرنا چاہ رہی ہیں، کیا اس کے لیے قابلِ قبول ہو گا؟'' یہ سوچ جیسے اس کے دماغ کو جکڑ گئی تھی۔

رات کھانے کے بعد اس نے چائے بنائی اور سب کو دے کر اوپر ٹیرس پر آ گئی جہاں عکرمہ اس کا منتظر تھا۔ وہ چائے لیے جس وقت اوپر آئی عکرمہ کسی سے فون پر محوِ گفتگو تھا اُسے دیکھا تو اللہ حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''چائے۔'' اس نے چھوٹی سی ٹرے جس میں دو مگ رکھے تھے اس کے سامنے کی۔

''شکریہ۔'' عکرمہ نے مسکرا کر مگ اٹھایا اور لبوں سے لگاتے ہوئے اس کے خاموش وجود کو نگاہوں کے حصار میں لیا۔

''سب ٹھیک ہے مسز؟''

''ہوں۔ جی..... جی بالکل۔'' وہ کسی خیال سے باہر آئی تھی۔

''تو پھر پریشان کیوں ہیں؟'' رسانیت سے پھر سوال ہوا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، میں پریشان تو نہیں۔'' بے ساختہ نظر اٹھا کر عکرمہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ ''ہاں مگر ردا آپی کے لیے دکھی ہوں۔ میمی کے لیے افسردہ ہوں۔'' وہ اس سے جھوٹ نہیں بول سکی۔ ''آج میمی بہت روئیں۔ ردا آپی کے مستقبل کے لیے بہت فکرمند ہیں وہ۔''

''فطری بات ہے۔ ردا بیٹی ہے ان کی۔ شادی والے دن سے لے کر اب تک وہ جن کرائسز سے گزری ہے اس نے ان کو ہی نہیں پوری فیملی کو دکھی کیا ہے۔'' عکرمہ کے سنجیدہ انداز پر اس نے افسردگی سے اسے بغور دیکھا۔

''آپ کو بھی؟'' ایک معنی خیز وقفے کے بعد اس نے سوال کیا تو عکرمہ نے بے دھیانی میں سر ہلا دیا۔

''obviously۔''

''کیا آپ ردا آپی کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟'' کچھ دیر ان دونوں کے مابین خاموشی حائل رہی جسے ایک بار پھر دُرِ مکنون نے توڑا تھا۔

''کم از کم وہ ہرگز نہیں، جو آپ چاہتی ہیں۔'' برجستہ جواب آیا تھا۔ جس پر دُرِ مکنون نے لب کاٹتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اسے بغور دیکھا۔

''اور اگر آپ کے باقی گھر والوں نے بھی یہی چاہا تو؟'' خوف خدشے اور تفکر۔ کیا کچھ نہیں تھا اس کے لہجے میں۔ عکرمہ نے حیرت سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سوال اور آنکھوں میں امید و بیم کی ایک نامانوس کیفیت تھی، کچھ کھو دینے کا ڈر تھا، جس نے عکرمہ کو بے اختیار مسکرانے پر مجبور کیا۔

''تب بھی میری طرف سے بے فکر رہیے، میں آپ کا تھا، آپ کا ہوں اور آپ کا ہی رہوں گا۔'' سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی جانب ذرا سا جھک کر شرارت آمیز لہجے میں بولتے عکرمہ نے یک دم جیسے اس کے دل کو پروں سے بھی ہلکا کر دیا تھا تاہم اس کے اس کھلم کھلا اظہار پر وہ بری طرح جھینپی تھی۔

''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''مگر میرا تھا۔'' اس کے خوب صورت چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے عکرمہ نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ نظر جھکا گئی۔ تاہم اس کے لبوں پر تیرتی محجوب مسکراہٹ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی جس میں ہلکورے لیتا اطمینان بہت واضح تھا۔

.....☆.....☆.....

''بہت خوب۔ کیا فول پروف پلان ہے۔'' زاویار کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے مولا بخش نے.... بے اختیار اپنی رائے کا اظہار کیا تو بھی وہ لب بھینچے میز پر دھرے صفحات کو تنقیدی نظروں سے گھورتا رہا۔

''یہ مشن میرے لیے میری زندگی سے زیادہ اہم ہے مولا بخش۔ I can't loose it۔''

''ان شاء اللہ ہمیں اس میں بھی کامیابی ہوگی۔ تم فکر نہ کرو زاویار صاحب۔''

''کیسے نہ فکر کروں۔ گزشتہ ساڑھے تین سال سے میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔ یہ موقع اگر میرے

ہاتھ سے نکل گیا تو بقیہ زندگی بھی میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔'' مولا بخش سے زیادہ وہ جیسے خود سے مخاطب تھا۔

''بہر حال تم کل ہی لاہور فلائی کر جاؤ اور اپنے اعتبار کے بندوں سے مل کر تمام انتظامات کر لو۔ میں بھی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں یہ سب دیکھ لوں گا زاویار صاحب! تمہیں ابھی لاہور آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سرفراز صاحب نے بتایا تو ہے کہ ابھی بابر زمان کے لینڈ کرنے میں وقت ہے۔''

''ہوں وہ تو ہے مگر.....''

''اگر مگر چھوڑو صاحب۔ تمہارا ابھی نئی، نئی شادی ہوا ہے۔ اپنے گھر والوں کو وقت دو۔ لاہور کے معاملات مجھ پر چھوڑ دو اور پُرسکون رہو۔'' مولا بخش نے اس کے پُرسوچ انداز پر اسے ٹوکا تو وہ گہری سانس بھر کر اسے دیکھنے لگا۔

''ویسے اس کام کے لیے ندیم بھی تو اعتبار کا بندہ ہے۔ پرتم اس کو اپنے ساتھ کیوں نہیں ملانا چاہتے؟'' یہ سوال مولا بخش کے ذہن میں کئی دن سے اودھم مچا رہا تھا، بالآخر زبان پر آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ لاہور میں اس نے ندیم کے ساتھ پچھلی مہم میں حصہ لیا تھا۔ مگر اس معاملے میں وہ ندیم سے مکمل رازداری برت رہا تھا۔ کراچی سے اس نے سوائے مولا بخش کے کسی کو ساتھ نہیں ملایا تھا۔

''ہاں ندیم بہت competent ہے مگر وہ سرفراز سے رابطے میں ہے جبکہ میں اس مشن کو سرفراز کے نہیں اپنے برتے پر کامیاب بنانا چاہتا ہوں۔'' ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا تو اس کے چہرے کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا مولا بخش کچھ سوچ کر خاموش ہو رہا۔

اگلے روز وہ لاہور پہنچ چکا تھا۔ اور وہاں جاتے ہی اس نے مطلوبہ افراد سے رابطہ کر کے طے شدہ لائحہ عمل پر عمل درآمد کرنا شروع کر دیا۔ زاویار کے لیے مولا بخش کا وہاں جانا باعث تقویت تھا۔ گو وہ جانتا تھا کہ سرفراز کی نگاہوں سے بچ رہنا اتنا آسان بھی نہیں ہوگا تاہم اس نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھا۔ لاہور میں گزارے پچھلے چند ماہ میں اس نے بابر زمان تک پہنچنے کے لیے جو رابطوں کی تلاش کی تھی، اس تک مولا بخش کی رہنمائی کر کے وہ کسی حد تک مطمئن تھا مگر وہ خود بھی وہاں جانے کے لیے پر تول رہا تھا اور کسی بہانے کی تلاش میں تھا کہ اچانک طارق کی چھٹی کی درخواست منظور ہونے اور خولہ کا نوٹس پیریڈ ختم ہو جانے کی نوید پاتے ہی میمونہ پھوپی نے ان دونوں کی شادی کی تاریخ پکی کرنے کے لیے اگلے ہفتے لاہور جانے کا ارادہ باندھا تو اس کے لیے عازم سفر ہونے کی راہ ہموار ہو گئی۔

.....☆.....☆.....

''بیٹا دُرِ سی، عکرمہ کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ جاؤ شاباش کوئی اچھا سا جوڑا نکال کر پہنو اور ہلکی پھلکی جیولری بھی۔ شوہر گھر میں داخل ہو تو بیوی کو اس کا اچھی طرح استقبال کرنا چاہیے۔'' ردا کی طلاق نے اتنے دنوں سے سب کی زندگی کے بہاؤ کو جیسے روک رکھا تھا۔

دُرِ مکنون تو یوں بھی آج کل سائرہ بیگم کے جلال کی زد میں تھی۔ ایسے میں اسے دادی کی، کی ہوئی نصیحتیں بھولی ہوئی تھیں۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس کا سجنا سنورنا سائرہ بیگم کے لیے کتنا تکلیف دہ ہے، اسے اندازہ تھا۔ مگر آج انہوں نے اسے سائرہ بیگم کے سامنے ٹوک ہی دیا تو وہ جی اچھا کہہ کر نظر چرائی اوپر کے پورشن کی طرف چلی گئی۔

''پتا نہیں اماں۔ اس گھر کو کس کی نظر لگی ہے کہ کوئی خوشی اسے راس ہی نہیں آ رہی۔'' اوپر کی جانب جاتی دُرِ مکنون کو دیکھتی سائرہ بیگم کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ''ردا کا گھر ہماری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ گیا اور ادھر عکرمہ کا بظاہر بس کر بھی نہیں بسا۔'' افسردگی کے ساتھ سائرہ کچھ ایسے دکھ سے بولیں کہ دادی کا دل جیسے تھرا کر رہ گیا۔

''اللہ نہ کرے سائرہ۔ ایسا کیوں کہہ رہی ہو بیٹا۔ عکرمہ کے گھر کو بھلا کیا ہوا ہے۔ اللہ اسے آباد رکھے۔''

''اللہ سے تو امیدیں اچھی ہی ہوتی ہیں اماں مگر اس کے بندے۔ یہ بھلا کب ہماری توقعات پر پورا اترتے ہیں۔'' انہوں نے تاسف سے کہہ کر گہری سانس بھری۔

''کیا مطلب بیٹا سائرہ۔ میں سمجھی نہیں۔'' دادی نے الجھی نظروں سے بہو کو دیکھا۔

''رہنے دیں اماں۔ اب آپ سے کیا کہوں۔ جب آپ کو آنکھوں دیکھا نظر نہیں آرہا تو میرے کہنے سے بھی کیا فرق پڑے گا۔''

''ایسا بھی کیا ہے سائرہ جو مجھے نظر نہیں آرہا۔ تم کس کی بات کر رہی ہو۔''

''میں دُرِ مکنون کی بات کر رہی ہوں اماں۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ وہ عکرمہ سے کیسے کھنچی، کھنچی، دور دور رہتی ہے۔ نو بیاہتا سہی۔ ہیں تو میاں بیوی۔ کیا میاں بیوی ایسے ہوتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں سائرہ بیٹا۔ دُرِی بڑی شرم وحیا والی بچی ہے۔ پھر عکرمہ کو بھی بڑوں کا لحاظ ہے۔'' دادی نے دونوں کی جانب سے صفائی دی۔

''شرم وحیا کی بھی آپ نے خوب ہی کہی اماں۔ یہ آج کے دور کی نسل ہے جسے شرم وحیا کی جیسے بھی بھولتے جا رہے ہیں۔ دُرِ مکنون کے رویے میں شرم وحیا سے زیادہ جھجک اور بیزاری ہے۔ شادی کو مہینے سے اوپر ہو گیا مگر وہ آج بھی عکرمہ سے اتنی ہی دور نظر آتی ہے جتنی شادی سے پہلے تھی۔ میں نے تو آج تک اسے عکرمہ سے مخاطب ہوتے نہیں دیکھا۔ بلکہ عکرمہ کے سوال کے جواب میں بھی بس وہ سر ہی ہلا دیتی ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو بیٹا۔ کھل کے کہو جو کہنا ہے۔ مجھے فکر ہو رہی ہے۔'' دادی کے دل کو تو جیسے پنکھے لگ گئے تھے۔

''سچ کہوں اماں۔ مجھے دُرِ مکنون، عکرمہ کے ساتھ خوش نظر نہیں آتی۔ سارا وقت تو اس کے چہرے پر بارہ بجے رہتے ہیں۔ مجال ہے جو کبھی شوہر کی طرف مسکرا کر دیکھ لے یا کوئی کام اس کی خوشی کا خود سے کر لے۔ ابھی تک آپ اسے انگلی پکڑ کر چلا رہی ہیں۔ کبھی میری روا کو دیکھا آپ نے کہ اسے کچھ سکھانا پڑا ہو۔'' سائرہ چالاکی سے گفتگو کو حسبِ منشا موڑ پر لے آئی تھیں۔ بظاہر متانت سے انداز میں معنی خیز وقفہ دیا اور جب بولیں تو لہجے میں بظاہر فکرمندی تھی۔

''دُری ابھی چھوٹی ہے بیٹا۔ آہستہ، آہستہ سمجھ لے گی۔'' دادی نے بے اختیار اس کی طرف داری کی۔

''اب اتنی بھی بچی نہیں ہے۔ شادی شدہ عورت ہے اب وہ۔ رشتے کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے لابسریاں نہیں چھانی جاتیں اماں۔ اب مچھلی کے بچے کو بھی تیرنا سکھایا جائے گا بھلا؟'' سائرہ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔ دادی لاجواب ہو کر انہیں سنے گئیں۔

''میں نے کتنا کہا آپ سب سے کہ عکرمہ کی شادی اس لڑکی سے مت کریں مگر کسی نے بھی میری ایک نہ سنی۔ تو اب دیکھ لیں انجام۔ وہ لڑکی عکرمہ جیسے شاندار شخص کو بھی دل سے قبول نہ کر سکی۔'' سائرہ بیگم نے جیسے بم پھوڑ ڈالا تھا۔ دادی کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو سائرہ بیٹا۔'' کتنے ہی لمحے ساکت بیٹھی دادی بمشکل بول سکیں۔

''میں تو بس وہی کہہ رہی ہوں اماں۔ جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جو سدرہ نے مجھے بتایا۔ نکاح جیسے مضبوط بندھن کے باوجود دُرِ مکنون اور عکرمہ کے بیچ میں آج بھی فاصلے ہیں۔ روا کی طرح ہمارے عکرمہ کو بھی اب تک شادی کے بندھن سے سچی خوشیاں نہیں مل سکی ہیں۔'' سائرہ بیگم کا درد بھرا انداز دادی کے دل کو اپنی جگہ سے ہلا گیا تھا۔

''کک کیا مطلب؟'' دادی کا حال دیکھنے والا تھا۔ جواب میں سائرہ بیگم نے وہ کچھ کہہ ڈالا جو دادی کے سان وگمان میں بھی نہ تھا۔

اس روز مذاق میں کہی سدرہ کی بات کو نمک مرچ لگا کر بتاتے ہوئے سائرہ بیگم کا لہجہ کچھ ایسے تاسف سے بھرا تھا کہ دادی جیسی سادہ لوح انسان کے لیے اعتبار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔

''میں تو کہتی ہوں اماں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ردا کے ساتھ، ساتھ عکرمہ کے لیے بھی کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بلکہ دور جانے کی بھلا کیا ضرورت، عدت کے بعد ردا کا ہی نکاح کر دیتے ہیں عکرمہ سے۔ عکرمہ جیسا شاندار، پڑھا لکھا شخص ردا جیسی لڑکی کو ڈیزرو کرتا ہے نہ کہ نفسیاتی مسائل کا شکار دُرِ مکنون کو۔'' انہوں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہہ کر ساس کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو سائرہ بیٹا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔'' دادی ان کی منصوبہ بندی سن کر لرز گئیں اور بے اختیار نظر اٹھا کر کمرے میں داخل ہوتے مظفر صاحب کو دیکھا جن کے چہرے پر یک بیک جلال ٹپکنے لگا تھا۔ گویا وہ سب سن چکے تھے۔

''کیوں نہیں اماں۔ کیوں نہیں ہو سکتا ایسا۔ کیا مرد دو، دو شادیاں نہیں کرتے۔ کیا عکرمہ کو ایک نارمل زندگی گزارنے کا کوئی حق نہیں۔'' سائرہ جھنجلا گئیں۔ ساس کے اختلاف کرنے کے ساتھ، ساتھ کمرے میں داخل ہوتے مظفر صاحب کے تاثرات بھی انہیں بری طرح کھلے تھے۔ لہٰذا براہ راست دُرِ مکنون کو طلاق دلوانے کا تو نہ کہہ سکیں تاہم ردا اور عکرمہ کے نکاح کی بات رکتے، رکتے بھی کہہ ہی ڈالی۔

''ہاں بالکل حق ہے بیٹا۔ مگر جو تم چاہتی ہو ویسا کبھی نہیں ہو سکتا۔'' دادی کی آواز بہت مدھم تھی۔ درحقیقت انہیں یہ سب سن کر شدید دھچکا لگا تھا۔

''کیوں؟ آخر کیوں نہیں ہو سکتا ایسا۔ جب آپ اس غیر لڑکی کے لیے عکرمہ کو راضی کر سکتی ہیں تو اب اپنی سگی پوتی کے لیے کیوں پیچھے ہٹ رہی ہیں آپ۔'' ساس کے انکار نے انہیں یک دم برگشتہ کر دیا تھا۔

دادی نے بے بسی سے ایک نظر بیٹے اور بہو کو دیکھا۔

''اگر یہ سب آپ اس کل کی آئی لڑکی کی خاطر کہہ رہی ہیں تو اسے میں خود راضی کر لوں گی۔ میرے حوالے سے آئی تھی وہ اس گھر میں۔ پناہ دی تھی میں نے اسے۔ بدلے میں کیا وہ اتنا بھی نہیں کرے گی۔'' سائرہ بیگم کا پارہ یک دم اوپر گیا تھا۔ دُرِ مکنون کا ذکر کرتے وہ نفرت سے نیلی پڑ گئی تھیں۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گی سائرہ۔ اس بات کو گرہ سے باندھ لو۔'' اس سے پہلے کہ دادی، بہو کو سمجھانے کے لیے کچھ کہتیں مظفر صاحب کا گرجدار لہجہ ایک لمحے کو کمرے میں موجود دونوں نفوس کو تھرا گیا۔

''کیوں نہیں کروں گی میں ایسا۔'' اگلے لمحے سائرہ بیگم تلملاتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کی بلند آواز میں سرکشی اور غصہ بیک وقت موجود تھا۔ ایک عالمِ طیش میں شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

''جب صوفیہ کی ماں میری ماں کی سوتن بن سکتی تھی، صوفیہ میری جگہ لے سکتی تھی تو پھر میری بیٹی ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔ وہ کیوں نہیں لے سکتی دُرِ مکنون کی جگہ؟ کیوں آخر کیوں؟''

''کیونکہ دُرِ مکنون تمہاری بہن صوفیہ کی نہیں، تمہاری.....''

''مظفر بیٹا.....'' یہ وہ کیا بتانے جا رہے تھے دادی نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

''کہہ لینے دیں مجھے اماں۔ آخر یہ راز آج کھل جانے دیں۔'' یک دم وہ ماں کی طرف پلٹ کر فیصلہ کُن انداز سے بولے تو اماں خاموشی اختیار کر گئیں۔ بیٹے کے بپھرے ہوئے تیوروں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ آج وہ کسی کی نہیں سنیں گے۔

''کون سا راز مظفر۔ کس راز کی بات کر رہے ہیں آپ...'' سائرہ بیگم کے دل کو جیسے کچھ الہام ہوا۔ وہ سب کچھ بھول کر کشیدہ تاثرات سمیت شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''وہ راز جو دُرِ مکنون کی ذات سے وابستہ ہے۔ وہ دُرِ مکنون جو میری اور تمہاری بیٹی ہے اور جو ردا کی سگی بہن ہے۔ سنا تم نے سائرہ بیگم دُرِ مکنون تمہاری اور میری سگی بیٹی ہے۔'' انتہائی غصے میں سائرہ بیگم کی اونچی آواز سے زیادہ بلند آواز میں مظفر صاحب نے وہ راز افشا کیا جس نے شیرازی ولا کے در و دیوار کو بری طرح ہلا ڈالا۔ اور مل تو ردا اور دُرِ مکنون بھی گئیں جو اس

شور شرابے کو سن کر اپنے اپنے کمروں سے نکل آئی تھیں اور اب اپنی اپنی جگہ بت بنی کھڑی رہ گئی تھیں۔

''یہ ہماری وہ چھٹی بیٹی ہے جسے تم نے مُردہ سمجھ لیا تھا مگر وہ مردہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے صوفیہ اور زاہد کی گود میں ڈالا تھا۔ ہاں میں نے۔'' سالوں سے جس راز کو مظفر صاحب چھپاتے چلے آئے تھے آج وہ ان کے لبوں سے نکل گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے سائرہ بیگم کو اپنی سماعتوں پر اعتبار نہیں آیا۔ وہ یک ٹک شوہر کو دیکھے گئیں مگر جب ان کے تاثرات ٹس سے مس نہ ہوئے تو وہ جیسے کسی بھیانک خواب سے جاگیں۔

''جھوٹ کہہ رہے ہیں آپ۔ ایسا قطعاً نہیں ہوسکتا۔ یہ سب آپ صوفیہ کی بیٹی کے گھر کو بچانے کے لیے کر رہے ہیں۔ ہیں ناں۔ بولیے جواب دیجیے مظفر۔'' شدید غیظ وغضب نے انہیں ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لیا تو وہ بری طرح چیخ اٹھیں۔

''یہ سچ ہے سائرہ بیگم۔ میں صوفیہ کی نہیں تمہاری اور اپنی بیٹی کا گھر بچا رہا ہوں۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو رکو ایک منٹ۔'' نہایت غصے سے کہہ کر مظفر صاحب تیز قدموں سے چلتے اسٹڈی کے دروازے کے اس طرف غائب ہوگئے اور جب چند منٹوں کے بعد پلٹے تو ہاتھ میں سیاہ فائل تھی اور ایک لفافہ۔

''یہ دیکھو، یہ ہیں وہ تمام ثبوت جنہیں میں نے آج کے دن کے لیے ہی سنبھال کر رکھا تھا۔'' غیظ کے عالم میں انہوں نے فائل اور لفافہ سینٹر ٹیبل پر لا پٹخے۔ جس میں دُرِّ مکنون کے برتھ سرٹیفکیٹ کے ساتھ، ساتھ ان دونوں اسپتال کے وہ تمام دستاویزات بھی موجود تھے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی اور جہاں بعد میں اسے سائرہ کے ساتھ لے جایا گیا تھا۔ قانونی طور پر دُرِّ مکنون کو ایڈاپٹ کرنے کے متعلق کاغذات بھی اسی فائل میں سنبھال کر رکھے گئے تھے۔ زاہد صاحب کے کچھ خطوط مع تصاویر لفافے میں محفوظ تھے۔

اگلے لمحے شیرازی ولا کے لاؤنج میں صرف کاغذ پلٹنے کی سرسراہٹ تھی یا پھر تحیر میں ڈوبتی ابھرتی سانسوں کی مدھم آوازیں.....

''یہ دیکھو مظفر! آج تمہاری بیٹی کے اسکول کا پہلا دن ہے۔'' ایک تصویر کے پیچھے لکھے نوٹ کے نیچے زاہد صاحب کے دستخط تھے، جس میں چھ سالہ دُرِّ مکنون اسکول بیگ کندھے پر لٹکائے کھڑی تھی۔ ایسی ان گنت تصاویر تھیں جو مختلف مواقع پر لی گئی تھیں۔ ہر تصویر کے پیچھے لکھے ''مظفر تمہاری بیٹی دُرِّ مکنون'' کے الفاظ سائرہ بیگم کو بے یقینی کے دشت سے نکال کر حقیقت کی وادی میں لے آئے۔

دستاویزات سے زیادہ ان تصاویر نے مظفر صاحب کے دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت کی تھی۔

''یہ ناممکن ہے آپ ایسا کیسے کرسکتے ہیں مظفر۔ یہ ظلم کیسا کیا آپ نے۔'' پہلے حیرت، پھر بے یقینی اور پھر شدید غیظ نے سائرہ بیگم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سرخ انگارہ آنکھوں سے ان کو گھورتے ہوئے وہ بمشکل ضبط کرسکی تھیں۔

''ظلم؟ کیسا ظلم سائرہ؟'' مظفر صاحب نے طنزیہ نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

''تم تو مزید بیٹیاں چاہتی ہی نہیں تھیں۔ تم پر تو میں نے رحم کیا تھا سائرہ۔ اُدھر صوفیہ پانچ مردہ بچوں کو دفنانے کے بعد لبِ مرگ تھی۔ اگر دُرِّ مکنون اسے نہ ملتی تو وہ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی۔ دُرِّ مکنون کو ماں باپ کی مکمل شفقت مل جائے گی۔ یہ سب سوچ کر میں اپنے جگر کا ٹکڑا ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ ظلم تو میرے ساتھ ہوا۔ تمہارے وحشیانہ جنون کی خاطر میں نے خود کو اس آزمائش میں لا ڈالا۔ سالوں اپنی بچی سے دور رہا اور جب اسے یہاں لایا تو بھی اسے اس کا جائز حق نہیں دے سکا۔ اس کے اپنے باپ کے گھر میں اس کی ماں اس پر ظلم کرتی رہی اور میں برداشت کرتا رہا۔ مگر اس سے زیادہ تحمل نہیں ہے مجھ میں۔ اب اگر کسی نے میری بچی کو دکھ پہنچانا چاہا تو میں چپ نہیں رہوں گا۔'' مظفر صاحب بولے تو سائرہ بیگم لب بستہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

''یہ سب کیا ہے پاپا۔ کیا یہ واقعی سچ ہے؟'' ردا کے استفسار کرنے پر ان سب نے چونک کر ردا کی طرف

دیکھا۔ جس کے عقب میں کھڑی دُرِ مکنون حیرت سے ساکت تھی۔

''ہاں یہ سب سچ ہے بیٹا۔'' مظفر صاحب نے گہری سانس بھر کر بیٹی کی بات کا جواب دیا اور پھر تھکے، تھکے قدموں سے چلتے دُرِ مکنون کے پاس آ رکے۔ جس کے صبیح رخساروں پر بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔

''اپنے اس باپ کو معاف کر دینا میری بچی۔ جس نے محض اس لیے کہ تمہیں بھرپور پیار اور توجہ ملے، خود سے دور کیا۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔'' یک دم دُرِ مکنون کے سر کو شفقت سے تھپکتے ہوئے وہ رو پڑے تو دُرِ مکنون بھی اپنے آنسو نہ روک سکی۔

انسٹی ٹیوٹ سے واپسی پر عکرمہ نے سیف کو کالج سے پک کیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔ ردا کی طرح سیف بھی حیرت زدہ تھا جبکہ عکرمہ فکرمندی سے دُرِ مکنون کو دیکھ رہا تھا۔ اور ایسے میں جب سب اپنی جگہ متعجب و پریشان کھڑے تھے یک دم سائرہ بیگم تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھیں اور اندر جا کر دروازے کو بند کر لیا۔

''اُف پاپا اب کیا ہوگا؟'' سیف نے سہمی، سہمی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔ ماں کے انداز نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا۔ سائرہ ابھی شاک میں ہیں، سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔'' مظفر صاحب نے گہری سانس بھرتے ہوئے رنجیدگی سے کہا۔ ''اور دھچکا تو شاید تم سب کو بھی لگا ہے۔ مگر سچ یہی ہے میرے بچو...! دُرِ مکنون میرا تمہارا خون ہے۔ میری لختِ جگر ہے تم چاروں کی بہن ہے۔ اس کے حق میں بہت بڑی کوتاہی ہوئی مجھ سے۔'' مظفر شیرازی نے نادم نظروں سے اسے کو دیکھا اور پھر عکرمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

''دُرِ مکنون کو کمرے میں لے جاؤ عکرمہ۔'' انہوں نے عکرمہ سے کہا تھا مگر اس سے پہلے کہ کوئی اسے کچھ کہتا وہ خود لٹے قدموں لوٹ گئی۔

''اسے سنبھال لینا عکرمہ۔ کہیں وہ روٹھ نہ جائے۔'' مظفر شیرازی نے اوپر جاتی بیٹی کو دکھ سے دیکھا۔

''آپ پلیز فکرمند نہ ہوں چچا جان۔ میں دیکھتا ہوں انہیں۔'' عکرمہ نے گہری سانس بھری اور مظفر شیرازی کو تسلی دیتے ہوئے بولا

''یہ سب کیسے ہو گیا پاپا.....'' ردا نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے اپنی دادی سے پوچھ لو بیٹا۔ جب تک میں تمہاری ممی کو دیکھتا ہوں۔'' مظفر صاحب گو کہ فکرمند تھے مگر ذہن و دل پر پڑے برسوں پرانے اس بوجھ سے جیسے نجات بھی مل گئی تھی جس نے ان کے کندھوں کو برسوں سے جھکائے رکھا تھا۔ بچوں کو نرمی سے جواب دے کر ماں کو متجسی نظروں سے دیکھتے وہ اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی ایک اور عدالت کا سامنا تھا ان کو۔

''سائرہ!'' مظفر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں تکیے میں منہ دیے روتا پایا۔ وہ جانتے تھے کہ اس سارے قصے میں بہت سا قصور سائرہ بیگم کا بھی تھا مگر اس وقت وہ کس کرب سے گزر رہی ہوں گی اس کا بھی بہت اچھی طرح اندازہ تھا انہیں۔ اس لیے نرمی سے پکارا۔

''چلے جائیں مظفر۔ میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' تکیے سے سر اٹھا کر وہ غصے سے چلائیں۔ مظفر صاحب کے لیے ان کا رویہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی سے بیڈ کے قریب رکھی ایزی چیئر پر آ بیٹھے۔

''اور اس طرح کیا مسئلہ حل ہو جائے گا؟'' انہوں نے رسانیت سے پوچھا تو سائرہ تلملا کر اٹھ بیٹھیں۔

''میں اس ظلم کے لیے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی مظفر۔ آپ نے نہ صرف ایک بچے کو اس کی ماں کی محبت سے محروم کیا بلکہ اس حقیقت کو چھپا کر اسے اپنی ہی ماں کے ہاتھوں نفرت کا نشانہ بھی بنایا۔'' سائرہ ایک بار پھر پھٹ پڑی

تھیں۔ ''آپ نے مجھے اپنی ہی اولاد کے سامنے سر اٹھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رو پڑیں۔

''میں جانتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھ سے بہت بڑی کوتاہی ہوئی۔'' وہ ندامت سے بولے تو سائرہ نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''جس عورت کو میں اپنی اترن دینا پسند نہ کرتی آپ نے اُس کی گود میں میری اولاد ڈال دی۔'' انہوں نے برہمی سے شکوہ کیا۔

''کس اولاد کی بات کرتی ہو تم سائرہ۔ وہ اولاد جسے تم نے اپنی ہی کوکھ میں مارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ تم تو اسے اس دنیا میں لانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔''

''کچھ بھی تھا۔ اسے جنم تو میں نے ہی دیا تھا ناں۔ وہ میرے وجود کا حصہ تھی۔ آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ اتنے سال اس حقیقت کو مجھ سے چھپا کر رکھا۔'' وہ سخت برگشتہ ہوئیں۔

''کئی بار بتانا چاہا۔ مگر ہر بار ہماری چھٹی بیٹی کے ذکر پر تم کچھ اس طرح کڑوی ہو جاتیں کہ میں چاہ کر بھی تمہیں بتا نہیں پاتا۔ یوں بھی دُرِ مکنون زاہد اور صوفیہ کے پاس جس ناز و نعم میں پلی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا فیصلہ درست لگتا۔'' سائرہ کے کچھ سوال اپنی جگہ برحق تھے۔ مظفر صاحب نے سادگی سے جواب دیا۔

''خاک درست تھا آپ کا فیصلہ۔ وہ دونوں آپ کی اولاد کو اس عظیم دکھ سے بچا بھی نہ سکے۔''

''بچا تو ہم ردا کو بھی نہ سکے اور ہماری آنکھوں کے سامنے اسی چھت کے نیچے آصف اسے برباد کر کے چلا گیا۔'' ایک گہری مضمحل سانس خارج کرتے ہوئے مظفر صاحب نہایت دلگرفتہ لگے۔ ''والدین اولاد کو پیار تو کر سکتے ہیں مگر اس کے نصیب کے لکھے کو بدل نہیں سکتے۔''

''کم از کم اسے یہاں لانے کے بعد تو بتا دیتے۔'' شوہر کی بات پر سائرہ کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا۔

''جس حالت میں وہ یہاں آئی، اس وقت اگر میں تمہیں یہ سب بتاتا تو کیا تم برداشت کر پاتیں؟ اتنا حوصلہ کہاں سے لاتیں تم۔ کلیجا پھٹ جاتا تمہارا۔'' مظفر صاحب کے استفسار پر سائرہ بیگم کی آنکھوں کے آگے ساڑھے تین سال پرانا کوئی منظر تازہ ہوا تو وہ بے اختیار پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑیں۔

''یہ سب کیا ہو گیا میرے اللہ۔ کیوں ہو گیا۔'' سائرہ بیگم کا یوں تڑپ، تڑپ کر رونا مظفر صاحب کے لیے ایک امتحان ہی تھا۔

''بس کرو سائرہ۔ اور کتنا روؤ گی۔''

''کیسے نہ روؤں۔ میں یہ بات کیسے بھلوں کہ میری بیٹی اس کائنات کے عظیم دکھ سے گزری، اپنوں کے ہوتے غیروں کے گھر میں پلی۔ لڑکی ذات کو ایک نامحرم مرد کی گود میں ڈالتے دل نہ کانپا آپ کا۔'' سائرہ کا شاکی انداز ہنوز تھا۔ جس پر مظفر صاحب لمحے بھر کے لیے چپ سے رہ گئے اور جب بولے تو لہجہ بہت دھیما اور مضمحل تھا۔

''زاہد نامحرم نہیں رہا تھا دُرِ مکنون کے لیے۔ اس نے دُرِ مکنون کو اپنی دودھ شریک خالہ زاد بہن سے کچھ ماہ دودھ پلوا کر رضاعت کا رشتہ قائم کر لیا تھا اس سے اور اسی شرط پر میں نے اسے اپنی بچی سونپی تھی۔ مگر جب بڑا ہونے پر دُرِ مکنون میرے ساتھ غیریت برتتی تو مجھے کتنی اذیت پہنچتی تھی میں یہ بیان نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے اس کرب کو جیسے اس وقت بھی محسوس کیا۔

''تمہاری سنگدلی اور صوفیہ کی زندگی کی خاطر اتنا بڑا اقدم اٹھایا میں نے۔ ورنہ تم جانتی ہو۔ مجھے اپنی بیٹیاں کتنی پیاری ہیں۔'' مظفر صاحب کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ سائرہ نے سرخ ہوتی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور ایک بار پھر رو پڑیں۔

''یہ سب آپ نے اچھا نہیں کیا مظفر۔ اچھا نہیں کیا۔''

اب وہ دُرِ مکنون کا سامنا کیسے کریں گی۔ اپنی زبان سے نکلا ایک، ایک لفظ اور اس کی آنکھ سے گرے ایک، ایک

حکمت

قائداعظم سفر ریل کے دوران اپنے لیے دو برتھیں مخصوص کرایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے وجہ دریافت کی تو جواب میں انہوں نے یہ واقعہ سنایا۔ ''میں پہلے ایک ہی برتھ مخصوص کراتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے میں لکھنو سے بمبئی جا رہا تھا۔ کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر ریل رکی تو ایک اینگلو انڈین لڑکی میرے ڈبے میں آ کر دوسری برتھ پر بیٹھ گئی۔ چونکہ میں نے ایک ہی برتھ مخصوص کرائی تھی، اس لیے خاموش رہا۔

ریل نے رفتار پکڑی تو اچانک وہ لڑکی بولی۔ ''تمہارے پاس جو کچھ ہے فوراً میرے حوالے کردو، ورنہ میں ابھی زنجیر کھینچ کر لوگوں سے کہوں گی کہ یہ شخص میرے ساتھ زبردستی کرنا چاہتا ہے۔'' میں نے کاغذات سے سر ہی نہیں اٹھایا۔ اس نے پھر اپنی بات دُہرائی۔ میں پھر خاموش رہا۔ آخر تنگ آ کر اس نے مجھے جھنجوڑا تو میں نے سر اٹھایا اور اشارے سے کہا۔ ''میں بہرہ ہوں، مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ کہنا ہے، لکھ کر دو۔'' اُس نے اپنا مدعا کاغذ پر لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے فوراً زنجیر کھینچ دی اور اسے مع تحریر ریلوے حکام کے حوالے کر دیا۔ اس دن کے بعد سے میں ہمیشہ دو برتھیں مخصوص کراتا ہوں۔''

☆☆☆

اصل رہنما

ایک بار قائداعظم محمد علی جناح اسکول و کالج کے طلبا سے خطاب کر رہے تھے۔ ایک ہندو لڑکے نے کھڑے ہو کر

آنسو کو یاد کر کے ان کی سسکیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

.....☆.....☆.....

''افوہ زوی! آخر تمہیں لاہور جانے کی جلدی کیوں ہے؟'' زاویار کا کوٹ الماری میں ٹانگتے ہوئے اس نے ٹھٹک کر سوال کیا تھا۔

''جلدی کی کیا بات ہے اس میں، آغا جان نے بلایا ہے سب کو۔ طارق کی شادی کی تاریخ طے ہو رہی ہے، تمہارا جانا بھی ضروری ہے۔'' وہ رسانیت سے بولا تھا۔

''کیوں؟ میں جا کر کیا کروں گی؟ تاریخ تو بڑے ہی طے کریں گے' میرا تمہارا وہاں کیا کام ہے؟'' شہرین کا سوال معقول تھا۔ بوٹ اتارتے زاویار نے نظر اور سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تم شاید بھول رہی ہو۔ وہاں ہمارے ریسیپشن کی ڈیٹ بھی فائنل کی جائے گی۔'' اس نے گویا شہرین کو یاد دلایا۔

''تو اس کے لیے شہریار ماموں اور سلمٰی مامی ہیں تو وہاں۔ وہ بڑے ہیں' وہ ہی طے کریں گے۔'' اسے جیسے اس کام میں بھی دلچسپی نہیں تھی

''وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہیں یہاں ایسا کون سا ضروری کام ہے جو تم یہاں سے جانا نہیں چاہ رہیں۔'' اب کے زاویار نے اسے بنظر غور دیکھا۔

''کمال ہے۔ یہاں اتنے مزے کی دعوتیں چل رہی ہیں اور تم پوچھتے ہو کہ ضروری کام کیا ہے۔ پتا ہے اس ویک اینڈ پر مہران کے گروپ نے ہمیں فارم ہاؤس پر انوائٹ کیا ہے۔''

''یہ سب تو بعد میں بھی ہوتا رہے گا شیری۔ فی الحال لاہور جانا ضروری ہے، وہاں سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''ہوں۔ وہ تو ہے مگر پھر ہم جلدی یہاں واپس آ جائیں گے۔'' زاویار کے نرم لہجے میں کہنے پر وہ کچھ دیر

آپ سے کہا کہ آپ ہندوستان کا بٹوارا کر کے ہمیں کیوں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ میں اور ہم میں کیا فرق ہے.....؟

آپ کچھ دیر تو خاموش رہے تو اسٹوڈنٹس نے آپ پر جملے کسنے شروع کر دیے کچھ نے کہا کہ آپ کے پاس اس کا جواب نہیں۔ ہر طرف سے ہندو لڑکوں کی ہوٹنگ اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

قائداعظم نے ایک پانی کا گلاس منگوایا۔ آپ نے تھوڑا سا پانی پیا اور گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ آپ نے ایک ہندو لڑکے کو بلایا اور اسے باقی بچا ہوا پانی پینے کو کہا تو ہندو لڑکے نے وہ پانی پینے سے انکار کر دیا۔ پھر آپ نے ایک مسلمان لڑکے کو بلایا۔ آپ نے وہی بچا ہوا پانی اس مسلم لڑکے کو دیا تو وہ فوراً قائداعظم کا جھوٹا پانی پی گیا۔ آپ پھر سب طلبا سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ ''یہ فرق ہے آپ میں اور ہم میں۔''

ہر طرف سناٹا چھا گیا کیونکہ سب کے سامنے فرق واضح ہو چکا تھا۔

محمد علی جناح نے کبھی کسی کو گالی نہ دی اور نہ کبھی آپ نے بداخلاقی کی۔ آپ اپنی بات اس قدر ٹھوس دلائل سے پیش کرتے تھے کہ بڑے، بڑے منہ میں انگلیاں دبا لیتے اور آپ کے سامنے لاجواب ہو جاتے۔

قائداعظم سے لوگوں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی آپ سے ہاتھ ملا لیتا تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا، اور سارا دن لوگوں کو بتاتا پھرتا کہ آج میں نے قائداعظم سے ہاتھ ملایا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح اتنی مخالفت کے باوجود ایک دن کے لیے بھی جیل نہیں گئے۔ اور آج تک ایسے الفاظ اپنے منہ سے نہیں نکالے جن کے بعد یہ کہنا پڑے کہ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں.....!

از: فضہ بتول، بہارہ کہو

سوچنے کے بعد بولی تھی ساتھ ہی فرمائش بھی داغ دی۔

''جلدی کا وعدہ نہیں کرتا، البتہ آتے جاتے رہیں گے۔'' بنا کسی رعایت کے زاویار نے اپنا مطمح نظر اس پر واضح کیا تو وہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیوں زوی؟ آتے جاتے کیوں رہیں گے۔ ہم یہاں مستقل طور پر شفٹ نہیں ہو سکتے کیا؟''

''تمہاری سسرال لاہور میں ہے اس لیے نہیں جانا چاہتیں وہاں؟'' اس کے سنجیدہ سوال کے جواب میں اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا تو شہرین بھی مسکرا دی۔

''well سسرال کے معاملے میں تو میں خود کفیل ہوں۔ اِدھر کراچی میں ایک منی سسرال موجود ہے تو اُدھر لاہور میں ساس سسر اور نندوں سے بھرپور سسرال۔ لہٰذا اس سے تو فرار مشکل ہے۔''

''تو یوں کہو کہ یہاں تمہارا میکا ہے اس لیے یہاں رہنا چاہتی ہو۔''

''اگر ایسا سمجھا جائے تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔ مگر تمہیں کیوں جانا ہے لاہور۔ جبکہ میں تو سمجھی تھی کہ تم کراچی میں رہنے کو ترجیح دو گے۔ میرے خیال سے تمہارا دل تو اس شہر میں لگنا چاہیے۔'' بلا ارادہ اس کے زبان سے نکلنے والے الفاظ نے ایک لمحے کے لیے کمرے میں سناٹا بچھا دیا۔ شہرین نے یک دم نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

زاویار کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ دھیرے، دھیرے غائب ہوتی گئی اور اس کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔

''جو میں نے سنا کیا تم واقعی ایسا ہی سمجھتی ہو شیری؟'' کچھ دیر خاموشی کے وقفے کے بعد زاویار نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا تو شہرین کی شرمندگی دُگنی ہو گئی۔

''سوری زوی۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں میری زبان سے یہ نکل گیا۔''

''ہماری زبان سے وہ ہی نکلتا ہے شیری! جو ہمارے دل میں کہیں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ تم نے وہی کہا جو تمہارے

دل میں تھا اور اچھا ہی کیا کہ کہہ دیا۔ شک دل میں رہ جائے تو رفتہ رفتہ شکوے کا روپ دھار لیتا ہے۔'' بوٹ ایک طرف رکھ کر وہ اس کے پاس چلا آیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے رسانیت سے بولا تو شہرین نے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرتی محسوس کیں۔

''دُرِ مکنون کے بارے میں تمہیں تو کیا میں نے کبھی کسی کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہا مگر میرے نہ چاہنے پر بھی یہ حقیقت تمہارے علم میں آنا تھی سو ایسا ہو کر رہا۔ مگر وہ میرا ماضی تھی جبکہ تم میرا حال اور مستقبل ہو۔ trust me میرے دل میں اس کے لیے سوائے نیک تمناؤں کے اب کچھ نہیں ہے۔'' اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کسی روز اسے شہرین مرزا کو اس طرح صفائی دینا ہوگی۔

''تو کیا تم اسے بھول جاؤ گے؟'' گہری سانس بھرتے ہوئے شہرین نے بے اختیار استفسار کیا۔ سوال مشکل تھا زاویار انصاری کو گویا الفاظ تلاش کرنے پڑے۔

''ہم کسی کو یاد رکھنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں شہرین! مگر کسی کو بھولنا، یہ انسان کے اختیار کی بات نہیں۔ میں نہیں کہتا کہ... میں اسے بھلا چکا ہوں مگر اب اس کی ذات سے جڑی یاد کا حوالہ بدل چکا ہے۔ وہ کسی اور کے نکاح میں ہے۔ جبکہ تم میری بیوی ہو میری زندگی کی شریکِ سفر۔ مجھ میں لاکھ خامیاں سہی مگر میں بددیانت اور غاصب نہیں ہوں۔ جس دن تمہیں اپنے نکاح میں لیا تھا، یقین کرو اس دن خود سے عہد کر لیا تھا کہ تمہارے ساتھ کبھی بدعہدی نہیں کروں گا۔'' مدھم آواز اور گہرے لہجے میں بولتا زاویار آپ اپنا یقین تھا۔ شہرین کو اپنے دل میں سکون کی لہریں موجزن ہوتی محسوس ہونے لگیں۔

''جب ہم کسی کا ناقابلِ تلافی نقصان کر بیٹھتے ہیں تو پھر اس کے اور ہمارے درمیان سوائے ناراضی یا نفرت کے کوئی اور تعلق نہیں رہتا۔ اور جس لمحے وہ ہمیں معاف کر دے تو پھر یہ تعلق بھی ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ میرے اور دُرِ مکنون کے درمیان جو کچھ بھی تھا وہ اب نہیں ہے۔'' باہر رات کا اندھیرا اور گہرا ہو رہا تھا اور اندر شہرین کے دل میں اترتا ایقان۔

.....☆.....☆.....

''وہ تم سے نفرت نہیں کر سکتیں دُرّی۔ تم بیٹی ہو ان کی۔'' دادی کے الفاظ اس کے حافظے میں تازہ ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی عکرمہ کی زبان سے نکلنے والے فقرے بھی آس پاس گونجے۔

''آپ چچا جان کو پاپا کیوں نہیں کہتیں؟''

''آپ کی صورت میں دادی کی خواہش پوری ہو گئی ہے۔ دادی کے لیے آپ روا جیسی ہی ہیں۔''

''کیا آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ چچا جان کی آپ کے ساتھ شفقت غیر معمولی ہے۔''

کھڑکی کے پار اس کی نگاہیں بظاہر باہر سڑک پر جمی تھیں مگر ذہن کی پرواز کہیں دور تھی۔

''بابا آپ مجھ سے اتنا پیار کیوں کرتے ہیں؟'' ماما کے منع کرنے کے باوجود جب بھی بابا اس کی کوئی فرمائش پوری کرتے یہ سوال وہ ضرور پوچھتی تھی۔

''کیونکہ تم میری بیٹی ہو۔''

''صرف اس وجہ سے؟'' وہ ناز سے پوچھتی، اپنی تعریف سننا مقصود ہوتا تھا۔

''نہیں۔ ایک وجہ اور بھی ہے۔'' بابا مسکرا کر کہتے۔

''وہ کیا؟'' ہر بار وہ اشتیاق سے استفسار کرتی۔

''اور وہ یہ کہ تم میری دودھ شریک بہن کی رضاعی بیٹی ہونے کے ناتے میری بھانجی بھی ہو۔'' اس کی نازک سی ناک کھینچتے ہوئے وہ اسے زچ کر دیتے۔

''جی نہیں میں صرف بیٹی ہوں آپ کی اور آپ میرے بابا ہیں۔ بس یہی رشتہ ہے میرا اور آپ کا۔ ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ نہ آپ کی بہن نہ اور کوئی۔''

''ہاں مگر تمہاری ماما تو ہیں ناں ہمارے بیچ۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہتے تو وہ ان کے کندھے پر سر رکھ دیتی۔

''ماما ہمارے بیچ نہیں ہمارے ساتھ ہیں۔'' وہ ساتھ بیٹھی ماں کو محبت پاش نظروں سے دیکھ کر اعتماد سے کہتی تو وہ دونوں ہنس پڑتے۔

''ڈیٹر ہے آپ کی بیٹی۔ اس سے بحث میں جیتنا مشکل ہے۔'' ماما ہنس کر کہتیں۔

''صد فیصد درست۔ آئندہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔'' بابا کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتے تو وہ کھلکھلا دیتی۔

وہ گزرے وقت کو چشم تصور سے دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک اسے ماضی سے باہر کھینچ لائی۔

اس نے گہری سانس بھر کر گالوں پر پھسل آنے والی نمی کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا اور گردن گھما کر دیکھا۔ عکرمہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اور رخ دوبارہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' نپے تلے قدم اٹھاتا وہ اس کے عقب میں آرکا تو اس نے گہری سانس بھر کر اپنا رخ اس کی جانب موڑا۔ اور بوجھل پلکیں اٹھا کر فکرمندی سے استفسار کرتے عکرمہ کو دیکھا۔ اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ اسے استحقاق سے دیکھ سکی تھی۔ نکاح والے دن سے لے کر آج تک جب بھی وہ عکرمہ کی طرف نظر اٹھاتی، اسے یوں لگتا جیسے وہ ردا کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہو۔ ہر بار میمی اور ردا اس کے اور عکرمہ کے درمیان آ کھڑی ہوتی تھیں۔ مگر آج اس نے پہلی بار بغیر کسی احساسِ جرم کے اس کے چہرے پر نگاہ جمائی تھی۔

''ایسا کیوں ہے کہ قسمت ہر امتحان کے لیے بھی، کبھی کسی ایک ہی انسان کو چن لیتی ہے؟'' عکرمہ کے پوچھنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو ایک بار پھر بہہ نکلے تھے۔

''اونہوں۔ یہ شکوے کا نہیں شکر کا مقام ہے دُرِ مکنون۔ قسمت نے اگر امتحان لیا ہے تو اچھا نتیجہ بھی تو دیا آپ کو۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ اس وقت دل میں خواہش جاگی کہ وہ اس کے رخسار پر بہتا نمکین سیال اپنی پوروں پر اتار سکتا۔ مگر وہ فاصلے جو اس کے اور دُرِ مکنون کے درمیان روزِ اوّل سے موجود تھے انہوں نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

''میرے ماما، بابا بہت پیار کرتے تھے مجھ سے۔ میں کیسے مان لوں کہ وہ میرے والدین نہیں تھے۔'' وہ بیچارگی سے پوچھ رہی تھی۔

''ان کی آپ سے محبت اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ آپ کی ماما تو یہ بات جانتی بھی نہیں تھیں۔ جبکہ زاہد انکل نے ایڈاپٹ کیا تھا آپ کو۔ حرمت ورضاعت کا رشتہ بھی قائم کیا آپ سے۔ اپنی اولاد سمجھ کر پالا۔ کہتے ہیں پیدا کرنے والے سے پالنے والا بڑا ہوتا ہے۔ وہ آپ کے سگے والدین نہ سہی ان سے کم بھی نہیں تھے۔ رہ گئے چچا جان تو اگر آپ کی ماما کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق نہ ہوتا تو شاید چچا جان اتنا بڑا فیصلہ کر بھی نہ پاتے۔ انہوں نے آپ کو disown نہیں کیا بلکہ ایک انسانی جان بچائی تھی۔ آپ ان کی طرف سے بھی دل میں کوئی بدگمانی نہ رکھیں۔''

''مگر آج انہوں نے میرے سر سے آسمان چھین لیا۔'' اس نے دل گرفتگی سے شکایت کی۔

''لیکن قدموں تلے زمین بھی تو لا بچھائی۔'' عکرمہ برجستہ بولا تو وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ ''آج کے بعد آپ شیرازی ولا میں سر اٹھا کر پورے حق کے ساتھ رہیں گی کسی کے احسان کا کوئی بوجھ نہیں ہوگا آپ پر۔ یہ آپ کے بھی والدین کا گھر ہے جبکہ میرے گھر کی تو بلاشرکت غیر مالک ہی آپ ہیں۔'' سنجیدگی سے کہتے، کہتے وہ شوخی سے بولا تو دُرِ مکنون بلا ارادہ اسے گہری نظروں سے دیکھے گئی۔

''by the way کیا اب بھی ردا کے لیے آپ کے دل میں قربانی کے وہی جذبات ہیں جو اس

حقیقت کو جاننے سے قبل تھے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ شرارت اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔ جس پر وہ یک دم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تو عکرمہ نے مسکراتے ہوئے سکون کی سانس لی۔

.....☆.....☆.....

''بابر زمان اگلے ہفتے نہیں بلکہ کل کی فلائٹ سے واپس آچکا ہے، تم کو غلط انفارمیشن تھا زاویار صاحب!'' سیل فون پر آنے والے مولا بخش کے اس پیغام نے اس کا فشارِ خون بلند کر ڈالا۔ ایک نہیں دو نہیں اس نے کئی بار یہ پیغام پڑھا مبادا اسے مغالطہ ہوا ہو۔ مگر نہیں، اس کی آنکھوں کے سامنے جو الفاظ تھے ان میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ مولا بخش کا یہ پیغام اس کی نس، نس میں شرارے دوڑا گیا۔

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟'' عالمِ طیش میں اس نے پیغام لکھا تھا۔

''بابر زمان کے گھریلو ملازم سے ملی ہے یہ خبر کہ وہ اور اس کا باپ دونوں گھر پہنچ چکے ہیں اور اس کو ائر پورٹ سے بھی تصدیق کروالیا گیا ہے۔'' اگلے ہی لمحے مولا بخش کا جواب اسکرین پر ابھر کر اس کے غیظ و غضب کو بھڑکا گیا۔

''یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا۔'' شدید غصے کی حالت میں اس نے ہاتھ میں پکڑا سیل فون زمین پر دے مارا۔ جو کارپٹ پر پڑے فلور کشن کے اوپر گرنے کی وجہ سے ٹوٹنے سے بچ کر کمرے کی دیوار تک پھسلتا چلا گیا تھا۔ ایک بے یقینی کی کیفیت نے اسے جکڑ لیا تھا۔ کل تک جو منزل اسے ایک ہاتھ کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی، وہ ایک ہی جھٹکے میں جیسے میلوں دور ہو گئی تھی۔

''کیوں ہوا یہ سب۔ مجھے غلط مطلع کیوں کیا گیا؟'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر دیے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ''کون کر سکتا ہے ایسا؟''

''سرفراز؟'' سوچ کے پردے پر یہ نام سرسرایا تو اسے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں رہی۔

''اس کا مطلب قدیر نے مجھے صحیح اطلاع دی تھی۔'' وہ جوں، جوں سوچتا جا رہا تھا معاملہ اس کے سامنے واضح ہوتا جا رہا تھا۔ ''تو گویا یہ تھا سرفراز کے لاہور آنے کا مقصد۔ مجھے قدیر کی انفارمیشن کی طرف سے مشکوک کر کے کراچی جانے کے لیے اس نے کس آسانی سے راہ ہموار کی۔''

اسے یاد آیا کہ قدیر سے رابطے کے دوسرے ہی دن وہ اچانک لاہور آ گیا تھا، ساتھ ہی کلثوم کی شادی کا دعوت نامہ بھی تھا اور پھر کلثوم کی اصرار بھری کال..... وہ جیسے کڑی، کڑی سے جوڑتا گیا تو جیسے تصویر کے تمام خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔

''تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے سرفراز۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' بے بسی اور بے یقینی سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

اگلے لمحے وہ سیلابی ریلے کے مانند دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ اندر داخل ہوتی شہرین کی وجہ سے رکنا پڑا۔

''آجاؤ زوی کھانا لگ گیا ہے۔ مامی بلا رہی ہیں۔'' وہ اپنے آپ میں مگن سی اطلاع دیتی اندر آئی تھی مگر پیر کے نیچے آتے زاویار کے سیل فون اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے اس کے طوفانی موڈ کا اندازہ ہو گیا تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم لوگ کھا لو۔'' وہ تند انداز میں کہتا اس کی سائڈ سے نکل کر جانے لگا تھا کہ شہرین نے اس کے سامنے آتے ہوئے اس کی راہ روکی۔

''کیسے بھوک نہیں ہے۔ پچھلے آدھا گھنٹے سے تو تم کھانا، کھانا چلا رہے تھے اب اچانک بھوک کیسے ختم ہو گئی تمہاری ہہ سب ٹھیک تو ہے زوی؟''

''ہاں سب ٹھیک ہے، بس مجھے کچھ جلدی ہے۔ تم لوگ کھانا کھا لینا میرا انتظار مت کرنا۔'' شہرین کے فکر مند انداز پر اس نے بمشکل اپنے انتہا کو چھوتے غصے کو دباتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی

تیز قدموں سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔
''اُف اب کس نے مزاج برہم کر دیا عالی جاہ کا؟'' اس کی چوڑی پشت کو بے بسی سے دیکھتی وہ سوچتی رہ گئی۔

.....☆.....☆.....

''میں اندر آسکتی ہوں میمی؟'' زوہا نے کوئی دسویں بار دستک دی تھی۔
''آجاؤ۔'' سائرہ کی آواز رو، رو کر بیٹھ گئی تھی۔ اس بار بھاری آواز میں بیزاری سے اجازت دی۔ عکرمہ اور دادی کے کہنے پر زوہا، دُرِ مکنون کے ساتھ میمی کے کمرے کے دروازے تک آئی تھی اور اس کے اجازت طلب کرنے پر ہی سائرہ نے اندر آنے کو کہا تھا۔ زوہا نے اسے حوصلہ افزا مسکراہٹ کے ساتھ اندر جانے کا اشارہ کیا تو وہ دھڑکتے دل سے کمرے میں داخل ہوئی۔
''میمی۔'' سائرہ سامنے صوفے پر بازو آنکھوں پر رکھے لیٹی تھیں۔ اس کے پکارنے پر یک دم بازو ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور کسلمندی سے اٹھ بیٹھیں۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ کمرے میں بند تھیں۔ مظفر صاحب انہیں سمجھانے کی بھرپور کوشش کر کے جا چکے تھے۔ ردا، سیف اور دادی سب نے ہی ان سے بات کرنا چاہی مگر وہ کسی طور راضی نہ ہوئیں۔ زوہا کو ردا نے فون کر کے بلوایا تھا۔ یہ ساری حقیقت سب کی طرح اس کے لیے بھی حیران کن تھی۔
دُرِ مکنون نے دیکھا سائرہ بہت دلگرفتہ تھیں۔ تاسف ان کے پورے وجود سے چھلک رہا تھا۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کی آمد کی منتظر تھیں۔ جبھی اس کو دیکھ کر ان چہرے پر ندامت کے باوجود طمانیت نظر آرہی تھی۔
''کھانا کھالیں پلیز۔'' دُرِ مکنون ہمت کر کے دو قدم آگے بڑھی اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ سائرہ نے اس بار گہری نظر سے اسے دیکھا تھا۔ کچھ دیر وہ اسے ایسے ہی دیکھتی رہیں۔ تو وہ نروس ہونے کے باوجود ان کے ساتھ آ بیٹھی۔ کچھ تھا ان کی نگاہوں میں جس نے اسے ان کے قریب آنے کا سگنل دیا تھا۔
''جانتی ہو دُرِ مکنون! تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ تم صوفیہ اور زاہد کی اولاد نہیں ہو سکتیں۔ مگر تم میری بیٹی ہو، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' سائرہ کا لہجہ بہت نرم تھا۔ ان کا اس اپنائیت سے دُرِ مکنون کہنا اس کا دل گداز کر گیا۔ پچھتاوے اور ندامت نے مل کر گویا ان کے سارا دم خم ختم کر دیا تھا۔ وہ جب بولیں تو لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔ دُرِ مکنون خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ ایک بار پھر چپ ہو گئی تھیں۔
''کیا کہوں تم سے۔ مظفر کی غلطی تھی یا قسمت کا لکھا، جس نے ہم دونوں کو اتنے فاصلے پر پہنچا دیا۔ کاش یہ سب کرتے ہوئے مظفر ایک لمحے کو سوچ لیتے۔ گزرے تین سالوں میں تم سے اتنی نفرت کی ہے کہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ حقیقت جاننے کے بعد جو جذبات میں محسوس کر رہی ہوں ان کا اظہار کیسے کروں؟'' ایک بار پھر ان دونوں کے مابین خاموشی کو سائرہ نے ہی توڑا۔ ان کا لہجہ بیچارگی سے معمور تھا۔
''اور تم نے بھی تو میری اتنی نفرت سہی ہے کہ میری کسی بھی بات پر اعتبار کرنا یقیناً دشوار ہو گا تمہارے لیے۔ کیسے بھول سکو گی تم وہ سب کچھ.....'' وہ کف افسوس ملتے ہوئے ملول سی کہے گئیں تو دُرِ مکنون بے اختیار ہو کر ان کے گلے لگ کر رو پڑی۔ ان کے سوال کا جواب تھا یہ۔
سائرہ اس پیش قدمی کے لیے تیار نہیں تھیں۔ اپنی جگہ سن سی بیٹھی رہ گئیں مگر جب اس کی سسکیوں نے ان کی آنکھوں سے بھی نمکین سیال بہا ڈالا تو وہ مغلوب کیفیت میں اس کے گرد بازو حمائل کر کے خود بھی پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑیں۔
کتنی ہی دیر بعد وہ دونوں سنبھل سکیں۔ دُرِ مکنون نے ان سے الگ ہونا چاہا مگر انہوں نے اسے خود سے لگائے رکھا۔ آج کتنے سالوں کے بعد اسے ماں کا لمس ملا تھا۔ وہ ایک بار پھر ان کے کندھے سے لگ گئی۔
''کچھ گناہوں کی سزا انسان کو اس دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔'' آنسو صاف کر کے وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔
''بیٹے کی خاطر ابا کی دوسری شادی نے مجھے ہمیشہ اس خوف میں مبتلا کر رکھا کہ میری ماں کی طرح کہیں میرے سر پر

بھی سوتن نہ لا بٹھائی جائے۔ شگفتہ بھابی کے دو بیٹے تھے اور میری صرف بیٹیاں۔ گو کہ مظفر اور اماں نے میری ہر بیٹی کو بہت دل سے خوش آمدید کہا مگر میں اس خوف سے کبھی نجات نہ پا سکی۔'' دھیرے، دھیرے وہ کہنے لگی تھیں۔

''یہ سچ ہے کہ میں نہیں چاہتی تھی تم اس دنیا میں آؤ اور میری طرح چھٹی بیٹی بن کر سدا ماں اور باپ کے پیار کو ترسو۔ اور ایک تیسرے درجے کے شہری کی طرح زندگی گزارو۔ مگر میری یہ خواہش اس طرح پوری ہوگی اس کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے قسمت کو ہمیشہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا مگر دیکھو کس بری طرح شکست کھائی۔ جن لوگوں سے میں نے شدید نفرت کی اللہ نے ان ہی کے ہاتھوں میری اولاد کو پلوایا۔'' خود ترسی اور پشیمانی ان کے لہجے سے عیاں تھی۔

دُرِ مکنون سے ان کا یہ ٹوٹا لہجہ برداشت نہ ہو سکا تو یک دم ان کے کندھے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''ماما اس حقیقت سے واقف نہیں تھیں لیکن بابا نے یہ سب جانتے ہوئے بھی بہت پیار اور مان سے مجھے پالا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بھی بہت خوش تھے لیکن جب بھی آپ کا ذکر نکلتا ماما بہت اداس ہو جاتیں اور مجھے تو یہاں آ کر پتا چلا کہ وہ کیوں اداس ہوتی تھیں۔ کیونکہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ آپ کے لیے دکھ کا باعث بنی تھیں۔'' ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولتی دُرِ مکنون، سائرہ کو خاموش کرا گئی۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ کے لیے سب کچھ بھلانا آسان نہیں اور نہ ہی آپ مجھے اپنے باقی بچوں کی طرح چاہ سکتی ہیں۔ مگر میں نے پہلے ہی دن سے آپ میں ایک ماں کو دیکھا ہے۔ مظفر انکل اور آپ سے میری محبت فطری ہے۔ ایک بدترین حادثے کے نتیجے میں قسمت نے مجھے آپ سے ملایا ہے، ہو سکے تو پلیز اس حقیقت کو قبول کر لیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس کے سوا آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔'' ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ کر وہ رندھے گلے سے بولی۔

''اوہ میری بچی۔'' دُرِ مکنون کے جملوں نے جیسے سائرہ کے دل پر ہاتھ مارا تھا۔ اسے کھینچ کر خود سے لگاتے ہوئے وہ ایک بار پھر بری طرح رو پڑیں تو دُرِ مکنون کے لیے بھی خود کو سنبھالنا ممکن نہ رہا اور پھر بہت دیر آنسوؤں کی یہ برسات جاری رہی جو اپنے ساتھ بہت سے پچھتاوے، ندامت اور گلے، شکوے بہا کر لے گئی۔

.....☆.....☆.....

وہ کسی سیلابی ریلے کے مانند سرفراز کے کیبن کی طرف بڑھا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دے۔ جس نے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کو پورا ہونے نہیں دیا تھا۔ بابر زمان سے حساب بے باق کرنے کا یہ موقع اور کسی نے نہیں اس کے اپنے دوست نے چھینا تھا اس سے۔ وہ اسے کیسے معاف کر سکتا تھا۔

''السلام علیکم زاویار! کیا حال ہیں؟'' دھڑ سے دروازہ کھولتا وہ اندر آیا تو آنکھوں میں سرخی اور چہرے پر جلال نمایاں تھا۔ سرفراز ٹیبل کی اس جانب بیٹھا جیسے اس کا ہی منتظر تھا۔ تحمل سے سلام کرتے ہوئے اس نے زاویار کو بغور دیکھا تھا۔

''تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو سرفراز؟'' چند ثانیے اسے گھور کر دیکھتے رہنے کے بعد جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں غصہ، بے بسی اور ملال سب کچھ تھا۔ ایک عالمِ طیش میں وہ ٹیبل کی چکنی سطح پر دونوں ہاتھ رکھ کر سرفراز کے مقابل جھکا تو آواز فرطِ غیظ سے کانپ رہی تھی۔

''ایسا بھی کیا کر دیا میں نے زاویار بابر؟'' دوسری جانب جس رسانیت سے پوچھا گیا وہ اسے مزید چراغ پا کرنے ... کو کافی تھا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ میں نے تمہیں دوست سمجھا اور تم نے میری ہی پشت میں چھرا گھونپ دیا۔'' اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ لہجے سے حیرت اور تاسف عیاں تھا۔ جواباً سرفراز لمحے بھر کے لیے چپ ہو گیا۔

''لیکن اگر یہ سب کر کے تم سمجھتے ہو کہ میرے منصوبے کو ناکام بنا دو گے تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اب تم یا کوئی بھی ایکس وائی زی، بابر زمان کو میرے عتاب سے نہیں بچا سکتا۔ میں اس سے انتقام لے کر رہوں گا۔''

''مگر یہ سب کر کے تم آخر کیا حاصل کر لو گے زاویار؟'' ہٹ دھرمی سے بولتے زاویار کو سرفراز کے اس رسانیت بھرے سوال نے مزید بھڑکایا تھا۔

''this is none of your business'' شدید اشتعال کے باعث اس کی کنپٹی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

''جو چھیڑ لڑائی کے بعد مارنا یاد آئے، وہ اپنے منہ پر مار لینا چاہیے زاویار انصاری۔ اب یہ سب کچھ کرنے سے سوائے قانونی سزا کے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا آئی سمجھ۔'' سرفراز کا ضبط جواب دے گیا تو وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار اس کے لہجے میں بھی سرزنش کی تپش تھی۔

''یہ میرا مسئلہ ہے تمہیں اس سب میں پڑنے کے لیے کس نے کہا تھا۔''

''دوست ہو تم میرے۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں کہ تمہیں اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے سے روک سکوں۔''

''دوست۔ to hell with your friendship۔ یہ ہے تمہاری دوستی۔ چیٹ کیا تم نے مجھے۔ دھوکا دیا۔'' باوجود ضبط کے وہ چیخ پڑا تھا۔

''پلیز زاویار۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ ٹرسٹ می۔ تمہارے وہاں جانے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے جو بھی کیا وہ سب تمہاری سیفٹی کے لیے تھا۔''

''نہیں کرنا چاہیے تھا ایسا۔ کوئی ضرورت نہیں تھی میرا تحفظ کرنے کی۔ کم از کم تمہارا اعتبار تو قائم رہتا۔ مگر اب میں وہ کروں گا جو تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا سرفراز..... اور اس بار تم مجھے روک نہیں سکو گے۔ بس اب انتظار کرو اور دیکھتے رہو۔'' دہکتے لہجے میں طنز یہ کہتا وہ سرفراز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا اور اس سے پہلے کہ سرفراز کچھ کہتا وہ یک دم پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

''زاویار رکو۔ میری بات سنو۔'' سرفراز اس کے پیچھے لپکا مگر وہ جیسے کسی گرداب پر سوار تھا۔ بس آگے ہی بڑھتا گیا۔

''کیا ہوا سرفراز؟ یہ زاویار اتنے غصے میں کیوں تھا۔'' ساتھ والے کیبن سے نکلتی اسا فکر مند تھی جسے ان دونوں کی اونچی آواز میں ہونے والی تلخ کلامی نے باہر آنے پر مجبور کیا تھا۔

''یہ سب بعد میں پوچھنا اسا۔ پلیز فی الحال لاہور کی سیٹ فوراً بک کروا دو۔ اٹس ارجنٹ۔'' عجلت میں کہتا سرفراز پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور تیزی سے مقفل دراز کو چابی سے کھول کر اپنا پاسپورٹ نکالا۔ سیل فون اور کار کی چابی اٹھا کر باہر کی طرف لپکا۔

''مگر تم کہاں جا رہے ہو؟'' اسا حواس باختہ سی اس کے پیچھے آئی تھی۔

''ائرپورٹ۔ and make sure کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے میری فلائٹ بک ہو جانی چاہیے۔'' عجلت میں جواب دے کر اسے تلقین کرتا وہ تیز قدموں سے چلتا لفٹ کی طرف جانے والے راستے پر ہو لیا تھا۔ اور اب اس کا ذہن تیزی سے آگے کا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے بھی وہ مسلسل کالز ملاتا رہا اور متعلقہ افراد کو ہدایات دیتا رہا۔ ائرپورٹ پہنچنے تک اس کا ذہن مکمل طور پر یکسو ہو چکا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ زاویار کا اگلا قدم کیا ہوگا اور اسے اس پیش قدمی سے روکنے کا بندوبست اس نے کر لیا تھا۔ مگر وہ بہت مطمئن نہیں تھا۔ آخری کال اس نے نتاشا کو ملائی اور اسے لاہور جانے کا بتا کر فون بند کر دیا۔ ائرپورٹ کے احاطے میں پہنچنے سے پہلے اسا نے اسے اس کا الیکٹرانک ٹکٹ ای میل کے ذریعے بھیج دیا تھا۔

.....☆.....☆.....

''السلام علیکم مسز۔ کیا آپ دس منٹ میں تیار ہو کر میرے ساتھ چل سکتی ہیں؟'' عکرمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس سے کہا تو وہ جو ظہر کی نماز پڑھ کر ابھی چائے بنانے کا سوچ ہی رہی تھی، سٹپٹا کر مصلے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''وعلیکم السلام۔ خیریت آپ اتنی جلدی کیسے آ گئے؟'' اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا تھا۔

''کیسے نہ آتا۔ مصلے پر بیٹھ کر اتنے خضوع و خشوع سے دعائیں کر کر کے غالباً مجھے ہی بلوایا جا رہا تھا۔'' دُرِ مکنون کے فکرمندی سے کہنے پر شوخی بھرابرجستہ جواب آیا تو اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

''پلیز مذاق مت کیجیے! سچ بتائیں۔ سب ٹھیک ہے ناں؟'' آج ان دونوں کو عمرے پر جانے کے لیے احرام اور دیگر ضروری چیزوں کی خریداری کرنے جانا تھا۔ عکرمہ اسے شام میں تیار رہنے کا کہہ کر گیا تھا مگر اب اچانک وہ دوپہر میں ہی گھر چلا آیا تو وہ کچھ فکرمند ہو گئی۔

''فکر مت کریں سب ٹھیک ہے۔ مگر وقت بہت کم ہے، آپ تیار ہو کر نیچے آ جائیں باقی باتیں راستے میں ہو جائیں گی۔ تب تک میں وادی کو جانے کا بتا کر آتا ہوں۔'' تسلی آمیز لہجے میں کہتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا تو وہ افتاں و خیزاں وارڈروب کی طرف چلی آئی۔ کچھ دیر پہلے ہی کپڑے تبدیل کیے تھے اس نے۔ لہٰذا بال سمیٹ کر حجاب باندھا۔

اگلے دس منٹ میں وہ واقعی پورٹیکو میں تھی جہاں کار کا دروازہ کھولے عکرمہ اس کا منتظر تھا۔

''آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟'' کار اسٹارٹ ہوتے ہی وہ بے صبری سے پوچھ بیٹھی تھی۔ عکرمہ کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر تھا جس نے اسے تجسس کر دیا تھا۔

''ایک شریف بندہ اپنی بیوی کو لے کر زیادہ سے زیادہ کہاں جا سکتا ہے یا تو کسی ہوٹل یا کسی پارک.....'' عکرمہ نے اس کے متوحش چہرے پر نظر ڈال کر بظاہر مسکرا کر کہا۔

''تو کیا ہم کسی ہوٹل جا رہے ہیں؟''

''ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تو وہ مطمئن نہ ہوتے ہوئے بھی خاموش ہو گئی۔ ٹھیک بیس منٹ بعد وہ عکرمہ کی ہمراہی میں ایک ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی۔ لفٹ سے ساتویں منزل پر پہنچنے کے بعد ایک طویل راہداری چل کر وہ دونوں ایک کمرے کے آگے جا رکے۔ عکرمہ نے اطلاعی گھنٹی بجائی اور دروازہ کھلنے پر جو شخص سامنے آیا اس نے دُرِ مکنون کو ششدر کر دیا۔

''آصف بھائی۔'' اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

''عکرمہ، دُرِ مکنون..... آپ لوگ..... یہاں کیسے؟'' متعجب تو آصف بھی تھا ان دونوں کو سامنے پا کر۔ دُرِ مکنون نے بھی حیرت سے عکرمہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ عکرمہ اسے آصف سے ملوانے لا رہا ہے۔

''اندر آنے کو نہیں کہو گے آصف۔'' دوستانہ لہجے میں بولتا عکرمہ، آصف کو شرمندہ کر گیا تو وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا اور ان دونوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا suite تھا۔ دُرِ مکنون نے دیکھا آصف وہیل چیئر کے بجائے اسٹک کے سہارے چل رہا تھا۔ تاہم چال میں اب بھی واضح لنگڑاہٹ تھی۔

''پلیز بیٹھیے۔'' آصف صوفے کی طرف اشارہ کر کے خود کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ دونوں بیڈ روم کی طرف کھلنے والے دروازے کے ساتھ رکھے ٹو سیٹر صوفے پر براجمان ہو گئے۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی گونجتی رہی جسے بالآخر آصف نے توڑا۔

''آپ کو میرے یہاں ہونے کا کیسے پتا چلا؟''

''فزیو تھراپسٹ مسٹر جنید سے۔ کل شام ان کا یہاں آخری وزٹ تھا۔ جس کے بعد وہ تمہارے وعدے سے آزاد ہو گئے۔ آج صبح انہوں نے مجھے تمہارا۔ ایڈریس دیا اور یہ بھی بتایا کہ آج رات کی فلائٹ سے تم جانے والے ہو۔ تو کہاں کے ارادے ہیں برادر؟'' عکرمہ نے رسانیت سے جواب دیا تو آصف خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ دیوار کے ساتھ بندھے رکھے سفری بیگ اس کی روانگی کا ثبوت تھے۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی گونجتی رہی۔

''میں تم سے یہ سب توقع نہیں کرتا تھا آصف۔'' تاسف سے کہہ کر عکرمہ نے لب بھینچ کر اسے دیکھا تو آصف نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔

''میں نے بھی قسمت سے یہ سب ایکسپیکٹ نہیں کیا تھا جو میرے ساتھ ہوا۔''

''قسمت کے لکھے کا بدلہ تم ردا سے کیسے لے سکتے ہو آصف۔ اس نے تو ہر قدم پر تمہارا ساتھ دیا تھا۔ مگر تم نے اس کے ساتھ کیا، کیا۔ پہلے تو اسے تنہا چھوڑ گئے اور پھر اسے طلاق دے ڈالی۔'' ہمیشہ کے تحمل مزاج عکرمہ کا لہجہ یک بیک آنچ دینے لگا تھا۔ دُرِ مکنون نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں ردا کو چھوڑ کر نہیں گیا مگر سائرہ آنٹی مجھے مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ نہ شیرازی ولا میں اور نہ ہی اپنی بیٹی کی زندگی میں۔'' قدرے تیز لہجے میں آصف نے انکشاف کیا تو وہ دونوں ششدر رہ گئے۔ عکرمہ لب بھینچ کر چند ثانیے اسے یونہی دیکھتا رہا۔

''تو پھر تم نے طلاق کیوں دی ردا کو؟''

''میں نے اسے طلاق نہیں دی اور نہ دوں گا۔ یہی کہا تھا میں نے سائرہ آنٹی سے جس کی پاداش میں انہوں نے مجھے گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھ پر چوری جیسا گھٹیا الزام تک لگانے سے گریز نہ کرتیں۔'' آصف کا یہ انکشاف اور بھی شدید تھا۔ وہ دونوں لمحے بھر کے لیے لب بستہ رہ گئے۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اگر تم نے طلاق نہیں دی تو تمہارے سائن والے divorce papers کس نے بھیجے؟'' عکرمہ نے خود کو تعجب سے نکال کر استفسار کیا۔

''اس سوال کا جواب آپ اپنی چچی جان سے لیں عکرمہ۔ ان کی قریب ترین دوست افروزہ صاحبہ کے شوہر نفیس بلگرامی اس شہر کے صفِ اول کے بیرسٹر ہیں۔ جو گزرے کئی ماہ سے مجھ پر پریشر ڈالتے رہے ہیں کہ میں ڈائیورس پیپرز (طلاق نامے) کو سائن کروں اور آوٹ آف کورٹ ہی معاملہ ختم کردوں مگر میں اس پر کسی طور راضی نہیں تھا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے مجھ پر domestic violence (گھریلو تشدد) کا کیس دائر کردیا اور ساتھ ہی خلع کا کیس بھی فائل کیا۔'' آصف ایک کے بعد ایک حیرت انگیز انکشافات کیے جا رہا تھا۔ جس پر دُرِ مکنون حیران و پریشان رہ گئی تھی۔

''مگر ایسا کیوں کریں گی آصف بھائی؟ ردا آپی ان کی بیٹی ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کا گھر کیوں خراب کرنا چاہیں گی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکلا تھا۔ جس پر آصف اس کی طرف دیکھ کر افسردگی سے مسکرا دیا۔

''وہ اپنی بیٹی کا گھر خراب کرنا نہیں، کسی اور کے ساتھ دوبارہ بسانا چاہتی تھیں دُرِ مکنون! انہیں ایک جاب لیس، معذور داماد نہیں چاہیے تھا۔'' عکرمہ کو گہری نظر سے دیکھ کر دل شکستگی سے بولتا آصف، دُرِ مکنون کو نظر چرانے پر مجبور کر گیا۔

''تو گویا میسی نے یہ بات آصف بھائی کو بھی بتا دی تھی۔'' دُرِ مکنون نے سوچا۔ آصف نے کہا۔

''بحیثیت ماں شاید وہ حق بجانب تھیں مگر اس کے لیے جو راستہ انہوں نے چنا وہ درست نہیں تھا۔''

''کچھ بھی تھا تمہیں ردا پر یا گھر میں کسی اور پر اعتماد کرتے ہوئے یہ سب بتانا چاہیے تھا۔ اس طرح خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا کوئی دانائی نہیں تھی۔'' عکرمہ تحمل سے بات کو اصل رخ پر لاتے ہوئے بولا تو آصف نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

''ان دنوں میں جس ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا کوئی بھی مثبت فیصلہ کرنا خود میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے چڑچڑے پن کی وجہ سے میرے اور ردا کے درمیان یوں بھی فاصلے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں بددلی اور بدگمانی کے زیرِ اثر میں نے یہی بہتر سمجھا کہ میں شیرازی ولا سے چلا جاؤں۔ لیکن ردا کو نہ میں پہلے چھوڑنا چاہتا تھا اور نہ اب چاہتا ہوں۔ اپنی ساری جمع پونجی لگا کر میں نے یہ کیس لڑا مگر اب جبکہ خلع کے کیس کا فیصلہ میرے خلاف ہونے جا رہا ہے، میں اس شہر میں رہ کر خود کو مزید اذیت نہیں دے سکتا۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ فیصلہ تمہارے خلاف ہوگا؟''

''میرے وکیل نے بتایا دیا ہے مجھے۔ سائرہ آنٹی کی کوشش بالآخر بارآور ہوئی لیکن آج وہ مجھ سے کیوں ملنے آرہی ہیں، میں نہیں جانتا۔ مجھے الوداع کہنا چاہتی ہیں یا میری بے بسی کا تماشا دیکھنے کا ارادہ ہے اب یہ تو ان کے آنے پر ہی پتا چلے گا۔'' استہزائیہ سا ہنس کر ان دونوں کو دیکھا۔

''چچی جان تم سے ملنے آرہی ہیں؟'' عکرمہ نے تعجب سے سوال کیا تھا۔

''ہوں مجھے بھی حیرت ہے۔ میں اس وقت آپ دونوں کے بجائے انہیں ہی expect کر رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ پہلے یہی ٹائم ٹیکسٹ کیا تھا انہوں نے۔'' کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے ابھی اس نے جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے ان تینوں کو متوجہ کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ آگئی ہیں۔ guys if you don`t mind آپ لوگ بیڈ روم میں بیٹھ جائیں۔ اچھا ہے ان کی گفتگو سن کر آپ دونوں کو بھی یقین آجائے گا کہ میں کوئی غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔'' اسٹک کے سہارے کھڑے ہوتے ہوئے آصف نے کہا تو دُرِ مکنون، عکرمہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جس نے کچھ سوچ کر سر اثبات میں ہلایا اور بیڈ روم کے ادھ کھلے دروازے کو وا کرتے ہوئے دُرِ مکنون سمیت اندر داخل ہوگیا۔

''السلام علیکم۔'' ذرا دیر بعد ان دونوں نے آصف کی آواز سنی۔ جس میں اجنبیت واضح تھی۔

''وعلیکم السلام۔ کیا حال ہیں آصف؟'' سائرہ شیرازی کی آواز میں واضح تھکن تھی۔

''جس حال کو آپ پہنچانا چاہتی تھیں، وہی حال ہیں۔'' آصف کا انداز استہزائیہ تھا۔

''کیا تم شہر چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' سائرہ نے اس کا لہجہ نظر انداز کر کے فکرمندی سے سوال کیا تو وہ تلملا گیا۔

''شہر بدر ہو جانے کے علاوہ آپ نے آپشن ہی کیا چھوڑا ہے میرے لیے۔ میرا گھر میری بیوی میری prestige سب کچھ تو چھین لیا آپ نے۔ میں اس شہر میں کسی سے نظر ملانے کے لائق نہیں رہا۔ سب سے بڑھ کر ردا کے دکھ کا سبب بنا۔ جھوٹے طلاق نامے کے ذریعے آپ نے اسے مجھ سے چھین لیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ آپ کے مقابلے کا بڑا وکیل کر سکتا تو فراڈ کے کیس میں آپ کو اندر کروا دیتا مگر کیا کروں اس شہر میں انصاف بھی بکتا ہے۔'' آصف کا بے بسی سے بھرپور لہجہ سائرہ کو ندامت سے دوچار کر گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی گونجتی رہی۔

''میں جانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا میں نے۔'' گہری سانس بھر کر سائرہ بولیں تو آصف سمیت اندر بیٹھے عکرمہ اور دُرِ مکنون بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

''جی.....'' آصف کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے بغور دیکھا۔ یہ وہ سائرہ شیرازی تو نہیں تھیں جن کے غرور اور ہٹ دھرمی نے اس کے اور ردا کے گھر کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ جو ہر صورت ردا کو اس سے چھڑا کر عکرمہ سے بیاہنا چاہتی تھیں۔

شیرازی ولا چھوڑنے سے پہلے کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ جب انہوں نے ردا کی غیر موجودگی میں اس کے کانوں میں زہر نہ ٹپکایا ہو کہ وہ ردا کے لائق نہیں۔ اسے احساسِ محرومی سے احساسِ کمتری کی طرف دھکیلنے والی کوئی اور نہیں سائرہ شیرازی ہی تھیں۔ مگر جب کبھی اس نے یہ بات ردا کو بتانا چاہی تو وہ اس سے ناراض ہو جاتی۔ جس ماں نے دادی اور باپ کی مخالفت مول لے کر اس کو اپنے من پسند ساتھی کی دلہن بنایا تھا وہ بھلا کیسے اس کا گھر اجاڑ سکتی تھی۔ ردا کی خفگی اور سائرہ کی نفرت نے اسے بالآخر انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کیا اور وہ سب کو چھوڑ آیا مگر آج جو عورت اس کے سامنے کھڑی تھی، یہ وہ تو نہ تھی جسے وہ جانتا تھا۔

''مجھے پتا ہے کہ تمہارے لیے میری بات کا یقین کرنا مشکل ہوگا مگر یہی سچ ہے آصف۔ مجھے واقعی اپنے کیے کا افسوس ہے، بہت دکھ ہے۔'' رکتے، رکتے بھی وہ کہہ ہی گئیں، آصف بے یقینی سے انہیں سنے گیا۔ اس کی آنکھوں میں شدید استعجاب تھا۔

''میں ردا کے لیے ایک اچھا شریکِ سفر چننا چاہتی تھی جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔ مگر نہیں معلوم تھا کہ اس کے دل میں صرف تم ہی بسے تھے۔ تم جو جیسے اور جہاں تھے اسے قبول تھے۔ مگر میں اپنی خواہش کے آگے کچھ ایسی اندھی ہو چکی تھی کہ میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کے گھر اجاڑنے کی ٹھان لی اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی کچھ منٹ پہلے ہی ردا کو اسپتال پہنچایا گیا ہے۔'' کہتے، کہتے یک دم وہ رو پڑیں تو آصف گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کک... کیا؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا ہوا ہے ردا کو؟'' آصف تڑپ سا گیا اور بے قراری سے پوچھا۔ اُدھر کمرے میں بیٹھی دُرِ مکنون نے بے قراری سے عکرمہ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر جانا چاہا مگر عکرمہ نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا اور سیل فون نکالنے کے لیے اپنی جیب ٹٹولی تو معلوم ہوا کہ وہ اسے گاڑی میں بھول آیا ہے۔ یقیناً اسے فون کیا گیا ہوگا مگر اس کا فون حسبِ معمول انسٹی ٹیوٹ میں سائلنٹ پر تھا، آصف سے ملنے کی فکر میں وہ اس کو unmute کرنا بھول گیا تھا۔ اس لیے گاڑی میں بھی اسے بیل سنائی نہ دی تھی۔

''یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ جب تم ڈائیورس دینے کو تیار نہ ہوئے تو میں نے ردا کو خلع کے لیے راضی کرنا چاہا مگر وہ کسی طور نہ مانی تب اپنے وکیل نفیس بلگرامی سے کہہ کر میں نے وہ طلاق نامے تیار کرائے۔ لیکن جس دن سے اسے تیسری اور آخری طلاق کے پیپرز ملے رجوع کی آخری امید کے ساتھ وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے اپنے کمرے سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ آج بھی حسبِ معمول اس نے ناشتا اور لنچ نہیں کیا۔ تنگ آ کر میں اسے شام کی چائے کے لیے بلانے گئی تو وہ بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔'' اعترافِ جرم کرتے ہوئے سائرہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے بہے جا رہے تھے۔

''وہ کیسی ہے اب؟ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟'' آصف کے فکرمند لہجے میں بے تابی تھی جسے محسوس کر کے سائرہ کو دل کو بڑی تقویت ملی۔

''ڈاکٹرز نے ڈیپریشن بتایا ہے۔ ساتھ ہی جسمانی طور پر بھی وہ بہت کمزور ہو گئی ہے۔'' انگلی کی پوروں سے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے انہوں نے کہا تو آصف ناراضی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''تو اب یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔ ایک دو دن میں آپ کے حسبِ منشا کورٹ کا فیصلہ آ جائے گا اور ردا آزاد ہو جائے گی۔ یہی تو چاہتی تھیں ناں آپ۔ کر لی آپ نے اپنی من مانی۔ دیکھ لیا اس کا نتیجہ۔'' آصف کے لیے ضبط کرنا محال ہو گیا تھا جس کے باعث اسے حدِ ادب کا پاس نہ رہا۔ اور وہ اونچی آواز میں چیخ پڑا۔

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے آصف۔ پلیز میری بیٹی کو زندگی کی طرف واپس لے آؤ۔ میں بلگرامی صاحب کو خلع کا کیس واپس لینے کا کہہ چکی ہوں۔'' سائرہ بیگم کا لہجہ خفت اور عاجزی سے بھرپور تھا۔

''اور وہ طلاق نامہ..... اس کا کیا ہوگا۔ کیا آپ اپنے گھر والوں کے سامنے یہ اعتراف کر سکیں گی کہ وہ جعلی پیپرز آپ کے کہنے پر بنوائے گئے تھے؟''

''میں ردا کی خاطر سب کچھ کر سکتی ہوں۔ ایک بار پہلے بھی میری ضد کی وجہ سے قسمت نے میری اولاد مجھ سے چھین لی تھی۔ مگر میں دوبارہ ایسا نہیں ہونے دینا چاہتی۔'' سائرہ فیصلہ کن لہجے میں بولیں تو آصف پُرسوچ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''سوچ کیا رہے ہو آصف۔ میں جانتی ہوں تمہارے لیے یہ سب کچھ بھولنا اور معاف کرنا آسان نہیں۔ لیکن پلیز میرے کیے کی سزا ردا کو مت دینا۔ اس کا اس سب میں کوئی قصور نہیں۔ دیکھ لو تمہاری جدائی اسے تباہ کر گئی ہے۔ پلیز اب میرے ساتھ چلو۔ ردا کو تمہاری، تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔'' ایک ماں اپنی انا، اپنا غرور اس کے قدموں میں رکھ چکی تھی۔ آصف کے لیے انہیں اس سے زیادہ شرمندہ دیکھنا ممکن نہ تھا۔ یہ اس کی تربیت اور اس کی فطرت کے منافی تھا۔

''میں اسے کیا سہارا دوں گا میں تو خود اس اسٹک کے سہارے چلتا ہوں۔'' وہ جیسے اپنی حالتِ زار پر خود ہی

ہنس پڑا تھا۔ ''سوچ لیں، قبول کرلیں گی آپ مجھے اس طرح۔''

''ان سب باتوں سے اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب میری بیٹی خوش تو میں بھی خوش۔''

''مگر میری فلائٹ؟'' آصف نے کچھ سوچ کر پوچھا تو سائرہ نے سر کو نفی میں جنبش دی۔

''اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ تم میری بیٹی کی زندگی ہو۔'' ان کے انداز میں اپنائیت بھرا تحکم تھا۔ آصف نے ایک لمحے کے لیے رک کر کچھ سوچا اور پھر ان کی طرف دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولا۔

''آپ لابی میں میرا انتظار کیجیے، میں آتا ہوں۔ چیک آؤٹ کرنا ہے مجھے۔'' اس کا یہ کہنا سائرہ کے چہرے پر بشاشت کے رنگ اتار لایا تو وہ خوشی سے چھلکتی آنکھوں کو صاف کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ جس کے بعد آصف بیڈ روم کا دروازہ کھول کر ان دونوں کی طرف آیا۔ دُرِمکنون کے لیے اس سے نظر ملانا آسان نہ تھا۔ اور دشوار تو ان دونوں کے لیے بھی تھا۔ چند لمحوں کے لیے کمرے میں خاموشی گونجتی رہی جسے عکرمہ کی بھاری آواز نے توڑا۔

''تم چچی جان کے ساتھ جاؤ آصف۔ ہم تمہارا سامان لے کر اسپتال پہنچتے ہیں۔''

.....☆.....☆.....

''ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چچی جان اپنی ضد پوری کرنے کے لیے اس حد تک پہنچ جائیں گی۔'' کار اسٹارٹ کرتے ہی ماتھے پر شکنیں لیے وہ جیسے زیرِلب بڑبڑایا تھا۔

''انسان کے ہر منفی رویّے کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے۔ اور ایسے رویّوں کا سب سے بڑا سبب خوف ہے۔'' عکرمہ کی بات کے جواب میں وہ بے اختیار کہے گئی تو عکرمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ خوف بھی بڑا عجیب احساس ہے، یہ اگر انسان کے دماغ کو جکڑ لے تو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کرلیتا ہے اور پھر اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ اپنے آپ کو یا اپنے کسی پیارے کو بچانے کی کوشش میں وہ دوسروں کا کتنا نقصان کر ڈالتا ہے۔'' وہ جیسے کسی خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔

''اور آپ کے نزدیک ایسے عمل کا کیا ردِعمل ہونا چاہیے؟'' بھویں سکیڑتے ہوئے اس نے سوال کیا تو دُرِمکنون نے سنجیدگی سے اس چہرے پر نظر جمائی۔

''یہ تو نہیں پتا۔ البتہ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ردِعمل مقابل کے عمل کے مطابق نہیں انسان کی اپنی شخصیت اور والدین کی تربیت کے مطابق ہونا چاہیے۔'' وہ بولی تو اس بار لہجے میں اعتماد تھا۔ ''میمی نے ہر دم کچھ کھو دینے کے خوف سے آلودہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ میں اور آپ جیسے لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ اپنے والدین کے لیے unwanted (ان چاہا) ہونا اور ہمہ وقت خود کو منوانے کے لیے جنگ لڑنا کیا ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں ان کے بارے میں judgemental نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے اپنا نقطۂ نظر کچھ ایسے الفاظ اور انداز میں بیان کیا کہ عکرمہ ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ''اس طرح کے ماحول میں رہنے والے حالات سے لڑتے، لڑتے کب تقدیر سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں شاید انہیں خود بھی اندازہ نہیں ہو پاتا۔''

''تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ چچی جان کو defend کر رہی ہیں؟''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔'' جواباً وہ بلا تامل بولی تھی۔ اور پھر پُراعتماد انداز میں نگاہ اٹھا کر عکرمہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''میں بس ان کے عمل کے پیچھے چھپے محرک کی بات کر رہی تھی۔ یوں بھی بقول آپ کے جب کوئی اپنے کیے پر نادم ہو تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔'' اس کا انداز قائل کر لینے والا تھا۔ اس نے عکرمہ کی ہی بات اسے ہی لوٹا دی تھی۔

''اب اس کا فیصلہ تو وہ ہی کر سکتا ہے جس کو دھوکا دیا گیا ہو۔ کچھ رشتوں پر ہم آنکھ بند کر کے بھروسا کرتے ہیں۔ ان سے دھوکا کھانا قابلِ برداشت نہیں ہوتا مسز۔'' عکرمہ کا انداز ہنوز تھا۔

''جب والدین اپنی اولاد کی بڑی سے بڑی غلطی معاف کر دیتے ہیں، نظر انداز کر دیتے ہیں تو اولاد کیوں نہیں

کرسکتی ایسا؟ میمی کا عمل غلط ہوسکتا ہے مگر ان کی نیت بری نہیں تھی۔ کچھ بھی ہے انہوں نے ردا آپی کا اچھا ہی چاہا تھا۔'' وہ مدلل لہجے میں بولی تو عکرمہ کے چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''agreed۔ دلیل مضبوط ہے مسز۔ آپ کی مقررانہ صلاحیتوں نے متاثر کیا آج۔ تاہم چچی جان کی اس نازیبا حرکت کے بارے میں جان کر باقی گھر والے کیا ردِعمل دیں گے۔ اس کا فیصلہ آپ یا میں نہیں کرسکتے۔'' متفق ہونے کا عندیہ دیتے ہوئے اس نے کچھ فکرمندی سے کہا تو درمکنون نے اسے دیکھا۔

''فیصلہ نہ سہی صلاح تو دے سکتے ہیں ہم۔ اگر آپ اور میں کوشش کریں تو مجھے یقین ہے کہ ہم اس صورتِ حال کو سنبھال لیں گے۔ پلیز وعدہ کریں کہ اس معاملے میں آپ میمی کی پوزیشن کلیئر کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔'' آنکھوں میں التجا اور امید لیے وہ اس سے وعدہ مانگ رہی تھی۔ جانے یہ التجائیہ حکم تھا یا پھر حکمیہ التجا۔

عکرمہ نے لب بھینچ کر لمحے بھر کے لیے اسے دیکھا اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر نظر تارکول کی سڑک پر جمادی۔ سائرہ بیگم سے لاکھ کبیدہ خاطر سہی مگر یہ سچ تھا کہ وہ دُرِمکنون کو اس بار مایوس نہیں کرسکتا تھا۔ سائرہ سے اپنے رشتے کا علم ہونے کے بعد وہ ان کے معاملے میں اور بھی حساس ہوگئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے مظفر صاحب کی طرف سے سائرہ کا دل صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب ان دونوں کے مابین مزید تلخیاں اور دوریاں برداشت کرنا اس کے لیے دشوار تھا۔

عکرمہ کی خاموش ہاں نے اس کے دل کو کسی حد تک پریشانی سے نکالا تو اس نے پُرسکون ہوکر عکرمہ کا سیل فون اٹھالیا اور اب اس کی انگلیاں مظفر صاحب کا نمبر ڈائل کررہی تھیں۔ ردا کی خیریت دریافت کرنے کے علاوہ آصف کی وہاں متوقع آمد کے لیے ان کو ذہنی طور پر تیار کرنا بھی ضروری تھا۔

''پلیز۔ بات کیجیے پاپا سے۔'' موبائل کا اسپیکر کھولتے ہوئے اسے عکرمہ کے قریب کیا۔

''آپ ساری زندگی مجھ پر اسی طرح حکم چلائیں گی؟'' دوسری طرف ابھی بیل جارہی تھی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عکرمہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں سوال کیا تو وہ جھینپ کر نظر چرا گئی۔

''حکم نہیں درخواست کی ہے۔'' دبے، دبے لہجے میں جواب دیا۔

''خاصی حاکمانہ درخواست ہے۔'' عکرمہ نے گہری نظر اس پر ڈالتے ہوئے کہا تو وہ خود کو مسکرانے سے نہ روک سکی۔

.....☆.....☆.....

''زوی ہم پرسوں کی فلائٹ سے جا تو رہے ہیں لاہور۔ وہاں سے چلے جانا اسلام آباد۔ آخر آج ہی جانا کیا ضروری ہے؟'' اسے تیزی سے سفری بیگ میں کچھ ضروری سامان رکھتا دیکھ کر شہرین نے پریشانی سے سوال کیا تھا۔ جو گھر سے بہت آتشیں موڈ میں نکلا تھا مگر واپسی پر وہ کسی سمندر کے مانند پُرسکون تھا۔ تاہم اس کا یہ سکون طوفان سے پہلے کی خاموشی لگ رہا تھا۔ شہرین اسے فکرمندی سے دیکھ رہی تھی۔ جس نے آناً فاناً اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔

''ضروری نہ ہوتا تو میں اس وقت جانے کی تیاری نہ کررہا ہوتا۔'' وہ ہنوز مصروف تھا۔ سنجیدگی سے جواب دیا۔

''پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ ہمارا لاہور جانا بہت ضروری ہے اور اب سب کچھ بھول بھال کر خود اسلام آباد جارہے ہو۔''

''چند دنوں کا کام ہے مجھے وہاں۔ میں بعد میں جوائن کرلوں گا تم سب کو۔''

''اور میں..... اتنے دن میں کیا کروں گی تمہارے بغیر؟''

''تم اپنی بقیہ شاپنگ مکمل کرنا لاہور سے۔ عینی اور شیبا وغیرہ کے ساتھ۔'' اس کے پاس جیسے ہر سوال کا جواب تھا۔

آج کئی دن بعد وہ اسے شادی سے پہلے والا زاویار انصاری لگ رہا تھا۔ سنجیدہ اور دوٹوک انداز میں فیصلے سنانے والا۔

''تم جا کہاں رہے ہو زوی؟'' کاغذات کو بیگ کی اوپری جیب میں رکھ کر اس نے سر اٹھایا تو شہرین کو اپنی جانب تشویش سے دیکھتا پایا۔

''بتایا تو ہے اسلام آباد۔'' اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔
''لیکن مجھے ایسا نہیں لگ رہا۔ پلیز مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ سچ کہو تم پھر کسی مشن پر جا رہے ہو؟'' شہرین اس کے تیوروں سے خائف ہوئے بغیر بولی تو فکر اور پریشانی اس کے لہجے سے جھلکی پڑ رہی تھی۔
''بیکار کے وہموں میں مت پڑو شہری۔ مجھے بس ایک بندے سے ضروری ملنا ہے۔ جس کا کتنے ہی دنوں سے انتظار تھا مجھے۔ اس بار وہ ہاتھ سے نکل گیا تو سمجھو بہت نقصان ہو جائے گا میرا۔'' کچھ تھا شہرین کے انداز میں اُسے نرم لہجے میں بات کرنی پڑی۔ جس پر شہرین متذبذب سی اسے دیکھنے لگی۔
''میں جلد کام مکمل کر کے لوٹ آؤں گا۔ ٹرسٹ می۔'' اس نے شہرین کو کندھوں سے تھام کر اپنے مقابل کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے شہرین کی پلکیں بھیگی، بھیگی لگیں۔
''اور کام مکمل ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟''
''تین سے چار دن۔''
''مجھے بھی ساتھ لے چلو زوی۔'' یک دم زاویار کے ہاتھوں کو اپنے نرم ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے وہ بے قراری سے بولی تھی۔
''تم وہاں کیا کرو گی۔ بور ہو جاؤ گی۔''
''تمہارے ساتھ میں کبھی بور نہیں ہوتی زوی۔ پلیز۔'' وہ ملتجی ہو گئی تھی۔ مگر زاویار کی نہ ہاں میں نہیں بدل سکتی تھی۔
''وہاں صرف مرد ہوں گے شہری۔ تم میرے ساتھ وہاں نہیں جا سکتیں۔ please try to understand تم ابھی میمونہ پھوپی کے ساتھ لاہور چلی جاؤ۔ ہم پھر کبھی اسلام آباد ساتھ چلیں گے۔''
''پھر کبھی..... پھر کبھی کب آئے گی زوی؟'' اس نے جیسے کھوئے، کھوئے انداز میں سوال کیا تو زاویار نے چونک کر اسے دیکھا تو احساس ہوا کہ شہرین انصاری وہموں کی نہیں خوف کی اسیر تھی۔
''ریلیکس شہری۔ میں کسی محاذ پر نہیں جا رہا۔ چھوٹا سا ایک کام ہے۔ مکمل کر کے لوٹ آؤں گا۔ سمجھیں۔'' کسی نادان بچے کو بہلانے کے سے انداز میں اس کا گال تھپک کر لہجے کو ہلکا پھلکا بناتے ہوئے وہ بولا تو شہرین نے بے بسی سے اسے دیکھا۔
''اور یہ سب گھر والے؟'' اسے جانے کے لیے پر تولتا دیکھ کر اس نے جیسے اسے روکنے کی آخری سعی کی۔
''انہیں تم سنبھال لینا۔'' اسے رکنا تھا نہ وہ رکا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی وہ سفری بیگ کندھے پر ڈال کر کمرے سے نکلتا چلا گیا۔
''انہیں تو میں سنبھال لوں گی زوی مگر اپنے دل کو کیسے سنبھالوں جو نہ جانے کس خیال سے ڈوبا جا رہا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو اس کے رخساروں کو بھگونے لگے تھے۔ آگے بڑھتے زاویار کا ہر قدم اس کے دل پر پڑ رہا تھا جیسے۔ اور لبوں سے دعا نکل رہی تھی۔
''یا اللہ زوی کی حفاظت فرمانا۔''

.....☆.....☆.....

''مولا یہ کام بغیر کسی جانی نقصان کے پورا ہونا ہے۔ گھر کے دوسرے مکینوں اور پہریداروں میں کسی کی جان نہیں جانی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے کہ تمہیں کیا اور کیسے کرنا ہے۔'' فلائٹ میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا، وقت جیسے رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ اس نے چیک اِن کرنے کے بعد سب سے پہلا کام مولا بخش کو فون کرنے کا کیا۔
''آپ فکر نہ کرو زاویار صاحب۔ کوٹھی کے بٹلر کے ذریعے رات کے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی گئی ہے۔ یوں بھی اس کوٹھی میں بابر زمان اور اس کے باپ کے علاوہ آج رات کوئی نہیں ہے۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بندہ یہ کام ہوشیاری سے کرلے گا؟'' وہ کچھ غیر مطمئن تھا۔

''بندہ ہوشیار اور لالچی ہونے کے ساتھ، ساتھ ضرورت مند بھی ہے زاویار صاحب۔ ابھی کچھ ماہ پہلے ہی کام پر لگا ہے۔ کوٹھی کے مالکوں کا وفادار نہیں ہے۔ اس لیے تھوڑی قیمت پر راضی ہوگیا۔ آپ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک سے ہوجائے گا۔'' مولا بخش اس کی فکرمندی کو سمجھتا تھا۔ اسے تسلی دی۔

''گھر کے اندر کے کیمروں کا کیا، کیا؟''

''اس کا انتظام بھی کردیا ہے۔ کل میرا بندہ الیکٹریشن کا روپ دھار کر گیا تھا کوٹھی پر۔ اس نے کیمروں کے ساتھ ریموٹ کنٹرولر کو اٹیچڈ کردیا ہے۔''

''تم لوگوں نے چیک کرلیا ہے اس کنٹرولر کو؟''

''جی۔'' مولا اپنے کام میں بہت مشاق اور پھرتیلا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں نے مزید کچھ رقم تمہارے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرادی ہے۔ جس کا بھی منہ بند کرنا ہے بند کرو۔ بس کام میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔''

''کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ آپ تسلی رکھو۔ سب انتظامات مکمل ہیں۔ البتہ اور پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے زاویار صاحب۔ پہلے کے پیسوں میں سے بھی ابھی کافی بچے ہوئے ہیں۔'' مولا بخش نے ایک بار پر اسے اطمینان دلایا تو اس نے گہری سانس بھر کر رابطہ منقطع کردیا۔

.....☆.....☆.....

ہر لمحہ دل پر پاؤں رکھ کر گزرا تھا جیسے۔ وہ سب رات بھر سو نہیں سکے تھے۔ کتنے گھنٹے گزرنے کے بعد کہیں جا کر ڈاکٹر نے روا کے ہوش میں آجانے کا مژدہ سنایا تو وہ سب اس سے ملنے کو بے قرار ہوگئے۔ سب سے آخر میں سائرہ

اور آصف اندر گئے تھے اور ہنوز اندر تھے۔ معافی، تلافی! ... زافات کا ایک لمبا سلسلہ تھا جو جاری تھا۔
جبکہ باہر عکرمہ اور اماں مظفر صاحب کو سمجھانے کی سعی کر رہے تھے جو حقیقت جاننے کے بعد بیوی سے سخت کبیدہ خاطر تھے۔ ایک بار پھر سائرہ کی ضد نے ان کے بچوں کو گزند پہنچائی تھی۔
''چچا جان پلیز۔ جو ہو گیا اسے بھول جائیں۔ چچی جان بہت شرمندہ ہیں۔ اس وقت ہم سب کو صرف ردا کا سوچنا ہے۔''
''عکرمہ صحیح کہہ رہا ہے مظفر بیٹے۔ تم بھی سائرہ کے ساتھ ویسے ہی کھلے دل کا مظاہرہ کرو جیسا اس نے دُرِ مکنون کے بارے میں جان کر تمہارے ساتھ کیا تھا۔'' اماں نے عکرمہ کی تائید میں وضعداری سے کہا تو مظفر صاحب نے ماں کی طرف تھکے ہوئے انداز سے دیکھا۔
''میرے بھول جانے سے کیا آصف اور دُرِ مکنون بھی وہ سب بھلا سکیں گے جو سائرہ نے ان کے گھر اجاڑنے کے لیے کیا۔''
''چچی جان نے آصف کو سب سچ سچ بتا دیا ہے۔ یقین کریں اس نے اور دُرِ مکنون نے بھی چچی جان کی معذرت کو قبول کر لیا ہے۔''
''اور تم... کیا تم بھی سائرہ کے اس قصور، اس زیادتی کو دل سے معاف کر دو گے؟'' عکرمہ کے جواب دینے پر انہوں نے اس سے بھی استفسار کر لیا تھا۔
''رشتوں کو جوڑے رکھنے اور انہیں مضبوط بنانے کے لیے کبھی، کبھی انسان کو جذبات سے بالاتر ہو کر بھی سوچنا پڑتا ہے۔ جب آصف بڑے پن کا مظاہرہ کر کے آگے بڑھ رہا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو بھی اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ جب ہمارے بزرگ ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو پھر ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔''
عکرمہ کا انداز نپا تلا تھا۔ مظفر صاحب نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ جس پر اطمینان دھرا تھا۔ وہ کچھ پُرسکون ہوئے۔
''پھر بیٹا ہمیں یہ بات بھی سمجھنی چاہیے کہ سائرہ نے جو کچھ بھی کیا ان کے پیشِ نظر صرف ردا کی بھلائی تھی۔ گو کہ ان کا طریقہ صحیح نہیں تھا۔ مگر اس سب میں بھی ان کا پیار چھپا تھا۔'' اماں نے تمکنت سے عکرمہ کی بات میں اضافہ کیا۔
''حیف ہے ایسے پیار پر جو اپنوں کی خاطر کسی دوسرے کا دل دکھا کر ثابت کیا جائے۔'' ماں کی بات پر مظفر صاحب کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔
''اولاد کی محبت بہت منہ زور ہوتی ہے بیٹا، وہ انسان سے ایسے فیصلے کرا لیتی ہے۔''
''یہ محبت نہیں خود غرضی ہے اماں۔ بہر حال مجھے ردا کی خوشیاں عزیز ہیں۔ آصف کی اس فراخدلی نے تو مجھے خرید لیا ہے۔'' مظفر صاحب نے گہری سانس بھر کر کہا اور گویا گفتگو کو سمیٹا۔
''تو بس پھر اس خوشی کے موقع پر میری بات مان کر آپ بھی چچی جان کو معاف کر دیں۔ نہیں تو آپ کی بیٹی صاحبہ مجھے معاف نہیں کریں گی۔'' عکرمہ نے پُروقار انداز میں مسکراتے ہوئے مظفر صاحب سے کہا تو انہوں نے کاریڈور کے انتہائی سرے پر زوہا کے ساتھ کھڑی دُرِ مکنون کی طرف بے ساختہ دیکھا۔ جو بظاہر اس کی بات سنتے ہوئے بھی ان تینوں کی طرف بڑی بے قراری سے متوجہ تھی۔
''ہوں۔ تو گویا یہ وکالت دُرِ مکنون کے کہنے پر کی جا رہی تھی۔'' مظفر صاحب بے اختیار مسکرا دیے۔
''یہی سمجھ لیجیے۔ پہلے آپ کی مقررہ بیٹی نے مجھے قائل کیا ساتھ ہی آپ کو کنوینس کرنے کی ڈیوٹی بھی لگا دی۔''
عکرمہ نے گہرے تبسم کے ساتھ اعتراف کیا تو اماں اور مظفر صاحب دونوں ہی مسکرا دیے۔
''میری بیٹی کا دل سونے کا ہے۔ اللہ اسے سدا خوش و آباد رکھے۔'' اشارے سے اسے قریب بلاتے ہوئے ان کے لبوں سے نکلا تو جواب میں اماں اور عکرمہ نے بے ساختہ آمین کہا تھا۔

☆.....☆.....

اسلام آباد ائرپورٹ سے اس نے حسبِ ارادہ ایک کیب پکڑی اور لاہور کی طرف گامزن سفر ہوا۔ چند گھنٹوں کے بعد وہ لاہور میں تھا۔ لاہور کی زمین پر قدم دھرنے سے لے کر رات کے ڈھلنے تک کا انتظار بہت جانگسل تھا۔ اسے بھوک تھی نہ پیاس۔ مولا بخش نے بہت کہا مگر اس سے ایک لقمہ تک منہ میں نہ ڈالا گیا۔ سورج مغرب میں منہ چھپا چکا اور اندھیرے کی سیاہ چادر افق پر خوب اچھی طرح پھیل گئی وہ اور اس کی ٹیم اپنی، اپنی گاڑیوں میں مطلوبہ راستے پر عازمِ سفر ہوئے۔

آج زاویار کے دل کا حال عجیب تھا۔ بہت سے پچھتاوے اور رنج دل میں سر اٹھا رہے تھے۔ جو کچھ وہ آج کرنے جا رہا تھا اگر اس روز کر لیا ہوتا تو اس کا اور دُرِ مکنون کا ''آج'' کس قدر مختلف ہو سکتا تھا۔ ٹریفک کے باعث مقررہ وقت سے زیادہ ٹائم لگا۔ تاہم جس وقت وہ ملک زمان کی کوٹھی کے باہر پہنچے کھڑکیوں سے جھانکتا اندھیرا بتا رہا تھا کہ مکین رات کا کھانا کھا کر سو گئے ہیں۔ وہ سب منہ پر ماسک لگائے ہتھیاروں سے لیس باہر نکلے۔

''اندر میرے ساتھ سوائے مولا بخش کے کوئی نہیں جائے گا۔ باقی سب کو چوکنا رہنا ہے۔ جیسے ہی اندر سے ہم اشارہ کریں صرف Cop 1 & 2 پیچھے کے دروازے سے داخل ہوں گے۔ انڈر اسٹینڈ؟'' اس نے ایک بار پھر اپنا مرتب شدہ پلان دُہرایا۔ اور پھر مزید ایک دو ہدایات دینے کے بعد وہ مولا بخش کی معیت میں دبے پاؤں کوٹھی کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے جو اُن کے لیے پہلے ہی سے وا کیا جا چکا تھا۔

واچ مین گیٹ کے ساتھ بنے کیبن میں موجود نہیں تھا۔ اس کی جگہ بٹلر ان کا منتظر تھا، جس نے ان کے اندر داخل ہوتے ہی مولا بخش کے ہاتھ سے بقیہ رقم وصولی اور حسبِ ہدایت مین گیٹ کو لاک کر کے پیچھے کے دروازے سے نکل گیا۔ صبح ہونے سے پہلے اسے ٹرین کے ذریعے لاہور کی سرحد سے کہیں دور نکل جانا تھا۔ جو رقم اس چھوٹے سے کام کے لیے اسے ملی تھی وہ اسے بیرونِ ملک کا ویزا دلانے کے لیے بہت تھی۔ گاؤں میں اس کا کون تھا جس کی خاطر وہ فکرمند ہوتا۔ پچھلے سال زمینوں کے جھگڑے میں اس کے دونوں بھائی مارے گئے تھے۔ اماں اور ابا کو گئے بھی کئی سال بیت چکے تھے۔ مولا بخش کی یہ پیش کش اس کے لیے بہت پُرکشش رہی۔ وہ جلد از جلد یہ ملک چھوڑ جانا چاہتا تھا۔

داخلی دروازے سے اندر آنے کے بعد انہیں بابر زمان کا کمرا ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کوٹھی کا اندرونی نقشہ وہ گزرے چند گھنٹوں میں ازبر کر چکا تھا۔ بڑے سے لاؤنج سے گزر کر وہ گیسٹ روم کی طرف آئے تھے اور اس کے بالکل سامنے بابر کا کمرا تھا۔ جس وقت وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے خون اس کی رگوں میں ٹھوکریں مار رہا تھا۔ غضب اور غصے سے اس کا تنفس اپنی رفتار بھولے ہوئے تھا۔

دروازہ بنا کسی آواز کے کھلا تو سامنے ایک حسین اور جدید تعیشات سے مزین کمرا ہلکی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مولا بخش کی طرف دیکھا۔

''یہ خانہ خراب ہمیشہ بتی کھول کر سوتا ہے۔ اس لیے بٹلر اسے بند نہیں کر سکا، نہیں تو اسے شک ہو جاتا۔'' مولا بخش نے سرگوشی کرتے ہوئے اسے بتایا۔ اس کے پاس معلومات مکمل تھیں۔ جواباً وہ بھویں سکوڑ کر پستول تانے آگے بڑھا مگر یہ کیا؟ بابر خلافِ معمول اس وقت بستر پر موجود نہیں تھا۔

''کہاں گیا وہ؟'' وہ دونوں بستر کے پاس ہی ٹھٹک گئے۔ ''زاویار صاحب تم یہیں رکو میں کمرے سے باہر دیکھتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ وہ اندر ہے۔'' نل کھولنے کی آواز پر کان لگاتے ہوئے اس نے مولا بخش کو روکا اور وہ دونوں پھرتی سے باتھ روم کے دروازے کے اطراف کھڑے ہو گئے۔ کان اندر کی آوازوں پر لگے تھے۔ جہاں سے پانی گرنے کی آواز بند ہو چکی تھی۔ اور اگلے لمحے دروازہ کھلا تو وہ دونوں چوکنے ہو کر متوجہ ہوئے۔ نگاہیں دروازے کی دہلیز پر جمی تھیں جہاں پر بابر زمان کے قدم نظر آنا ہی چاہتے تھے مگر یک دم سیاہ پوہیہ بصارت کا حصہ بنا تو وہ دونوں ہی لحظہ بھر کے لیے حیران رہ گئے۔ اگلے لمحے وہیل چیئر سست روی سے باہر نکلی تو اس پر بیٹھے بابر زمان نے

زاویار انصاری کی رگوں میں دوڑتے خون کو ایک سیکنڈ کے لیے روک دیا۔

گزرے چند سال اس لمحے کا اس نے کس بے چینی سے انتظار کیا تھا اور اب جب وہ لمحہ آیا تو بابر زمان کو اپنے قدموں کے بجائے وہیل چیئر پر بیٹھا دیکھ کر وہ سُن سا رہ گیا۔ اس کے سامنے ظلم ڈھانے والا سفاک انسان نہیں ایک بے بس اور معذور شخص تھا۔ مولا بخش تیزی سے پستول تھامے اس کے سامنے آیا تو اس نے دہشت زدہ ہو کر وہیل چیئر روک دی۔

''ششش۔ آواز مت نکالنا نہیں تو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیے جاؤ گے۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا مولا بخش نے پستول اس کے ماتھے سے لگا دی۔ اس اثنا میں زاویار بھی اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں کو مسلح دیکھ کر بابر زمان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ کچھ سال پہلے کم و بیش زاویار کے چہرے پر بھی موت کو دیکھ کر ایسی ہی دہشت چھائی ہوگی جیسی اس وقت بابر زمان کے چہرے پر تھی۔ اس وقت وہ بابر کے پالتوؤں کے ہتھیاروں کے نشانے پر تھا اور آج معاملہ اس کے برعکس تھا۔

''کک کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو مجھ سے۔'' ایک کمزور اور کپکپاتی آواز میں بابر نے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

☆.....☆

''تقدیر سے لڑنے کی، اسے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے ذریعے بدلنے کی کوشش کرنا اللہ کی تقسیم پر سوال اٹھانے کے مترادف ہے سائرہ۔ تمہیں یہ سب کر کے کیا ملا.....؟'' مظفر صاحب نے مایوسی سے بیوی کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔ جو فرطِ ندامت سے سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھی تھیں۔

''گہرا سبق۔'' ایک گہری سانس بھر کر سائرہ بیگم نے افسردگی سے کہا اور نظر اٹھا کر شریکِ حیات کو دیکھا۔ ''سبق ملا مجھے مظفر۔ میں نے اپنے ارادوں کی شکست سے اپنے رب کو پہچانا۔ میں نے جان لیا کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، خواہ بندہ کتنا ہی زور لگا لے تقدیر سے زیادہ اور وقت سے پہلے کسی کو نہیں ملے گا۔ Fate is ultimate (تقدیر حتمی ہے)۔'' وہ بولیں تو لہجے میں صدیوں کی تھکن اور پشیمانی تھی۔ ''میں نے اپنی سی کر کے دیکھ لی۔ میگر میں صوفیہ سے جیت سکی نہ ہی خود کو چھٹی بیٹی کی ماں بننے سے روک سکی۔ یہاں تک کہ دُرِمکنون اور عکرمہ کو ایک دوسرے سے دور کرنے اور آصف کو ردا کی زندگی سے نکالنے کی میری ہر، ہر کوشش کی ناکامی نے مجھے باور کرایا کہ میں سوائے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کرنے کے کسی بھی کاوش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ شاید اس لیے کہ میں نے جب بھی جو کچھ بھی کیا اس کے پیچھے خلوص نہیں ضد تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں قسمت کو اپنی تدبیر سے بدل لوں گی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بس ایک فریب تھا جو میں اپنے آپ کو دیے جا رہی تھی۔'' پچھتاوے اور پشیمانی نے سائرہ بیگم کے لہجے کے طنطنے کو ختم کر ڈالا تھا۔ رہی سہی کسر ردا کے نروس بریک ڈاؤن اور دُرِمکنون سے اپنے رشتے کے ادراک نے پوری کر دی تھی۔ ان کا سارا دم خم گویا نکل چکا تھا۔

''کتنا ہی اچھا ہوتا کہ تم یہ سب پہلے جان لیتیں سائرہ۔ کم از کم ہمارے بچوں کو اس تکلیف سے تو نہ گزرنا پڑتا۔'' مظفر صاحب نے گہری سانس بھر کہا تو سائرہ یک دم چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑیں۔

''بس بھی کرو مظفر بیٹے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ سائرہ سب سے معافی مانگ تو چکی ہیں۔ اب تم بھی ظرف بڑا کرو۔ اللہ سبحان وتعالیٰ معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔ تم سب بھی ماضی بھلا کر ایک نئی ابتدا کرو میرے بچوں۔ میں تم سب کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔'' سائرہ بیگم کو خود سے لگاتے ہوئے اماں نے بیٹے کو رسانیت سے نصیحت کی۔ تو مظفر صاحب ماں کی بات پر فرمانبرداری سے سر جھکا گئے۔ آج دل سے سارے بوجھ چھٹ گئے تھے۔ سائرہ بیگم کے اس نئے روپ نے ان کی ساری کلفتیں گویا سمیٹ لی تھیں۔

رات کو کھانے کی ٹیبل پر خوشگوار ماحول تھا۔ ردا اسپتال سے گھر آ گئی تھی۔ آصف کی موجودگی نے اس کے چہرے پر طمانیت کے رنگ بکھرا رکھے تھے۔ سائرہ بیگم نے دیکھا دوسری طرف دُرِمکنون اور عکرمہ ایک دوسرے کے

ساتھ کس قدر خوش نظر آرہے تھے۔

''سچ کہا ہے کسی نے کہ ہم وہ مانگتے ہیں جو ہمیں اچھا نظر آتا ہے جبکہ اللہ وہ دیتا ہے جو ہمارے لیے اچھا ہوتا ہے۔'' بیٹیوں کو یوں خوش دیکھ کر ان کا دل تشکر کے احساس سے بھر گیا تھا۔

.....☆.....☆.....

''بولتے کیوں نہیں۔ کیا چاہتے ہو تم لوگ۔'' بابر زمان کو ان کی خاموشی خلجان میں مبتلا کر رہی تھی۔ لرزتی آواز میں اس نے سوال دہرایا تھا۔

''کچھ خاص نہیں بابر۔ بس تین ماہ، بارہ دن اور اٹھارہ گھنٹوں کے لیے تمہیں ہمارا مہمان بننا ہوگا اور پھر ایک اقبالی بیان پر دستخط کرنے پر تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔'' مولا بخش نے استہزائیہ انداز میں کہا جبکہ زاویار بے یقینی سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کے غصے کی بھڑکتی آگ پر جیسے کسی نے ٹھنڈا پانی انڈیل دیا تھا۔ یہ وہ بابر زمان تو نہیں تھا جس کی تلاش نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ تنومند، غرور اور سفاکیت کا شاہکار بابر زمان جس سے ایک جہاں عاجز تھا، جس کے چہرے سے جھلکتی رعونت کے آگے کسی کے دم مارنے کی مجال نہ ہوتی تھی، یہ وہ نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا۔ خوفزدہ، کمزور، نحیف اور معذور بابر زمان۔

''کک کیا مطلب۔ کیوں کرنا چاہتے ہو یہ سب۔ کون ہو تم دونوں؟'' بابر زمان کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ اب اسے کون سی قید میں لے جایا جانا تھا۔

''مجھے پہچانا بابر زمان۔ میں زیڈ۔ زاویار انصاری... زیڈ فرام گورنمنٹ کالج لاہور.....'' اس سے پہلے کہ مولا بخش کچھ کہتا زاویار انصاری نے سرسراتی آواز میں اپنا تعارف کراتے ہوئے چہرے پر چڑھایا ہوا ماسک کھینچ کر نیچے کیا تو بابر زمان نے چونک کر اسے دیکھا۔ دہشت نے اس کے حواس گم کر رکھے تھے۔ زاویار نے اپنا وہ نام بتایا جس سے وہ یار دوستوں میں مشہور تھا تو اس نے بغور اس کا چہرہ جانچا۔ جس پر غیظ و غضب تحریر تھا۔

''زیڈ تم!'' بابر زمان نے کچھ دیر ذہن پر زور ڈالا تو کچھ دھندلے سے خاکے ماضی کے دریچوں سے جھانکنے لگے۔

''ہاں میں۔ زیڈ۔ زاویار انصاری۔'' وہ بولا تو لہجے میں ایک پھنکار تھی۔ بابر نے حیرت سے اس کے عصیلی آنکھوں میں جھانکا جن میں گویا خون اترا ہوا تھا۔

''ایک عرصے بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے زیڈ۔ مگر تم اتنے غصے میں کیوں ہو اور یہ ہتھیار۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں اغوا کرنا چاہتے ہو تم مجھے؟ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''کیا بگاڑا ہے تم نے میرا؟ تم نے سنورا ہوا رہنے ہی کیا دیا میری زندگی میں بابر زبان۔ میرا بس چلے تو تمہیں زندہ دفنا دوں۔'' بابر زمان کے سوال پر اس نے یک دم بھڑک کر اس کا گریبان اپنے بائیں ہاتھ سے دبوچا۔

''تت.....تت تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے زیڈ۔ مم میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ کالج لائف کی لڑائیاں اور رنجشیں تو میں کب کا بھول چکا ہوں۔ تم بھی بھلا دو۔'' زاویار کے تیوروں نے بابر زمان کے حواسوں کو بری طرح منتشر کیا۔ وہ یک دم ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگا تھا۔

''بکواس بند کرو۔ اب تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو میں تمہیں یہیں ڈھیر کر دوں گا۔'' بابر کی التجا نے اس کے دبے ہوئے غصے کو یک دم بھڑکایا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا مولا بخش نے رومال پر بے ہوشی کی دوا چھڑک کر اس کی ناک سے لگا دیا۔ اگلے چند سیکنڈوں میں وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ابھی وہ دونوں وہیل چیئر کو دھکیل کر دو قدم بڑھے ہی تھے کہ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ نے ان دونوں کو متوجہ کیا۔

''تم رکو زاویار صاحب، میں دیکھتا ہوں۔'' مولا بخش پھرتی سے دروازے کی جانب بڑھا تھا لیکن دو قدم چل کر ہی اسے رکنا پڑا۔ اگلے لمحے شوکت زمان مولا بخش پر ریوالور تانے اندر داخل ہو رہا تھا۔ جو نہ جانے بے ہوشی

کی دوا کھانے سے کیسے بچ گیا تھا۔

''خبردار لڑکے! اگر میرے بیٹے کو ذرا سی بھی خراش آئی تو میں اس بندے کو ڈھیر کر دوں گا۔'' شوکت زمان ریوالور سے مولا بخش کو نشانے پر لیے ہوئے زاویار سے مخاطب تھا۔

''وہیں رک جاؤ شوکت زمان! نہیں تو بیٹے کے ساتھ تمہیں بھی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ تمہارا بیٹا میرے نشانے پر ہے۔ تم اسے نہیں بچا سکو گے۔ بہتر ہے کہ ریوالور پھینک دو۔'' زاویار نے بے خوفی سے کہتے ہوئے ریوالور بے ہوش بابر کی کنپٹی سے لگایا تو وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

''آخر تم کیا چاہتے ہو؟'' گلے کو تر کرتے شوکت زمان نے چند ثانیے کے لیے کچھ سوچا اور بے بسی سے سوال کیا۔

''کافی حساب نکلتا ہے تمہارے بیٹے کی طرف۔ اسے ہمارے ساتھ جانا ہے۔ تم اس کام میں رکاوٹ نہ بنو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔'' وہ بولا نہیں غرایا تھا۔ شوکت زمان کی آنکھوں میں اترتا خوف اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا تھا۔

''نہیں، میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ بہت مشکل سے اسے ایک قید سے چھڑا کر لایا ہوں۔ اب دوبارہ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' شوکت زمان ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

''تمہارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں بزرگو۔'' مولا بخش نے ناگواری سے کہا اور آگے بڑھ کر شوکت زمان سے ریوالور چھین لیا۔ جبکہ زاویار کا دھیان جیسے شوکت زمان کے فقرے میں الجھ گیا تھا۔

''مگر تم یہ سب کیوں کرنا چاہتے ہو۔ آخر ایسا کیا، کیا ہے میرے بیٹے نے؟'' شوکت زمان نے بے بسی سے زاویار کی طرف دیکھا جو لب بھینچے اسے گھور رہا تھا۔

''ساڑھے تین سال پہلے ایک لڑکی تمہارے بیٹے کی نجی جیل سے بازیاب کرائی گئی تھی۔ جس کے باپ کو تم نے قتل کرا کر روڈ ایکسیڈنٹ کا نام دے دیا تھا۔ کچھ یاد آیا شوکت زمان؟'' غیظ و غضب کے باعث اس کی آواز چیخ گئی تھی۔ شوکت زمان نے اس کی بات پر اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے بہت کچھ یاد آ چکا ہے۔

''تو بس اس کا تاوان ادا کرنا ہے اسے۔ سالوں اس دن کا انتظار کیا ہے میں نے۔'' زاویار کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں۔

''ایسا مت کرو۔ اس کے حال پر رحم کھاؤ۔ اگر اس نے کبھی تمہارے ساتھ برا کیا تھا تو اچھا زندگی بھی نہیں کیا اس کے ساتھ۔ یہ حالت دیکھ رہے ہو اس کی۔ اپنے گناہوں کی سزا ہی تو بھگت رہا ہے یہ۔'' شوکت زمان تھکے ہوئے انداز میں بولا تو یوں لگا جیسے رو دیا ہو۔

''کیا مطلب؟'' زاویار نے نفرت سے بھویں سکوڑ کر اسے سوالیہ انداز سے دیکھا۔ تو شوکت زمان نے بیچارگی سے بیٹے کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے جیسے الفاظ تلاش کیے۔

''کبھی سوچتا ہوں شاید اسی لڑکی کی آہ لگی بابر کو۔'' ایک صبر آزما انتظار کے بعد اس نے کہنا شروع کیا تو سامنے کھڑے زاویار کا رواں، رواں گوش برآواز ہو گیا۔ ''اس لڑکی کے باپ نے اسے بازیاب کرنے کے بعد بابر کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ میں نے اسے خاموش کرانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ پیسے کا لالچ اور قتل کر دیے جانے کی دھمکی بھی اسے اپنے ارادوں سے باز نہ رکھ سکی تو بابر نے تنگ آ کر اسے ایک ایکسیڈنٹ کے ذریعے راستے سے ہٹوا دیا۔ جس کے بعد میرے شریکوں نے میڈیا کو ہمارے پیچھے لگا دیا۔ جب معاملہ کسی طرح بھی قابو میں نہ آیا تو میں نے بابر کو امریکا کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ دلوا کر کچھ سالوں کے لیے باہر بھیج دیا۔ سوچا جب لوگ آہستہ، آہستہ اس واقعے کو بھول جائیں گے تو اسے واپس بلا لوں گا۔ مگر بابر کا دل وہاں کچھ زیادہ ہی لگ گیا۔ اس نے وہاں اپنے بہت سے یار

دوست بنا لیے۔ جن کے ساتھ وہ خوب موج مستی کرتا تھا۔ ایک رات کسی پارٹی سے واپسی پر جب وہ ..... شراب کے ..... نشے میں دھت تھا۔ اس سے ایک ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں ایک شخص زندگی بھر کے لیے معذور ہوگیا۔ میں نے بابر کا کیس لڑنے اور اسے سزا سے بچانے کی بہت کوشش کی، پیسہ پانی کی طرح بہایا مگر وہ کیس ہار گیا اور اسے جیل جانا پڑا۔'' شوکت زمان کی آنکھیں آبدیدہ تھیں اور لہجہ درد سے چور۔

''بابر کے لیے اپنی ہار کو تسلیم کرنا آسان نہ تھا۔ وہ روز بروز چڑچڑا ہونے لگا۔ جیل کے عملے اور دوسرے قیدیوں سے آئے دن اس کی چپقلش رہتی۔ اور ایک دن کسی بات پر اس کا چند سیاہ فام قیدیوں سے جھگڑا ہوگیا۔ بات بڑھتے، بڑھتے ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ بابر نے غصے میں اس گروہ کے سرغنہ کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ بندہ یہ..... بے عزتی بھول نہ سکا اور پھر اس رات اور آنے والی کئی راتوں میں ان سب نے بابر کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا.....'' یک دم بولتے، بولتے شوکت زمان پھوٹ' پھوٹ کر رو پڑا۔

زاویار انصاری کو یوں لگا جیسے اس کے آہنی اعصاب جھنجھنا گئے ہوں۔

''جیلر اور اس سیاہ فام بندے کے آپس میں غلیظ تعلقات تھے۔ اس لیے بابر اور ہمارے احتجاج سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تنگ آ کر بابر نے جیل سے بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنایا مگر وہ عین وقت پر پکڑا گیا۔ جیل کی دیوار پھاندتے وقت کمر میں لگنے والی گولی کے نتیجے میں وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہوگیا ہے۔ گزرے کئی ماہ اسے جسمانی اور نفسیاتی علاج کے لیے اسپتال میں اور پھر اپنی سزا پوری کرنے کے لیے دوبارہ جیل میں رکھا گیا۔ تب کہیں جا کر اسے وہاں سے نجات ملی۔''

شوکت زمان کبھی رونے لگتا کبھی چپ ہو جاتا۔ تو کبھی بولنے لگتا۔ بیٹے کے ساتھ بیتی روداد سناتے ہوئے اس کی آنکھیں ہی نہیں دل بھی رو رہا تھا۔

''صحیح کہتے ہیں اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ جو دوسروں پر ظلم کرتا ہے وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ تمہارے بیٹے کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا بزرگو!'' کچھ دیر کمرے میں شوکت زمان کی سسکیاں اور پھر خاموشی گونجتی رہی جسے مولا بخش کی ہموار آواز نے توڑا۔ جس پر وہ ایک بار پھر رو پڑا۔ زاویار نے لہو رنگ آنکھوں سے بے ہوش بابر کو دیکھا جو وہیل چیئر پر بے بس سا پڑا تھا اور ہاتھوں میں سر دیے بیٹھے اس کے باپ کو۔ یہ سب سن کر اس کے دل میں جو بدلے کا جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا وہ دودھ کے ابال کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ معاً سرفراز کے الفاظ اس کی سماعتوں میں تازہ ہوئے۔

''پلیز زاویار۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ ٹرسٹ می۔ تمہارے وہاں جانے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔'' اسے اب سمجھ میں آیا کہ وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

''ویسے ایک بات بتاؤ بزرگو! ہم نے تو سب کو ایک ہی کھانا دیا تھا پر تم دونوں باپ بیٹے بے ہوش کیوں نہیں ہوئے۔'' نہ جانے مولا کو یہ پوچھنے کا خیال کیوں آیا؟ زاویار نے بھویں سکیڑ کر شوکت زمان کی طرف دیکھا۔ جس کے مغرور چہرے پر بیچارگی چھائی ہوئی تھی۔

''کیونکہ ہم نے آج کھانا نہیں کھایا۔ شام کو مجھے کسی پولیس والے کا میسج آیا تھا کہ وہ ہمیں رات کے کھانے پر ملنے آئے گا۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔'' شوکت زمان کی تھکی، تھکی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''پولیس والے کا میسج؟ کس پولیس والے کی بات کر رہے ہو تم؟'' زاویار نے چونک کر سخت لہجے میں سوال کیا مگر اس سے پہلے کہ شوکت زمان کوئی جواب دیتا، بالکونی کا دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

''وہ میسج میری طرف سے تھا زاویار۔'' سرفراز کی اطمینان بھری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ برق کی سی تیزی سے آواز کی سمت متوجہ ہوا۔ اس نے دیکھا اپنی پشت پر دروازہ بند کرتے ہوئے سرفراز ان چاروں کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں زاویار کہ اب تمہارے یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس معصوم لڑکی اور اس

جیسے کتنے ہی معصوموں کا خوں بہا اس ظالم سے وصول کیا جا چکا ہے۔''

''تو گویا تم یہ سب جانتے تھے؟'' زاویار نے گہری سانس کھینچتے ہوئے استفسار کیا تو سرفراز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''میں بتاتا تو کیا تم یقین کر لیتے؟'' جواباً سرفراز نے ہلکی مسکراہٹ سمیت الٹا اس سے سوال پوچھ ڈالا تو وہ چپ سا رہ گیا۔ ''اپنی وے یہ لو۔ بابر زمان کی فائل۔ بس اسی کو تیار کرانے میں کچھ دیر لگ گئی۔ مگر بہر حال جو ہوا اچھا ہی ہوا۔'' ایک سیاہ فولڈر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سرفراز کے لبوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ ''رہ گئی بابر زمان کو ملنے والی قانونی سزا تو اب وہ اس سے بچ نہیں سکتا۔ جو کچھ بھی شوکت زمان نے ابھی بتایا ہے وہ ریکارڈ کیا جا چکا ہے۔ یہ ان دونوں باپ بیٹے کی طرف سے اقبالی بیان ہے اور اب ان کا قانون سے بچنا ناممکن ہے۔'' مستحکم قدموں سے چلتے سرفراز نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کی آڑ میں چھپایا ہوا ہینڈی کیمرا نکالا تو شوکت زمان کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ ذرا دیر میں پولیس والوں کے بوٹوں کی آوازوں سے کوٹھی گونج رہی تھی۔ علاقے کا ایس ایچ او اپنی پوری ٹیم سمیت آیا تھا۔ ان دونوں کو گرفتار کر کے وہ سب پولیس موبائل میں تھانے کی طرف روانہ ہو گئے تو وہ بھی سرفراز کی معیت میں باہر نکل آیا۔

''تمہیں میری پلاننگ کے بارے میں کیسے پتا چلا؟'' کچھ سوال اس کے ذہن میں اٹکے ہوئے تھے۔ ''کیا مولا بخش نے مجھے ditch کیا؟''

''نہیں ایسا بالکل نہیں۔ مولا بخش کمیٹڈ بندہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے ایک قدم آگے چل رہا تھا۔ مولا بخش کے اچانک کراچی سے غائب ہو جانے نے میرے شک کو یقین میں بدلا اور میں نے ندیم کے ذریعے اسے ٹریس کیا اور جس طرح تم مولا بخش کو گائڈ کرتے رہے، میں ندیم کی رہنمائی کرتا رہا اور یوں تمہاری منصوبہ بندی کے متوازی میری پلاننگ بھی چلتی رہی۔ میرا مقصد تمہیں شکست دینا نہیں تھا۔ بس تمہیں بچانا تھا۔ علی کے بعد اب مجھ میں کسی اور کو کھو دینے کا حوصلہ نہیں۔'' سنجیدہ لہجے میں سب کچھ بتاتے ہوئے سرفراز بہت مطمئن تھا۔ اس کا آخری فقرہ اس کے خلوص کا مظہر تھا۔

''سرفراز!'' زاویار نے لب بھینچ کر اسے دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ مصافحہ کر کے اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھاتا اس نے اسے روک لیا۔

''میرے پاس الفاظ نہیں کہ تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ میں تمہارا یہ احسان تاعمر نہیں بھولوں گا۔ لیکن یقین کرو میں یہاں بابر زمان کو قتل کرنے نہیں آیا تھا۔ بس اتنے مہینے اور دن اسے قید میں رکھ کر اقبالی بیان دینے پر راضی کرنا تھا جتنے دن اس نے درمکنون کو یرغمال بنا کر رکھا تھا۔''

''مگر تمہاری قید سے رہا ہوتے ہی وہ اپنے اقبالی بیان سے مکر جاتا۔ بنا ثبوت تم اسے کبھی سزا نہیں دلوا سکتے تھے زاویار۔''

''ہوں۔ صحیح کہا تم نے۔ تم نے مجھ سے کہیں زیادہ بہتر حکمت عملی سے کام لیا۔ اور مجھے ایک لمبی اور مشکل راہ چلنے سے بچا لیا۔ مجھے فخر ہے کہ میں تمہاری ٹیم کا حصہ ہوں اور رہوں گا۔'' اس کے دوستانہ لہجے میں سکون اور اعتماد تھا جس نے سرفراز کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''میرے لیے بھی یہ اعزاز سے کم نہیں زاویار کہ تم میری ٹیم میں شامل ہو اور رہو گے۔ رہ گئی تمہاری پلاننگ کی بات تو مجھے اندازہ نہیں بلکہ یقین تھا کہ تم قانون کو کبھی ہاتھ میں نہیں لو گے۔'' فخریہ انداز میں کہتے ہوئے سرفراز اس سے بغل گیر ہوا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

''بابر زمان کا باب اب بند ہو چکا ہے۔ لہٰذا زاویار اپنی زندگی کی ایک نئی شروعات کے ساتھ ابتدا کرو۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' پُرخلوص لہجے میں کہہ کر سرفراز اپنی مطلوبہ منزل کی طرف گامزن ہوا تو وہ بھی اپنی

گاڑی کی طرف چلا آیا۔ واپسی کا سفر بہت مختلف تھا۔ مولا بخش ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے اپنا آپ کئی سالوں بعد کسی قید سے آزاد محسوس ہوا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے ایک طویل مدت کے بعد کھلی فضا میں سانس لی ہو، جیسے دُرِ مکنون کا قرض کسی حد تک چکا دیا ہو اس نے اور یہ احساس بہت سکون آمیز تھا۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس وقت وہ اس سرخوشی کو محسوس کرنا چاہ رہا تھا جو اس کے شعور پر چھائی ہوئی تھی کہ سیل فون پر آنے والے شہرین کے پیغام نے اس کی توجہ مبذول کر لی۔

''جلدی سے لاہور آجاؤ زوی۔ تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔''

''کیسی خوشخبری؟'' وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ شہریار ماموں، دادا اور آغا جان پر دادا بننے والے ہیں۔'' اس کے بے اختیار سوال پوچھنے پر شہرین کا جواب آیا تو وہ لمحے بھر کے لیے سمجھ نہیں سکا اور جب بات سمجھ میں آئی تو اس کی انگلیاں بے صبری سے شہرین کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔

''کیا جو میں نے سمجھا وہ سچ ہے شیری!'' مسرت آمیز بے یقینی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ جواب میں شہرین کی محجوب ہنسی ایئر پیس پر گونجی تو اس کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔

''میں بس پہنچ رہا ہوں شیری۔'' اس کا لہجہ خوشی سے معمور تھا۔

''میں منتظر ہوں زوی۔'' شہرین نے مسکرا کر کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''مولا بخش گاڑی تیز چلاؤ یار۔ میں جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر انصاری ہاؤس پہنچ جائے۔ خوشی اس کے لہجے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ مولا بخش نے اسے مسکرا کر دیکھا اور ایکسی لریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔ زاویار نے ونڈ اسکرین کے پرے دیکھا صبح صادق کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ گویا رات گزر گئی تھی۔

.....☆.....☆.....

''معروف تاجر اور سیاست دان شوکت زمان اور ان کے بیٹے بابر زمان پر ایک لڑکی کے اغوا اور جنس بے جا میں رکھنے پر فرد جرم عائد ہونے کے بعد انہیں کوٹ لکھپت جیل منتقل کیا جا رہا ہے۔'' کسی پرائیویٹ چینل سے نشر ہونے والی اس بریکنگ نیوز نے دروازے کی دہلیز پر دُرِ مکنون کے قدم منجمد کر دیے۔ لمحے بھر کے لیے اسے لگا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتا خون تھم گیا ہو۔ اس نے بنا گردن گھمائے دزدیدہ نظروں سے ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھا جہاں ان دونوں باپ بیٹے کی خبر کے ساتھ وڈیو بھی چل رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں کسی کام سے آئی تھی کہ اس خبر نے اسے سب بھلا دیا۔ وہ کہاں ہے کیا کرنے آئی ہے، سب فراموش کر چکی تھی۔

''بابر زمان کی نجی جیل سے بازیاب اور فرار ہونے والوں کے عزیزوں میں سے چند ایک نے اس کے خلاف پکے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ جبکہ یہ وڈیو محکمہ پولیس کے ایک فرض شناس آفیسر کا کارنامہ ہے۔ جن کی بنیاد پر نیب نے یہ کیس تیار کیا۔ تین سال پہلے بھی ان باپ بیٹے کے خلاف 'مقدمہ' کیا گیا تھا مگر ناکافی ثبوت ہونے کی وجہ سے یہ کیس بند کر دیا گیا۔ تاہم بتایا جا رہا ہے کہ اس بار کیس ایک ہائی پروفائل شخصیت نے دائر کیا ہے۔ ثبوت مستحکم ہونے کی وجہ سے دونوں پر فرد جرم عائد کر دی گئی ہے۔'' نیوز کاسٹر فوفر خبر سنا رہی تھی۔

''الحمدللہ۔'' کچھ سیکنڈز کے لیے سانس لینے کا عمل رک گیا تھا۔ اور جب سانس بحال ہوئی تو بے اختیار اللہ کا شکر دُرِ مکنون کے دل سے ابھرا تھا۔ شوکت زمان کی زبانی اس کے بیٹے کا انجام سن کر دل میں یہ یقین واثق ہوا کہ اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

''کیا ہوا درِ مکنون؟ آپ اس طرح راستے میں کیوں رکی کھڑی ہیں؟'' وہ شاید ایسے ہی ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے اپنے آپ میں کھوئی رہتی اگر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے عکرمہ نے اسے مخاطب نہ کر لیا ہوتا۔

''جی؟'' وہ جیسے خود میں لوٹی۔
''سب ٹھیک ہے؟'' وہ قریب آتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
''اب ٹھیک ہے۔'' گہری سانس بھرتے ہوئے وہ بولی تو عکرمہ اس کے معنی خیز جواب پر شوخی سے مسکرا دیا۔ جواباً وہ بھی بھیگی آنکھوں سمیت ہنس دی۔

.....☆.....☆.....

باب عبدالعزیز پر پہنچ کر اس کے دل کی دھڑکن اپنی رفتار بھولنے لگی تو قدم سست پڑ گئے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ حرم کعبہ میں داخل ہو رہی ہے۔ اللہ سبحان وتعالیٰ نے اسے اپنے گھر بلایا ہے۔ سفید ماربل کے ٹھنڈے فرش پر چلتے ہوئے تراوٹ جیسے اس کی روح میں اتر رہی تھی۔ مگر جس غلاظت میں وہ خود کو لتھڑا محسوس کرتی تھی اس کے ہوتے ہوئے بارگاہِ خدا میں جانا کتنا مشکل تھا یہ بس وہی جانتی تھی۔ اس ناپاک وجود کو حرم کعبہ میں لاتے ہوئے اس کا دل بہت بوجھل تھا۔ انسانوں کا ایک جم غفیر تھا مگر اسے کسی قسم کی گھبراہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی نہ ہی کسی سے خوف محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس پاک مقام کا اعجاز تھا، وہ خود کو محفوظ محسوس کر رہی تھی۔

اس کے گرد وجد کے پروانے جوق در جوق کعبہ کی سمت قدم بڑھا رہے تھے۔ عکرمہ سفید احرام میں ملبوس اس کے ہم قدم تھا۔ مگر اس وقت دونوں ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں گم تھے۔ یہ مقام ایسا تھا کہ ہر ایک کا دل محوِ دعا تھا، اللہ سبحان وتعالیٰ سے لو لگائے ہوئے تھا۔ ہر اٹھتا قدم انہیں کعبہ شریف کے قریب لیے جا رہا تھا۔ سفید ستونوں والی راہ چلتے، چلتے اگلے لمحے وہ کھلے آسمان تلے مطاف میں آ گئے تھے اور اب ان کے سامنے وہ سیاہ پُرشکوہ عمارت تھی جو سفید براق زمین پر اپنی حسین شان سمیت کھڑی تھی۔ یہ کعبۃ اللہ تھا۔ اس پوری کائنات کے یکتا مالک کا بیت، اس کا گھر، بیت اللہ۔

سیاہ غلاف پر سنہرے دھاگوں سے کڑھے ہوئے حسین الفاظ جگمگا رہے تھے۔

کعبہ پر پہلی نظر کا پڑنا تھا اور پھر اسے یاد نہیں وہ کیا کہنا چاہتی تھی کیا مانگنا چاہتی تھی۔ بس آنسوؤں کی ایک مسلسل جھڑی تھی اور لبوں سے نکلنے والے ایک ہی فقرے کی گردان۔

''یا اللہ مجھے معاف کر دے۔ مجھے معاف کر دے میرے مالک۔ مجھے معاف کر دے مجھے معاف کر دے۔''

روتے، روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں مگر رونا تھا کہ رک نہیں رہا تھا۔ آج تو عکرمہ نے بھی اسے روکا نہیں۔ اس کے دل کا غبار نکل رہا تھا۔ ایک بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی کعبے کے سامنے مطاف میں موجود ہے۔ اپنے تمام تر گناہوں سمیت۔

کعبے پر پڑی جب پہلی نظر، کیا چیز ہے دنیا بھول گیا
یوں ہوش و خرد مفلوج ہوئے دل ذوق تماشا بھول گیا
پہنچا جو حرم کی چوکھٹ تک، اِک ابرِ کرم نے گھیر لیا
باقی نہ رہا پھر ہوش مجھے، کیا مانگا اور کیا بھول گیا
جس وقت دعا کو ہاتھ اٹھے یاد آ نہ سکا جو سوچا تھا
اظہارِ عقیدت کی دھن میں، اظہارِ تمنا بھول گیا
ہر وقت برستی ہے رحمت، کعبے میں جمیل اللہ اللہ
خاکی ہوں میں کتنا بھول گیا عاصی ہوں میں کتنا بھول گیا

کبھی روتی کبھی دعا مانگتی کبھی کعبے کو بھیگی آنکھوں سے دیکھے جاتی۔ کتنی ہی دیر وہ اسی کیفیت میں گم رہی۔ اور جب دل ذرا سنبھلا تو اسے عکرمہ کا خیال آیا۔ دائیں جانب نظر اٹھائی تو اسے رب سے لو لگائے دیکھا۔ اس کی

آنکھوں میں نمی اور لبوں پر کوئی ورد تھا۔ سفید احرام میں ملبوس وہ نور میں نہایا ہوا لگ رہا تھا۔ درمکنون نے بے اختیار آنسو صاف کیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلیے طواف شروع کرتے ہیں۔'' وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ حلاوت سے کہا تو وہ سر ہلا کر اس کے ساتھ ہو لی۔ حجرِ اسود کے استلام سے طواف کی ابتدا کرتے ہوئے اسے اپنا دل پروں سے بھی ہلکا محسوس ہوا۔ اور طواف کے ہر چکر میں مخصوص اذکار کے علاوہ بہت سی دعاؤں کے ساتھ رب کریم کے لیے شکر کے کلمات بھی ان کے دلوں سے نکل رہے تھے۔ جس نے ان پر رحمت کرتے ہوئے انہیں اپنے گھر کا مہمان بنایا تھا۔ مقام ابراہیمؑ پر دو نفل پڑھ کر وہ سعی کے لیے صفا و مروہ کی طرف چلے۔ سعی کے سات چکر پورے ہونے پر عکرمہ نے بال ترشوائے اور دُرِمکنون نے بالوں کی لٹ کٹوا کر عمرہ مکمل کیا تو دونوں ہی سجدۂ شکر میں جھک گئے۔

''واقعی تو رب کریم ہے غفور و الرحیم ہے اے میرے اللہ... کہ مجھ جیسی گناہوں میں لتھڑی بندی کو یہ سعادت عطا کی، میرے ناپاک وجود کو آج تو نے پاک کر دیا۔ میں تیرا شکر ادا کر ہی نہیں سکتی اے میرے مالک۔ مگر بس آج سے یہ طے ہے کہ اپنی آئندہ آنے والی زندگی کا ہر لمحہ ممکنہ حد تک صرف اور صرف تیری رضا کے حصول کی کوشش میں گزاروں گی۔ میری مدد فرمانا میرے اللہ۔'' حطیم میں نوافل کی ادائیگی کے بعد دعا کر کے وہ عکرمہ کے ساتھ حرم سے نکلی تو گویا ایک نئی دُرِمکنون تھی۔ عکرمہ نے دیکھا وہ بہت خوش مطمئن اور پُراعتماد لگ رہی تھی۔ لبوں پر سجی مسکراہٹ اس کے روحانی سکون کا مظہر تھی۔

پھر وہ پورے دس دن وہاں رہے۔ مقدس مقامات کی زیارتوں کے ساتھ حرم میں باجماعت نماز ادا کرنا، طواف کرنا اور تلاوت قرآن پاک میں وقت گزارنا ان کا معمول رہا۔ اکثر وہ دونوں مطاف کے ساتھ بنی سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے اور کعبہ کو نظروں کا مرکز بنائے اذکار میں مصروف رہتے۔ دس دن بعد حسبِ ارادہ وہ مدینہ منورہ کی طرف گامزن ہوئے۔ راستے میں مسجد قبا پر حاضری دی نوافل پڑھے اور ایمان میں مزید تازگی محسوس کی۔ مدینہ میں ان کا قیام ہفتے بھر رہا۔ وہ سارا سارا دن مسجد نبوی میں گزارتے اور نوافل کے ساتھ دینی دروس میں بھی شرکت کرتے۔ زیارتوں اور عبادتوں سے بھرپور وقت گزار کر وہ واپس مکہ کی طرف عازمِ سفر ہوئے تو راستے میں میقات پر ایک بار پھر دونوں نے عمرے کی نیت سے نوافل ادا کیے اور احرام باندھ لیا۔ اس بار حرم کی کشش اور بھی بڑھ گئی تھی۔ دوسرا عمرہ اور بھی باعثِ تسکین ہوا۔

تاہم یہ انتہائی حسین روحانی سفر بالآخر اپنے اختتام کو آ پہنچا۔ صبح ان کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ دُرِمکنون نے سارا سامان پیک کر لیا تھا۔ عشا کی نماز حرم میں باجماعت ادا کر کے وہ ہوٹل واپس آئے تو دل بہت خوش تھا۔

''آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' کلاک ٹاور کے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتے کعبۃ اللہ پر نظریں جمائے اچانک اس نے عکرمہ کو مخاطب کر لیا تھا۔

''ضرور پوچھیے۔'' دوستانہ مسکراہٹ سمیت اس کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بولا تو لمحے بھر کے لیے وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی کہ پوچھے نہ پوچھے۔ مگر کئی دنوں سے اس سوال نے اس کے اندر اودھم مچا رکھا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہیں مسز۔ پوچھ لیں جو پوچھنا چاہتی ہیں۔ ویسے بہت صحیح جگہ کا انتخاب کیا ہے آپ نے۔ غلط بیانی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔'' عکرمہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا تو اس کے لبوں پر سنجیدہ تبسم سج گیا۔

''میرے اور شیرازی ولا کے مکینوں کے درمیان حقیقی رشتے کے بارے میں آپ کب سے جانتے تھے؟'' ذرا توقف کے بعد عکرمہ کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے اس نے استفسار کر لیا تھا۔

''جب آپ کومہ میں تھیں، اتفاقیہ طور پر ایک روز چچا جان اور دادی کو بات کرتے سنا تو پتا چلا۔''

''اور تب آپ نے پاپا کی خاطر مجھے اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ سچ بتائیے ترس کھایا تھا ناں مجھ پر؟'' نکاح کے

اتنے دنوں بعد دُرِ مکنون اسے کٹہرے میں لے آئی تھی۔

''آپ مجھ سے کیا سننا چاہتی ہیں دُرِ مکنون''۔ ہلکی سی شوخی سے وہ ایک بار پھر اس سے وہی سوال کر گیا جس نے ہمیشہ درِ مکنون کو لاجواب کیا تھا مگر اس بار نہیں۔

''وہی جو سچ ہے۔ پلیز اس بار مجھے ٹالیے مت۔'' وہ بلبتی ہو گئی۔

اس کا استفسار عکرمہ کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ تاہم اسے جواب تو دینا تھا۔ کیا کہے۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے الفاظ کا چناؤ کیا اور کھنکھار کر بولنا شروع ہوا۔

ایمانداری سے کہوں تو سچ یہی ہے کہ آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے جو وجہ پیش نظر تھی، وہ تھی آپ سے ہمدردی۔ دوسرے میں دادی اور چچا جان کو آپ کے دکھ سے نکالنا چاہتا تھا جو انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔'' وہ رسانیت سے بولا تو سچائی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ دُرِ مکنون کے چہرے پر یک دم افسردگی سی اتری۔ جسے نظر انداز کر کے وہ کہتا رہا۔

''لیکن جب مجھے زوہا کے ذریعے آپ کے انکار کا پتا چلا اور میرے پوچھنے پر آپ نے میرے اس فیصلے کی وجہ جاننا چاہی، تب مجھے اپنے اندر جھانکنے کا موقع ملا اور اس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہمدردی کے ساتھ، ساتھ کوئی اور جذبہ بھی ہے جو میرے دل میں جگہ بنا چکا ہے۔ میں آپ کے انکار سے بہت بے چین ہو گیا تھا اور اس بے چینی نے مجھے خود پر آشکار کیا۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ مسکرایا تو دُرِ مکنون بے اختیار نظر چرا گئی۔ اس کے چہرے پر گلابی رنگ پھیل گیا تھا۔

''ایک سوال میرا بھی ہے آپ سے۔ آپ نے فرحان کا پروپوزل رد کر کے میرے لیے اقرار کیوں کیا؟'' اس کی محجوب خاموشی پر اب عکرمہ نے سوال کر لیا تھا۔

''اب آپ مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں عکرمہ۔'' جواباً وہ برجستہ بولی تو لہجہ متبسم اور انداز پُراعتماد تھا۔ کچھ تھا اس کے انداز میں جس پر عکرمہ بے اختیار ہنستا چلا گیا۔ آج پہلی بار اپنا نام اس کے لبوں سے سنا تھا۔ بہت خوب صورت تجربہ تھا یہ۔ اس پر مستزاد دُرِ مکنون کا اعتماد۔ عکرمہ نے دل میں سکون اترتا محسوس کیا۔

''وہی جو سچ ہے۔'' اُدھر بھی جیسے خود پر بھروسا تھا۔ وہ اطمینان سے بولا تو دُرِ مکنون سر جھکا کر ہنس دی۔ اور جب ہنس چکی تو کچھ دیر خاموش رہی۔ عکرمہ تحمل سے اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

''میرے دل پر دکھوں کا، مایوسیوں اور احساسِ کمتری کا جو زنگ تھا، اسے آپ نے اتارا میرا خود پر اعتماد بحال کرایا۔ مجھے نہیں پتا کہ کب میں نے آپ کو اپنے دکھوں کا درماں مان لیا۔ بس اتنا پتا تھا کہ میں اپنے رب کے بعد اگر کسی پر بھروسا کر سکتی ہوں تو وہ آپ ہیں۔'' کچھ دیر بعد نظر اٹھا کر وہ بولی تو لہجہ صداقت سے بھرپور اور سادگی کا مظہر تھا۔ ''تب میں نے جانا کہ شادی کے لیے جس اعتماد اور بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے وہ میں آپ کے سوا کبھی کسی پر کر ہی نہیں سکی۔''

کس قدر خوب صورت اعتراف تھا۔ عکرمہ کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ سمیت اسے دیکھا اور اس کا نازک سا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''شکرانے کے طور پر ایک الوداعی طواف کے لیے میرے ساتھ چلیں گی؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ جواباً دُرِ مکنون نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں ہم قدم حرم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور عکرمہ کی کسی بات پر دُرِ مکنون کی کھلی، کھلی ہنسی فضا میں بکھر رہی تھی۔

مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ سنور سکیں میرے خال و خد
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو، میرا سارا زنگ اتار دو

(ختم شد)

میں بدقسمتی سے ملک کے اس مظلوم طبقے سے تعلق رکھتی ہوں جسے متوسط کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا وجود سماج میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جب بھی دنیا میں کوئی سیاسی، معاشی یا تاریخی انقلاب آتا ہے تو سب سے پہلے چوٹ اسی ریڑھ کی ہڈی پر پڑتی ہے اور سب سے زیادہ نامساعد حالات کا یہی طبقہ شکار ہوتا ہے۔ حالانکہ انصاف سے دیکھا جائے تو اخلاقی ضابطوں، خاندانی روایات اور مذہبی رسومات کی پاسداری سب سے زیادہ یہی طبقہ کرتا ہے۔ علم ہماری میراث اور عمل ہمارا خزینہ گو ہماری آمدنی عمومی طور پر ایک مزدور

تکمیلِ آرزو

سلمیٰ غزل

سے بھی کم ہوتی ہے مگر ہم تعلیم یافتہ ہونے کا تمغہ اپنے سینے پر سجائے فخر سے جینے کو طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں اور سفید پوشی کا بھرم نبھاتے، نبھاتے ہم نیم مردہ ہو جاتے ہیں مگر خود کو باضمیر اور شرفا میں شمار کرنے کا شوق ہمیں زمین سے اٹھنے ہی نہیں دیتا کیونکہ چوری ہم کر نہیں سکتے، رشوت لینا گناہ سمجھتے ہیں، بھیک اور خیرات لینا ہمیں گوارا نہیں اور زکوٰۃ کے ہم حقدار نہیں غرض درمیانی طبقہ ساری زندگی مشقت کی چکی میں پستا اور ضمیر کی بیداری پر خوش ہوتا رہتا ہے۔

میرا تعلق بھی ایک ایسے ہی طبقے سے تھا۔ ابا سرکاری محکمے میں کلرک تھے ترقی ہوئی تو ہیڈ کلرک بن گئے..... بے حد دیندار، نیک اور ایماندار جس کی گواہی محکمے کے علاوہ پڑوسی اور رشتے دار بھی دیتے تھے..... اپنے پانچ بہن بھائیوں میں، میں سب سے بڑی اور ابا کی چہیتی تھی۔ اس تنگدستی میں بہن، بھائیوں کی پرورش اور تعلیمی اخراجات پورے کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا مگر ابا علم کے شیدائی تھے اور امی کفایت شعار۔ میں (انابیہ) سب سے زیادہ حساس اور زود رنج تھی جس کا ابا کو بھی اندازہ تھا اور وہ قدم قدم پر میری رہنمائی کرتے اور سراہتے بھی تھے۔ میں نے A one گریڈ میں جب میٹرک کیا تو امی، ابا دونوں ہی نے ہمت ہار دی کیونکہ کالج کی فیس اور کتابوں کے اخراجات برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا لیکن میرے شوق نے اس مسائل کو راہ میں حائل نہیں ہونے دیا اور میں نے پرائیویٹ پڑھتے ہوئے اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی۔ زندگی ایک ایسی قید بامشقت بن گئی تھی جس میں سانس لینے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ صبح ابا سمیت سب بہن بھائی گھر سے چلے جاتے اور میں گھر کے کاموں کے علاوہ شام کی ٹیوشن میں مصروف ہو جاتی تھی لیکن میں خندہ پیشانی سے ہر مشکل کا سامنا کر رہی تھی۔ ابا چونکہ شام ڈھلے آفس سے آتے تھے اس لیے گھر کے ساتھ، ساتھ باہر کی ذمے داری بھی مجھ پر آ گئی تھی۔ بہن، بھائیوں کی فیس جمع کرانا، ان کو ہوم ورک کرانا اور ان کا ہر کام کرنا اور اس وجہ سے وہ کام چور اور بے پروا ہو گئے تھے جس کا سب سے زیادہ احساس ابا کو ہوتا تھا اور وہ سب کو ڈانٹتے رہتے۔

''تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، انابیہ پورے دن گھن چکر بنی رہتی ہے اور تم لوگ اسکول سے آ کر اس طرح پلنگ توڑنے لگتے ہو جیسے ہل بیل جوت کر آئے ہو.....''

ایسے میں امی ان کے آگے دیوار بن جاتیں۔

''اے لو انابیہ گھر میں ہوتی ہے تو کام کر لیتی ہے، وہ کون سا باہر جاتی ہے، بچے اسکول سے تھک کر آتے ہیں بلاوجہ ان کے پیچھے نہ پڑا کریں۔''

☆☆☆

اس دوران میں نے اچھے نمبروں سے بی اے کر لیا تو سب زیادہ ابا خوش ہوئے اور فخر سے بولے۔ ''انابیہ میری بیٹی نہیں بیٹا ہے.....''

اور میں ان کی اس بات پر خوشی سے پھولی نہ سمائی اور زیادہ تندہی سے کام کرنے لگی مگر اپنی دوست کے مشورے پر میں نے B.Ed کالج میں داخلہ لے لیا اور اب میری محنت اور بھی بڑھ گئی تھی کیونکہ میں پرائیویٹ MA کی تیاری بھی کر رہی تھی اور بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری تھا، دو سال پلک جھپکتے گزر گئے اور مجھے ایک پرائیویٹ اسکول میں معقول تنخواہ پر نوکری مل گئی جس میں میری دوست عنایہ کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس اسکول کے روح رواں عنایہ کے والد اور بھائی تھے۔ میں اپنی اس کامیابی پر بڑا خوش تھی اور ہر مہینے پوری تنخواہ لا کر امی کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھی۔ ٹیوشن سے میری ضروریات پوری ہو جاتی تھیں اب ابا کو سب سے زیادہ میری شادی کی فکر تھی۔ دونوں بہنیں کالج پہنچ چکی تھیں اور بھائی نویں اور دسویں جماعت میں تھے لیکن ابا کے سوا میری محنت اور مشقت کا کسی کو احساس تک نہیں تھا، وہ میری محنت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔

میری عمر 25 سال سے زائد ہو گئی تھی اور آہستہ، آہستہ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ بے شک ابا مجھے بیٹا کہتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میری نسوانیت ہی مر گئی ہو یا میں لڑکیوں کی صنف سے خارج ہو گئی ہوں، میں نے یہ سب اس سے پہلے کبھی اس شدت سے محسوس نہیں کیا تھا جب ایک دن امی کو رشتہ کرانے والی خاتون سے کہتے سنا۔

''ارے انابیہ تو خود کماتی ہے، مجھے اس کی فکر نہیں

بس تم ہادیہ اور نائمہ کا خیال رکھو۔ اس سال ان کی بھی تعلیم مکمل ہوجائے گی اور پھر ان کے ابا بھی ریٹائرڈ ہونے والے ہیں' میں چاہتی ہوں ان کی ریٹائرمنٹ سے پہلے دونوں بیٹیوں سے فارغ ہوجاؤں....." مجھے لگا میرے سوئے ہوئے جذبات بیدار ہوگئے۔ اب جاگوں یا سوؤں لیکن وہ لڑکی تو اب مر نہیں سکتی جو میرے جذبات کے اندر تلاطم برپا کرچکی تھی، میں بھی ایک لڑکی تھی مجھے بھی چاہے جانے اور اپنے گھر کی خواہش ہوسکتی ہے۔ کیا میری زندگی کا مقصد صرف گھر والوں کو کما کر کھلانا تھا؟

☆☆☆

مجھ پر آج کل ایک عجیب سی بے کلی طاری تھی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا تب ایک دن امی، ابا کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنا نام سن کر میرے قدم غیر ارادی طور پر رک گئے۔

"زیب النسا بیگم تم یہ غلط کررہی ہو، انابیہ کے ہوتے ہوئے تم دونوں چھوٹیوں کی شادی پہلے کیسے کرسکتی ہو.....؟ پہلا حق اس کا ہے۔" ابا کی آواز غصے سے بلند ہوگئی۔

"ارے تو میں نے کب انکار کیا ہے' اس کی بھی ہوجائے گی..... دیکھو دو سگے بھائیوں کا رشتہ ہماری دونوں بیٹیوں کے لیے آیا ہے۔ پہلے اس سے فارغ ہوجاؤں پھر انابیہ کے بارے میں بھی سوچیں گے ویسے بھی آپ ریٹائرڈ ہوگئے ہیں' پنشن میں کہاں پورا پڑتا ہے گھر کی بڑی ذمے داری تو انابیہ کی تنخواہ سے پوری ہوتی ہے اس کی شادی کردی...تو گھر کیسے چلے گا.....؟" امی نے کہا تو ابا چیخ اٹھے۔

"تم اتنی خود غرض اور ناشکری عورت ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یعنی تم انابیہ کی شادی اس لیے نہیں کرنا چاہ رہیں کہ وہ اس گھر کا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ ایسا سوچتے ہوئے بھی تمہیں شرم آنی چاہیے، گھر چلانے کی ذمے داری میری ہے اس کی نہیں..... جب تمہیں ماں ہو کر اس کا احساس نہیں تو باقیوں سے تو توقع ہی فضول ہے۔ وہ بچپن سے ہی اس گھر کے لیے محنت مشقت کررہی ہے مگر اس کی قربانیوں کا کسی کو احساس تک نہیں سب نکمے، ہڈ حرام....." انابیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے دل گداز ہوگیا کوئی تو ہے جسے اس کی فکر اور احساس ہے۔ اس کی پوری رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی عجیب سی بے چینی اور بے کلی تھی۔

☆☆☆

اور پھر ابا کی ایک نہیں چلی وہی ہوا جو اماں نے چاہا اور دونوں بہنوں کی شادی ہوگئی۔ انابیہ خوش تھی مگر لوگوں کی سوالیہ نگاہیں..... ان کے چبھتے ہوئے سوال اس کو پریشان کررہے تھے۔

"اے لو بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی بیاہ دیں یہ کوئی انصاف ہوا....."

"چھوڑو بہن کیا چھوٹی اور کیا بڑی..... انابیہ تو کماؤ پوت ہے زیب النسا بھی سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیں گی' اتنی گنوں والی بچی ہے مگر ...گھر والوں نے کمانے کی مشین سمجھ لیا ہے۔"

جب انابیہ نے عنایہ کو بہنوں کی شادی کا کارڈ دیا تو وہ پھٹ پڑی۔

"انابیہ تمہاری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ تم نے کسی کو بھی اپنی ذمے داری کا احساس نہیں دلایا۔ خود ایثار و قربانی کی دیوی بنی رہیں اور آنٹی بھی اسے اپنا حق اور تمہارا فرض سمجھ بیٹھیں حالانکہ مائیں تو اپنی اولاد کو یکساں پیار کرتی ہیں مگر تمہارے معاملے میں انہوں نے ڈنڈی ماردی..... تم خود سوچو تمہاری عمر بڑھ رہی ہے۔ کم نہیں ہورہی کل کلاں کو خدانخواستہ تمہارے والدین نہ رہے تو تمہارا مستقبل کیا ہوگا۔ بھائیوں کی شادی ہوگئی تو وہ بیویوں کو پیارے ہوجائیں گے اور تم کمانے اور بھائیوں کے بچے پالنے کے لیے رہ جاؤ گی کبھی سوچا ہے تم نے.....؟" عنایہ کی شادی ہوچکی تھی اور وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ دونوں بھائیوں کی تعلیم بھی مکمل ہوگئی تھی اور اب وہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھے' انابیہ اب اسی اسکول کی پرنسپل ہوگئی تھی جہاں سے اس نے ابتدا کی تھی۔ رشتے تو اس کے اب بھی آرہے تھے۔ خوش مزاج، خوش شکل اور اعلیٰ

عہدے پر فائز... مگر اماں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر انہیں مسترد کر دیتی تھیں۔ ابا کو دل کی بیماری نے بستر تک محدود کر دیا تھا مگر وہ انابیہ کے لیے فکر مند تھے۔ دونوں بہنیں عید بقر عید پر آتیں اور کپڑے لتے، تحفے لے جاتیں اور ان کے فرمائشی پروگرام بھی جاری رہتے جس پر ابا جلتے کڑھتے رہتے۔

ایک دن ابا کے کہنے پر عنایہ، ابا سے ملنے آئی اماں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ انابیہ چائے بنا کر لائی تو جانے دونوں میں کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ انابیہ کے پوچھنے پر اس نے ٹال دیا۔ وہ روز بروز قنوطی، آدم بیزار اور زود رنج ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک عنایہ کے توسط سے اس کا بڑا اچھا رشتہ آ گیا۔ فائق علی... عنایہ کا کزن تھا اور انابیہ کے اسکول میں ایڈمنسٹریشن سائڈ میں تھا۔ عنایہ کا فائق سے سامنا کم ہی ہوتا تھا کیونکہ زیادہ تر تو عنایہ کے ابا اور بھائی ہی معاملات دیکھتے تھے۔ فائق علی خوب رو ہونے کے ساتھ مہذب بھی تھا، شادی شدہ بہن امریکا میں تھی اور وہ اس کے ماں، باپ بڑی مختصر فیملی تھی ابا خوش ہو گئے لیکن اماں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

''یہ کبھی نہیں ہو سکتا، لڑکا اسی اسکول میں ہے جہاں انابیہ پڑھاتی ہے۔ لوگ کیسی کیسی باتیں بنائیں گے، عشق کا چکر چل رہا ہوگا۔ لڑکی نے پھانسا ہوگا، صبر نام کی کوئی چیز نہ تھی انابیہ میں خود ہی رشتہ پسند کر لیا۔ کوئی باہر کا رشتہ ہوتا تو میں مان لیتی لیکن اس لڑکے سے شادی کر کے میں لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتی اور کیا پتا اس کے پیچھے لالچ ہو، انابیہ کمانی جو اتنا اچھا ہے، لڑکے کو پتا ہوگا ایسے مطلبی لوگوں میں تو میں ہرگز بھی انابیہ کی شادی نہ کروں۔'' ابا چیختے، چلاتے رہے لیکن اماں نے فائق کے ماں، باپ کو ٹکا سا جواب دینے میں دیر نہیں لگائی جو بڑے چاؤ اور ارمانوں سے بیٹے کا رشتہ لائے تھے اماں کی باتوں سے انابیہ.... شرم سے پانی، پانی ہو رہی تھی کیونکہ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے لیے فائق کا رشتہ آئے گا۔ اس میں اسکول جانے اور فائق کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی وہ تو اس کو پوری طرح جانتی بھی نہیں تھی کبھی کبھار ہی سامنا ہوتا تھا اس نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔

☆☆☆

ابھی اس کی چھٹیوں میں دو دن باقی تھے جب ابا نے اسے تیار ہونے کو کہا۔

''اے لو..... چلا تو جاتا نہیں اب انابیہ کو لے کر کہاں جا رہے ہو؟''

''اسی لیے تو انابیہ کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں، سنا ہے پنشن بڑھ رہی ہے، اچھا ہے یہ ساتھ ہوگی تو مجھے آسانی ہوگی۔''

''تب تو ضرور جاؤ مہنگائی بھی تو قیامت ہو گئی ہے، گزارہ کرنا مشکل ہو گیا ہے.....'' اماں خوش ہو گئیں، باہر نکلتے ہی ابا نے رکشا پکڑا اور انابیہ کے بتانے پر عنایہ کی سسرال پہنچ گئے اور انابیہ کو کچھ پوچھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اسے شاید پہلے سے خبر تھی بڑی گرم جوشی سے اس کی ساس، سسر اور میاں نے دونوں کا استقبال کیا۔ پھر عنایہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور ایک بھاری ساکامدار جوڑا اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

''جلدی سے نہا کر بدل لو، میں تمہارا میک اپ کر دوں گی؟'' انابیہ کو غصہ آ گیا۔

''پاگل تو نہیں ہو گئیں، یہ کیا تماشا لگایا ہے کوئی تقریب ہے کیا اور یہ کپڑے تو میں ہرگز نہیں پہنوں گی۔''

''اچھا زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں، پہنیں گے تو تمہارے اچھے بھی ورنہ میں انکل کو بلاؤں گی.....'' انابیہ کو سخت الجھن ہو رہی تھی مگر عنایہ کے سامنے اس کی ایک نہ چلی..... عصر کی نماز کے بعد عنایہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی تو وہ اپنے حواس کھونے لگی..... عنایہ نے ایک بھاری دوپٹا اس کے اوپر ڈال دیا بھی قاضی صاحب کی آواز گونجنے لگی۔

''بیٹی انابیہ آپ کا نکاح فائق احمد ولد اخلاق احمد کے ہمراہ.....'' اس سے زیادہ اس سے سنا ہی نہیں گیا اس نے گھبرا کر سر اٹھایا تو ابا آنسوؤں بھری آنکھوں سے اس کی طرف التجا کرتے نظر آئے انہوں نے سر پر ہاتھ پھیر کر حوصلہ دیا پھر کس طرح اس نے قبول کیا اور نکاح نامے پر دستخط کیے کچھ یاد نہیں تھا یاد تو بس یہ تھا

کہ اس کا نکاح فائق احمد سے ہوگیا ہے۔ چائے کے دوران عنایہ اس سے مذاق کرتی رہی مگر اس کے ہوش و حواس گم اور ذہن ساکن ہو چکا تھا امی کی ناراضی کے خیال سے خوشی ادھوری لگ رہی تھی۔ عنایہ نے اپنی گاڑی میں انہیں گھر ڈراپ کردیا۔ اب وہ اندر جانے سے ہچکچا رہی تھی لیکن ابا نے حوصلہ بڑھایا، ابا کو دیکھ کر اماں پھٹ پڑیں۔

''کہاں چلے گئے تھے، ہول، ہول کر میرا برا حال ہوگیا۔ موبائل بھی آف کیا ہوا تھا..... دونوں بیٹیاں آئی بیٹھی ہیں.....'' پھر ان کی نظر انابیہ پر پڑی جو بنی سنوری اور سہمی ہوئی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

''کمال ہے مجھے بتایا بھی نہیں اور اسے کسی تقریب میں بھی لے گئے اور یہ بھاری کپڑے کہاں سے آئے؟ اور یہ سونے کے کنگن.....؟'' ان کی سوالیہ نظریں انھیں تو انابیہ گھبرا گئی اسے یاد آیا کہ سونے کے کنگن اپنے ہاتھ سے اتار کر فائق کی امی نے پہنائے تھے۔

''جلدی میں یہی ہوسکا، ان شاء اللہ رخصتی پر سارے ارمان نکالوں گی میرا ایک ہی تو بیٹا ہے.....'' انہوں نے پیار سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تو اس کی روح اندر تک سرشار ہوگئی، وہ خاموش کھڑی تھی جب ابا بول اٹھے۔

''نکاح کردیا ہے میں نے انابیہ کا فائق احمد کے ساتھ اور ایک ہفتے بعد رخصتی ہے۔'' دونوں بھائی اور بہنیں انگشت بدنداں تھے اور امی پر تو سکتہ طاری ہوگیا۔

''مجھے معلوم تھا تم سب لوگ بے حس ہو چکے ہو تو اس لیے مجبوری میں یہ قدم اٹھانا پڑا..... جب ماں کو احساس نہیں تو بہن، بھائی کس کھیت کی مولی ہیں۔ بچپن سے انابیہ حالات کی چکی میں پستی رہی، تم لوگوں کے لیے اس نے اپنی جوانی کے قیمتی سال نچھاور کردیے اور کسی کو احساس تک نہیں ہونے دیا کہ اس کے بھی کچھ ارمان ہیں، خواہشات ہیں..... کیا خوشیوں پر اس کا کوئی حق نہیں.....؟ مگر تم جیسے بے حس لوگ اس کی محنت اور مشقت کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے رہے اور وہ اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹتی رہی۔ کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ ماں نے بھی نہیں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ خودغرضی اور لالچ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..... اچھے، اچھے رشتے تمہاری ماں نے ٹھکرا دیے کہ گھر کیسے چلے گا۔'' پھر وہ بیٹیوں کی طرف مڑے۔ ''اور بہنیں تو بہنوں کا خیال رکھتی ہیں تم کیسی بہنیں ہو کہ ہر وقت اپنے مطالبات کی گٹھری اٹھائے آجاتی ہو۔ ہمارا ایمان کتنا کمزور ہے کیا ہمارا رب ہم سے غافل ہے، وہ تو پتھر کے اندر کی ذی روح کو بھی خوراک پہنچاتا ہے جو مسلمان نہیں ہیں انہیں بھی ہر چیز دیتا ہے۔ ہر شخص کو اس کے مقدر کا ملتا ہے اللہ کے سوا کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا مگر تم نے سوچ لیا کہ انابیہ چلی گئی تو اس گھر میں فاقے ہونے لگیں گے، رزق کے دروازے بند ہوجائیں گے۔ کیا تمہارا اللہ پر سے یقین اٹھ گیا ہے یا خودغرضی نے تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کرلی ہیں؟'' سب کے چہروں پر شرمندگی رقم تھی سب سے پہلے اماں آگے بڑھیں اور اسے گلے لگا کر رونے لگیں۔

''میری بچی مجھے معاف کردینا، میں ماں کا فرض ادا نہ کرسکی شاید میں خود غرض ہوگئی تھی خدا کا شکر ہے تمہارے ابا نے بروقت فیصلہ کرکے میری آنکھیں کھول دیں۔'' چاروں بہن، بھائی بھی انابیہ سے لپٹ کر خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

''ابا اب ہم دھوم دھام سے آپی کی رخصتی کریں گے اب آپ بے فکر ہوجائیں۔'' ہادیہ خوب چہکتے ہوئے بولی۔

''آپی اب ہم اپنی کوتاہیوں کا اس طرح ازالہ کریں گے کہ فائق بھائی کو بھی پتا چل جائے گا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں.....'' پھر نائمہ بھی اسے پیار کرتے ہوئے کہنے لگی۔ دونوں بھائی اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگے۔ انابیہ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ خوشیاں اس طرح اس پر مہربان ہوں گی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اسے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ اس کی آزمائشوں کے دن ختم ہوگئے اور ایک مسرتوں اور چاہتوں بھری زندگی اس کی منتظر تھی۔

❁❁❁

ناولٹ

میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں

سعدیہ ہما شیخ

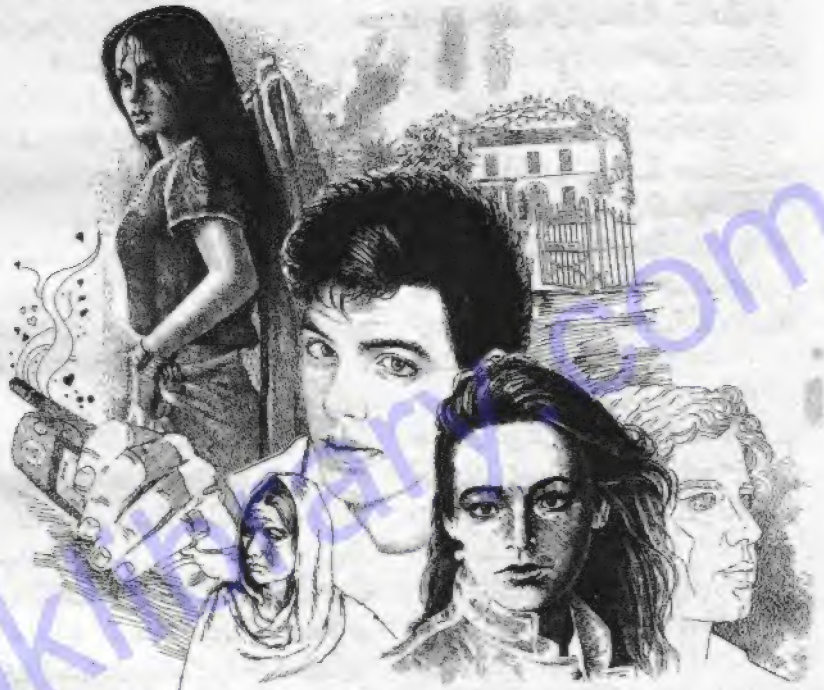

''ہم نے بہت خواب بُنے تھے ساتھ چلنے کے..... ہر راستے پر ہم ساتھ چلتے تھے، خواب میں خیال میں، کوئی رستہ میں نے اکیلے طے نہیں کیا تھا، ہر رستے پر ہم قدم تھا وہ میرے..... جب راستے الگ ہوئے؟ تو میں ہر اس راہ تک گئی ہوں اس کے خیال کے ساتھ..... جس پر ہم نے مجسم ہم قدم ہو کے چلنا تھا..... میں نے اس کی ہر اِک راہ پر رک کر اس کا انتظار کیا..... اس کے ساتھ دیکھے خواب میں نے اس کے خیال کی انگلی پکڑ کے پورے کیے..... ہر رستے پر اس کے ساتھ قدم ملا کے چلی ہوں لیکن فرق صرف یہ تھا کہ وہ میرے ساتھ مجسم صورت نہیں بلکہ خیال بن کے ہم قدم رہا۔''

خوابوں اور خیالوں کے دیس میں رہنے والی لڑکیاں، جگنوؤں کے پیچھے بھاگنے والی لڑکیاں، تتلیوں کے پروں سے اپنی پوروں پر رنگ سمیٹنے والی لڑکیاں کب کیسے اور کس طرح کسی اَن دیکھے، اجنبی، انجان شخص کے خوابوں میں الجھتی ہیں کہ ان کو رنگ، خوشبو، ہوا، بادل، جگنو، تتلیاں..... سب کچھ بھول جاتا ہے۔

☆☆☆

وہ چھوٹے سے دیہات کی چھوٹی سی لڑکی تھی۔ چھوٹے، چھوٹے کچے خواب آنکھوں میں لیے وہ بہت اچانک اس بڑے شہر میں آ گئی تھی مگر اس سے پہلے اس نے بھلوال کے ڈگری کالج سے بی اے کی ڈگری مکمل کر لی تھی۔ بھلوال پسماندہ سا شہر تھا۔ مگر ان کے گاؤں سے بڑا تھا۔ بھلوال تک پہنچنا بھی ثنا جیسی لڑکی کے لیے کچھ آسان نہیں تھا۔ اس کی ماں ہر فصل سے کسی نہ کسی انداز میں محفوظ کی گئی رقم سے اس کی تعلیمی ضروریات پوری کرتی تھی اور اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کی معمولی خواہشوں کو تکمیل کے کن مراحل سے گزارتی تھی یہ بھی ثنا کے سامنے روشن حقیقت کی طرح واضح تھا۔

خاندان کی بھرپور مخالفت کے بعد اب بھلوال سے آگے یونیورسٹی آف سرگودھا میں داخلہ مل جانا ثنا کے لیے دو جہانوں کی خوشی کے مترادف تھا۔

وہ ایک محنتی اور ذہین لڑکی تھی اور اس کے سامنے مقصد بہت واضح تھا۔ منزل دور اور راستہ کٹھن ضرور تھا مگر اس کی لگن سے زیادہ کٹھن نہیں تھا۔ جس دن امی اسے ہاسٹل چھوڑ کر گئیں۔ ثنا کا دل افسردہ تھا۔ وہ فطرتاً ایک معصوم اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ ابھی اسے اس بڑے شہر کے چال چلن کی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ اس کے لیے ہاسٹل کا ماحول بھی اجنبی تھا۔ اور دور، دور سے آئی لڑکیاں بھی انجان تھیں۔ یہاں دل لگانا بہت کٹھن تھا۔

پہلی رات اسے ہاسٹل کی چھت تلے سخت گرم ہوا کے زیر اثر نیند ہی نہیں آئی تھی۔ ہاسٹل کی چھت کی اندرونی سطح پلاسٹر آف پیرس کی تھی، سرگودھا کی گرمی نے اسے تندور بنا رکھا تھا۔ اوپر سے ریگ، ریگ کر چلتا پنکھا دمے کے مریض جیسا لگ رہا تھا۔ فرش پر سب لڑکیوں نے اپنے، اپنے گدے بچھا رکھے تھے۔ اس کا گدا فوم کا نہیں بلکہ دیسی روئی کا بنا تھا۔ اسے یہ فوم جتنا ہی گرم محسوس ہو رہا تھا۔

وہ ہاسٹل کی وارڈن کی تمام ہدایات ذہن میں دہراتی آخرکار گہری نیند میں ڈوب گئی۔

صبح سورج کی تیز چمکیلی روشنی نے اس کی نیند میں خلل ڈالا تھا۔ جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی وہ کمرے کا

ماحول دیکھ کر قدرے سراسیمہ ہوگئی۔

اس وقت ثنا کی تمام روم میٹس جو کہ تعداد میں چھ تھیں، مکمل فارم میں تھیں۔

سب نے اپنی باری پر غسل کیا، بال ڈرائیر سے سکھائے اور اب شیشے کے سامنے کھڑی اپنے چہروں کے نقوش سنوارنے میں ایسے مگن تھیں جیسے ثنا کے دیہات میں چوتھی کی دلہنیں تیار ہوتی تھیں۔

اس کے لیے یہ منظر سخت حیرانی کا باعث تھا۔ کہاں وہ چھوٹے سے قصبے کے ڈگری کالج کی بی اے پاس لڑکی جو کالج کی سختیاں سہہ، سہہ کر یہاں تک پہنچی تھی۔

اسے یاد تھا امی نے کبھی منہ پر اپنی مشہور زمانہ تبت کریم بھی نہیں لگانے دی تھی۔ کجا کہ رنگ برنگے میک اپ سے سجتی سنورتی لڑکیوں کو تعلیمی ادارے میں جاتے دیکھنا۔ ثنا کے خیال میں یہی تھا کہ یہ لڑکیاں کوئی بڑے ماڈرن گھرانوں کی آزاد خیال لڑکیاں ہوں گی۔ یہ خیال اگلے دو ہفتوں کے بعد اتنا مربوط نہیں رہا تھا۔ ابھی تو اسے اپنی روم میٹس کے نام یاد رکھنے میں خاصا وقت لگا تھا۔ کرن، نائلہ، ثمرہ، بینا اور گلناز.....

ان میں گلناز وہ لڑکی تھی جس نے ازخود ثنا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ جسے اس نے بڑی محبت کے ساتھ تھام لیا۔ ثنا اور گلناز کا ساتھ یونیورسٹی میں بھی چلتا رہا۔ وہ اتفاق سے کلاس فیلوز بھی تھیں۔ یوں اس دوستی کا دورانیہ طویل ہونے والا تھا۔ گلناز کافی تیز، ماڈرن اور خوش شکل لڑکی تھی۔ کچھ اسے خود کو سنوارنے کا بھی جنون تھا۔

ثنا جو پہلے دن سے گلناز کی مرید بنی تو پھر یہ عقیدت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔

اگلے دو دن بعد ثنا نے اپنا گدا گلناز کے برابر لگا لیا۔ اب دن کے علاوہ رات کو بھی جب تک نیند نہ آتی وہ گلناز کی باتیں بہت شوق اور دلچسپی سے سنتی رہتی۔

گلناز بہت ہی باتونی لڑکی تھی۔ اس کے پاس بے شمار قصے تھے اور اسے شیخیاں بگھارنے کا بھی بڑا کریز تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ ہاسٹل کی سب ہی لڑکیاں اس کی شیخیوں سے تنگ تھیں۔ خیر گلناز کو ایک سامع میسر تھا۔ سو وہ بہت لمبی، لمبی چھوڑ کے اسے اپنے متاثرین میں شامل کر رہی تھی۔ ثنا کو ویسے بھی گلناز پسند تھی، سو وہ گہری دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی رہتی اور اس کے اعتماد پر دل ہی دل میں بڑا متاثر ہوتی۔

''یہ جو ساری لڑکیاں اتنا میک اپ کر کے یونیورسٹی جاتی ہیں تو ان کو استادوں کا کوئی ڈر نہیں؟'' ایک دن ثنا نے اس سے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا تھا۔

اس کی بات پر گلناز کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

''تم کس ڈنگر خانے سے آئی ہو لڑکی!'' وہ ہنس، ہنس کر بے حال ہوتی بمشکل بولی۔

''ان میں اکثریت تو پروفیسروں کو پھنسانے کے لیے لشکارے مارتی یونیورسٹی جاتی ہے۔'' گلناز کے منہ پھاڑ کے کہنے پر ثنا کا رنگ فق ہوگیا تھا۔

''کیا واقعی؟'' اس نے زرد ہلدی جیسی رنگت کے ساتھ پوچھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔ جیسے اسے یہ سب مذاق لگ رہا ہو۔

''قسم اٹھوا لو۔'' گلناز نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''یہ ساری چالو ہیں۔'' اس نے ایک آنکھ دبائی تھی۔ ثنا کی رنگت ایک مرتبہ پھر فق ہوئی۔ اس کا جملہ عجیب سا لگا۔

''ان میں سے چند ایک چھوڑ کے سب ایک ہی رنگ میں رنگی ہیں۔ اوپر سے شریف..... اندر سے گنوں کی پوری۔ تم کو آہستہ، آہستہ سب پتا چل جائے گا۔'' گلناز نے قہقہہ لگایا اور پھر سے بھویں دھاگے سے کھینچنے لگی۔ وہ پہلے بھی یہی کام ذوق وشوق سے کر رہی تھی۔

ثنا کے لیے بڑے شہر کے سارے رنگ انوکھے تھے۔ اسے شاید ان لوگوں کے بیچ ایڈجسٹ ہونے میں کافی وقت لگنے والا تھا۔ اس نے دیکھا زیادہ تر اس کی روم میٹ عبایا پہن کر اسٹائلش سا حجاب لیتی تھیں۔ میک اپ زدہ چہرہ خوب صورت میک اپ زدہ آنکھوں کے ساتھ سر کے گرد لپٹا حجاب اتنا پاکیزہ لگ رہا تھا کہ اچھے بھلے انسان دھوکا کھا جاتے۔ عبایا یونیورسٹی کا سمبل تھا۔ فیشن اور ضرورت کے تحت پہنا جاتا۔ مڈل اور لوئر مڈل کلاس کی لڑکیوں کے لیے عبایا ایک مجبوری تھا۔ وہ اتنے رنگ برنگ اسٹینڈرڈ کے کپڑے کہاں سے لاتیں۔ سو عبایا کے

نیچے ٹراوزر شرٹ یا کوئی بھی پرانی قمیص گھسی جینز پہن کے بس چہرہ سجاتیں اور یونیورسٹی پہنچ جاتیں۔

ثنا نے اگلے دو ہفتوں میں مشاہدہ کیا کہ اس کے ساتھ رہنے والی اور اس کے ساتھ پڑھنے والی اسی فیصد لڑکیاں مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس سے تھیں۔ جن کے والدین بمشکل ان کے اخراجات پورے کر پاتے تھے اور مائیں دیسی گھی، دودھ، گڑ، تمباکو، لہسن، گندم، چاول بیچ کے ان کی پڑھائی اور ہاسٹلز کے اخراجات پورے کرتی تھیں۔ ثنا کا احساسِ کمتری رفتہ، رفتہ خود بخود نکل گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح جھجک کر یونیورسٹی نہیں جاتی تھی بلکہ اب اس کی ذات میں اعتماد آرہا تھا۔

گلناز سے اس کی دوستی بھی مضبوط ہو رہی تھی۔ پہلی مرتبہ جب وہ چھٹی پر گھر گئی تو اس کے پاس بتانے کے لیے بے شمار قصے تھے اور اس کا جوش اور جذبہ اس کی ماں کو بہت مسرور کر رہا تھا۔ اس کی ماں کو اپنے خواب پورے ہوتے دکھائی دے رہے تھے تاروں کی چھاؤں میں جب ثنا کا تھکا ہارا کسان باپ سو چکا تو چپکے سے بیٹی کا بازو ہلا کر اس نے پوچھا۔

''ثنا! میری دھی! تیرا دل لگ گیا ہے ناں نئے شہر؟''

''ہاں امی! میرا دل خوب لگا ہے وہاں میرے سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔'' وہ آنکھوں میں شوق کے رنگ بھر کے بتانے لگی۔

''امی! میری کلاس فیلوز میرے ہی جیسی ہیں مگر وہ میرے سے بہت آگے ہیں۔ وہ بہت سالوں سے وہاں رہ رہی ہیں۔ ان کے لیے کچھ بھی نیا نہیں مگر میرے لیے سب کچھ بہت نیا ہے۔ پر مجھے یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ بہت خوشی سے کھلے کھلے چہرے کے ساتھ بتا رہی تھی۔

''میری دھی! دھیان سے سن، تو نے دل لگا کے پڑھنا ہے اور بڑی آدمی بننا ہے۔ دیکھ بیٹی! تو اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہے جو بڑے شہر، بڑی یونیورسٹی پڑھنے گئی ہے۔ تو نے خاندان والوں کو باتیں بنانے کا موقع نہیں دینا۔ دل لگا کر پڑھنا ہے۔'' اس کی ماں مٹھی بھر نصیحتیں اس کے پلو کے ساتھ ٹانکتی رہی جو ثنا نے آدھی سنیں اور آدھی میٹھے خوابوں کی نذر ہو گئیں۔

پہلی دفعہ گاؤں آنے پر گاؤں اتنا اجنبی نہیں لگا تھا۔ پرانی سہیلیوں سے شہری سہیلیوں کا موازنہ بھی اتنا برا نہیں لگا مگر اگلے چند مہینوں میں کچھ تبدیلی آنے والی تھی۔

پہلی چھٹی پر میٹرک پاس گھروں میں سلائیاں، کڑھائیاں سیکھتی سہیلیوں کو بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔

''شہر میں چھوٹی کرتیوں اور ٹائٹس کا فیشن ہے۔ جینز کے اوپر کرتے بھی چلتے ہیں۔ یہ کھلے فلیپر اور پلازو تو کوئی نہیں پہنتا۔'' اس نے فری کے کھلے پاجامے کو ناقدانہ دیکھتے ہوئے قدرے منہ بنا کر کہا تھا۔ فری جو اپنا نیا نکور سوٹ پہن کر ثنا سے داد سمیٹنے آئی تھی، اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

''اچھا تم ہمیں نئے فیشن بتاتی رہو گی ناں! پھر میں ویسے کپڑے ہی سلائی کر لوں گی۔'' اس نے خفت مٹا کر بات سنبھالی تھی۔

''نئے فیشن کے کپڑے سلائی تو کر لو گی مگر یہاں پہننے کون دے گا؟'' اب کے ثنا کا انداز طنزیہ تھا۔

فری دلبرداشتہ ہو گئی تھی۔ پہلی مرتبہ اسے ثنا بہت اجنبی لگی۔

''شہر کے پانی میں ہی وفا نہیں۔'' اس نے دل مسوس کر زیرِ لب کہا اور اپنا فریم اٹھا کر چلی گئی۔ ثنا کی چھوٹی بہن حنا نے گھور کر اسے دیکھا اور غصے سے بولی۔

''بندہ چار دن شہر رہ کر آجائے تو اپنوں سے بات کرنے کی تمیز بھول جاتا ہے۔ شہر میں تمہیں تمیز سیکھنے بھیجا تھا سیکھی ہوئی تمیز بھلا دینے کے لیے نہیں۔'' حنا کے الفاظ ثنا کو ضرب کی طرح لگے۔ وہ بلبلا اٹھی اور امی کو اپنی مدد کے لیے فوراً پکارا۔

''امی! دیکھیں، حنا مجھ سے بدتمیزی کر رہی ہے۔ اب تو میں مہمان ہوں۔ کیا مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟''

وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔ امی کو پہلوٹھی کی اولاد کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہ ہوئے تو چھوٹی کو جھڑک کر خاموش کروا دیا۔

''کبھی کبھار بہن گھر آئے گی۔ اب میں تمہیں

اس کے ساتھ چونچ لڑاتے نہ دیکھوں۔''

حنا غصے میں پاؤں پٹختی نکل گئی تھی اور ثنا فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھتی مسکراتی رہی۔ اس کی مسکراہٹ گہری سے گہری ہوتی جارہی تھی۔

گھر میں مہمانوں جیسا پروٹوکول پانا بھی ایک الگ ہی تجربہ تھا، جمعہ شام سے اتوار شام تک خوب مہمان نوازی کے بعد ہاسٹل میں پہلا دن اداس ہی گزرا تھا کیونکہ گلناز اس دن تھی نہیں۔ شاید گلناز اپنے گھر سے واپس نہیں آئی تھی۔ ثنا رات تک منتظر رہی اور پھر دس بجے کے قریب اسے نیند میں گلناز کی آواز سنائی دی تھی۔

''تو کیا گلناز آگئی...؟''

ثنا بے ساختہ اٹھی۔ اس کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

''تم آگئیں یار اتنی دیر سے آئی ہو۔ میری امی تو مجھے کبھی اتنی دیر سے نہ نکلنے دیں تم کل آجاتیں۔'' گھڑی کی طرف دیکھتی وہ مسلسل بول رہی تھی۔ گلناز نے کافی بیزاری سے اس کی نان اسٹاپ چلتی زبان اور سوالات کو نظر انداز کیا اور اپنے گدے پر ڈھے گئی۔

''بہن! اپنا بھونپو بند کردو۔'' گلناز نے عاجز آ کر ہاتھ جوڑے۔

''میں تو یہ کہہ رہی تھی اتنی رات کو اکیلی۔'' اس کے اگلے الفاظ منہ میں دبے رہ گئے تھے۔ کیونکہ گلناز نے اس کے سر پر تکیہ مارا تھا۔ وہ ایک دم خاموش ہوگئی تھی۔

''مجھے دس سال ہوگئے ہیں اکیلے آتے جاتے مجھے رات، دن، دوپہر، سویر کچھ نہیں کہتی اور اب میرا سر نہ کھانا پہلے ہی بھیجا الٹا کر آئی ہوں۔'' گلناز نے سر منہ لپیٹا اور چادر میں چہرہ غروب کرلیا۔ ثنا اپنا سا منہ لے کر دیکھتی رہ گئی تھی۔

اگلی صبح بھی وہ گلناز کے رویے کو سوچتی رہی۔ اور ساتھ گلناز کے اٹھنے کا انتظار بھی کرتی رہی تاکہ ایک ساتھ یونیورسٹی جاسکیں مگر گلناز نے اٹھنا تھا نہ اٹھی۔

''تین راتوں کے رتجگے کا کمال ہے۔ یہ نہیں اٹھنے والی بہن! تم نے دو چار لفظ پڑھنے ہیں تو اکیلی چلی جاؤ اس کا انتظار نہیں کرو۔'' اسے گومگو کی کیفیت میں بیٹھا دیکھ کر کرن نے آنکھ دبا کر کہا۔

کرن کے الفاظ پر وہ ہکا بکا سا منہ کھولے دیکھتی رہ گئی۔

''ابھی تو حیران ہو۔ کچھ دن بعد عادی ہو جاؤ گی۔ یہاں یہ سب چلتا رہتا ہے۔ کچھ چھپا کے چلاتے ہیں اور کچھ گلناز جیسے ڈھول بجا کر۔''

اب کے نائلہ نے قہقہہ لگایا اور اپنی تیاری کرنے چل دی۔

جبکہ ثنا سے اس دن یونیورسٹی کی طرف جاتے فٹ پاتھ پر چلنا محال ہوگیا تھا۔ یہ باتیں اس کے ذہن کی سلیٹ سے چپک گئی تھیں۔ وہ جتنا سوچتی اتنا الجھتی اور سوچ، سوچ کے تھکنے لگتی۔

کچھ دن گزرے وہ پڑھائی کی مصروفیت میں کھو گئی۔ وہ یہاں انگریزی ادب میں ایم اے کرنے آئی تھی۔ یہ اس کا پہلا خواب تھا وہ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے کوشاں تھی مگر اس کے راستے میں کتنے بریکر آنے والے تھے اس بات کا ثنا کو اندازہ نہیں تھا۔

یہ چند دن بعد کی بات تھی وہ اکثر گلناز کو رات، رات بھر جاگ کے فون پر مصروف دیکھا کرتی۔ رات بھر سرگوشیوں میں گفتگو کرنے کے باوجود وہ صبح یونیورسٹی کے لیے تیار ہو جاتی۔ یہ بھی ثنا کے لیے معما ہی تھا۔

ایک ثنا تھی کہ نصاب کی کتاب پڑھتے، پڑھتے ہی نیند میں لڑھک جاتی۔ اکثر کتاب کے اوپر اس کا سر گرا ہوتا اور نیند اسے ہر چیز سے بے پروا کر دیتی۔ اسے کچھ ایسی ہی بے فکری کی نیند میسر تھی۔

☆☆☆

اس رات ہوا کچھ یوں کہ اچانک رات کے دوسرے پہر ثنا کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے برابر گدے پر گلناز کی موجودگی کا احساس کیا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نہ جانے کون سا احساس تھا جو اس کی نیند بار، بار ڈسٹرب کر دیتا تھا۔ اسے گلناز کی آواز معمول سے کچھ ہٹ کے لگی۔ شاید وہ کسی سے فون پر الجھ رہی تھی۔

''تصویر پر ہی گزارہ کرو کہہ تو رہی ہوں مجھے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس کی آواز میں واضح جھلاہٹ تھی۔

''دیکھو تیمور! سمجھنے کی کوشش کرو۔''

اس نے دوسری طرف کیے جانے والے اصرار پر جھلا کر کہا۔

''نہ مل سکتی ہوں۔ نہ وڈیو کال کر سکتی ہوں، بتایا تو ہے میرے پاس انڈرائڈ فون ہی نہیں۔'' اس نے کمال صفائی کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ ثنا کی آنکھیں حیرانی سے کھل گئیں۔

''اتنا سفید جھوٹ.....؟''

''نہیں یار! میں تم سے لے بھی نہیں سکتی' اچھا سنو، میرا پیپر ختم ہو رہا ہے۔ دو سو کا بیلنس شیئر کر دینا اور ہاں وارڈن راؤنڈ پر ہے سو کل بات کروں گی اچھا بابا! ثنا کی جان! کل کروں گی بات۔'' اب وہ خوب مسکے لگا کے کال بند کر رہی تھی۔ ثنا کی تو اپنے نام پر ساری نیند ہوا ہو گئی۔

کیا گلناز نے مغالطے سے اس کا نام لیا؟

وہ شدید ہراساں سی ہو کر سوچنے لگی۔

پھر اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے گلناز کا کندھا ہلا کر پوچھ لیا۔

''سنو! تم نے میرا نام لیا ہے ابھی کیا؟''

گلناز اچانک چونک گئی تھی اور پھر ذرا اور چوکنا ہوئی۔

''یہ ابھی جاگ رہی ہے کیا؟'' اس کے کان کھڑے ہوئے تھے اور خطرہ بالکل قریب محسوس ہوا۔

''کیا اس دنیا میں صرف ایک تم ہی ثنا ہو؟''

گلناز کا انداز واضح چبھتا ہوا تھا۔ وہ ذرا سر اسیمہ ہوئی اور اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا۔

''نہیں تو۔''

''پھر اپنے کام سے کام رکھو اور سکون سے سو جاؤ۔'' گلناز کا لہجہ کاٹ دار ہو گیا تھا۔ جبکہ ثنا کا دل بہت برا ہوا۔ پہلی دفعہ گلناز نے اس سے اتنی ترشی سے بات کی تھی۔ اس کے دل میں یہ بات ترازو ہو گئی تھی۔

چھوٹی سی ناسمجھ سیدھی سادی ثنا کو خبر نہیں تھی کہ آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا تھا۔ وہ جن خوابوں کے خوب صورت رنگ آنکھوں میں سجا کر آئی تھی، ان خواب زدہ آنکھوں کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟

☆☆☆

خیابان صادق میں زرد سویرے

سڑک کی دونوں جانب درختوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ اونچے گھنے لمبے درختوں کے پیچھے دو منزلہ کوٹھیوں کا طویل سلسلہ تھا۔ ہر کوٹھی پرائیویٹ ہاسٹل کا منظر پیش کرتی تھی۔ یہ اچھا کاروبار کا سلسلہ تھا۔ ہر ہاسٹل میں بیس تیس لڑکیوں کا قیام تھا۔ ان ہاسٹلز میں اگر رولز تھے بھی تو کوئی فالو نہیں کرتا تھا۔ اور پابندیوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وارڈن سختی سے پیش آتی تو کوئی بھی لڑکی اپنا بوریا بستر اٹھا کر کسی اور ہاسٹل کا رخ کر لیتی۔ یوں پرائیویٹ ہاسٹل کمائی کے چکروں میں اپنا بزنس مندا کرنا نہیں چاہتے تھے اور لڑکیاں یونیورسٹی کے انٹرنل ہاسٹلز کی پابندیاں نہیں سہتی تھیں۔ سو اس وقت پرائیویٹ ہاسٹل کی خوب چاندی تھی۔

یہاں ''تعبیر'' کے نام سے جو ہاسٹل ثنا کی رہائش گاہ تھا، کم و بیش یہاں کا ماحول بھی ویسا ہی تھا۔ وارڈن آتی تھی چلاتی، اٹھلاتی اور پھر سے مطلع صاف..... یوں لگتا وہ بھی بس فارمیلٹی نبھانے آتی ہے۔

ہاسٹل کی لڑکیاں اپنی صوابدید پر آزاد تھیں۔ والدین انہیں پرائیویٹ ہاسٹل کے عفریت کدے میں آزاد چھوڑ کر اسی خمار میں ہوتے تھے کہ ان کی بیٹیاں پڑھ لکھ کر بڑی آدمی بن جائیں گی۔ ہاں ان میں ثنا جیسی لڑکیوں کی تعداد مٹھی بھر ضرور تھی۔ جو کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ اور جو وقتی عیاشی کو بھی گناہ کبیرہ سمجھتی ہیں۔

اس ہاسٹل کا ماحول بھی باقی نجی ہاسٹلز جیسا تھا۔ جس کا جب دل چاہا منہ اٹھایا اور نکل گیا، جب دل چاہا منہ اٹھایا اور واپس آ گیا۔ نائلہ، کرن، ثمرہ، گلناز ان سب کے معمولات بھی ایک جیسے تھے۔

حیرانی تو اسے تب ہوئی جب اس نے اچھی بھلی لڑکیوں کو ایک، ایک برگر کے لیے فاسٹ فوڈ پوائنٹ کے رائڈرز اور سروس بوائز سے گپ شپ میں مصروف دیکھا۔ یہ اس کے لیے حقیقتاً دھچکا تھا۔

ایک دن ہوا کچھ یوں..... نائلہ نے تین برگرز آرڈر کیے اور پے منٹ کیے بغیر اوپر آ گئی۔

اتفاقاً یہ منظر ثنا نے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسی وقت

یونیورسٹی سے واپس آئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سروس بوائے کو فلائنگ بوسہ دیتے اور نائلہ کو وصول کرتے بھی دیکھ لیا۔ یہ اس کے لیے شدید دھچکا تھا کیونکہ وہ نائلہ کے اس دوست کے بارے میں جانتی تھی جس سے نائلہ کو محبت کا دعویٰ تھا۔

''اگر نائلہ کو محبت وسیم سے تھی تو یہ سب کیا تھا؟'' ثنا حقیقتاً ڈسٹرب ہوئی تھی۔ یہ جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی اس کے لیے ہر گزرتے دن کے ساتھ ذہنی اذیت کا باعث تھا۔ جب اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے نائلہ سے پوچھ لیا۔

''یہ جو نیچے ہو رہا تھا یہ کیا تھا؟''

''ابھی تم بہت بھولی اور معصوم ہو، جب تمہیں ہوا لگے گی تو پھر کچھ برا نہیں لگے گا۔ سوچ چاپ دیکھ کے تجربے حاصل کرتی رہو کیونکہ جلد یا بدیر تمہیں اس سب کی ضرورت محسوس ہو جائے گی۔ اب دیکھو ناں کون پورا ہفتہ ہاسٹل کا بوگس کھانا کھائے۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے فاسٹ فوڈ یا چٹ پٹا کھانے کو دل کرتا ہے۔ ہم ٹھہرے اسٹوڈنٹس گھر سے اتنا ہی خرچہ ملتا ہے جتنا رو پیٹ کے مہینہ گزر جائے۔ یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔'' آخر میں اس نے ایک آنکھ میچ کر برا سا اشارہ کیا تو ثنا بیچاری شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

''اللہ نہ کرے مجھ پر ایسا وقت آئے۔'' اس نے جھرجھری لے کر کہا۔

''کبھی ہم نے بھی یہی کہا تھا مگر کہاں اُسے وقت کی ضرورت کہتے ہیں۔'' نائلہ اسے استہزائیہ دیکھنے لگی۔ وہ اس کا صاف مذاق اُڑاتے کہہ رہی تھی۔ ثنا کا دل بہت برا ہوا۔

''صرف زبان کے چسکے کی خاطر؟'' اس کی زبان سے بے ساختہ پھسل گیا۔

''اور بھی بہت ساری ضرورتیں ہوتی ہیں ابھی تم نہیں سمجھو گی۔'' نائلہ نے اس سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''ابھی یہ یونیورسٹی کے باہر کی کہانی ہے، یونیورسٹی کے اندر کیا ہوتا ہے۔ بہت جلد تم پر وہ بھی کھل جائے گا۔'' نائلہ نے قہقہہ لگایا۔

''اس حمام میں کوئی بھی صاحب پوشاک نہیں۔''

''مگر تم تو.....''

''چھوڑو اگر مگر اپنا کام کرو اور دوسروں کے بارے میں کم ہی سوچا کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔'' نائلہ نے معنی خیزی سے کہا تھا۔

''آؤ تمہیں برگر کھلاتی ہوں۔'' اس کی آفر پر ثنا نے خوف زدہ انداز میں فوراً انکار کیا۔

''نہیں تم کو ہی مبارک۔''

''ڈرو مت زہر نہیں ہے اس میں۔ تمہارے لیے حلال ہی ہوگا کون سا تم نے فراڈ سے حاصل کیا ہے۔'' اب وہ دانت نکال کر ہنس رہی تھی۔ ثنا کو ایک دم ہی پورے ماحول سے کراہیت محسوس ہونے لگی تھی اور وہ اٹھ کر بالکونی میں کتاب پکڑے چلی گئی۔ ان سب باتوں سے فرار کے لیے پڑھنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی میں Love road خیابان یرم بہت مشہور تھی۔ اکثریت وہاں کپلز کو دکھائی دیتی تھی۔ یونیورسٹی میں بلکہ رورل ایریا کی اس یونیورسٹی میں مرد و زن کی دوستی پروان چڑھتے دیکھنا ثنا کے لیے بڑا عجیب تجربہ تھا۔ اس نے یہ سب بھلوال کے کالج میں نہیں دیکھا تھا۔ یہاں ہر دوسری لڑکی کا ایک پوشیدہ دوست تھا۔ جو اس کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ ثنا کو گزرتے وقت کے ساتھ سمجھ آ گئی تھی کہ پوشیدہ دوست وقت کی ضرورت تھے۔ ان کے بغیر گلنار ٹائپ لڑکیوں کا شہر میں گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب گھر سے لگا بندھا بمشکل پڑھائی کا خرچ ملا کرتا ہو۔

ثنا کا یونیورسٹی میں کم اور پڑھائی میں زیادہ دل لگ گیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ اس کی زندگی میں دو برے شگون ہونے والے تھے۔

وہ سر عارف کا پیریڈ لے کر کلاس سے نکلی تو اس کا کلاس فیلو رمیز بھی غیر محسوس طریقے سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ ثنا کو فوراً احساس ہو گیا اور ساتھ ہی وہ عادتاً خوفزدہ بھی ہو گئی۔ یہ یونیورسٹی میں اس کے لیے بالکل نئی سچویشن تھی۔ کچھ ہی دیر بعد پیچھے آنے والا رمیز اس کے برابر چلنے لگا تھا۔ ثنا کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی تھی کہ اچانک اسے رکنا پڑا۔ رمیز بالکل اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اب ثنا آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ رکنا اس کی مجبوری تھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' وہ چاہ کر بھی اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ رمیز نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا۔

''بدتمیزی تو میں نے کی ہی نہیں اور کرنے کا ارادہ بھی نہیں۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔'' اس کا انداز صاف تمہیدی تھا۔ اب کے ثنا کچھ کہہ نہیں پائی۔

''کیا بات کرنی ہے اور یہ بات کرنے کا کیا طریقہ ہے؟''

''اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہے تو بتا دیں میرے ذہن میں تو اور کوئی آئیڈیا نہیں آ رہا تھا۔'' رمیز نے لاچاری سے کہا۔

''آپ نے کیا کہنا ہے؟'' ثنا کو اس سے جان چھڑوانے کا یہی حل سوجھا کہ جلدی سے مدعا ہی نپٹا لے ورنہ ایسے تو وہ ٹلنے والا نہیں لگ رہا تھا۔

''یہ آپ نے عقل مندانہ سوال کیا ہے؟'' اس نے خوب باچھیں کھلا لیں۔

''مجھے یہ کہنا تھا کہ میں کلاس کا سب سے شریف بچہ ہوں۔ کیا ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں؟ مجھے آپ بہت اچھی لگی ہیں۔'' رمیز کے منہ پھاڑ کر دوستانہ آفر کرنے پر ثنا کا پورا منہ کھل گیا تھا، اس نے سخت ناگواری سے رمیز کو دیکھا۔

''میں آپ کو ایسی ویسی لڑکی لگ رہی ہوں۔ آپ مجھے جانتے نہیں ہیں۔''

''بخدا مجھے غلط نہیں سمجھیں، میرا مقصد برا نہیں، دراصل یہاں ہر کسی کو کسی کا دوست بننا پڑتا ہے، میری تو کوئی بھی دوست نہیں ہے۔ مجھے آپ اپنے جیسی اکیلی لگی ہیں تو میں نے سوچا ہم دونوں یہاں دو سال گزار سکتے ہیں، اچھے دوست بن کے۔'' رمیز کو مدعا بیان کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا تھا کیونکہ ثنا کے چہرے پر پھیلے تاثرات خاصے ناگوار تھے۔

''آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے، مجھے دو سال یہاں گزارنے کے لیے آپ کی دوستی کی ضرورت نہیں ہے۔'' ثنا کے لہجے میں بہت ناگواری تھی۔

''اچھا!'' اس کا اچھا بڑا ہی معنی خیز تھا۔

''گلنار کی دوست ہو کے اتنی اتراہٹ؟ ایسی آفرز

جشن آزادی کی
زبردست تیاریاں
اگست کے شمارے
کی دلچسپ کہانیاں

مکے باز
زندگی میں ہار جیت کا کھیل جاری رہتا ہے..... کھیل اور زندگی دونوں میں ہار اس کا مقدر بن رہی تھی..... ایک مکے باز کی انہونی داستاں.....
طاہر جاوید مغل کے قلم سے

شعلہ زن
بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستان حیات.....
روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

الاؤ
صیاد اور اس کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی..... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے دلچسپ خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ
رنگ لاتا ہے شہیدوں کا لہو..... وطن دشمن اپنوں کی حیلہ سازیاں

دوسرا رنگ
اس شخص کی کتھا جسے اپنے گھر کی شدید خواہش تھی..... سرورق کی سچی کہانی

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

گلناز تو miss نہیں کرتی۔'' اس کے الفاظ ثنا کے تن بدن میں آگ لگا گئے تھا۔ اس کا کھویا ہوا اعتماد نہ جانے کہاں سے لوٹ آیا تھا اور وہ شدید اہانت سے چلا اٹھی تھی۔

''میں نہیں جانتی کہ گلناز کون ہے اور کیا ہے؟ مجھے صرف اپنا پتا ہے، میں ثنا بشیر ہوں، چودھری بشیر کی بیٹی۔ مجھے ایری غیری تھو خیری مت سمجھنا۔ تم سے دوستی کرتی ہے میری جوتی۔'' وہ غصے میں بھناتی تیز قدموں سے یونیورسٹی کی ''لوروڈ'' کو روندتی تقریباً بھاگتے ہوئے ..... ہاسٹل پہنچی تھی اور اپنے روم میں آ کر اپنے گدے پر ڈھے گئی۔ اس کا خون ابھی تک کھول رہا تھا جبکہ رمیز کے الفاظ اس کا فشارِ خون بڑھانے کے لیے کافی تھے۔

''گلناز کی دوست، گلناز کی دوست۔'' ان الفاظ کی بازگشت اس کے دماغ کی چولیں ہلا رہی تھی۔ اسے لگا اتنا برا طعنہ شاید ہی زندگی میں اس نے سنا ہو۔ دل و دماغ پر جیسے احساسِ توہین حاوی تھا۔ اسے لگا رمیز نے اس کی بے عزتی کی ہو۔

کیا چودھری بشیر کی بیٹی ایسی گئی گزری تھی کہ سڑک سے اٹھ کر کوئی بھی اسے دوستی کی آفر کر دیتا؟

اب غصے کی جگہ آنسوؤں نے لے لی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا اور وہ روتی چلی گئی۔ احساس تو تب ہوا جب گلناز نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

''اے بنو! کیوں روئے جا رہی ہے کسی نے کچھ کہہ تو نہیں دیا؟ بتا کس نے جرأت کی؟ گلناز کے... ہوتے تمہیں کوئی کچھ کہے؟ میں آگ نہ لگا دوں؟ چل بتا مجھے۔'' وہ اس کے گال پچکارتے غصے سے بول رہی تھی۔ ثنا ایک دم ہی سنبھل گئی۔

''کک کچھ نہیں ہوا۔'' اس نے ہکلا کر ٹالنا چاہا۔

''اب گلناز سے جھوٹ بولے گی بتا مجھے کیا ہوا ہے؟'' گلناز کے اصرار پر وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

''بتاتی ہے یا لگاؤں دو ہاتھ؟''

''وہ یونیورسٹی میں مجھے رمیز نے۔'' اس نے سر جھکا کر سارا قصہ سنا دیا جسے سن کر گلناز نے قہقہہ لگایا۔

''اتنی سی بات پر روئے چلی جا رہی ہو۔'' وہ ہنس، ہنس کر بے حال ہو گئی تھی۔

''یہ اتنی سی بات ہے؟'' ثنا کو شدید تعجب ہوا۔ اس کے آنسو تک رک گئے۔

''تو اور کیا۔'' گلناز نے اس کے گال پر چٹکی کاٹی۔

''وہ تمہارے لیے برے انداز میں بات کر رہا تھا۔''

''تو کرتا رہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''تم کو ذرا بھی پروا نہیں ہے؟'' تعجب سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

''نہیں ہے بالکل پروا نہیں ہے۔ پروا کرنے سے ہماری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں؟ پروا کرنے سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں؟ الٹا نکے، نکے کے لوگوں کی باتیں دل سے لگا کر اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔'' اس کا انداز بے پروا سم کا تھا۔

''مگر اس نے مجھے دوستی کی آفر کیوں کی؟ وہ مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہا تھا۔'' وہ پھر سے رو دینے کو ہو گئی تھی۔

''تو سمجھتا رہے۔ تم نے اسے جواب دے دیا ناں۔''

''ہاں! ٹکا کے جواب دیا ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پھر رونا کس بات کا ہے...؟ اب چپ کرو ایسی بہت ساری سچوئیشنز زندگی میں آئیں گی۔ کیا ہر دفعہ رونے بیٹھ جاؤ گی؟ خود کو مضبوط کرو رونے دھونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔'' اس کا انداز ناصحانہ تھا۔

''پر اس کی ایسی جرأت کیوں ہوئی منہ اٹھا کے میرے پیچھے آنے کی۔''

''اب نہیں ہوگی۔'' گلناز کا انداز جان چھڑوانے والا تھا۔ اس نے جو کہا اس کے بالکل برعکس ہی ہوا۔ اگلے دن رمیز پھر اس کے رستے میں کھڑا تھا۔ اس دفعہ اس کا دوست فرحت بھی اس کے ساتھ تھا۔ فرحت یونیورسٹی میں کافی مشہور تھا۔ نام لڑکیوں والا مگر گڈ لکنگ اور ہینڈسم ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی کی ''کریم'' اس کے پیچھے رہتی تھی۔ فرحت کے بارے میں تو گلناز بھی کریزی تھی۔ اس نے فرحت کا نام غائبانہ سن رکھا تھا۔ پہلی مرتبہ اس نے رمیز کے ساتھ ہی فرحت کو دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کا وہ بہت ہی عجیب دن تھا۔ جب اس نے ایک لڑکے کو دماغ کی سرزنش کے باوجود بار،

بار دیکھا۔ وہ اس کے پاس سے دانستہ دو بار گزری تھی اور دونوں دفعہ اس نے فرحت کو بلاوجہ دیکھا اور پھر اس کے دل نے چاہا کہ فرحت کو پھر سے دیکھے۔ اسی کشمکش میں وہ اگلی دو کلاسیں بنک کر کے ہاسٹل چلی آئی تھی۔ ہاسٹل آنا بھی غیر شعوری کوشش تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کلاس کیوں چھوڑی؟

وہ فرحت کو دانستہ کیوں دیکھ رہی تھی؟ وہ فرحت کو دیکھنا کیوں چاہتی تھی؟

ہاسٹل میں آ کر بھی اس پر عجیب کیفیت طاری رہی۔ کھانے میں دھیان رہا اور نہ نماز میں یکسوئی۔ امی نے کال کی تو مختصر بات کر کے فون بند کر دیا۔ دل کا حال عجیب تھا اتنا عجیب کہ اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ باہر خیابانِ صادق پر شام اتر رہی تھی۔ درختوں پر ویرانی تھی۔ جیسے بے آباد اور خاموش ہوں پرندے غول کی شکل میں آسمان پر بھٹک رہے تھے۔ جیسے بے ٹھکانا ہوں۔ بادلوں کا بھی کوئی گھر نہیں تھا۔ خانہ بدوشوں کی طرح اڑ رہے تھے۔

ہاں! یہ سب اس کی اندرونی کیفیات تھیں حالانکہ فطرت کے نظام میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔

اس کا دل عجیب اداسی کی لپیٹ میں تھا۔ یہ شہرِ دل کی گلیوں میں اتنی خاموشی کیوں تھی؟ یہ شہرِ دل کی گلیوں میں اتنی ویرانی کیوں تھی؟ یہ شہرِ دل کی گلیوں میں اتنا سناٹا کیوں تھا؟ مگر پھر بھی اس سناٹے میں دل کی ان کی گلیوں سے کون گزر رہا تھا؟

اس کا دل سکڑ، سکڑ کر چلنے لگا، رک، رک کر پگھلنے لگا، پگھل، پگھل کر موم کی طرح گرنے لگا پھر موم سا دل کسی اور ہیئت میں کسی اور شکل میں کسی اور سانچے میں ڈھل گیا اس کا دل پورے کا پورا بدل گیا۔

اور ثنا بشیر چودھری جیسے اپنے آپ میں نہ رہی وہ کسی اور کے روپ رنگ میں ڈھل گئی۔ فرحت کے ہونے کا احساس اس کی جان کے لیے فرحتِ جاں بن رہا تھا۔ روح کو سرشار کرنے والا اس کو سوچنا اتنا سکون دے رہا تھا کہ وہ پوری رات اسے سوچتی رہی۔ کبھی جاگتی آنکھوں کے ساتھ، کبھی سوتی آنکھوں کے ساتھ، اسے سوچنا زندگی کا سب سے خوب صورت احساس تھا۔ اسے آج کی رات سے زیادہ حسین کوئی رات نہیں لگی تھی، اسے لگتا تھا کہ فرحت کا چہرہ کسی جھلی کے مانند اس کی آنکھوں میں جم گیا ہے۔ وہ اسے بن دیکھے بھی پہچان سکتی ہے۔ اس کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کر سکتی ہے، وہ اسے اپنے دل کے بہت قریب پا سکتی ہے، جہاں وہ اسے اپنے تخیل میں چھو بھی سکتی ہے۔

یہ اس کے دل پر کیسے موسم اتر رہے تھے؟

خیابانِ صادق کی زرد سویر اچانک گلابی خوش رنگ شاموں میں بدل گئی تھیں۔ خیابانِ صادق پر محبت معصوم فرشتوں کے مانند اتر گئی تھی۔

☆☆☆

Love road یا خیابانِ پریم

ثنا کے لیے دل کے بدلتے موسموں کے ساتھ چلنا مشکل لگ رہا تھا۔ جہاں محبت کسی اٹل حقیقت کی طرح اس کے دل میں پنجے جما رہی تھی۔ وہیں محبوب ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے سے فاصلے پر محسوس ہوتا ... جہاں پوری یونیورسٹی کی کریم فرحت کے آس پاس منڈلاتی، وہاں ثنا جیسی لڑکی کی کیا اہمیت تھی۔ ایک بڑی ٹینٹ نما چادر میں لپٹی لڑکی بھلا فرحت جیسے لڑکے کو اٹریکٹ کر سکتی تھی؟ جب اس کے آس پاس ایک سے بڑھ کر ایک طرح دار لڑکی تھی تو پھر اسے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی معمولی سی ثنا میں کون سی کشش محسوس ہو سکتی تھی۔ اسے تو خبر بھی نہیں ہو گی کہ کسی چھوٹے سے دیہات کی سادہ سی لڑکی کے دل نے اس سے کس طرح دغا کر دی۔ وہ کیسے ثنا کے پہلو سے پھسل کر فرحت کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ وہ اسے کیسے بتائے کہ ثنا کا اپنا دل دغا باز ہو گیا۔

اب اسے یونیورسٹی کی طویل روڈ پر چلنا بہت سہانا، بڑا سہانا بلکہ شدید سہانا لگتا تھا۔ گھنے درختوں کی چھایا تلے چپکے، چپکے اسے سوچنا اور کبھی جو وہ دوستوں کے جلو میں سامنے نظر آ جاتا تب ثنا کی حالت غیر ہو جاتی۔ وہ دانستہ راہ بدل لیتی یا نگاہ چرا لیتی۔ اسے دیکھنا تو دور اس کے پاس سے گزرنا بھی محال لگتا۔ محبت کے اس بار کو اٹھائے، اٹھائے وہ ہلکان ہو رہی تھی۔ اس کا

راز دار کوئی نہیں تھا اور وہ اس راز کو دل کے نہاں خانوں میں چھپائے ہوئے تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی محبت کا راز کسی اور تک جائے۔ اس نے گلناز کو بھی شریکِ راز نہیں کیا تھا۔ وہ فرحت سے اپنی یک طرفہ محبت کو مقدس امانت کی طرح چھپائے ہوئے تھی۔ وہ اسے کبھی کبھی نظر آجاتا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی فرحت اسے اکثر نظر آتا رہے۔ یہ دل کی خواہش تھی اور دلِ نادان تو بڑی، بڑی خواہشیں کرتا رہتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کی دلچسپی کا مرکز صرف فرحت تھا۔ فرحت کی مصروفیات، اس کی مقبولیت اور اس کے دوست، ہاں اس کے لیے فرحت سے منسلک ہر چیز اہم ہوتی جارہی تھی۔

جہاں کہیں اس دشمنِ جاں کا ذکر ہوتا وہ دانستہ رک جاتی۔ بڑے شوق اور دلچسپی سے سنتی۔ اس کے بارے میں جو بھی اچھا برا کہا جاتا ثنا کے لیے اہم تھا۔

جتنا فرحت مشہور تھا، اتنی اس کی دشمنیاں بھی مشہور تھیں۔ اس کے بہت سارے پھڈے تھے۔ آئے دن اس کا کوئی نہ کوئی پنگا چل رہا ہوتا تھا۔ در پردہ ثنا اس کے لیے بہت دعائیں کرتی تھی۔ وہ اس کی دعاؤں کا مرکز بن گیا تھا۔

اس دن کلاس لے کر جیسے ہی وہ باہر آئی مطلع ابر آلود ہو گیا۔ کینٹین سے ایک سموسہ اور چائے کا کپ پکڑتے ہی بارش شروع ہوئی تو پھر رکی نہیں۔ وہ ایک سایہ دار بینچ کا انتخاب کر کے سکون سے بیٹھی ہی تھی، جب نہ جانے رمیز کا آنا پہلی مرتبہ اسے برا نہیں لگا تھا۔ اس نے فرحت کو رمیز کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس حوالے سے رمیز اب اسے برا نہیں لگنے والا تھا پھر وہ فرحت کا دوست بھی تھا۔ ثنا پہلے کی طرح اسے دیکھ کر سیخ پا نہیں ہوئی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟ لگتا ہے دل لگا لیا؟''

رمیز کے اچانک الفاظ پر وہ ایک دم سہم گئی تھی۔ یہ دل لگانے والی بات رمیز کو کیسے پتا چلی؟ ثنا کا خوفزدہ ہونا بنتا تھا؟ اس راز کو تو اس نے اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھا تھا پھر رمیز کو کیسے پتا چلا؟ ابھی وہ اسی ادھیڑبن .... میں تھی کہ رمیز پھر سے بولنے لگا۔

''کوئی مسئلہ یا پریشانی ہو تو بتانا مجھے، تمہارے کام آکے اچھا لگے گا، کوئی تمہیں پریشان کرے تب بھی ہم حاضر ہیں۔ ہمارے گروپ سے سب ڈرتے ہیں۔ وہ میانوالی کا شہزادہ فرحت ہے ناں، جان نکلتی ہے سالوں کی اس کے نام سے۔'' رمیز کا انداز بڑا اپنی... بگھارنے والا تھا۔ پھر بھی ثنا کو برا نہیں لگا۔ فرحت کے نام پر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ یہ اور بات کہ اس نے اپنے تاثرات پر قابو پالیا تھا۔

''مجھے تمہارے کام آکے اچھا لگے گا ویسے بھی دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر دوستانہ حق جتا رہا تھا۔ اس دفعہ ثنا نے اس پر غصہ نہیں کیا۔

''اور ہاں، یہ سر عارف بڑے خراب ہیں۔ اگر بہانے سے اپنے دفتر بلائیں تو مت جانا۔'' وہ اچھے دوستوں کی طرح اسے خبردار بھی کر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے رمیز قدرے معقول ہی لگا۔

''مجھے خود بھی سر عارف پسند نہیں ہیں بغیر وجہ کے کلاس میں کھڑا کر دیتے ہیں۔'' ثنا نے لب کشائی کی تو رمیز کو سر عارف کی نیت پر گفتگو کا مزید موقع مل گیا۔

''ارے! بڑے بدنیت ہیں۔ یونیورسٹی کی آدھی لڑکیوں سے فلرٹ کر چکے ہیں مگر ابھی تک پکڑے نہیں گئے، نہ ان کے خلاف کوئی ثبوت ہے۔ تم ان سے بچ کے رہنا۔ خاصے بدنام زمانہ پروفیسر ہیں۔'' رمیز کو جتنی برائیاں یاد تھیں اس نے فر فر اگلوا دیں۔

''میں نے نوٹ کیا ہے وہ جان بوجھ کے مجھے کلاس کے سامنے ٹارچر کرتے ہیں۔'' وہ اپنا مسئلہ بیان کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

''یہی تو ان کا طریقۂ واردات ہے بس تم پریشان نہ ہونا مجھے بتانا اگر انہوں نے تمہیں دانہ ڈالنے کی کوشش کی تو مزہ چکھا دیں گے انہیں۔'' رمیز کا انداز سخت جوشیلا تھا، جیسے سر عارف کو کچا چبا جانے کا ارادہ ہو۔

''میری اور کلاس فیلوز بھی سر عارف سے نالاں ہیں۔''

''ارے کوئی بھی شریف لڑکی ایسے ٹھرکی کو پسند نہیں کرتی، یہ تو گلناز ٹائپ لڑکیوں نے ان کی بڑھاپے میں چاندی کر رکھی ہے۔'' رمیز نے بری سی گالی دے کر کہا تھا۔

''مجھے بلاوجہ ٹیسٹ میں کم مارکس دے کر کلاس کے

سامنے کھڑا کیا اور بے عزتی کر دی۔'' ثنا کو بھی اپنے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیاں یاد آنے لگی تھیں۔

''بس ان کے یہی کرتوت ہیں بٹ ڈونٹ وری۔'' وہ اسے تسلی دیتا چلا گیا تب ہی گلناز تھی آدھمکی تھی۔

''یہ رمیز بڑے پھیرے لگاتا ہے تمہارے آس پاس؟ خیر تو ہے؟ پسند تو نہیں آ گئیں تم؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ بری طرح جھینپ گئی تھی۔

''تو پھر کیسی بات ہے بتاؤ۔'' اسے خواہ مخواہ ... گدگدی ہونے لگی۔

''غلط خیال نہیں کرو، وہ ہمدردی میں آیا تھا سر عارف نے جو مجھے کلاس میں کھڑا کیا تھا تو اس بابت پوچھنے۔'' اس نے کچھ دیر بعد اسے تفصیل بتائی تو گلناز کا منہ بن گیا۔

''یہ سر عارف تو وبالِ جان ہیں۔'' گلناز بھی سر عارف سے تنگ نظر آتی تھی۔

''خیر یہ رمیز لوگوں کا گروپ یونیورسٹی کی کریم سمجھی جاتی ہے۔ اگر وہ خود چل کے تمہارے پاس آیا ہے ناں تو اس کی دوستی کو مت ٹھکراؤ۔'' کچھ دیر تک گلناز اسے سمجھاتی رہی تھی اور رمیز اور فرحت کی مالی حیثیت کا بھی بتا رہی تھی۔ اس نے بے دلی سے ساری تفصیل سنی۔ اسے کسی کی گاڑی، پیسے سے کیا لینا دینا تھا۔

''بیوقوفی نہیں کرو رمیز کے گروپ سے دوستی کرنا ایک اعزاز سمجھا جاتا ہے۔'' گلناز نے اسے پھر سے اکسایا تھا۔

''مگر مجھے دوستی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم ہو ناں میری دوست، میں زیادہ دوست نہیں بناتی۔'' اس نے بے بسی سے گلناز کے راگ سنے۔

''مجھ میں اور رمیز میں بہت فرق ہے، تمہیں سمجھ آجائے گی، یہ اپر وچ والے لوگ ہیں سب ہی ان کے ساتھ بنا کر رکھتے ہیں۔'' اس کا انداز ناصحانہ تھا۔

''اور جو فرحت ہے ناں اس کی تو کیا ہی بات ہے۔ لڑکیاں اس سے بات کرنے کو ترستی ہیں۔'' گلناز نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ فرحت کے نام پر ثنا کے اندر سرشاری سی بھر گئی تھی۔ ایک ایسا احساس جس نے اس کے چہرے پہ کومل تاثرات پھیلا دیے تھے۔ اس کا چہرہ ایک ایسی کھلی کتاب تھا جسے ہر کوئی بہ آسانی پڑھ سکتا تھا سو گلناز جیسی ہوشیار لڑکی نے اس تبدیلی کو فوراً محسوس کر لیا تھا۔

''مجھے تو کہانی کچھ اور ہی لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے ہماری بنو نے شہزادے کو دل تو نہیں دے دیا؟'' اس کا انداز چھیڑنے والا تھا، ثنا جھینپ کر رہ گئی تھی۔

''ایسا نہیں ہے۔'' اس کا سر جھک گیا تھا۔

''اپنوں سے پردہ داری۔'' گلناز کھلکھلائی تھی۔ ثنا سے کوئی بات نہ بن پڑی۔

''فرحت کی بڑی ٹاپ کلاس لڑکیوں سے دوستی ہے۔'' اب شاید وہ اسے فرحت کا اسٹینڈرڈ بتا رہی تھی۔ ثنا نے بے بس نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ گلناز اسے فرحت اور اس کے بیچ فرق بتائے، یہ سب باتیں اسے خود بھی پتا تھیں۔

''مگر تمہارے جیسی لڑکی بھی کوئی عام نہیں شکل صورت کردار میں اعلیٰ۔'' اس کا انداز تعریفی تھا جیسے ثنا کو ڈھارس دینا چاہ رہی ہو کہ وہ دل چھوٹا نہ کرے۔ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں سے دوستیاں کر ہی لیتے ہیں۔

''مجھے امید ہے وہ تم سے دوستی ضرور کرے گا۔''

''مگر مجھے اس سے دوستی نہیں کرنی۔'' اس نے سر جھکا لیا تھا۔

''تو پھر؟''

''پھر کچھ نہیں۔'' وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی اور جانے لگی۔ گلناز نے اس کا بے ساختہ ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اسے بادل ناخواستہ رکنا پڑا۔

''کیا اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' گلناز منہ پھٹ تو تھی مگر اتنی منہ پھٹ ہوگی اسے اندازہ نہیں تھا۔

''بولو ناں بنو'' اوپر سے اس کا اصرار.....

''ارے..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ بہت بے ساختہ بولی تھی۔

''تو پھر یہ یک طرفہ محبت؟ تم کو کیا فائدہ دے گی؟'' گلناز کا انداز چبھتا ہوا تھا۔

''ہر چیز میں نفع نقصان نہیں دیکھتے۔'' ثنا نے اپنی

بات مکمل کی اور تیز قدموں سے ہاسٹل کی طرف بڑھ گئی۔ بارش رک چکی تھی۔ مطلع صاف تھا مگر نہ جانے کیوں یونیورسٹی کی اس Love road پر چلتے ہوئے اس کے اندر کن من پھوار برستی رہی۔ شاید یک طرفہ محبت پر یہ بے موسمی بارشیں ایک معمول کی طرح برستی رہتی تھیں۔

☆☆☆

اس دفعہ وہ معمول سے ہٹ کر قریب ایک مہینے بعد گھر گئی تھی۔ امی نے چھوٹے بھائی خرم کو لینے بھیجا تھا۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی اسے گھر سے لینے آتا تھا جبکہ ہاسٹل کی لڑکیاں خود ہی آتی جاتی تھیں۔ اس نے امی سے شکوہ کیا۔

''آپ کب تک مجھے بچہ سمجھتی رہیں گی؟ آپ نے مجھے بڑا ہونے نہیں دینا، سارے ہاسٹل کی لڑکیاں اکیلے آتی جاتی ہیں۔ اتنا تو مشکل نہیں آنا جانا۔''

''مشکل ہے ناں میری دھی! اکیلے کیوں آنے جانے دیں؟ کیا تیرے سر پر باپ بھائی نہیں ہیں؟ آج اکیلی آئی تو کل عادت ہو جائے گی۔ ایک بھاکا تو ہے اتر جائے تو دید لحاظ نہیں رہتا۔ ویسے بھی تیرے ابو کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔'' امی نے اس کے جواز ختم کر دیے تھے، شاید وہ بھی اپنی ہاسٹل فیلوز کی طرح دلیر ہونا چاہتی تھی، اکیلے سفر کرنا چاہتی تھی۔ مگر امی نے اس کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اسے خبر تھی کہ لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کی کتنی مشکل سے اجازت ملی تھی۔ وہ اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔

اس دفعہ گھر آ کر طبیعت بوجھل ہی رہی تھی۔ ابو کی وہی معمول کی لڑائیاں، امی سے جھگڑا اور چھوٹے بہن بھائیوں پر غصہ۔

''پتا نہیں امی نے ساری زندگی ابو جیسے انسان کے ساتھ کیسے ضائع کر دی؟'' ان دنوں اسے اپنی ماں کی زندگی کے یوں رائگاں ہونے پر دکھ ہوتا تھا۔ اس کی ماں اپنے وقتوں کی میٹرک پاس جبکہ ابو چٹے ان پڑھ تھے۔ یہ امی کا شوق تھا جو اسے یونیورسٹی تک لے گیا تھا ورنہ ابو کے بس میں ہوتا تو اسے پرائمری سے ہی اٹھوا لیتے۔ اس سے چھوٹی حنا بھی تھرڈ ائیر میں تھی جبکہ بھائی خرم ابھی دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ امی کو اپنی مختصر اولاد کو پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اس شوق کی راہ میں ابو بھی حائل نہیں ہو سکے تھے۔ امی نہ جانے کیسے اتنی بہادر ہو گئی تھیں کہ ابو کے سامنے تن گئیں۔ انہوں نے ثنا کے مستقبل پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ جو علم کا رستہ امی کی کوششوں کے سبب اس کے لیے کھلا ہے۔ وہ حنا کے لیے بھی کھلا رہے گا۔ ابو امی اس سے ناخوش تھے۔ اسی طرح وہ ثنا سے بھی ناخوش تھے۔ ویسے بھی ابو کے لیے اولاد کا پیدا کرنا اہم تھا۔ ان کی تعلیم اور پرورش کیسے ہو گی یہ اہم نہیں تھا۔

ابو، امی کو لگا بندھا خرچ دیتے تھے۔ باقی اخراجات امی کی سلائی، دودھ، گھی بیچ کے پورے کرتیں۔ یہ نہیں تھا کہ ثنا کے والد کوئی غریب آدمی تھے، وہ علاقے کے اچھے خوشحال زمیندار تھے۔ ان کی فصل دور دور کے علاقوں میں بکنے جاتی تھی۔ ابو کا آڑھت کا کام بھی خوب چل رہا تھا۔ روپے پیسے کی تنگی نہیں تھی مگر وہ ان لوگوں میں سے تھے جو باہر تو نام بنانے کے لیے خوب خرچ کر آتے البتہ گھر میں بیوی بچوں کو دھیلا دیتے جان نکلتی ہے۔ اس صورتِ حال پر امی ہی کڑھتی جو اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مار کے گزارہ کر لیتی تھیں۔ ثنا کی فیس اور ہاسٹل کے بلز امی اپنی سلائی سے نکالتی تھیں۔ اسے امی کی محنت کا بہت احساس تھا۔

اگلے دن اس کی واپسی تھی۔ جمعے کی شب کو گھر آتی اور اتوار سہ پہر تک واپس چلی جاتی۔ اس کی واپسی کے دن ابو کا موڈ آف رہتا۔ دراصل ابو کو اس کی اکلوتی پھوپی بھڑکاتی رہتی تھی۔ پھوپی کا گھر برابر میں تھا وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ بیوگی کے بعد سے یہاں آباد تھیں۔ گھر ان کا ذاتی تھا اور زمین بھی ثنا کے ابو سے زیادہ تھی۔ ان کا بیٹا عادل بھی ماموں کی طرح خالص زمیندار تھا۔

پھوپی کا بس نہیں چلتا تھا کسی بھی طریقے سے ثنا کو گھر بٹھا لیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ثنا اتنا پڑھ لکھ جائے کہ ان کی پہنچ سے ہی دور ہو جائے۔ اس سہ پہر پھوپی ابو کو کسی دینے کے بہانے آ گئی تھیں، ثنا کو تیار دیکھا تو

ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''یہ تانا بانا کب تک چلے گا؟ یہ روز کا تماشا کب ختم ہوگا؟ بس اللہ بخشے اماں کے بعد فرزانہ اور اس کی اولاد شتر بے مہار ہوگئی ہے۔'' پھوپی کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا تھا۔ پھوپی کو دیکھ کر ابو کو بھی اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

''خود تو جیسے پڑھ لکھ کے افسر بن گئی ہے، ماں، اب بیٹی کو بھی افسر بنانا چاہتی ہے۔''

''یہ ساری تمہاری ڈھیل ہے بشیر! ورنہ فرزانہ کی اتنی جرأت نہیں تھی۔ چودہ جماعتیں پڑھ لی تھیں۔ چپکے سے ہاتھ پیلے کرتے اور اگلے گھر بھیجتے۔'' پھوپی نے نخوت سے کہا تھا۔

''میں نے اپنی زرقا کو دسویں سے اٹھا کر بیاہ دیا تھا آج اپنے گھر میں آباد ہے۔'' پھوپی خود کو عقلِ کل سمجھتی تھیں اور اپنے سامنے کسی کی نہ سنتیں۔

''میں مجبور ہوگیا تھا آپا! ورنہ ثنا کی تاریخ پکی کرتے دیر نہ کرتا۔'' ابو کو اپنی کمزوری پر غصہ آ گیا تھا کہ کیوں بیوی کی باتوں میں آ کر ثنا کو پڑھنے کی اجازت دی۔

''رہن دے میرا ویر! یہ سب منہ کی باتیں ہیں۔ ورنہ لڑکی کی کیا مجال تھی جو لڑکوں کے ساتھ پڑھنے جاتی۔ چار ہاتھ لگا کے بیاہ دینا تھا، میں تو زیور لتا تیار کیے بیٹھی تھی۔ میرے ارمانوں میں تم نے آگ لگا دی۔'' پھوپی کے ملال کم ہونے والے نہیں تھے، اِدھر ابو کی جان پر بن آئی تھی۔ کون تھا جو پھوپی کو ناراض کرنے کی جرأت کرتا۔

''دو سال کی بات ہے دل چھوٹا نہ کرو آپا! پڑھ لکھ جائے گی تو تمہارا ہی فائدہ ہے۔'' ابو کا انداز خوشامدانہ تھا۔ ساری زندگی ابو پھوپھی کی خوشامد کرتے رہے مگر پھوپی کی ناک سیدھی نہ ہوئی۔

''نہ میں نے گون سا نوکری کروانی ہے۔ ایک ہی تو میری نوں (بہو) ہوگی اسے نوکری کے چکر میں ڈال دوں، میرے پاس کون سا رزق کی کمی ہے۔'' پھوپی نے پُرجلال لہجے میں کہا تھا۔ پھوپی کی اور ابو کی تکرار نے ثنا کا دل بوجھل کر دیا تھا۔ اس سے کھڑا رہنا دشوار ہوگیا۔ دماغ میں سنسناہٹ بھر گئی تھی۔

غزل

نشان سارے ہی منزل کے اک نظر میں ہیں
وہ دیکھتی ہے جدھر کارواں سفر میں ہیں
کبھی وہ یاد جو آتے ہیں خوشبوؤں کی طرح
ہمیں تو لگتا ہے پھولوں کے ہم نگر میں ہیں
پناہ دیتا ہے بھٹکے ہوئے پرندوں کو
بڑی ہی وسعتیں دیکھی کسی شجر میں ہیں
انہیں بھی پیار ہے شاید پرانی چیزوں سے
کہ مدتوں سے پرندے اسی شجر میں ہیں
سکوں کے واسطے بھٹکے ہیں لوگ جانے کہاں
سکون جتنے میسر ہیں سارے گھر میں ہیں
وفا، خلوص، مروت سبھی ہیں گردش میں
محبتوں کے سبھی قافلے سفر میں ہیں
وہ الجھنیں جنہیں سلجھانا ہم نہیں چاہیں
انہیں تلاش کرو وہ اگر نگر میں ہیں
ہماری ناؤ جو ڈوبی تو ایسا لگنے لگا
سمندروں کی سبھی کشتیاں بھنور میں ہیں
وہ پا چکے ہیں کنول اپنی منزلِ مقصود
مجھے گمان کہ وہ میری رہگذر میں ہیں

از: یاسمین کنول، پسرور

اس کا مستقبل اسی گاؤں کی ایک گنوار عورت کی بہو بننا تھا؟ کیا وہ انگریزی ادب میں اس لیے ماسٹرز کر رہی تھی کہ صبح اٹھ کے چاٹیوں میں مدھانیاں ڈالے۔ سوکھے اپلوں سے آگ جلا کر بڑے، بڑے پتیلوں میں دودھ کاڑھے۔ ڈیرے پر کام کرتے مزدوروں کی روٹیاں تندور پر لگاتے لگاتے ختم ہو جاتی۔ پھوپی کی تین درجن مرغیوں کی سیوا کرتی یا وارے میں آئے مہمانوں کے لیے پکوان پکا، پکا کے ہلکان ہو جاتی۔ اس کا مستقبل ابو کے گھر کے برابر میں لکھا جا چکا تھا۔

وہ شدید اذیت میں تھی۔ اس کی ابتری شکل دیکھ کے امی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی تھی۔

''میرے ہوتے غم کیوں کھاتی ہے۔ میری بھلی دھی! میں یہ سب نہیں ہونے دوں گی۔'' امی کی تسلی پر اس کا کپکپاتا دل لمحوں میں پُرسکون ہو گیا تھا۔ اب

اسے ٹھہرانا نہیں تھا، کسی بات سے خوف نہیں کھانا تھا۔ امی اس کے ساتھ تھیں اسے پتا تھا امی اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے ہمت رکھتی ہیں۔

پھوپی کو اس کا تیار ہو کر شہر جانا بڑا اچھبتا تھا۔ ان کو پورا یقین تھا بڑے شہروں میں لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں۔ ''ایک دوسرے کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہیں۔

''لکھوا لو مجھ سے لڑکی ہاتھ سے نہ نکلی تو میرا نام بدل دینا۔'' ابو کے نکلتے ہی پھوپی امی کو کچوکے لگانے سے باز نہیں آئی تھیں۔

''کوئی چن چڑھا لے گی اور سارا زمانہ دیکھے گا۔''

پھوپی نے ہاتھ جھاڑے تھے۔ امی کو بڑا دھچکا لگا تھا، ایک طرف وہ اسے اپنی بہو یعنی اپنی عزت بنانا چاہتی تھیں اور دوسری طرف ان کے خیالات اتنے زہر آلود تھے۔

''آپا! خدا کا خوف کرو، ثنا میری ہی نہیں تمہاری بھی بیٹی ہے۔''

''ثنا مجھے ریشماں کی طرح عزیز ہے مگر مجھے اس زمانے کے چلن سے خوف آتا ہے۔'' پھوپی ایک دم ہی دھیمی پڑ گئی تھی۔

''اللہ میری بچی کی حفاظت کرے گا۔'' امی نے اپنے ساتھ ثنا کو بھی ڈھارس دی تھی مگر ان کے دل کو دھڑکا لگ گیا تھا۔ ثنا نے دیکھا امی بس میں بھی خاموش تھیں۔ سارا راستہ وہ گہری سوچ میں ڈوبی رہیں۔

ہاسٹل پہنچ کر ان کی گہری خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔

''ثنا! میری دھی! تم نے دیکھا ہے، میں کس عذاب سے دوچار ہوں۔ تم ہفتے بعد یہ سب سنتی ہو، میں روزانہ یہ سب کچھ برداشت کرتی ہوں۔ میں کچھ زیادہ نہیں کہوں گی۔ میری دھی! اپنے باپ کی پگ اور میرے سفید سر کا خیال رکھنا۔'' امی نے چادر کے پلو سے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھی اور اندھیری سڑک پر گم ہو گئیں۔ ثنا کا دل اور بھی بوجھل ہو گیا تھا۔ وہ تب تک وہاں کھڑی رہی جب تک امی ایک نقطے کی صورت اختیار کر کے نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی تھیں۔ نہ جانے وہ کب تک ایک مجسمے کی طرح کھڑی رہتی، اس کے بازو پر کسی نے اپنا دباؤ ڈالا تھا اس کے پیچھے گلناز نہ جانے کب کی کھڑی تھی اور کیا کچھ سن چکی تھی۔

''یہ ماؤں کے پرانے ہتھیار ہیں، ایسی باتیں دل پر نہیں لیتے، ایک کان سے سنتے ہیں دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ یہ 1970ء کے سبق آج کے دور میں نہیں چلنے کے بچھیں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔

''یہ ہماری سادی مائیں، ان کو عشق محبت کا کیا پتا؟ ساری زندگی چکی پیستی اور دیسی گھی بیچ کے روپوں کا حساب کرتے گزار دی۔ ساری عزتیں، غیرتیں، دستاریں ہمارے لیے ہیں، جائدادیں اپنے نکمے بیٹوں کو بانٹ دیتے ہیں۔'' نہ جانے گلناز کس پر تپی بیٹھی تھی اپنا سارا غصہ نکال دیا۔

''چل موڈ ٹھیک کر تجھے پزا کھلا کے لاتی ہوں۔'' اس نے ثنا کا زبردستی ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

''پر میں نہیں جاؤں گی مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔'' ثنا بے ساختہ گھبرا گئی تھی۔

''گولی مار اجازت کو، ہاسٹل میں آج پالک پکی ہے۔ یہ بھوسا میں تو نہیں کھانے والی۔ چل تجھے بھی عیش کرواتی ہوں۔'' گلناز نے اس کی ایک نہیں سنی اور زبردستی کھینچ کر باہر لے آئی۔ ثنا اس افتاد پر گھبرا گئی اور کچھ سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ گلناز نے ایک آٹو روک کر اس میں ثنا کو دھکیل دیا۔

وہ سنبھلی تو تب جب اس نے اپنے سامنے اس خوب صورت ریسٹورنٹ کو دیکھا۔ اس طرح کے ماحول میں وہ پہلی دفعہ آئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں ہوٹلنگ کا صرف نام ہی سنا تھا۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو''۔ ثنا کی آواز بھی حلق میں گھٹ گئی تھی۔

''انسان ہی ہیں یہاں جنات نہیں جو تمہیں چٹ جائیں گے۔ چھوٹی سی پارٹی ہے، فور اسٹار کی طرف سے، میں اور تم بھی انوائٹڈ تھے۔'' وہ اس کے کانوں میں پھونکتی اب جھلا گئی تھی۔

''موڈ ٹھیک کرو بے عزتی نہ کروانا میری ایسے لگ رہا ہے جیسے گن پوائنٹ پر اٹھا کر لائی ہوں۔'' گلناز نے تپ کر کہا۔

"تو کیا جھوٹ ہے؟"

"اس وقت میرا موڈ نہیں کچھ سننے کا تم ہاسٹل چل کے اپنا موڈ دکھا دینا۔" وہ اسے گھسیٹ کر اوپر لے آئی۔ وہاں اور بھی اس کے کلاس فیلوز تھے۔ یہ فرحت کی طرف سے پارٹی تھی مگر ثنا یہاں کیوں تھی؟ اس کو شدید کوفت اور غصہ آ رہا تھا، میز اسے دیکھ کر کھل اٹھا اور فرحت نے بھی ازلی خود پسندی سے نکل کر سب کو ویلکم کیا۔

وہ لوگ ایسی پارٹیز کے عادی تھے۔ حالانکہ ان میں زیادہ لڑکیاں لوئر مڈل کلاس اور مڈل کلاس سے تھیں۔ ثنا نے حیرانی سے دیکھا اس وقت وہ پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔ یونیورسٹی میں عبایا پہن کے جانے والی لڑکیاں اس وقت جینز اور شرٹس میں کسی ایلیٹ کلاس کا حصہ لگ رہی تھیں۔ ثنا کے لیے یہ بہروپ اس طرح کا دُہرا پن ناقابلِ فہم تھا۔

بہرحال اس پارٹی کے اختتام تک ثنا کی جھجک قدرے کم ہو گئی تھی چاہے جتنی بھی ناگواری وہ محسوس کر رہی تھی پھر بھی اس نے ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ اس پارٹی کے اختتام پر فرحت نے اس سے بہت خوشگوار انداز میں بات کی تھی۔ سب سے انوکھا اور حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ فرحت نے ثنا کے ہاتھ سے موبائل پکڑ کے اس میں اپنا نمبر فیڈ کر دیا تھا پھر اس نے اپنی قاتل مسکراہٹ کے ساتھ ثنا کا قتل عام کیا اور کہا۔

"میں آپ کی طرف سے رابطے کا منتظر رہوں گا۔" اسے نہیں خبر تھی کہ روئے زمین پر اسے خود سے زیادہ خوش قسمت کوئی دوسرا انسان لگ رہا تھا۔ اسے ہی خبر تھی کہ یہ چند الفاظ اس نے سنے کیسے تھے؟ اسے بس اتنا پتا تھا کہ وہ اپنی چھا جانے والی شخصیت کے ساتھ اس کے دل کو، خواہشات کو، مرضی کو اور سوچنے کی صلاحیتوں کو اپنی مٹھی میں دبا کر اسے ہمیشہ کے لیے فتح کر چکا تھا جبکہ ثنا اس کے سحر سے اگلے دو سال بھی آزاد نہیں ہو پائی تھی۔ وہ کوئی فاتح جنگجو تھا جو آیا اور اسے فتح کرتا چلا گیا۔

وہ کوئی جادوگر تھا جس نے اس پر سحر پھونکا اور اسے پتھر کی مورت بنا دیا۔ وہ کوئی شعبدہ گر تھا جس نے اپنے کرتب سے ثنا پر سکوت طاری کر دیا تھا۔

اگلے دو سال تک بھی وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ فرحت آخر کیا تھا؟

یہ ٹھیک چار روز بعد کی بات ہے۔ اس کے موبائل پر ایک ٹیکسٹ موصول ہوا تھا۔ اس نے.... بے خیالی میں دیکھ کر پڑھا اور قدرے چونک گئی۔

"پھر سے دید و شنید ہو جائے
دل سراپا امید ہو جائے
دور ہوتا گیا ہے وہ ہم سے
جیسے ماضی بعید ہو جائے
اس کی قسمت پہ رشک جو اپنی
جستجو میں شہید ہو جائے
تار بن کر تڑپ اٹھے ہستی
درد ایسا شدید ہو جائے
گر بڑھا دیں وہ ہاتھ بیعت کو
سخت کافر مرید ہو جائے"

اندازِ سخن میں اجنبیت نہیں تھی، یہ کون اس قدر... بے تکلف تھا سب سے بڑی بات کہ نمبر کس کے پاس چلا گیا؟ اس کا نمبر تو بہت ہی گنے چنے لوگوں کے پاس تھا۔

پہلا خیال اسے فرحت کا آیا۔ اس نے نام کے ساتھ سیو نہیں کیا تھا شاید۔ کیا فرحت نے اسے میسج کیا ہے؟ اس کی طرف سے رابطہ نہ کرنے کے بعد کیا وہ خود سے پہل کر رہا تھا؟ وہ اتنا مغرور شخص کیا پہل کر سکتا تھا؟

ثنا اس احساس کے تحت منجمد ہو رہی تھی۔ اس کا دل اس کے اختیار کی حدیں توڑ رہا تھا۔ اس نے لاکھ چاہا کہ جواب نہ دے مگر اس کی انگلیاں خود بخود ٹائپ کرنے لگیں۔

مگر اس کے جواب سے بھی پہلے پھر سے ایک میسج آیا تھا۔

"سوچتا ہوں جو کبھی حکم زیارت ہوگا
لاؤں گا کہاں سے تیرے معیار کی آنکھیں"

ثنا کے کچھ لکھتے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے رک گئے تھے۔

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ دوسری طرف فرحت کے سوا اور کوئی نہیں۔

"اللہ! میں ایسی بانصیب ہوں کہ فرحت مجھ

سے رابطہ کر رہا ہے؟ خود سے رابطہ بنا رہا ہے۔'' ثنا کی مارے خوشی کے آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اس پل اسے اپنی ماں کی سرزنش اور ساری نصیحتیں بھول گئیں۔ اسے اپنی ماں کی آنکھوں سے بہتی نمی بھی بھول گئی تھی۔ باپ کی دستار اور بھائی کی غیرت بھی بھول گئی۔

اس کے ہاتھ جیسے میسج لکھتے، لکھتے خوشبو سے لتھڑ گئے تھے۔ وہ لمحہ بھر میں سراپا خوشبو ہو گئی تھی۔

''اس حسنِ انتخاب کے قربان جایئے
تیرِ نگاہ یار کو آئے ہیں ہم پسند''

اس نے ٹیکسٹ لکھا اور سینڈ کر دیا اتنی سی مشقت میں اس کی ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں۔

''اللہ! یہ میں نے کیا کر دیا۔'' اب وہ گھبرا رہی تھی، پچھتا رہی تھی، بے چین تھی، مضطرب تھی۔ مگر تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔

وہ اس کھیل میں بالکل اناڑی تھی۔ اس کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا، وہ اسی ادھیڑ بُن میں تھی کہ اچانک موبائل کی اسکرین چمکنے لگی۔

''گلے خوش بوئے در حمام روزے
رسید از دست محبوبے بہ دستم''
(ایک دن حمام میں، ایک مہربان کے ہاتھ سے مجھ تک ایک خوشبودار مٹی پہنچی۔)

''بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دل آویز تو مستم''
(میں نے اس سے کہا کہ تو مشکی ہے یا عبیری (دونوں اعلیٰ خوشبو کی قسمیں ہیں) کہ تیری دل آویز خوشبو سے میں، میں مست ہوا جاتا ہوں۔)

''بگفتا من گلے ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم''
اس نے کہا میں تو ناچیز مٹی تھی لیکن ایک مدت تک گل کے ساتھ نشست رہی ہے۔

''جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم''
(ہمنشیں کے جمال نے مجھ پر بھی اثر کر دیا ہے وگرنہ میری ہستی تو محض خاک ہے۔)

اس کے بعد ثنا بے خود ہونے لگی تھی۔ اس کی لرزتی انگلیاں بے جان ہو گئی تھیں۔ شاید وہ کبھی کچھ لکھنے کی جسارت نہ کر سکتی۔ اس کی آنکھیں شدتِ محبت سے نم آلود ہو رہی تھیں۔

معاً موبائل کی اسکرین پھر سے روشن ہوئی۔

''اے پیاری لڑکی! میں اس خاموشی کو ناگواری سمجھوں؟''

اس کے بعد ثنا سے خاموش رہنا محال ہو گیا تھا، اس نے ساری دنیا سے چھپا کر چپکے سے ایک میسج لکھ دیا تھا۔

''مجھ ناچیز میں ایسا خاص کیا ہے؟''

''یہ پوچھیے کہ آپ میں کیا خاص نہیں ہے؟ آپ تو سراپا خاص، سراپا راز ہیں۔''

دوسری طرف سے ترنت ریپلائی آیا تھا۔ دھیرے، دھیرے اس کے لبوں پر نرم نرم سی مسکراہٹ آنے لگی تھی اور پھر اس مسکراہٹ نے مستقل اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے میسج پر کال کی اجازت لی تھی۔

''ٹائپنگ میرا مزاج نہیں ہے۔ کیا میں آپ کو کال کر سکتا ہوں؟''

''جی کر لیں۔'' ثنا کی کیا مجال تھی جو انکار کرتی۔

پھر وقت نے یہ بھی دیکھا کہ ثنا نے فرحت سے پوری رات کال پر بات کی۔ بات سے بات نکلتی گئی اور رات سے سویر ہو گئی۔

فرحت ایک مہذب اور سمجھدار لڑکا تھا۔ اس نے ثنا سے کوئی بے ہودہ بات نہیں کی، نہ ہی آج کل کے لڑکوں کی طرح وہ پچھڑا تھا، نہ اس کی کوئی فضول ڈیمانڈ تھی۔ وہ ثنا کو بہت ہی اچھا لگا۔ اس کے آئیڈیل کے پیمانے پر پورا اترنے والا۔ جتنا وہ خوب صورت تھا اتنی خوب صورت وہ باتیں بھی کرتا تھا۔ کاش کہ وہ اس کا نصیب بن جاتا۔

ثنا کو حیرانی تھی کہ فرحت نے اتنی بے شمار لڑکیوں میں صرف دوستی کے لیے اس کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ جبکہ ثنا سے زیادہ خوب صورت اور ماڈرن لڑکیاں موجود تھیں۔ شاید اس میں کوئی خاص بات تھی! اس احساس نے اسے سرتاپا سرشار کر دیا تھا۔

(باقی آئندہ)

ڈیرے کے ساون کے

طیبہ عنصر مغل

چاچو کی لاتوں سے دُہری ہوتی تو پھپھو کے تھپڑ میرے چہرے کو لال کر دیتے۔ اماں کا روکنا بھی کام نہ آیا دُھان پان سی اماں چند دھکوں میں ہی ایک طرف کو ڈھیر ہو گئی تھیں۔ ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی بے بسی کے آنسوؤں نے اُن کا چہرہ بھگو رکھا تھا۔ میں نیل ونیل چہرہ لیے شاید مر جاتی لیکن چاچو ہانپ گئے تو پھپھو کے ہاتھ درد کرنے لگے۔ اب کوسنوں سے کام لیا جا رہا تھا جبکہ میں گھٹنوں میں منہ چھپائے اپنے ناکردہ گناہ پر شرمندہ ہو رہی تھی۔

''اللہ کی مار ہو تم پہ مرحا! ہماری عزت نیلام کر ڈالی تم نے، ذرا بھی نہیں سوچا کسی نامحرم کے ساتھ یوں بھاگتے ہوئے وہ بھی اتنی ذلت کہ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی تم ہمارے سروں میں خاک ڈالنے نکل کھڑی ہوئیں.....! اس سے اچھا تھا تم مر جاتیں۔

''میں نے کوئی گناہ نہیں کیا پھپھو! نہ ہی میں کسی کے ساتھ بھاگی ہوں۔ یہ مجھ پر الزام لگایا ہے زین کی ماں نے۔'' میں الزامات کی بوچھاڑ پر بلبلائی۔

''بکواس بند کرو! تمہاری وجہ سے میرا بھائی کمرا بند کیے پڑا ہے۔'' چاچو دہاڑے۔

☆☆☆

میں نے نم آنکھوں سے امی کی طرف دیکھا جو بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھیں اور یہ کون سا پہلی بار تھا، بچپن سے دادی، پھپھو اور چاچو کے سامنے وہ ایسے ہی بے بس ہو جاتی تھیں اور کیوں نہ ہوتیں، ابو کی بے جا فرمانبرداری نے ان سب کو شیر کر رکھا تھا۔

میرا تعلیم یافتہ ہو جانا بھی ایک معجزہ ہی تھا، وہ بھی اس لیے کیونکہ چاچو کی رمشہ اور رملہ کو بھی پڑھنا تھا تو مجھے روکنے کا کیا جواز دیا جاتا اسی لیے ایف ایس سی میں نمایاں پوزیشن لینے کے باوجود مجھے ایم بی بی ایس میں ایڈمشن نہیں لینے دیا گیا وجہ پھر وہی کہ چاچو کی بیٹیاں سائنس نہیں لے سکی تھیں تو پھر مجھے ڈاکٹر کیوں بننے دیا جاتا بمشکل پھپھو نے نہ جانے کیا سوچ کر مجھے نرسنگ کے شعبے میں دھکیل دیا کیونکہ خود ان کی لاڈلی کم نمبروں کی وجہ سے نرسنگ ہی پڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

''اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ ہمارے خاندان میں کسی کی مرضی کی شادی ہوئی ہو تو پھر یہ مرحا کے کلاس فیلو کو جرأت کیسے ہوئی کہ وہ اپنے والدین کو اس مقصد کے لیے ہماری چوکھٹ تک لے آیا۔ مسعود احمد تمہاری لاڈلی کے لچھن اچھے نہیں یقیناً اسی نے آسرا کرا رکھا ہوگا۔'' پھپھو کی زبان زہر اگل رہی تھی اور وہ جو ابھی پسینہ دے کر گھر آئی تھی گرمی سے بے حال ایک لمحے کے لیے چکرا کر رہ گئی وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پانچویں کلاس تک مخلوط ادارے میں پڑھتے ہوئے کب سرمئی آنکھوں والا عمران اس کا شیدائی ہو گیا کہ اتنے انتظار کے بعد اتنے سالوں بعد اس کے گھر رشتہ بھی بھیج دیا۔

☆☆☆

''آپا محلہ ایک ہے، ہو سکتا ہے عمران کی ماں کو مرحا بھا گئی ہو اور.....!'' اماں نے ہلکی آواز میں احتجاج کیا۔

''نہ بی بی تم تو چپ ہی رہو، یہ بال ہم نے دھوپ میں سفید نہیں کیے اتنا تو ہم نے لڑکے کی ماں کی باتوں سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ مرضی تو لڑکے کی ہی ہے۔'' پھپھو نے بے دردی سے امی کی بات کو جھٹلا دیا۔

پھپھو کی تکلیف دہ باتوں کے باوجود مجھے لگا جیسے اندھیرے گھٹن زدہ کمرے میں کسی نے ہوادار کھڑکی کھول دی ہو۔ دل پر ساون کی ہلکی پھلکی کن من ہونے لگی ویسی ہی ہلکی ساون کی ہلکی کن من باہر بھی برس رہی تھی۔ اگست کے مہینے میں جیسے ..... مجھ پر بہار چھانے لگی تھی اور دل مچل مچل کر عمران کی ہمراہی مانگنے لگا تھا آتے جاتے ایک ہی محلے میں رہتے میری نظر سے عمران کیسے چوک سکتا تھا، بے انتہا وجیہہ و جمیل شخصیت کا مالک اکثر دیکھا تھا لیکن کبھی اسے سوچا نہ تھا۔ آج اسے سوچنے کا انداز یکسر بدل گیا تھا۔

☆☆☆

کسی معجزے کی صورت امی نے ابو کو علیحدگی میں ہموار بنا لیا کون ناشکرا ہوگا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر داماد جو شکل صورت اور حسب نسب میں بھی لاجواب تھا اسے منع کر دے گا لوگ تو ایسے رشتوں کے لیے منتیں مانگتے ہیں۔ اِدھر ابو نے حامی بھری اُدھر وہ لوگ رسم کے لیے تاریخ مانگنے لگے جو کہ دے دی گئی..... شب و روز بہت حسین ہو گئے تھے لیکن.....!

☆☆☆

''سوچ لیں بھیا! یا تو آپ اپنی لاڈلی کا رشتہ عمران سے طے کر لیں یا پھر ہمیں چن لیں۔'' چاچو نے سفاکی سے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے شہود، میں بھی صاف کہہ رہی ہوں میرا بھی تم سے ہرگز تا آج ہی ختم سمجھو تا وقتیکہ ..تم لڑکے والوں کو نہ نہیں کرتے ہو۔''

''لیکن آپا میں لڑکے والوں کو منگنی کی تاریخ بھی دے چکا ہوں اور قریبی عزیزوں کو بلاوا بھی دے دیا

ہے؟" ابا نے پہلی بار کھل کر بات کی۔

"لو تو تم نے ہم سے پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور بالا ہی بالا سب کر لیا۔ یہ سب اس بھاپھا کٹنی کا کیا دھرا ہے ورنہ میرا مسعود تو ہرگز ایسا نہ تھا۔" پھپھو نے منہ پر دوپٹا رکھ کر آنسو بہانا شروع کر دیا یہ ان کا خطرناک ترین حربہ تھا اور پھر وہی ہوا ابا پگھل گئے لیکن ان کا ایک جواز باقی تھا اب جو رشتے کی بات لوگوں میں پھیل گئی ہے اسے کیسے ڈھانپا جائے۔

☆☆☆

پھپھو نے اپنے اکلوتے نور نظر کا رشتہ تو چاچو کی رمشہ سے طے کر رکھا تھا، ہونے کو تو ابا کو سوچنا چاہیے تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی کے لیے چاچو یا پھپھو کیوں قربانی نہیں دے سکتے لیکن وہ ہمیشہ ہی ایک کمزور شوہر ہی نہیں کمزور باپ بھی رہے تھے اوپر سے پھپھو جھٹ پٹ کہیں سے رشتہ لے آئیں۔ لڑکے سے ایک ملاقات ہوئی اور ہاں بھی کر دی گئی۔ زین بھی اپنے گھر کا اکلوتا بیٹا تھا دیکھنے میں مناسب صورت شکل کا تھا والد نہیں تھے اور اس کی ماما نے بتایا کہ انہوں نے زین کے ساتھ سارا کاروبار سنبھال رکھا ہے، بہت معقول رشتہ لگا تھا والدین کے ساتھ، ساتھ میں نے بھی اپنے پگلے دل کو سمجھا لیا۔

"ضروری نہیں کہ جو ہم چاہیں وہی ہو بعض اوقات جو ہوتا ہے وہ ہمارے لیے بہترین ہوتا ہے۔" امی نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

منگنی کی جو تاریخ عمران کے گھر والوں کو دی گئی تھی ان سے معذرت کے بعد اسی تاریخ پر میری انگلی میں زین کے نام کی بیش قیمت انگوٹھی آ گئی۔ نم آنکھوں سے انگوٹھی کو دیکھتے میں نے شکر میں سر جھکا دیا، والدین کی لاج رکھنا میری پہلی ترجیح تھی۔

☆☆☆

دنوں کو پر لگ گئے اور بالآخر دھوم دھام سے ہونے والی شادی کے بعد لہنگا پھیلائے میں بے حد سجی ہوئی قیمتی سامان سے مزین حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ کمرے کے تمام سامان میں میرے علاوہ کچھ بھی میرے گھر والوں کو دینا نہیں پڑا تھا اور میری ساس کے سختی سے جہیز کی مخالفت کرنے پر پھپھو نے فخریہ ابو کو جتایا تھا کہ کیسا کار آمد رشتہ انہوں نے کروایا تھا وہ بھی ہتھیلی پر سرسوں جما کے، اتنی جلدی ان کی کوئی جاننے والی تھی جس کے ذریعے یہ رشتہ میرے لیے آیا تھا زیور سے لدی پھندی سرخ لہنگے میں سامنے نظر آتے آئینے میں جھلملاتے میرے عکس نے بتا دیا تھا کہ میرا شوہر دل و جان سے مجھے چاہے گا۔

☆☆☆

نوچ کھسوٹ کے اتارے زیورات کا ڈھیر میرے پیروں میں پڑا تھا ان سے ہوتی میری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے زین پر پڑی جو پورے انہماک سے گلے میں میرے نیکلس کو ڈال کر سر پر میرا عروسی دوپٹا اوڑھے میک اپ کے ساتھ نبرد آزما تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا، لپ اسٹک سے لپے ہونٹوں سے مردانہ آواز نکلی۔

"لہنگا اتار کے مجھے دو۔" میں جو کتنی ہی دیر سے حیرت کا بت بنی بیٹھی تھی سختی سے لہنگے کو پکڑنے لگی وہ اٹھ کر میری طرف بڑھا تو میرے منہ سے مسلسل چیخیں نکلنے لگیں دروازہ جو مقفل نہیں تھا بغیر دستک کے میری ساس داخل ہوئیں اور آتے ہی میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ تم کچھ ایسا ہی ردعمل دکھاؤ گی لیکن میں نے گھر میں مہمانوں کی موجودگی کے پیش نظر اونچی آواز میں باہر میوزک نائٹ کا اہتمام کر رکھا ہے۔ یہ زین میرا بیٹا ہے اس میں جو کمی ہے وہ تمہیں پتا چل ہی چکی ہوگی۔ میں نے بہت محنت سے اس کی شخصیت کو ایک مکمل مرد کی شخصیت میں ہی ڈھالے رکھا ہے لیکن حقیقت یہی ہے جو تم لوگ دوسرے الفاظ میں، نامرد کی اصطلاح میں استعمال کرتے ہو لیکن لڑکی یاد رکھو یہ راز تمہارے سینے میں ہی بند رہنا چاہیے کوئی تماشا مت بنانا، کل اگر تم نے میرے بیٹے کی حقیقت کھولنے کی کوشش کی تو میں اور میرا بیٹا تمہیں بدچلن قرار دینے میں لمحہ نہیں لگائیں گے اور طلاق دے کر روانہ کر دیں گے اس لیے جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔" وہ میری حیرت سے پھٹی

آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سب کہہ رہی تھیں۔

''اب یہ لباس تبدیل کر کے ایزی ہو جاؤ اور زینی کو ڈسٹرب مت کرنا' وہ جو کرے اسے کرنے دینا ورنہ اس کا غصہ بہت خطرناک ہے، اسے دلہن چاہیے تھی وہ یہ گیم کھیلنا چاہتا تھا' میں نے اسے لادی اور سوسائٹی میں بھی سرخرو ہونا تھا سو ہوگئی باقی تمہیں کسی چیز کی یہاں کمی نہیں ہوگی۔ ایک مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی کو اور کیا چاہیے۔' یہ کہتے ہوئے زین کی ماما سفاکی سے ہنسیں اور دروازہ کھول کر باہر کی طرف مڑ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد میرالہنگا زین نے پہن رکھا تھا اور میں سادہ سوٹ میں کارپٹ پر بیٹھی ... کپکپا رہی تھی تیز، بخار میں پھنک رہی تھی شب عروسی کا یہ انداز تو کسی سہیلی سے سنا تھا نہ پڑھا تھا ڈھیروں خوابوں کی کرچیاں میرے بدن میں چبھ گئی تھیں۔

☆☆☆

طلاق اور بدچلنی کا لیبل دونوں ہی مجھے قبول نہ تھے اس لیے ولیمہ بھی خود پر ضبط کر کے گزار دیا، میکے کا پھیرا بھی میری زبان نہ کھلوا سکا۔ امی کی آنکھوں کے کچھ سوالوں پر میں پلکیں جھکا دیتی جسے وہ شاید شرم پر محمول کرتی رہی تھیں۔

☆☆☆

میکے سے آنے کے بعد میری ساس نے میرا فون مجھ سے لے لیا۔ اسے بند کر دیا میرے گھر والوں کو یہ بتایا گیا کہ میں زین کے ساتھ ہنی مون پر ہوں اور اسی لیے فون بند کر رکھا ہے تاکہ کوئی ڈسٹرب نہ کرے' ایک ماہ میں، میں نے بہت کوشش کی کہ زین کو دوست بنالوں لیکن وہ بہت چھوٹی باتوں پر مشتعل ہو جاتا تھا۔ ہاتھ میں جو چیز ہوتی دے مارتا اسے میرے لمبے بال اچھے لگتے تھے۔ وہ ان کو کھینچتا۔ ایک دن جب وہ میرے بال کاٹنے کو بڑھا تو میری ہمت جواب دے گئی اسے میرے بال چاہیے تھے۔ میں نے اسے کمرے میں بمشکل چھوڑا اور بہانے سے کسی نہ کسی طور اس بنگلے جیسے عقوبت خانے سے بھاگ نکلی۔ ماما گھر پر نہیں تھیں۔

☆☆☆

اکھڑی سانسوں کے ساتھ جب میں رکشے سے اتر کر گھر میں داخل ہوئی تو امی کے بازوؤں میں جا کر سُدھ بُدھ بھلا دی۔

میں جو اپنوں میں پہنچ جانے پر ابھی صحیح معنوں میں شکر بھی نہ بجا لائی تھی کہ زین کی ماما کے الزامات نے مجھے اپنوں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ اس عورت کے مطابق میں کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس لیے زین کی جانب سے الزامات کے طوق کے ساتھ طلاق نامہ بھی موصول ہو گیا اور اب دن رات میں اپنوں کے کٹہرے میں بے جرم سزا پا رہی تھی' ابا نے مجھ سے بات کرنا بند کر دی تھی' چاچو اور پھپھو جب چاہتے مجھے پیٹتے، میری کزنز نے مجھ سے ہر رابطہ توڑ دیا تھا..... میری ماں البتہ ماں ہی رہی جسے میری باتوں کی سچائی پر یقین تھا لیکن وہ ہمیشہ سے بے بس تھی' مجھے لگتا تھا زندگی اب بدسلوکی کی انتہا کر چکی ہے اب شاید دن بدل جائیں گے۔

☆☆☆

''کیا سوچا ہے تم لوگوں نے؟ کب تک اس بدنامی کی پوٹ کو سینے پر تمغے کی طرح سجائے رکھو گے۔'' پھپھو نے مجھے نفرت سے گھورا' میں جو برآمدہ دھونے میں مصروف تھی جلدی سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

''کیا کروں آپا اس حرماں نصیب کا آپ ہی بتائیں۔ اب گلا تو گھونٹ نہیں سکتی۔'' آج امی کے لہجے میں بھی تھکن تھی۔

''میرے خیال میں تو پھر سے اس کی شادی کر دو جانے کس کے سنگ منہ کالا کر کے آئی ہے اور کیا چاند چڑھا چکی ہوگی میرے پاس ہے ایک رشتہ، تم کہو تو مسعود سے تو بات کروں۔''

''جیسے آپ کی مرضی آپا' میرے لیے تو مر حامر گئی ہے، یہ چلتی پھرتی لاش میرے گھر میں مجھے تکلیف دیتی ہے، اچھا ہے خلاصی ہو۔''

ابا کی بے رخی اور نفرت سب سے کاری ضرب تھی میرے دل پر مر جانے کو دل چاہتا تھا کتنا مشکل ہوتا ہے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی الزام سہنا، سزا کاٹنا کوئی مجھ سے پوچھتا۔

میں ایک بار پھر دوسروں کے لائے رشتے کی بھینٹ چڑھ رہی تھی، میری ہاں کا احتجاج بھی صرف نظر کر دیا گیا اور مجھے ایک ایسے شخص کے نکاح میں دے دیا گیا۔ جو نہ صرف پہلے سے شادی شدہ تھا بلکہ چار بچوں کا باپ بھی تھا، بڑا لڑکا سولہ سال کا تو چھوٹا بچہ سال بھر کا تھا بیوی مر چکی تھی اور مجھ جیسی زندہ لاش پر وہ احسان کر کے لے جا رہا تھا۔ بارات کے نام پر وہ چار بندوں کے ساتھ آیا اور مجھے سادہ سی دلہن بنا کر اس کے ہمراہ کر دیا گیا۔

☆☆☆

ایک دفعہ پھر میں تنہا کمرے میں بیٹھی تھی بالکل مختلف ماحول تھا نہ تو کمرہ سجا نہ عروسی لگ رہا تھا نہ ہی دلہن، دلہن لگ رہی تھی سامان کے نام پر سادہ سا پلنگ تھا اور ایک سادہ سا ڈریسنگ ٹیبل اس میں نظر آتا عکس دلہن تو دور کسی باراتی عورت کا بھی نہ تھا۔ آج آنکھوں میں سپنے نہیں، آنسو تھے، آنکھیں ان آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں۔

میری آنکھیں ڈیرے ساون کے
بن برکھا تن میرا تھر جیسے

تھوڑی دیر بعد باہر ہلچل محسوس ہونے پر میں سنبھل کر بیٹھی ہی تھی کہ آگے پیچھے میرا دولھا اور سولہ سالہ لڑکا کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوتے آپس میں الجھ رہے تھے' میں ابھی معاملات سمجھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ لڑکے نے تیز دھار چھری اپنی گردن پر رکھ لی، پیچھے آتے گھر کے باقی افراد کمرے کی دہلیز پر ہی رک گئے کیونکہ لڑکے نے شاید انہیں اسی بات کا اشارہ کیا تھا آپ جاننا چاہیں گے ناں! یہ سب کیا تھا تو سنیے!

☆☆☆

تھوڑی ہی دیر بعد میں ایک بار پھر سہاگن سے ابھاگن ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ تھا میرے شوہر کا بڑا بیٹا جس کی مرضی کے برعکس اس کا باپ مجھے بیاہ لایا تھا۔ لیکن اب وہ اس قدر غصے میں تھا کہ اس نے اپنی گردن پر چھری رکھ کر باپ سے مطالبہ کر دیا تھا کہ وہ چھری تب ہٹائے گا جب اس کا باپ مجھے طلاق دے گا۔ باپ نے

کھلے، کھلے پھول

☆ امید ایک ایسی چھاؤں ہے جو اپنے دامن میں انسان کو پناہ دے کر مایوسی کے سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے۔

☆ ہم چاہیں تو کچھ بھی شروع نہیں ہوتا مگر اللہ چاہے تو اختتام کے بعد بھی آغاز ہو جاتا ہے۔ ہر صبح تاریکی کے وجود سے جنم لیتی ہے۔

☆ آسانیاں عطا کرنا تمہارے بس میں نہیں، اللہ کا اپنے خاص بندوں پر کرم ہوتا ہے لہٰذا آسانیاں بانٹنے کی دعا کیا کرو۔

☆ حالات اور وقت بدلتے رہتے ہیں اس لیے ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... پریشانی حالات سے نہیں خیالات سے پیدا ہوتی ہے سو اپنے خیالات مثبت رکھو۔

☆ تحمل اختیار کرو، اپنے دشمن پر غلبہ پالو گے اور نفس سے بڑھ کر تمہارا بھلا کون دشمن ہے۔

☆ بے شک تم خدا سے جیسا گمان رکھو گے وہ تمہارے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرمائے گا۔

از: سباس گل، رحیم یار خان

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوالِ عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کاملِ عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

کلام: شاعرِ مشرق، علامہ اقبال
پسند: مہرین ضیا، کوہاٹ

اس کی بات کو اہمیت نہ دی تو اس نے چھری کی نوک گردن میں چبھو دی ایک باریک لکیر خون کی نکلتی دیکھ کر میرے منہ سے جہاں چیخ نکلی وہیں میرے شوہر کے منہ سے میرے لیے تین لفظ آزاد ہو گئے چند پل تھے جو مجھے ایک بار پھر طلاق یافتہ بنا گئے۔

☆☆☆

میں نے ہاسٹل کے کمرے میں داخل ہو کر ایک لمبی سانس لی آج اسپتال میں کام زیادہ تھا تھکن سے برا حال تھا اس لیے میں نے سیدھا منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور بستر کی راہ لی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے میں گھر واپس نہیں گئی یا اب اسپتال میں کیوں ہوں۔ تو وقت اور حالات نے مجھے یہی فیصلہ کرنے پر مجبور کیا گھر واپس جانے پر ایک بار پھر میرے ساتھ سب کا وہی سلوک تھا۔ حالانکہ اس بار تو مجھ پر کوئی الزام بھی نہیں لگا تھا لیکن میں پھر بھی.... بے گناہ نہ تھی اب مجھ پہ منحوسیت کا لیبل لگا دیا گیا تھا۔ میری کزنز پر میرا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ میری امی بھی میرے غم میں بیمار رہنے لگی تھیں اور اس سے پہلے کہ پھر کسی ایسے رشتے کے حوالے کر دیا جاتا، میں نے اپنی دوست روحی کے مشورے سے اسپتال میں اپلائی کر دیا اور ابا جو اب بہت رقیق القلب ہو چکے تھے ان سے اجازت لے کر ہاسٹل شفٹ ہو گئی۔

☆☆☆

''ممی پاپا کب آئیں گے؟'' میری معصوم سی بیٹی نے مجھ سے سوال کیا میں نے گھڑی کی طرف دیکھا رات کے نو بجے تھے محبت سے اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے اسے تسلی دی۔

''بس بیٹا تھوڑی دیر میں ان شاء اللہ وہ آ جائیں گے۔'' سائڈ ٹیبل پر رکھی تصویر پر میں نے عقیدت سے نظر ڈالی۔ سرمئی آنکھوں میں شرارت تھی میرے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔

جی آپ بالکل صحیح سمجھے ہیں، میں اب عمران کی بیوی ہوں بالآخر عمران کی خواہش نے حقیقت کا روپ دھار ہی لیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ یہ سب آسانی سے ہوا تھا ایک ہی اسپتال میں کام کرتے میں کب تک عمران سے.... بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتی اس کی محبت، اس کی توجہ نے مجھے اعتماد بخشا تو میں نے اسے ایک بار پھر اپنے گھر رشتہ بھیجنے کو کہا۔

یہ ایک الگ کہانی ہے کہ میرے گھر میں ایک بار پھر کس قدر مخالفت کا طوفان اٹھا، کتنے الزامات مجھ پر لگے لیکن اس بار نہ میری امی ہاری تھیں نہ ہی میں نے اپنی زندگی کے فیصلے کو دوسروں پر چھوڑا تھا ابا سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے عمران سے شادی کرنی ہے ورنہ کبھی نہیں کرنی ہے آپ ہی بتائیں، وہ جو اتنے سال سے میرا انتظار کر رہا تھا اور کبھی شادی نہ کرنے کی قسم کھائے بیٹھا تھا اس کا اتنا تو حق بنتا تھا ناں کہ میں اس کے لیے مقدمہ لڑتی..... مجھے یہ بھی منظور تھا کہ اگر کوئی نہ مانتا تو میں یہ فیصلہ تنہا لے لیتی لیکن زندگی کے رنگ انوکھے ہیں میں جو مایوس ہو چکی تھی زندگی کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی اپنی دوست روحی کے سمجھانے پر میرے اندر ہمت و جرأت پیدا ہو گئی تھی زندگی کو حاصل کرنے کے لیے حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلنا پڑتا ہے اس کی سمجھ مجھے اب آئی تھی۔

یوں رم جھم برستے ساون کے ایک نرم گرم دن میں ابا کی مرضی سے عمران کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ پھپھو اور چاچو نے ابا سے قطع تعلق کر لیا تھا لیکن امی کو کھونے کی ہمت نہیں تھی ابا میں کیونکہ امی نے کہہ دیا تھا اب کے مرحا کی بات نہ مانی اور عمران کو انکار کیا، گیا تو وہ ابا سے علیحدگی اختیار کر لیں گی۔ اور عمر کے اس حصے میں ابا اپنی خدمت گزار بیوی کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عمران کی محبت کے ساون میں بھیگتے یوں لگا جیسے جھلسا دینے والی دھوپ سے ساون کی ٹھنڈی پھوار نے میرے وجود کو سکون بخش دیا ہو۔

مجھے صبر کا بے حد حسین پھل ملا تھا، باہر گاڑی کا ہارن بجا میں نے جلدی سے حرا کو اٹھایا اور گیٹ کھولنے کو بڑھی جہاں میرا نصیب میرا منتظر تھا۔

❁❁❁

pklibrary.com

افسانہ

میری شناخت گم شدہ

شیریں حیدر

''لگتا ہے نئے پرفیوم خریدنے کا وقت آ گیا ہے۔'' میں نے خود کلامی کی تھی۔ دوسرے کے بعد تیسرے پرفیوم کی بوتل کھول کر خود پر اسپرے کیا تھا اور محسوس ہوا تھا کہ اس کی خوشبو ختم ہو چکی تھی۔ ''اب کے سمیر آئے گا تو اسے کہوں گی کہ مجھے خریداری کے لیے لے جائے اور میں کچھ نئے پرفیوم خرید لوں۔'' خوشبوئیں اور رنگ ہمیشہ سے میری کمزوری رہے تھے، اسی لیے میں اپنی ساری بچت ان دو چیزوں پر خرچ کر دیتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سمیر کا پیغام آ گیا تھا کہ وہ شام کو میری طرف چکر لگائے گا۔

''کیسا رہا آپ کا دن مام؟'' میرے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے میرے گال کا بوسہ لیا، میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹالیا، وہ ذرا سا جھینپ گیا کیونکہ اس کے عقب میں اس کی نئی دوست کھڑی تھی۔ ہر ہفتے اس کے ساتھ اس کی کوئی نہ کوئی نئی دوست ہوتی تھی۔ اب یہ جانے کتنے دن کے لیے تھی۔

''ہائے۔'' اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے ہائے کہا تھا۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور مڑ کر نظر ہی نظر میں سمیر سے سوال کیا تھا کہ وہ کون تھی۔

''مام..... سامی، میری دوست ہے۔'' اس نے مسکرا کر سامی کے صرف نام کا تعارف کروایا۔ بلیوں جیسا نام تھا۔ اس سے مجھے نہ اس کے مذہب کا علم ہوا تھا نہ ملک کا۔ ''میرا مطلب ہے کہ میری گرل فرینڈ۔''

''اور اس نینا کا کیا ہوا؟'' میرے منہ سے پھسل گیا۔ ''سوری۔'' میں نے فوراً سوری کہا۔

''اٹس اوکے مام، نینا کا قصہ پرانا ہوا۔ سامی کو سب علم ہے، نینا میرے ٹائپ کی لڑکی نہیں تھی، بس وہ ٹائم پاس والی لڑکی تھی۔'' انتہائی وسیع القلبی سے سامی نے اس کے ذکر کو سنا تھا۔ ''کیا پکایا ہے مام؟ میں نے سامی سے آپ کے کھانوں کی بہت تعریف کی تھی۔''

''وہ اصل میں..... میں نے آج کچھ بھی نہیں پکایا بیٹا، میں سمجھی کہ تم تنہا ہو گے، تم مجھے سامی کے بارے میں بتا دیتے تو میں کچھ بنا لیتی، میں نے تو تمہیں اپنے ساتھ خریداری پر لے کر جانا تھا اور واپسی پر کچھ کھا لیتے۔'' میں نے شرمندگی سے وضاحت کی۔ عموماً تو ایسا ہی ہوتا تھا کہ وہ مجھے اپنے آنے کا بتاتا تو میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ خاص بنا لیتی تھی، اس کی پسند کی کوئی چیز۔ نینا نے ساتھ آنا ہوتا تو مجھے بتا دیتا تھا، وہ زیادہ مسالے دار کھانا کھاتی تھی، میں اس کے لئے علیحدہ سے کوئی چٹخارے دار چیز بنا لیتی تھی۔

''کیا خاص شاپنگ کرنی ہے مام؟ آپ خود کیوں نہیں اپنے کام سے واپسی پر ہوتی ہوئی آئیں؟'' اس نے فریج کھول کر دیکھا اور کولڈ ڈرنک کے دو ٹن نکالے، کھول کر دو گلاسوں میں ڈالے اور ایک سامی کو پکڑا کر دوسرا میری طرف بڑھایا۔

''چائنا سے ایک وفد آیا ہوا تھا، انہی کے ساتھ مصروفیت رہی، جب تک فارغ ہوئی تب تک کافی دیر ہو چکی تھی اور یوں بھی واپسی پر میں نے ایک کولیگ سے لفٹ لی تھی، اس لیے اچھا نہیں لگا کہ.....'' اس نے گلاس میرے سامنے رکھا اور مڑا۔ ''تم لو میری جان، میں کافی پیوں گی۔ اتنا ٹھنڈا میں نہیں پیتی۔'' میں نے کہا مگر وہ اتنی دیر میں فریج کھول کر تیسرا ٹن کھول چکا تھا، مجھے پیسے بنا کوئی چارہ نہ تھا، حالانکہ چند گھونٹ لینے سے ہی میرا گلا پکڑا جاتا تھا مگر سوچا کہ کوئی حرج نہیں کہ اب وہ کھول چکا تھا۔

''اچھا وہی ہوں گے ہارون انکل؟'' کہہ کر وہ ہنسا، میں کھسیانی ہو گئی۔ ''اپنی گاڑی پر کیوں نہیں گئیں آپ؟''

''اس کی انشورنس کی مدت ختم ہو چکی ہے بیٹا۔'' میں نے چند گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھ دیا، میرے گلے میں خراش سی ہونے لگی تھی۔ ''پھر جا سکیں گے ہم مال؟''

''ابھی تو وقت بالکل ختم ہونے کے قریب ہے، جب تک ہم پہنچ کر پارکنگ تلاش کریں گے، مال بند ہو جائے گا۔'' اس نے عذر پیش کیا۔ ''کسی اور دن پر رکھ لیتے ہیں۔''

''پھر میں تم دونوں کو کہیں کھانا تو کھلا دوں۔''

''دیر ہو جائے گی مام، سامی کو اس کے ہاسٹل چھوڑنا ہوتا ہے، جب تک وہ میرے پاس شفٹ نہیں ہو جاتی، تب تک ہاسٹل کے اوقات کی پابندی برداشت کرنا پڑے گی۔'' کہہ کر وہ دونوں چل دیے۔

''میری گاڑی کی انشورنس.....'' بات میرے منہ میں ہی تھی کہ بیرونی دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی۔

☆☆☆

''میرا یہاں دم گھٹتا ہے سلمان۔'' میں نے اسے خود سے دور دھکیلا۔

''میری قربت میں تمہارا دم کیوں گھٹتا ہے زارا؟'' اس کے چہرے پر مایوس سا تاثر ابھرا تھا۔

''مجھے اس گھر اور اس ماحول سے گھٹن محسوس

ہوتی ہے سلمان، تم سے نہیں۔'' اس سے میری محبت کی شادی تھی، اس لیے اس کے قرب سے دم کیوں گھٹتا۔ وہ تھا بھی کون سا غیر، میرے ہی دور پار کے خاندان سے تعلق تھا۔ اس کی والدہ میری پھوپی کی نند تھیں، کسی شادی پر ہم دونوں ملے اور ہم دونوں کو ایک دوسرے میں عجیب سی کشش محسوس ہوئی تھی۔ شادی کے ہنگاموں میں ہم دونوں ایک دوسرے سے قریب ہونے کے مواقع بصد کوشش تلاش کرتے رہے تھے۔ دونوں طرف برابر کی آگ لگی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد گھر لوٹی تو لگا کہ کچھ نامکمل سا تھا، کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ قسمت جانے ہمیں کب دوبارہ ملاتی۔

گھر میں ان دنوں میری شادی کو لے کر باتیں ہو رہی تھیں اور گھر میں رشتے والیوں کی آمد و رفت جاری ہو گئی تھی، ایسے سلسلے مجھ سے پہلے بڑے بہن بھائیوں کے سلسلے میں بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ جب کوئی رشتہ اماں، باوا کو مناسب لگتا تو کسی نے کون سا میری رائے پوچھنا تھی۔ مگر میرے دل میں سلمان پوری طرح براجمان تھا اور میں اس کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھوپی کی ایک بیٹی کنول لگ بھگ میری ہم عمر تھی، اسے شریکِ راز بنایا اور اس کے ذریعے بات پھوپی تک پہنچی اور ان کے ذریعے میرے والدین تک۔ خاندان کا حوالہ تھا، بظاہر اس رشتے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی مگر سلمان کے والد کا تعلق ایک چھوٹے سے شہر سے تھا اور ان کے گھر سے واپس لوٹ کر میرے والدین قدرے مایوس بھی تھے۔ انہیں اس کا گھر چھوٹا سا لگا تھا... وہ لوگ درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھوپی نے بتایا کہ لڑکا... فی الحال ایک چھوٹے سے دفتر میں نوکری کر رہا ہے مگر وہ اور نوکریوں کے لیے بھی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی باہر جانے کی کوشش بھی۔ پھوپی کی طرف سے ان کے گھر اور والدین کی طرف سے ہر طرح کی گارنٹی دی گئی تھی کہ سلمان ان کی اکلوتی اولاد تھا اور وہ بہت شریف اور قدر کرنے والے لوگ تھے، بیٹی کو خوش رکھیں گے۔

محض کارروائی پوری کرنے کو میری رائے بھی دریافت کی گئی تھی، مجھے کیا اعتراض ہوتا، میری خاموشی کو میری رضامندی سمجھا گیا تھا اور جونہی میری اور سلمان کی بات پکی ہونے کا عندیہ ملا، میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

میرے اور سلمان کے بیچ سماج کی کوئی دیوار حائل نہیں ہوئی تھی۔ پھوپی نے میرے راز کی حفاظت کر کے میرے مان کو قائم رکھا تھا اور میں ان کی احسان مند تھی۔ جلد ہی منگنی کی چھوٹی سی رسم ہوئی اور اس کے چند ماہ کے بعد ہم دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''سمیر بیٹا تم جلدی میں نکل گئے، میں کہہ رہی تھی کہ میری گاڑی کی انشورنس کا کچھ کر دو بیٹا، روز، روز کسی کا احسان لینا اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے اسے پیغام بھیجا تھا کیونکہ کال وہ اٹھا نہیں رہا تھا۔

''مام، اتنی کالیں کیں آپ نے، کسی کی پرائیویسی کا بھی خیال کر لیا کریں، میں کوئی کاکا تو نہیں ہوں، آپ کو علم بھی ہے کہ میں سامی کے ساتھ تھا.....'' کال کر کے اس نے ناراضی کا اظہار کیا۔

''سوری بیٹا، میں سمجھی کہ تم اسے ہاسٹل چھوڑ کر واپس.....'' مجھے کھانسی شروع ہو گئی تھی، میں جب بھی بات کرتے ہوئے گھبرا جاتی تو ایسا ہی ہوتا۔ ''تم نے کہا تھا ناں کہ ہاسٹل واپس جانے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔''

''ہاں کہا تھا مگر میں نے اسے کھانا کھلا کر ہی چھوڑنا تھا مام۔''

''نینا کے ساتھ کیا قصہ ہوا بیٹا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''اچھی خاصی لڑکی تو تھی، خاندان بھی اچھا تھا۔''

''مام آپ میرے اس طرح کے معاملات میں دخل نہ دیا کریں..... مجھے جولڑکی کلک کرے گی میں اسی سے دوستی کروں گا ناں.....'' اس نے قدرے گستاخ لہجے میں کہا تھا۔

''بس دوستیاں ہی کرتے رہو گے یا شادی کا بھی ارادہ ہے؟'' میں نے یاسیت سے کہا، وہ کن راہوں پر چل نکلا تھا۔

''میں کل کسی وقت آپ کی گاڑی کی انشورنس کا

کچھ کر دوں گا، آپ کے دفتر سے میں کاغذات لے لوں گا۔''

''اگر میں دفتر میں نہ ہوئی تو ہارون سے لے لینا۔''

''آپ کو کہیں جانا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں، اسی چائنیز وفد کے ساتھ میرا لنچ ہے۔'' اسے کہہ کر میں نے فون بند کیا اور انھی کہ اپنے کھانے کے لیے کچھ بندوبست کروں۔ فریج بھی خالی تھا، کافی دنوں سے گروسری کی خریداری کے لیے بھی نہیں جا سکی تھی۔ اپنے فون سے ایک ریسٹورنٹ کا نمبر ڈائل کیا اور سبزی والا پزا آرڈر کر دیا۔ ان کا پزا مجھے اور سمیر دونوں کو بہت پسند تھا، یہ دیسی پزا نہیں تھا اسی لیے میں ہمیشہ سبزی والا پزا آرڈر کرتی تھی جبکہ سمیر تعلقات کی طرح کھانے پینے میں بھی حلال حرام کی تفریق سے کوسوں دور تھا۔ جب تک پزا آتا تب تک میں نے گروسری کی فہرست تیار کر لی، اگلے دن واپسی پر لیتی ہوئی آؤں گی، مجھے باہر کا کھانا کم ہی پسند آتا تھا۔

پزا کھاتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اس روز پزا بہت ہی بدمزہ تھا۔

اس سے کہیں اچھی تو سلمان کی اماں کے ہاتھ کی بیسنی روٹی ہوتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب سمیر کے ہونے کی خوش خبری ملی اور میں الٹیوں اور متلی سے... بے حال ہو رہی تھی تو ان دنوں انہوں نے پہلی بار بیسنی روٹی بنائی، اس کے ساتھ ہری مرچ اور پودینے کی چٹنی اور گھٹی لسی۔ میں نے وہ روٹی کھائی اور اتنے ہفتوں ... میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں نے کچھ کھا کر ہضم کیا تھا۔ اس کے بعد ہر روز وہ اتنی محنت اور محبت سے میرے لیے بیسنی روٹی بناتی تھیں۔ زندگی میں جب بھی پزا سامنے آتا ہے، ان کے ہاتھ کی بیسنی روٹی کی یاد دماغ میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اتنے دن تک بیسنی روٹی کھانے سے میرا وجود کچھ پھولنے سا لگا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہمارا بچہ پکوڑے جیسی ناک والا ہوگا۔'' سلمان نے ایک دن مجھے چھیڑا۔

''اچھا تو کیا تمہاری اماں بھی بیسنی روٹی کھاتی تھیں تمہاری پیدائش سے پہلے؟'' میں نے جوابی وار کیا تو وہ ہنس دیا۔ اس کی ہنسی بہت پیاری تھی۔ اس کے چہرے کا ہر نقش ہنستا تھا۔

''میری اماں تو شاید پکوڑے ہی کھاتی تھیں..... تم بتاؤ تمہاری اماں کیا مکھن بہت کھاتی تھیں؟'' اس نے میری شفاف اور گوری رنگت کی بالواسطہ تعریف کی۔

''سلمان کیا بنا تمہارے باہر جانے کا؟'' میں نے فوراً بات بدلی۔

''یقین کرو زارا، میرا بالکل جی نہیں چاہتا باہر جانے کو، اماں ابا بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام کر التجائیہ لہجے میں کہا تھا کہ شاید میں اپنی ہٹ سے باز آ جاؤں۔

''جب ہم وہاں سیٹل ہو جائیں گے سلمان تو اماں اور ابا کو بھی وہیں بلوا لیں گے..... اس سڑے ہوئے ملک میں رکھا بھی کیا ہے؟ وہی رشوت، سفارش، جرائم، ریپ، چوریاں، ڈاکے، قتل، غربت، کسمپرسی۔''

''اماں اور ابا کبھی اپنے ملک کو چھوڑ کر جانے والے نہیں ہیں..... یہ ملک ہمارا اپنا ہے، اپنی پہچان، اپنی شناخت۔ اس کے بگاڑ کے ذمے دار بھی ہم ہی ہیں اور اسے سنوارنے کا فرض بھی ہمارا ہی ہے۔''

''تم فوج میں کیوں نہیں بھرتی ہو گئے سلمان؟'' میں نے طنز کیا تھا۔

''کاش ہو سکتا..... کوشش کی تھی مگر قسمت میں نہیں تھا۔'' اس نے یاسیت بھرے لہجے میں کہہ کر گہری سانس لی۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ ہم دونوں کے بیچ رشتہ قائم رہے سلمان تو تمہیں اپنی باہر جانے کی کاوشیں تیز کرنا ہوں گی..... اتنی تیز کہ ہمارا بچہ بھی وہیں جا کر پیدا ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس کے ویزے کے حصول میں کئی اور ماہ بلکہ سال بھی لگ سکتے ہیں۔''

''اتنی جلدی کیا ہے زارا، چار دن میرے اور اپنے والدین کو اپنے پوتے یا پوتی، نواسے یا نواسی سے کھیلنے کا موقع تو ملنے دو۔''

''میں چاہتی ہوں کہ ہمارے بچے کی آنکھ اسی

ماحول میں کھلے جس میں اسے ہمیشہ رہنا ہے..... یہاں تو پیدائش کے وقت سے ہی مسائل کا انبار شروع ہو جاتا ہے۔ اسپتالوں کی حالتِ زار دیکھو، بچے ہی بدل دیے جاتے ہیں، غلاظت سے بھرے ہوئے لیبر روم، گندے سندے بستر اور بیڈ۔ اسی لیے تو ہمارے سارے لیڈر صاحبان اپنے علاج کے لیے ہمیشہ باہر جاتے ہیں۔''

''زارا، میں کوشش تو کر رہا ہوں مگر جب اللہ کو منظور ہوگا تو.....''

''کوشش نہیں..... بلکہ تیز ترین کوشش کی ضرورت ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

☆☆☆

''سامی کا نام کیا ہے؟'' میں نے سمیر سے پوچھا۔

''سامی ہی ہے مام۔'' اس نے بیزار سے لہجے میں جواب دیا۔

''سامی تو بلیوں کا نام ہوتا ہے.....'' میں نے مذاقاً سے کہا۔

''اس کے سامنے نہ کہیے گا مام، اسے برا لگے گا.....'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''جانتی ہوں، تم سے مذاق کر رہی ہوں۔ اس سے تو تب تک مذاق نہیں کر سکتی، جب تک تم اسے اپنی زندگی میں شامل نہ کر لو۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''شادی..... شادی۔'' اس نے بلند آواز سے کہا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو مام، مجھے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں نہیں اٹھا سکتا کسی کی ذمے داری اور نہ ہی کسی کے نخرے برداشت کرنے کا اسٹیمنا ہے میرا۔''

''تو کیا ساری زندگی شادی کے بغیر ہی رہو گے بیٹا؟'' میں نے اس کے غصیلے لہجے کے باوجود رسان سے سوال کیا۔ اس ملک میں اولادیں ذرا، ذرا سی بات پر گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ سمیر بھی اسی طرح کا ہی تھا، جب اس کے ساتھ کوئی گرل فرینڈ ہوتی تو وہ اپنے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہتا تھا اور جب ''فارغ'' ہوتا تو وہ چند دن میرے ساتھ گزار لیتا تھا۔

''ویسے دیکھنے میں اچھی شکل کی ہے سامی۔''

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''اپنی چوائس ہے ہی ایسی مام.....'' وہ ہنسا۔

''ویسے اس سے شادی کا امکان ہے نہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیونکہ وہ شادی شدہ ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا، میں اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ حلال اور حرام بہت چھوٹی بات تھی اس کی نظر میں، وہ تو اخلاقی اور غیر اخلاقی کے بیچ کا فرق بھی بھول گیا تھا۔

''اس کا شوہر کہاں ہے؟'' میں نے خواہ مخواہ میں ایک غیر متعلقہ سا سوال کر دیا۔

''وہ اس سے خوش نہیں ہے، ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر ہاسٹل چلی گئی ہے۔ وہ اسے بچوں کی خاطر منا رہا ہے مگر وہ اپنی شرائط منوانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''اس دوران وہ تمہارے ساتھ دوستی کر کے وقت گزار رہی ہے؟'' میرے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

''دوستی اور شادی دو الگ، الگ چیزیں ہیں مام..... آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں۔'' اس نے مڑ کر مجھے گھورا، میں سٹپٹا گئی۔ ''کیا فلیور لیں گی آپ آئس کریم میں؟''

''کوئی بھی نہیں..... کل والی کولڈ ڈرنک سے ہی میرا گلا پکڑا گیا ہے، سوزش ہے اور بخار بھی محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایک اسکوپ لے لیں، کچھ نہیں ہوگا..... میں اکیلا کھاتا ہوا کیا اچھا لگوں گا؟'' اس نے زبردستی مجھے ایک اسکوپ والی کون پکڑائی۔

''یہ کیا فلیور ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ کون نصف ہو گئی تھی اور مجھے اس کا ذائقہ ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''اسٹرابری ہے مام، آپ کا پسندیدہ۔''

''مجھے تو اس میں کوئی ذائقہ ہی نہیں آ رہا ہے اسٹرابری کا۔'' میں نے بادلِ ناخواستہ باقی کون کو ختم کیا۔

''آپ مجھے ڈسٹرب لگ رہی ہیں مام۔ پرفیوم کی دکان پر آپ کو خوشبو نہیں آ رہی تھی، آئس کریم میں آپ کو ذائقہ نہیں آ رہا۔ کہیں آپ کی ساری حسیں کسی حادثے سے متاثر تو نہیں ہو گئیں؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے.....'' میں نے بھی اسی طرح مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''رات کو پزا منگوایا تو اس میں بھی مجھے کوئی ذائقہ نہیں آرہا تھا۔''

''سبزیوں والے پزا میں کیا ذائقہ ہونا ہے مام، کوئی چکن یا بیف پزا ہو تو اس کا ذائقہ ہوتا ہے۔''

''تمہیں معلوم ہے میر کہ میں حلال اور حرام کے بارے میں کتنی محتاط رہتی ہوں۔'' میں نے ناراضی سے اسے گھورا۔

''ہارون انکل کی فیملی واپس آ گئی ہے پاکستان سے کہ نہیں؟'' اس نے فوراً سوال کیا، مجھے لگا کہ وہ میری اور ہارون کی دوستی کو حرام کہہ کر میرے منہ پر میری تذلیل کر رہا تھا۔ بیوقوف، کیا سمجھتا کہ ہمارے بیچ کیسی مقدس دوستی تھی، کیسا صاف تعلق تھا۔

☆☆☆

''اتنا کم عرصہ رہ گیا ہے بچے کی پیدائش میں، اماں کو جب سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے ہاں بیٹا..یعنی ان کا پوتا آنے والا ہے، وہ دن رات گن گن کر وقت گزار رہی ہیں۔ انہیں ہم ان کے پوتے کے پہلے لمس سے محروم کر دیں گے زارا؟'' سلمان نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے ویزے لگ گئے تھے، ہم دونوں کو اتنے عرصے کا ویزا ملا تھا جتنی ہمارے پاسپورٹ کی معیاد باقی تھی، یعنی چار سال۔ کاش کہ ہم نئے پاسپورٹ بنوا لیتے، اس صورت میں پانچ سال کا ویزا لگ جاتا۔ سلمان نے اپنے کام کا اور میرا پڑھائی کا ویزا لگوایا تھا، مجھے کسی کورس میں داخلہ دلوایا تھا۔ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہاں جا کر پڑھائی کرتی۔ مشکل سے پڑھائی سے جان چھوٹی تھی، جب شادی ہوئی تھی تو اب دوبارہ اس چکر میں کون پڑتا۔

''مجھے کچھ نہیں پڑھنا وڑھنا وہاں، میں اپنی زندگی سے لطف اندوز ہونے جا رہی ہوں..... آزادی سے سانس لوں گی، اپنے بچے کے ساتھ گھوموں پھروں گی، دنیا دیکھوں گی۔''

''اتنا آسان نہیں ہوتا یہ سب کچھ زارا۔ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ پردیس کی زندگی میں بڑی محنت اور مشقت ہے۔ میرے جو بھی جاننے والے باہر گئے ہیں، وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ اپنے دیس میں تھوڑی کھا لو مگر سکون ہے، پردیس میں سکون ہے نہ خوشی۔ دن رات محنت کر کے جو کچھ کماتے ہیں وہیں خرچ ہو جاتا ہے۔ پردیس تو ایک گورکھ دھندا ہے، جو اس میں الجھ جاتا ہے، وہ ڈور کا سرا نہیں پاتا۔'' اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

''تم اتنے بقراط نہ بنو..... خوش ہو جاؤ کہ ہم جلد ہی باہر چلے جائیں گے اور یہ تمہارے حاسد دوست، خود تو باہر جا کر زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور دوسروں کو منع کرتے ہیں۔''

''سوچ لو زارا..... کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس فیصلے پر پچھتائیں؟''

''میں ہرگز نہیں پچھتاؤں گی، نہ ہی تمہیں پچھتانے دوں گی۔ فکر نہ کرو، جلد ہی ہم اماں اور ابا کو وہیں بلا لیں گے پھر ہمارے لیے پاکستان میں کیا کشش رہ جائے گی؟''

''تمہارے والدین..... تمہارے بہن بھائی۔ کیا تم ان سب کو مس نہیں کرو گی؟''

''وہ سب اس قابل ہیں کہ ہمیں ہاں آ کر مل لیا کریں گے۔ اچھا ہے، ان سب کو گھومنے پھرنے اور دنیا دیکھنے کا بہت شوق ہے، اسی بہانے وہ ہمارے پاس آ جایا کریں گے اور ہم ان کے ساتھ مل کر باقی ملکوں کی سیر کو جایا کریں گے۔'' خوشی میرے چہرے پر اٹھکارے مار رہی تھی۔

☆☆☆

''اس گھٹے ہوئے فلیٹ میں ایک چھوٹا سا کمرا..... پورے فلیٹ میں تین کمرے تھے اور ایک غسل خانہ۔ نچلی منزل پر فی وی لاؤنج اور ڈائننگ روم تھا۔ کچن بھی نچلی منزل پر تھا۔ کچن اور غسل خانہ، تین جوڑوں اور نچلی منزل پر جانوروں کے باڑے کی طرح ٹھونسے ہوئے بارہ لوگوں کے لیے۔ اتنے چھڑے تھے اور پھر میری حالت ایسی کہ میں نیچے جاتی ہی نہ تھی۔ سلمان نے اپنے پاس موجود رقم سے ایک ٹوسٹر اور چائے بنانے کے لیے بجلی سے چلنے والی ایک سستی سی

کیتلی لے لی تھی۔ دو پلیٹیں، دو مگ، دو گلاس، دو چمچے اور سالن ڈالنے کے لیے ایک ڈونگا لیا تو ہمارے پاس سے بہت سے پیسے کم ہو گئے تھے۔ بچے کی پیدائش پر بھی کچھ نہ کچھ تو خرچ ہونا تھا، بچے کی تیاری بھی کرنا تھی کہ پاکستان سے آتے ہوئے میں نے ان تمام چیزوں کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا تھا جو میری اور سلمان کی ماؤں نے اپنے پوتے اور نواسے کے لیے بنائی تھیں۔

اگرچہ اس ایک کمرے کی دنیا میں میرا دم گھٹتا تھا مگر اس دنیا کا انتخاب میرا اپنا تھا، اب جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ ان کمروں میں..... سرگوشی کی آواز بھی پورے گھر میں آتی تھی۔ کوئی لباس بدلتا تو اس کی سرسراہٹ بھی ہر طرف محسوس ہوتی اور کوئی ٹوائلٹ استعمال کر کے فلش کرتا تو پورے گھر میں گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ میں اس مشکل وقت کو جھیل رہی تھی اسی آس میں کہ یہ سب کچھ عارضی تھا ایک دن ہمارے پاس بھی ایسا گھر اور گاڑی ہوگی جس طرح کی میں انگریزی فلموں میں دیکھا کرتی تھی۔ جس سماجی تفاوت کو میں اپنے ملک میں پیچھے چھوڑ کر آئی تھی، یہاں اس سے کہیں بڑھ کر دیکھ رہی تھی مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں کیسے یقین کر لیتی کہ ہم یہاں غربت کے نچلے ترین طبقے کے افراد تھے۔

سلمان کو ایک بڑے اسٹور میں ملازمت ملی تھی..... اسے ٹرکوں سے سامان اتارنا ہوتا تھا، بھاری سامان اٹھانے سے اس کی کمر تھکاوٹ سے چور ہوتی اور وہ نیند میں بھی کراہتا رہتا تھا۔ میں اسے تسلی دیتی کہ کون سا ہمیں ہمیشہ اس گھر میں اور اسے اسی ملازمت میں رہنا تھا، جلد وقت آئے گا کہ ہمارے حالات تبدیل ہو جائیں گے۔ خوراک کی کمی کا اثر جلد ہی ہم دونوں پر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چہرے کی جلد، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جسمانی کمزوری ہمیں خود بھی محسوس ہوتی تھی۔ میرے اندر یہ پچھتاوا پیدا ہو گیا تھا کہ کاش ہم بچے کی پیدائش کی منصوبہ بندی میں کچھ تاخیر کر لیتے کہ اس کی آمد کے مہینے ان چند ہفتوں میں رہ گئے تھے اور ہمارے پاس کوئی تیاری نہ تھی۔ بچہ پیدا کہاں ہونا ہے، یہ بھی معلوم نہ تھا۔ ہمارے پاس اپنی انشورنس کروانے کے بھی پیسے نہ تھے اور ہمارے ویزے کے اسٹیٹس میں ہمیں بغیر انشورنس کے علاج کی سہولت میسر نہ تھی۔

جو رقم ساتھ لے کر آئے تھے وہ یوں ختم ہو رہی تھی جیسے پانی میں نمک گھل کر غائب ہوتا ہے۔ سلمان نے کچھ رقم اپنے کچھ جاننے والوں سے ادھار لی تھی کہ ہمیں بچے کی خریداری کی ضرورت تھی۔ دو ٹرینیں اور تین بسیں بدل کر ہم جس علاقے میں بچے کی خریداری کے لیے گئے تھے وہ شہر کا غالباً سستا ترین اور گندا ترین علاقہ تھا۔ ہر طرف سیاہ فام اور بنگالی بھرے ہوئے تھے اور ریڑھیوں پر دکانیں سجی تھیں۔ وہاں سے ہم نے وہ گھٹیا سے کپڑے خریدے جو شاید میں پاکستان میں بھی اپنے بچے کو نہ پہناتی۔ اور تو اور ان میں سے کچھ چیزیں سیکنڈ ہینڈ بھی تھیں۔ ایک اور سستے سے اسٹور سے ہم نے دودھ کے لیے فیڈر اور دیگر اشیائے ضرورت بھی خریدیں۔ دل میں درد لیے میں اس سامان کے ساتھ کھڑی تھی، سلمان مجھے وہاں کھڑا کر کے خود ایک بنگالی ہوٹل سے کھانا لینے گیا تھا۔ کچھ کمزوری اور کچھ دماغی بے سکونی سے مجھے چکر آیا اور اس کے بعد جب ہوش آیا تو میں کسی اسپتال میں تھی۔

بعد میں سلمان نے بتایا کہ میں وہیں بے ہوش ہو کر گر گئی تھی اور ارد گرد کسی کو نہ پا کر کسی نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو ایمرجنسی کو کال کر دی اور چند منٹوں میں مجھے اسپتال پہنچا دیا گیا تھا..... بہت خون بہہ جانے اور گرنے سے بچے کی ڈلیوری بھی کر دی گئی تھی اور جب تک میں مکمل ہوش میں آئی تب تک سلمان نے مجھے بتایا کہ اس نے اسپتال میں بچے کا نام بھی لکھوا دیا تھا۔ سمیر کے نام کا فیصلہ تو ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔

☆☆☆

اسپتال سے فارغ ہوئی تو علم ہوا کہ اسی سستے اور غلیظ سے علاقے میں سلمان نے ایک اور جگہ کرایے پر لے لی تھی۔ اتنے ہی کرایے میں یہاں ایک نسبتاً بڑا کمرا اور اس کے ساتھ چھوٹا سا کچن اور باتھ بھی تھا۔

سلمان نے وہیں پر خود بھی اسی طرح کا ٹھیلا لگانے کا کام شروع کرنے کا سوچا تھا جس طرح کے ٹھیلوں سے ہم نے سمیر کی خریداری کی تھی۔ میں اب پہلے سے بھی برے حال میں خود کو پاتی تھی مگر مرتی کیا نہ کرتی۔ سلمان کا کام شروع تو ہو گیا مگر بمشکل گزارہ ہوتا تھا، تاہم بوجھ اٹھانے والی مشقت کی نسبت بہتر کام تھا۔ اس علاقے میں ایک دو ایسے ریستوران تھے جہاں سے کبھی کبھار ہم کھانا بھی منگوا لیتے تھے کہ وہاں حلال کھانا ہوتا تھا۔ اسی طرح کے ایک ریستوران سے ایک دفعہ کھانا منگوایا تو مجھے خیال آیا کہ لوگ اتنے بدذائقہ اور گھٹیا کھانے کے لیے بھی تو رقم ادا کرتے ہیں، اگر میں یہ کام شروع کر دوں تو؟ اپنا خیال سلمان کو پیش کیا اور اس نے سیدھے سبھاؤ مخالفت کی کہ مجھے بچے کی پرورش پر توجہ دینی چاہیے۔

☆☆☆

ہمارے پرانے پتے پر ایک خط آیا تھا جو کہ وہاں سے ہمیں بھجوایا گیا تھا، جس بنیاد پر مجھے ویزا ملا تھا اس کے لیے اب مجھے کلاسیں جوائن کرنا تھیں۔ ان کے مطابق اب تک میرے بچے کی پیدائش ہو چکی تھی اور میٹرنٹی کا عرصہ بھی گزر چکا تھا تو اب مجھے اپنے انسٹی ٹیوشن میں جانا تھا اور یہ کہ ابھی تک میں نے فیس بھی ادا نہیں کی تھی۔ اس خط کو پڑھ کر تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ ایسا کب سوچا تھا کہ جس بہانے سے میں نے ویزا لیا تھا، انگریز اس کے بارے میں اتنے سنجیدہ ہو جائیں گے..... بھلا کون پڑھنا چاہتا تھا اور میرے پاس فیس کے لیے کہاں پیسے تھے۔ جوابی خط لکھا کہ ابھی بچہ چھوٹا ہے اور فیس ادا کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے تو اس کے جواب میں سخت خط آیا کہ میرا ویزا ایک ماہ کے اندر کینسل کر دیا جائے گا اور مجھے لوٹ کر واپس اپنے ملک جانا ہوگا۔ اب نئی صورتِ حال میں پھنس گئی تھی، مجبوراً اپنا کچھ زیور بیچا اور فیس ادا کی۔

کھینچ تان کر ہر بار مشکل سے فیس ادا کرتی اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، ورنہ یہاں کا ویزا کینسل ہو جاتا۔ میری تعلیم مکمل ہونے تک سمیر دو سال کا ہو گیا تھا اور سلمان کا کام بھی جم گیا تھا۔ میں نے بھی کئی جگہ پر کام کے لیے اپلائی کر رکھا تھا، ایک کمپنی میں مجھے ریسپشنسٹ کی ملازمت مل گئی تھی، اس سے کچھ حالات بہتر ہوئے، اپنی ملازمت پر مجھے اپنے لباس اور حلیے پر کافی توجہ دینا پڑتی تھی، اس کے لیے سلمان ہمیشہ سیکنڈ ہینڈ چیزوں میں سے کچھ نہ کچھ تلاش کر کے لے آتا تھا۔ میں اس علاقے سے نکلنا چاہتی تھی، اس وقت سے پہلے کہ جب سمیر کو اسکول جانا تھا۔ میں اس گھٹیا علاقے کے اسکول میں اسے نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور ہمیں پردیس آئے ہوئے پانچ برس بیت گئے تھے..... سلمان کے ابا کا انتقال ہوا تو اس وقت جانے کے وسائل نہ تھے اور جب میرے ابا کا انتقال ہوا تو اس وقت ہمارے پاسپورٹ مستقل ویزا لگنے کے لیے جمع کروائے ہوئے تھے۔ دونوں ہی ان حالات میں تڑپ کر رہ گئے مگر یہ زندگی ہمارا اپنا انتخاب تھی..... بالخصوص میرا۔

☆☆☆

سمیر مجھے گھر چھوڑ کر گیا تو میرے گلے میں پھندے سے پڑ رہے تھے..... ہچکی، ہچکی کھائی ہو رہی تھی اور جسم تھکاوٹ سے چُور ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ جانے کتنے ہی میل بھاگ، بھاگ کر آئی ہوں۔ اب بڑھاپا آ رہا ہے۔ میں نے خود کو بتایا، کبھی اس سے پہلے ایسا محسوس نہیں ہوا تھا، ایسی تھکاوٹ، ایسی ناطاقتی۔ میں صوفے پر ہی دراز ہو گئی، جوتے تک نہ اتارے تھے۔ چائے بنانے کا سوچا مگر طبیعت بہت خراب تھی، سو دو... تک میز پر رکھا تھا، دو ایک چیزیں ایسی تھیں جو کہ فریج اور فریزر میں رکھنی تھیں، اس کے علاوہ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی دھرا تھا۔

''کہاں غائب ہیں جناب؟'' ہارون کا پیغام آیا تھا۔

''گھر پر ہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں آیا تھا چار بجے۔'' پیغام آیا۔ ''آنے سے پہلے پیغام بھیجا تھا، جواب نہ آیا تو میں سمجھا کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں۔''

''سوری، میں نے آپ کا پیغام دیکھا ہی نہیں..... کچھ خریداری کرنا تھی، باہر گئی تھی، سمیر کے ساتھ۔''

''اچھا، کیا، کیا خریدا؟''

''بس عام سودا سلف اور اپنے لیے کچھ پرفیوم وغیرہ۔''

''خوشبوؤں کی تو دیوانی ہیں آپ..... حالانکہ آپ کو ان کی ضرورت بھی نہیں۔ اتنے اچھے پرفیوم تو لگاتی ہیں آپ۔''

''اچھے تھے..... اب تو ان میں خوشبو نہیں رہی۔'' کمزوری کے باوجود مجھے ہارون سے تبادلۂ خیالات کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

''ارے ..... ابھی تو کل آپ نے اتنا اچھا پرفیوم لگا رکھا تھا، چنبیلی کی خوشبو تھی اس میں۔''

''واقعی؟ کیا آپ کو اس کی خوشبو آئی تھی؟ مجھے تو لگتا ہے کہ میرے سارے پرفیوم بے بُو ہو چکے ہیں۔''

''ابھی تک میری گاڑی میں آپ کے اس پرفیوم کی خوشبو رچی ہے۔''

''کل سے لے کر ابھی تک؟ زور بیان ہے آپ کا۔''

''یقین نہیں آیا تو خود آ کر سونگھ لیں.....''

''کہاں آ کر؟''

''میں آ جاتا ہوں، آپ کے گھر کے قریب ہی ہوں۔''

''ارے نہیں، اِس وقت نہیں، میں بہت تھکی ہوئی ہوں اور آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''تو ہم بے آرام کرتے ہیں کیا آپ کو؟'' اس کے پیغام میں شکوہ تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ ہارون کی قربت میں مجھے بہت اچھا محسوس ہوتا تھا مگر اس وقت میرا بالکل اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے مام آپ کی؟'' سمیر کا پیغام آیا تھا۔

''تھکاوٹ ہے بہت زیادہ، آرام کروں گی کل تک تو بہتر ہو جاؤں گی۔''

''او کے مام، اپنا خیال رکھیں، کوئی دوا وغیرہ لے لیں۔'' اس نے پیغام بھیجا، میں نے پڑھ کر فون ایک طرف رکھ دیا۔ ہمت کر کے اٹھی کہ کچھ اور نہیں تو چائے بنا کر دو بسکٹ لے لوں اور اس کے ساتھ درد کی دو گولیاں تو جسم کا درد کم ہو۔

☆☆☆

اتنا آسان کہاں تھا کہ ہم کسی بہتر علاقے میں گھر لے لیتے۔ اب یہ امید نظر آئی تھی کہ کونسل کی طرف سے جو چھوٹے، چھوٹے گھر آفر کیے جاتے ہیں، ان کی قیمت تیس، پینتیس سالوں میں ادا کرنا ہوتی ہے، ویزے کا اسٹیٹس تبدیل ہوا تھا تو اب ہم اس گھر کے لیے درخواست دے سکتے تھے۔ طویل انتظار کے بعد ایک نسبتاً اچھے علاقے میں ہمیں گھر مل گیا تھا، بے سروسامانی تو تھی مگر مجھے یہ خوشی تھی کہ اب سمیر کسی اچھے علاقے کے اسکول میں جائے گا۔ سلمان اسی کاروبار کو اس بہتر علاقے میں کر سکے گا۔ سلمان اب مختلف علاقوں میں ایسے اسٹال لگانے لگا تھا، کہیں اتوار کو، کہیں جمعے کو اور کہیں ہفتے کو۔ باقی دنوں میں وہ اپنے اسی پرانے اسٹال پر جاتا تھا، وہاں اس نے ہر روز کے کام کے لیے اور لڑکوں کو ملازم رکھ لیا تھا۔

اب ہم جس علاقے میں رہتے تھے اور اپنا گھر تھا تو کم از کم کوئی بہن بھائی آنا چاہتا تو آ سکتا تھا۔ اتنی طویل آزمائش سے گزر رہے تھے، کچھ رقم جوڑ رکھی تھی تو پانچ سال کے سمیر کو لے کر پہلی بار اسے اس کے والدین کے خاندانوں سے ملوانے کے لیے گئے تھے۔ ملک میں کتنا کچھ بدل چکا تھا۔ پائی، پائی جوڑ کر جو چیزیں میں وہاں سے تحائف کے طور پر اپنے بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کے لیے لے کر آئی تھی، ان سب نے ان سے کہیں بہتر چیزیں پہن رکھی تھیں۔ سویٹر، بیگ، جوتے، گھڑیاں۔ سب کچھ وہاں دستیاب تھا اور اس سے سستا بھی جتنے میں یہاں سے میں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر وہ سب کچھ خریدا تھا۔

سلمان کی اماں تو اپنے بیٹے اور پوتے کو دیکھ کر جی اٹھی تھیں، بیچاری تنہا رہ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے گاؤں کی ایک بیوہ عورت کو اپنی دوسرا ہٹ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ انہوں نے بارہا کہا کہ ہم لوٹ آئیں مگر ہم کون سا لوٹ کر آنے کے لیے ملک چھوڑ کر گئے تھے۔ ایک ماہ گزرنے کا علم بھی نہ ہوا اور ہم واپس لوٹ آئے۔ سمیر کو پاکستان بہت پسند آیا تھا کیونکہ وہاں بہت سے اس کے اپنے تھے، یہاں تو وہ تقریباً تنہا ہی تھا۔

لیکن اس کا اسکول شروع ہو جائے گا تو وہ بہل جائے گا۔ ہم دونوں بھی لوٹ کر کچھ دن اداس رہے مگر اپنی زندگی کے دھندے شروع کرتے ہی سب کچھ بھول بھال گئے۔ پاکستان میں سلمان اپنے کچھ ایسے دوستوں سے بھی ملا تھا جو کہ کپڑے کے کاروبار میں تھے، ان کے ذریعے اس نے مختلف تجربات کیے، کھیلوں کے لیے پہنے جانے والے ٹریک سوٹ، پاکستانی ملبوسات وغیرہ اور اپنے انہی سٹالوں پر اس نے ان اضافی آئٹم کو بھی متعارف کروایا جس سے اس کا کام بہت اچھا ہو گیا تھا۔ وہ سال میں ایک بار اسی سلسلے میں پاکستان جانے لگا، وہ جب بھی پاکستان سے لوٹ کر آتا تو ایسا لگتا جیسے... وہ اپنے آپ کو وہاں چھوڑ آیا ہو۔ میں اس کے بعد نہیں جا سکی تھی کہ مجھے اتنا شوق ہی نہ تھا۔

☆☆☆

''سمیر..... سمیر۔'' میں سوتے میں ہی بڑبڑا رہی تھی اور اتنا سا بولنے سے ہی مجھے کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ میں نے اپنا فون اٹھایا، اس کی بیٹری ختم ہو گئی تھی، جانے میں نے کیسے چائے بنا کر پی تھی اور کون سی دوا لی تھی، میں سو گئی تھی مگر یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ میں کتنی دیر تک سوتی رہی تھی۔ فون کا چارجر کمرے میں تھا، میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بالکل نہ اٹھ سکی، مجھے تو لگا کہ میں کروٹ تک نہیں بدل سکتی تھی۔ ''چکر اتنے آ رہے ہیں کہ جیسے زمین گھوم رہی ہو، ایسا بھی کیا ہو گیا ہے مجھے اچانک؟''

''ہارون۔'' ذہن میں بھی اس کا نام آیا اور منہ سے بھی ہولے سے نکل گیا جیسے اس تک میری آواز پہنچ رہی ہو۔ فون بند ہو گیا تھا تو وقت کا علم ہو رہا تھا نہ دن کا، جانے کب تک میں سوتی رہی تھی۔ ''سمیر اور ہارون دونوں کالیں کر رہے ہوں گے، پیغام بھیج رہے ہوں گے۔'' میں نے اٹھنے کی ایک اور کوشش کی کیونکہ باتھ روم جانے کی طلب ہو رہی تھی۔ درد کی ایک لہر نے سر سے ٹانگوں تک تیزی سے سفر کیا، میں نے صوفے کو تھام کر خود کو گرنے سے روکا مگر دوبارہ کھڑی نہ ہو سکی تھی۔ چھوٹے بچے کی طرح گھٹنوں پر چلتے ہوئے میں غسل خانے تک گئی اور خود کو جسم کی پوری طاقت سے کھڑا کر پائی عجیب سی حالت ہو رہی تھی کہ وہیں بیٹھے، بیٹھے میں نے بغیر صابن کے ہاتھ دھوئے اور اسی لوٹے سے منہ لگا کر پانی کے چند گھونٹ پیے، میرا حلق بالکل بند ہو رہا تھا، پانی تک مشکل سے نگل پائی تھی۔

☆☆☆

''اگر مجھے کچھ ہو جائے زارا تو؟'' سلمان نے اچانک سوال کیا تھا۔ تھوڑے دن پہلے ہی وہ پاکستان سے ہو کر آیا تھا، اس نے بتایا تھا کہ اماں بیمار رہتی ہیں۔

''کیا ہو جائے اور کیوں ہو جائے؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''اگر میں نہ رہوں تو؟'' اس نے سوال واضح کیا۔ اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا تھا۔

''کیوں نہ رہو؟ تم ٹھیک تو ہو ناں، طبیعت تو خراب نہیں ہے تمہاری؟'' میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

''بس ایسے ہی ایک خوف سا دل میں بیٹھ گیا ہے زارا، پردیس میں ہی مٹی ہو جاؤں گا، اپنے وطن کی مٹی بھی نصیب نہیں ہو گی۔'' لگ رہا تھا کہ اس دفعہ اماں نے اس کی خوب جذباتی بلیک میلنگ کی تھی۔

''ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ مٹی تو جہاں کی بھی ہو مٹی ہوتی ہے، مرنے والے کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مٹی کہاں کی ہے، سوکھی ہے کہ گیلی۔'' میں نے اس کے کاندھے پر سر رکھ کر اسے تسلی دی۔

''اپنی مٹی اپنی ہوتی ہے زارا، یہاں تو قبر بھی مفت میں نہیں ملتی۔ ہم نے کون سا اپنے ملک کی مٹی سے وفا کی ہے جو ہمیں وہاں دفن ہونا نصیب ہو گا۔''

''نہیں تو نہ سہی..... جہاں پر مرنا اور دفن ہونا نصیب میں لکھا ہے، وہیں ہو گا۔ اس طرح کی باتیں سوچ، سوچ کر خود کو ہلکان مت کیا کرو۔''

''اگر میں یہاں مر گیا تو مجھے واپس لے کر جاؤ گی زارا؟ مجھے اپنی دھرتی ماں کی آغوش میں سونا ہے۔''

''اس وقت اگر ہم کسی اور موضوع پر بات کریں تو اچھا ہو گا سلمان۔''

''ہماری ائر لائن میتوں کو مفت میں لے کر جاتی

ہے، اگر تم نہ بھی جا سکیں تو مجھے بھجوا دینا پلیز۔''

''سلمان.....'' میں چیخی۔ ''بس میں تم سے بات نہیں کر رہی اگر تم اسی موضوع پر بات کرتے رہو گے تو۔'' میں منہ پھیر کر لیٹ گئی مگر دیر تک نیند نہ آئی کہ سلمان ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا۔ دیر تک خاموشی ہم دونوں کے بیچ میں لیٹی رہی۔

''اگر کبھی لگے کہ پردیس میں زندگی دشوار ہے تو سمیر کو لے کر لوٹ جانا..... دھرتی ماں سے معافی مانگ لینا، اس کا دامن بہت وسیع ہے۔'' اس نے مجھے اپنے قریب کر کے میرے کان میں سرگوشی کی۔

☆☆☆

چھ سال کی عمر سے سمیر کا اسکول شروع ہو گیا تھا، وہ اسکول سے ہر روز کوئی نئی بات سیکھ کر آتا تھا۔ میں اسے گھر سے لنچ باکس بنا کر دیتی اور وہ ہر روز اسی طرح واپس آ جاتا، میں اس کی ٹیچر سے بات کرنے کے لیے گئی کہ وہ لنچ کیوں نہیں کھاتا تھا۔ علم ہوا کہ وہ اسکول میں فراہم کیا جانے والا لنچ کھاتا تھا۔

''مگر اسے اس کی اجازت نہیں ہے۔'' میں نے سختی سے ٹیچر سے کہا۔

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیونکہ وہ حلال نہیں ہوتا ہے؟''

''حلال اور حرام کیا ہوتا ہے؟ وہ سب بھی تو کھانے کی چیزیں ہیں، اگر اس کے باقی کلاس فیلو کھاتے ہیں اور انہیں کچھ نہیں ہوتا تو اسے بھی نہیں ہو گا؟'' اس نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں سمیر مسلمان ہے اور ہم کھانے پینے میں حلال اور حرام کی تخصیص سے تمیز کرتے ہیں۔ آپ آئندہ اسے اسکول سے لنچ نہیں لینے دیں گی پلیز۔'' میں نے اس کی منت کی۔

''آپ کے مذہب میں کیا حرام ہے اور کیا حلال؟''

''کسی بھی قسم کا گوشت نہیں کھا سکتا سمیر کیونکہ وہ اللہ کے نام پر حلال نہیں کیا جاتا..... یوں بھی علم نہیں کہ آپ کے اسکول میں کس، کس جانور کا گوشت بچوں کو کھلایا جاتا ہے۔''

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروا لیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

''سمیر صرف آلو کے چپس لے کر کھاتا ہے، دودھ سب بچوں کو دیا جاتا ہے، دودھ تو حلال ہی ہوتا ہے ناں۔''

''چپس کس تیل میں فرائی کیے جاتے ہیں، اس کے بارے میں بھی مجھے شک ہے، جانوروں کی چربی استعمال کرتے ہوں گے۔''

''آپ کو اگر سمجھانا ہے تو سمیر کو سمجھائیں، بچوں کو اسکول میں وہ سب کھانے سے منع نہیں کیا جا سکتا جو کہ ان کے باقی کولیگ کھا رہے ہوتے ہیں اور وہ سب ان کے اسکول کی طرف سے مفت فراہم کیا جاتا ہے۔'' اسے سمجھانا بے سود تھا، سمیر کو سمجھایا اور اس دن سے میں نے معمول بنا لیا کہ بہت سویرے اٹھ کر اپنے کام پر جانے سے پہلے سمیر کو تازہ چپس بنا کر دیتی تھی۔ اب مجھے تسلی تھی کہ وہ کچھ غلط سلط نہیں کھا رہا ہوگا۔

اس روز میں کام سے جلدی فارغ ہوگئی تھی تو سوچا کہ بس اسٹاپ سے گھر جاتے ہوئے راستے میں سمیر کا اسکول پڑتا ہے، اسے ساتھ لیتی ہوئی چلی جاؤں۔ اسکول کے باہر میں والدین کے ہجوم میں کھڑی تھی، جب میں نے اسے باہر کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے دھیان میں تھا، میں اسے دیکھ رہی تھی، ماشاء اللہ اس کی اٹھان اچھی تھی۔ اب تو ہمارے حالات ایسے تھے کہ اس کی خوراک بھی اچھی تھی۔ وہ بڑے سے کوڑا دان کے پاس رکا تھا، بیگ سے لنچ باکس نکال کر اس نے اس کوڑا دان میں خالی کیا اور اسے واپس اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ میں نے اس کی چوری پکڑ لی تھی، میں چند قدم دور ہوگئی اور جب وہ گیٹ کے پاس پہنچا تو میں اس وقت یوں اس کے قریب آئی جیسے میں اسی وقت پہنچی تھی۔

''ہائے مام۔'' وہ میرے ساتھ لپٹ گیا۔ ''آپ مجھے لینے آئی ہیں؟''

''ہاں میں نے دفتر سے واپسی پر سوچا کہ تمہیں لیتی ہوئی جاؤں.....'' وہ خوش ہوگیا تھا اور مجھ سے آگے آگے گھر کی طرف چل رہا تھا۔ میں اسی وقت اس سے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

''سلمان، سمیر اسکول سے لے کر لنچ کھاتا ہے، میں نے چیک کیا ہے، اسکول میں چپس جانوروں کی چربی کے ساتھ فرائی کیے جاتے ہیں، میں نے اسے منع بھی کیا تھا اور گھر سے چپس بنا کر دیتی تھی مگر وہ چپس کوڑا دان میں ڈال دیتا ہے، کہہ رہا تھا کہ وہ ڈھیلے اور ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، اسے تازہ تلے ہوئے چپس پسند ہیں۔'' میں نے اس رات سمیر سے بات کرنے کے بعد سلمان سے بات کی، اس امید پر کہ وہ اسے سمجھائے گا۔

''یہ سب تو ہونا تھا زارا۔ پردیس بہت سی چیزوں کی وجہ سے برا ہے، یہاں رہ کر تم اپنے بچوں کو بہت سی غلط باتوں سے بچا نہیں پاؤ گی، انہیں ہر حرام سے دور نہیں رکھ پاؤ گی۔'' سلمان نے طنز سے کہا تھا۔

''ایسا ہرگز نہیں ہے سلمان کہ یہاں رہنے والا ہر بچہ غلط اور حرام کاموں میں ملوث ہے، بہت سے گھرانوں کے بچے نیک عادات والے، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور والدین کے فرمانبردار ہیں۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''ان گھروں کا ماحول بھی اسی طرح کا ہے..... ہماری طرح نہیں کہ چند سالوں میں اپنی اقدار بھلا کر ان کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔'' وہ صاف میرے مغربی لباس پر چوٹ کر رہا تھا۔

''میرے لباس میں کوئی بے حیائی نہیں جھلکتی، ایسا لباس پہننا میری مجبوری ہے، میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ.....''

''میں تمہارے لباس پر تنقید نہیں کر رہا..... سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم میں قناعت ہوتی تو اس ملک میں آنا ہی ہماری مجبوری نہیں تھا۔ وہاں ملک میں میری ماں تنہائیوں کے عذاب جھیلتی ہے۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

''تم جاتے تو ہو ہر سال انہیں ملنے.....'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''تمہیں اگر کہا جائے کہ اپنے بیٹے سے سال بھر نہ ملو تو؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔

''اس کا کیا موازنہ ہوا؟'' میں گڑبڑا گئی۔

''میرے ماں باپ بھی تو چھوٹے تھے.....''

''تم تو انہیں چھوڑ کر بہر حال ہمارے ہاں آ گئی تھیں، میں اس کی بھی بات نہیں کر رہا۔ اب بھی وقت ہے زارا، لوٹ چلو۔ ماں کو آخری عمر میں کچھ خوشیاں دے دیں گے تو ہمیں بھی اپنی آخری عمر میں خوشیاں مل جائیں گی۔ پردیس میں رہنے کا شوق تو تم نے پورا کر لیا ناں۔'' اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

''سلمان۔ تم حواس میں تو ہو..... صرف تین سال کے بعد ہمیں یہاں کی شہریت مل جائے گی، یہاں کا پاسپورٹ بھی۔'' میں نے اسے احساس دلایا۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' اس نے بے تاثر لہجے میں سوال کیا۔

''ہمیں یہاں کی تمام سہولیات مل جائیں گی، مفت علاج، ووٹ دینے کا حق، دنیا کے کسی بھی ملک میں جانے کے لیے ہمیں بہ آسانی ویزا مل جائے گا۔ یورپ کے کئی ملکوں میں ہم بنا ویزے کے جا سکیں گے۔'' میں نے اسے سب گنوایا۔

''یہاں ووٹ دے کر ہم نے کیا کرنا ہے زارا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''جن ممالک میں ہم بنا ویزے کے جا سکیں گے یا بہ آسانی ویزا مل سکے گا، وہاں جانے کے لیے اور بھی ضروریات ہوتی ہیں۔ آٹھ برسوں میں تو تفریح کے نام پر اس شہر میں بھی کہیں نہیں جا سکے۔ اس گھر میں آج تک ہم فرنیچر مکمل نہیں کر سکے، جو کچھ بھی خریدا ہے سب سیکنڈ ہینڈ لیا ہے اس کے باوجود بھی ہمارا ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ اگر میرا کاروبار نہ ہو تو ہم اس گھر کی قسط بھی نہ دے سکیں۔ تمہاری تنخواہ سے تمہارا آنے جانے کا اور تمہارے لباس وغیرہ کے اخراجات نکال کر اتنا ہی بچتا ہے کہ ہم بل دے لیتے ہیں..... آج تک ہم گاڑی نہیں خرید سکے۔''

''اتاؤلے کیوں ہو رہے ہو سلمان، سب کچھ ہو جائے گا۔ گاڑی بھی آ جائے گی، میری کچھ بچت ہے، فرنیچر بھی پورا ہو جائے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''بس عمر رائگاں جانے کا احساس ہی پیچھا نہیں چھوڑتا زارا۔''

''کیوں عمر رائگاں کی تم نے؟ کیا میں تنہا قصور وار ہوں اس کی؟''

''بس پیروں میں زنجیریں ہی ایسی پڑیں کہ آنا بھی پڑا اور لوٹ کر بھی نہ جا سکا۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تو ہم زنجیریں ہیں کیا؟'' میں نے ابرو اچکا کر سوال کیا۔

''تم لوگ نہیں..... محبت کی زنجیریں ہیں جو مجھے تم لوگوں سے ہے، انہیں توڑ کر نہیں جا سکتا..... احساسِ زیاں بھی ہے مگر اسی احساس کے ساتھ جینا مقدر ٹھہرا۔'' اس نے کہا تو میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ سمیر اب کافی بڑا ہو گیا تھا، زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی تو یہی وقت تھا کہ اس کے پیروں کی زنجیروں کو اور مضبوط کر دیا جائے۔

''تمہیں میرے ساتھ زندگی برباد ہونے کا پچھتاوا ہے تو تم لوٹ جاؤ..... نہ رہو یہاں احساسِ زیاں کے ساتھ۔'' میں نے غصے سے کروٹ بدلی۔ جانے کس گھڑی میرے منہ سے وہ بات نکلی تھی کہ اگلے ہی روز پاکستان سے اس کی اماں کے شدید بیمار ہونے کی خبر ملی۔ اس نے مجھ سے پوچھا نہ بتایا اور اپنی ٹکٹ کروالی۔

''ابھی چند دن پہلے ہی تو تم لوٹے ہو پاکستان سے سلمان۔'' میں نے اسے احساس دلانا چاہا کہ ہم اس کے یوں جلدی، جلدی کے پاکستان کے پھیرے افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ جواب میں اس نے صرف غصے سے مجھے گھورا۔

☆☆☆

فون تھوڑا سا چارج ہوا تھا تو میں نے کمرے میں لیٹے، لیٹے ہی سمیر کو کال کی، اس نے بہت دیر کے بعد فون اٹھایا تو اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

''مام، کیسی ہیں..... میرے کسی پیغام کا.....

جواب'' اتنا ہی کہا تھا کہ اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔

''بہت تکلیف میں ہوں بیٹے.....'' کھانس، کھانس کر میرا برا حال ہو گیا تھا۔ جسم میں انتہا کا درد ہے۔'' مشکل سے اتنا کہہ سکی۔

''کوئی دوا لی مام..... ڈاکٹر کے پاس چلی جائیں۔'' اس نے کہا۔

''تم بھی کوئی دوا لو بیٹا، اتنی کھانسی ہے، کل کہا بھی تھا کہ آئس کریم نہ کھاتے مگر.....'' کھانسی کا حملہ ہوا۔ ''کوشش کرتی ہوں بیٹا۔'' میں نے اسے کہہ کر فون بند کیا۔

اسے کیا بتاتی کی میں اٹھنے کی سکت سے بھی محروم تھی، کجا یہ کہ گاڑی چلاتی۔ فون پر ہارون کے بھی کئی پیغامات تھے۔ ان کا جواب دینا تو ایک طرف، مجھ میں ان کو پڑھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ جانتی تھی کہ وہ کتنا پریشان ہوگا مگر کمزوری اور نقاہت نے بے بس کر دیا تھا۔ خود کو کھینچ تان کر اٹھایا اور کچن میں جا کر کیبنٹ سے درد کی دوا نکالی، اسے دودھ کے ساتھ کھایا اور تھرما میٹر سے بخار چیک کیا۔ بخار تھا مگر اتنا تیز نہیں جتنا جسم ٹوٹ رہا تھا، سینے سے درد کی لہر اٹھتی تھی اور کمر پر کندھوں کے درمیان پچھلی طرف جاتی تھی، یوں جیسے اس جگہ پر آگ لگی ہوئی ہو۔ کچن کے فرش پر ہی نڈھال ہو کر گر سی گئی، فون سے بمشکل اپنے ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کیا۔ اس سے وقت لیا جو کہ سات گھنٹے بعد کا تھا، سات گھنٹے تک مجھے اسی کرب میں رہنا تھا۔

☆☆☆

دفتر کے نمبر پر پیغام بھیجا کہ میں نہیں آسکوں گی، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہاں سے پیغام آ گیا کہ میری چھٹی منظور ہو گئی تھی کیونکہ جو چائنیز وفد آیا ہوا تھا اور جن کے ساتھ میری ڈیوٹی تھی، وہ سب بیمار ہو گئے تھے اور انہیں بخار کے ساتھ الٹیاں آ رہی تھیں۔ دفتر والوں نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ پچھلے روز جو ہم سب نے اکٹھے کہیں لنچ کیا تھا، اس میں کوئی مسئلہ ہو گا جو سب بیمار پڑے تھے۔ میں نے تو وہ لنچ نہیں کھایا تھا کیونکہ ان سب نے ایک چینی ریستوران کا انتخاب کیا تھا اور وہاں میرے کھانے کے لیے کچھ نہ تھا تو میں نے بہانہ بنا دیا تھا کہ میں نے ناشتا بہت پیٹ بھر کر کیا تھا اور چائے کے ساتھ بھی سینڈوچ لیا تھا، حالانکہ ایسا کچھ نہ تھا مگر یہ کہتی کہ حلال اور حرام کا مسئلہ ہے تو وہ بدتہذیبی شمار ہوتی۔

میں نے کئی ملازمتیں بدلی تھیں اور اب اس ملازمت پر میں گزشتہ دس برس سے قائم تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے تین سال مکمل ہونے کے بعد مجھے کمپنی کی طرف سے گاڑی خریدنے کے لیے قرضے کی پیش کش ہوئی تھی۔ میں نے اس کا فائدہ اٹھا کر اپنے کمپنی کے ہی کولیگ ہارون کے توسط سے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی لے لی تھی۔ گاڑی کا عمومی استعمال کام سے گھر اور گھر سے کام کا تھا، کم از کم میری بسیں اور ٹرینیں بدل، بدل کر کام پر جانے سے جان چھوٹ گئی تھی۔ پہلی بار ہارون سے گاڑی کے حصول کے سلسلے میں ہی تعارف ہوا تھا، اس کے بعد یہ تعارف دوستی میں بدلا اور ہم اکثر لنچ ساتھ بیٹھ کر کرنے لگے..... اس میں ہم ایک دوسرے کا لنچ شیئر بھی کر لیتے تھے۔

ہارون کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا، اپنی غربت مٹانے کو اپنی نو بیاہتا بیوی کو وہیں چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ جب تک اس کی بہنوں کی شادیاں نہیں ہوئیں اور اس کے ماں باپ حیات رہے، اس کی بیوی وہیں رہی تھی۔ والدین کی وفات کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کے چار بچے تھے، تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ اس کی بیوی ایک سادہ سی عورت تھی، وہ اسے لنچ میں رات کے بچے ہوئے سالن، سبزی کے ساتھ پراٹھے بنا کر دیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ کے بنے مکھن کے پراٹھے بہت لذیذ ہوتے تھے مگر میں کم ہی کھاتی کہ مجھے اپنی اسمارٹ نیس کا خیال رہتا تھا۔ یہ اسمارٹ نیس میری ملازمت کے لیے اہم تھی۔ مجھے غیر ملکی وفود کے ساتھ ذمے داری دی جاتی تھی اور اس کے لیے مجھے..... زبان پر عبور ہونا، لباس کا اچھا ہونا اور ادب آداب کے ساتھ، ساتھ اسمارٹ ہونا بھی اہم تھا۔

☆☆☆

ائر پورٹ پر لینڈنگ سے چند لمحے پہلے ہی وہ طیارہ گر کر تباہ ہوا تھا..... مجھے علم بھی نہیں کہ وہ کس ائر لائن سے گیا تھا اور کیسے۔ اسے لاہور کی پرواز نہیں ملی تھی تو اس نے کراچی اور وہاں سے اسلام آباد کی پرواز بک کروالی تھی۔ وہاں سے اس کا ارادہ براستہ موٹروے لاہور جانے کا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے ایک دوست نے بتایا تھا جس نے اس کی ساری بکنگ کروائی تھی۔ سلمان نے اس سے کہا تھا کہ سب سے پہلی، پہلی جو

پروازیں ملتی ہیں، وہ بک کر دے۔ اسی دوست نے اپنی بیوی کے ہمراہ میرے گھر پر آ کر مجھے وہ بری خبر دی تھی..... اس پرواز کا کوئی مسافر زندہ نہیں بچا تھا، سب کچھ جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ اسے بالآخر اپنے وطن کی مٹی نصیب ہو گئی تھی، اس طرح کہ کوئی اسے اس مٹی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکا تھا۔

پاکستان کال کی تو علم ہوا کہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی اماں بھی راہیِ عدم ہوئی تھیں۔ ماں بیٹا اکٹھے ہی اس سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ اب پاکستان میں میرے لیے کیا بچا تھا، والدین بھی نہ رہے تھے اور بہن بھائیوں کی اپنی، اپنی زندگیاں تھیں۔ ابا کی وراثت کی تقسیم میں سے میرا حصہ انہوں نے مجھے بھجوایا تو اس بڑی رقم کو میں نے سمیر کی تعلیم کے لیے محفوظ کر لیا۔ زندگی کا سفر اب تنہا ہی گزارنا تھا۔ سلمان کے جانے سے احساس ہوا تھا کہ ملک سے ہجرت کر کے آنا کتنی بڑی غلطی تھی۔ اتنا عرصہ گزار کر بھی ہم اپنی شناخت وہی رکھتے ہیں..... یعنی تیسرے درجے کے ممالک کے شہری ہونے کی، اس ملک کی شہریت تو حاصل ہو گئی تھی مگر اس ملک کے باسیوں نے ہمیں اس طرح کبھی تسلیم نہیں کیا۔ صبح کو شام اور رات کو دن کرنا ہی زندگی کا مقصد رہ گیا تھا۔

ہارون نے مجھے عدت مکمل ہونے کے بعد نکاح کی پیش کش کی تھی۔ اس کی بیوی کا دل پاکستان میں زیادہ لگتا تھا اور وہ اکثر جاتی رہتی تھی۔ اب ایک ایک کر کے اس نے سارے بچوں کو بھی پاکستان میں اسکول اور کالج میں داخل کروا دیا تھا اور اسی بہانے خود بھی وہاں کرایے کا ایک مکان لے کر رہ رہی تھی۔ چھٹیوں میں کسی سال وہ آ جاتی تھی، کبھی نہیں آتی تھی۔ عموماً بیٹی اس کے ساتھ آتی تھی، بیٹوں کا دل بھی پاکستان میں لگ گیا تھا تو وہ کم، کم ہی آتے تھے۔ سال میں ایک بار ہارون بھی دو تین ہفتے کے لیے چلا جاتا۔

''سمیر بہت بڑا ہو گیا ہے، میں دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' میں نے شائستگی سے کہا تھا۔

''سمیر کو میں اپنے بیٹوں کی طرح.....''

''نہیں ہارون، میں چار بچوں والی کسی عورت کا گھر نہیں اجاڑ سکتی۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہو گا، ہر کسی کا اپنا مقام ہو گا۔ میری بیوی کو یہاں نہیں رہنا اور آپ پاکستان نہیں جائیں گی، نہ کسی کا آمنا سامنا ہو گا نہ کوئی گھر اجاڑنے کی صورتِ حال ہو گی۔ میں اس کی تحریری رضامندی سے ایسا کروں گا۔ وہ تو بارہا مجھے کہہ چکی ہے کہ.....''

''پلیز ہارون، ایسی بات دوبارہ مت کہیں، مجھے اب شادی نہیں کرنی ہے۔ میری زندگی کا مقصد صرف سمیر کی اچھی پرورش ہے۔ پھر بھی اگر میرا ذہن تبدیل ہوا تو سب سے پہلے آپ کی پیش کش پر غور کروں گی۔''

''سمیر آج آپ کے پاس ہے، چند سالوں میں وہ خود مختار ہو جائے گا اور اس وقت آپ تنہا ہو جائیں گی۔'' وہ مجھے بھیانک مستقبل کا نقشہ دکھا رہا تھا اور میں مصر تھی کہ ایسا نہیں ہو گا۔ موضوع ایک بار بات کرنے سے ہی ختم نہیں ہوا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملتا تو وہ اس سوال کو ضرور دُہراتا۔ سمیر اسکول سے کالج، کالج سے یونیورسٹی اور پھر ملازمت پر بھی چلا آیا اور ہارون کی پیش گوئی کے عین مطابق جب وہ اٹھارہ برس کا ہوا تھا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ گھر سے اپنے دوستوں کے ساتھ منتقل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''تم گھر کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو سمیر، میری جان!'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''مام تمہارے بغیر تنہا کیا کریں گی؟''

''مام پلیز..... سب بچے اس عمر میں گھر چھوڑ کر جاتے ہیں، آپ مجھے جذباتی طور پر بلیک میل نہ کریں.....''

''اس گھر میں کیا کمی ہے؟ کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ، میں سب کچھ تمہاری خواہش کے مطابق کر دوں گی بیٹا۔''

''میں اٹھارہ سال کا ہو گیا ہوں مام، کوئی چھ سال کا بچہ نہیں، مجھے اب گھر چھوڑ کر جانا ہے، اپنی زندگی خود جینا سیکھنا ہے۔''

''تم انگریزوں کے بچوں جیسی باتیں نہ کرو.....'' میں نے لہجے میں سختی پیدا کی۔

اور کیا ہے میری شناخت؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم ایک پاکستانی بچے ہو سمیر۔"

"اچھا۔" میرے کہنے پر وہ منہ پھاڑ کر ہنسا تھا۔ "کس نے کہا ایسا؟"

"میں جو کہہ رہی ہوں۔"

"میں یہیں پیدا ہوا ہے، یہیں پلا بڑھا اور یہیں کی شہریت ہے میری مام، پاکستان میں زندگی میں فقط ایک بار گیا تھا، چند ہفتوں کے لیے، شاید چھ سال کی عمر میں؟"

"تمہارے ماں باپ پاکستانی ہیں سمیر....."

"اچھا....." اس نے کہہ کر قہقہہ لگایا۔ "کہاں ہے آپ کا پاکستانی پاسپورٹ، شہریت؟" وہ پھر ہنسا۔ "سب کچھ تو آپ نے سرینڈر کر دیا تھا مام، یہاں کی شہریت کے لیے، اب آپ کو پاکستان جانے کے لیے ویزے کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس نے مجھے آئینہ دکھایا تھا، میں روتی پیٹتی رہ گئی اور وہ اپنا مختصر سامان لے کر چلا گیا۔ بقول اس کے وہ اب جوان ہو گیا تھا، اس کی اپنی مصروفیات تھیں، دوستیاں تھیں اور شغل۔ گھر ان سب کے لیے مناسب مقام نہ تھا اور میں قدم، قدم پر اس کی حرکتوں پر اعتراض کرتی۔

"میں آپ سے ملنے آتا رہوں گا اور میں آپ سے ایک کال کی دوری پر ہوں گا۔ جب بھی وقت ملے گا اور آپ کے ہاتھ کا کچھ اچھا کھانے کو من چاہے گا تو میں آ جایا کروں گا۔" اس نے مجھے وعدے کی ڈور تھمائی تھی۔

"ہر ویک اینڈ پر گھر آ جایا کرنا بیٹا؟" میں نے ایک درخواست کی۔

"نو مام، بالکل بھی نہیں، ایک ویک اینڈ ہی تو ہوتا ہے زندگی کو انجوائے کرنے کے لیے....." اس نے صاف انکار کر دیا۔ کم، کم ہی آتا تھا مگر وہ آ جاتا تھا، میں بھی بہانوں، بہانوں سے اسے بلاتی رہتی۔ ہر بار اس کی بغل میں ایک نئی لڑکی ہوتی، میں جانتی تھی کہ وہ پیتا پلاتا بھی تھا اور کھانے پینے میں حرام اور حلال میں تمیز بھی نہیں کرتا تھا..... مگر پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا، حلال اور حرام کے چکر سے تو میں اسے اس وقت بھی نہ نکال سکی تھی جب وہ کچی مٹی جیسا خام تھا۔ اس پر اپنا لیا تھا، شاید یہی اسے زندگی میں کامیابی کے حصول کا شارٹ کٹ لگا تھا۔ میرے پاس پچھتاووں کے انبار تھے اور ہارون کا مطالبہ اب بھی زندہ تھا۔

ایک آدھ بار تو کسی کام سے تنگ آ کر سمیر تک نے مجھے کہہ دیا کہ مجھے ہارون کے ساتھ شادی کر لینی چاہیے۔ جانے کب اور کہاں اس نے کچھ ایسا سن لیا تھا، میں شرمندگی سے گڑ سی گئی اور اس سے نظر چرا گئی۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے مام؟ پاپا کے بعد آپ نے کتنی مشکل زندگی گزاری ہے، تنہا رہ رہی ہیں، کوئی سہارا تو نہیں آپ کو کہ پاپا مر گئے اور آپ جیتے جی مر گئیں۔ وہ کیا کہتے ہیں انڈیا میں کہ خاوند مرتا ہے تو عورت کو زندہ اس کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں؟ اس کا ایک نام ہوتا ہے....." وہ سوچ رہا تھا اور لفظ "ستی" اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

"اپنی تازہ ہندو گرل فرینڈ سے پوچھ لینا۔" میں نے غصے سے کہا تو وہ ہنس دیا۔ وہ ایسا ہی تھا، اپنی زندگی اپنے ڈھب سے گزارنے کو گھر سے چلا گیا تھا مگر اسے میرا خیال بھی تھا، میری ایک پکار پر چلا آتا اور ماتھے پر بل بھی نہیں لاتا تھا۔ اپنی ہر گرل فرینڈ سے وہ مجھے ضرور ملواتا تھا۔ اتفاق سے اس کی نظرِ انتخاب ہمیشہ ہندو اور عیسائی لڑکیوں پر ہی پڑتی تھی۔ اس کی حالیہ گرل فرینڈ سمانتھا..... نہ صرف عیسائی تھی بلکہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔

☆☆☆

"میں نے کہا تھا ناں آپ سے کہ سمیر ایک دن آپ کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔" لنچ کرتے ہوئے ہارون نے کہا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ سمیر کئی دنوں سے نہیں آیا۔ فون پر کبھی کبھار پیغام بھیج دیتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے، میری خیریت بھی دریافت کر لیتا ہے۔

"میری خواہش اب بھی زندہ ہے زارا۔" اس نے کہا تھا۔

"پراٹھا کیسا بنا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ کبھی کبھار اپنا لنچ باکس تیار کرتے ہوئے میں اس کے لیے بھی ایک پراٹھا بنا لیتی تھی، اس کی بیوی جتنا اچھا

''پراٹھا اچھا ہے مگر میرے کچن میں بنے تو اور بھی اچھا بنے گا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کسی دن بنالوں گی آپ کے کچن میں آ کر بھی۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ ہر روز میرے گھر کے کچن میں پراٹھا بنایا کرو..... میں کام پر چلا جاؤں تو اس کے بعد آپ کچھ کام وام سمیٹ کر آرام کرو، صوفے پر بیٹھ کر ڈرامے اور فلمیں دیکھو.....''

''نہ بابا نہ..... مجھے ایسی بے مقصد زندگی کی عادت نہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا، دیکھتی تو پگھل جاتی۔

''کیا کبھی آپ کا فیصلہ بدلے گا؟''

''پتا ہے..... اگلے روز سمیر آیا تھا، میں نے اسے لان کی گھاس کاٹنے کے لیے بلایا تھا اور گاڑی میں ویکیوم کلینر مارنے کے لیے، اتنے سے کام سے تنگ پڑ گیا اور مجھے کہنے لگا کہ میں آپ سے شادی کرلوں۔'' بات کرنے کے بعد مجھے اپنی بیوقوفی کا اندازہ ہوا اور وہ ہنس دیا۔

''اسے آپ نے بتایا ہے کہ میری طرف سے آپ کے لیے رشتہ آیا ہوا ہے؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں..... میں نے نہیں بتایا، اس نے شاید کبھی ہمارے بیچ ایسی کوئی بات ہوتے ہوئے سنی ہو۔''

''ہم م م.....'' اس نے گہری سانس لی۔ ''میں تو اسے بے پروا سا انسان لڑکا سمجھتا تھا مگر اب جانا کہ اسے آپ کا کتنا خیال ہے اور وہ آپ کی تنہائی اور بڑھتی عمر کے ساتھ پیدا ہونے والے مسائل کا بہترین حل پیش کرسکتا ہے۔''

''مگر میں نہیں کرسکتی اس عمر میں کسی..... مرد کی غلامی۔''

''غلامی کرنے کو کون کہہ رہا ہے..... آپ جناب تو دل پر راج کرنے کو آئیں گی میری زندگی میں۔'' وہ مسکرایا۔

''جو مزہ دوستی میں ہے، مجھے وہی پسند ہے۔ آپ اپنی پیش کش کو اب دفن کردیں۔''

''یہ تو میرے ساتھ ہی دفن ہوگی.....'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ویسے آپ اتنا حلال اور حرام کے چکر میں رہتی ہیں، یہ مرد اور عورت کے بیچ دوستی کے حلال اور حرام کے اسٹیٹس کے بارے میں آپ کا کیا

''ہمارے بیچ کوئی غلط تعلق نہیں ہے.....'' میں نے کہہ کر خود ہی اپنے الفاظ کے بودے ہونے کو جانچا۔

''ہم کئی بار تنہا ہوتے ہیں، ایک گاڑی میں اکٹھے ساتھ، ساتھ ہوتے ہیں، کبھی آپ میرے گھر پر اور کبھی میں آپ کے گھر پر گھنٹوں ایک ساتھ گزارتے ہیں..... ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہیں ہوتا ماسوائے شیطان کے۔ کبھی بھی کوئی بہک سکتا ہے، آپ شاید بہت مضبوط ہوں گی مگر مجھے تو شیطان ورغلاتا ہے، میرا تو دل مچلتا ہے آپ کی قربت کے لیے، آپ کے ساتھ ہمیشہ اپنے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا کاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید میر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

گھر میں رہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، آپ کے ساتھ زندگی کا سفر، رفیقِ زندگی کے طور پر گزارنے کو جی چاہتا ہے۔ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں زارا، انسان ہوں، میرے پاس ہر طرح کے جذبات ہیں اور ان میں سفلی جذبات بھی ہیں، جسمانی خواہشات بھی ہیں۔ میں سب کچھ آپ کو دیانتداری سے بتا رہا ہوں۔'' وہ سب کچھ دیانتداری سے بتا رہا تھا اور میرے دل میں پرت در پرت خوف بیٹھ رہا تھا۔ واقعی کئی بار ہم بہت زیادہ دیر تک ایک جگہ تنہا رہے تھے، قریب، قریب، ساتھ ساتھ سفر کرتے، کھانا کھاتے، بیٹھ کر میوزک سنتے اور کافی پیتے۔ اس دوران کبھی میرے ذہن میں تو ایسا خیال نہیں آیا تھا کہ ہماری دوستی غلط ہے۔ مگر ہاں ایسا ہی تھا، یہ دوستی غلط ہی ہے۔ اس نے مجھے حقیقت سے آشنا کر دیا تھا، وہ حقیقت جسے میں جانتے ہوئے بھی بھولے ہوئے تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس کے بعد ہمارے بیچ دوستی بھی ختم؟'' میں نے اس کی طرف سے نظر چرائی۔

''نہیں..... اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اس دوستی کو رشتے کا نام دے دینا چاہیے، ایک جائز رشتہ، ہم اس رشتے میں بندھ کر بھی اچھے دوست رہیں گے۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''میں سمیر سے بات کروں گی اور اس کے بارے میں خود بھی سوچوں گی۔''

''شکریہ، اس مان کا کہ آپ میرے بارے میں سوچیں گی۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور میں بھی مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

سمیر سے کیا بات کرنا تھی، اس نے تو پہلے ہی مجھے یہ مشورہ دیا تھا۔ مگر میرے ذہن میں الجھن تھی کہ اس نے وہ سب کب اور کہاں سنا ہوگا یا خود سے اس نے سوچا ہوگا کہ میرے اور ہارون کے بیچ اسی نوعیت کی دوستی ہے جیسی وہ کرتا تھا۔ میں شادی کے بندھن میں اب اس عمر میں نہیں پڑنا چاہتی تھی مگر یہ بھی ایک مستند حقیقت تھی کہ میں ہارون کی دوستی کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ ہارون میرے لیے ایک عادت کی طرح بن گیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر اس سے شادی کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ اگر شادی نہ بھی تو ہم باہم رضامندی سے الگ ہو جائیں گے۔ مگر اس صورت میں مجھ پر طلاق کا دھبا لگتا، وہ مجھے گوارا نہ ہوتا اور میں ایک دوست سے بھی محروم ہو جاتی۔

''اگر اس عمر میں کوئی بچہ وچہ دنیا میں آ گیا تو؟'' میں نے خود سے ہی سوال کیا اور ہنس دی۔ کتنا عجیب لگے گا ناں، یہ عمر تو سمیر کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی ہے۔ ہارون کے دوسرے نمبر کے بیٹے اور بیٹی کا ایک ہی گھر میں رشتہ طے ہوا تھا اور چند ماہ میں شادی ہونے والی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا مقابلے کا امتحان پاس کر کے فارن سروس میں چلا گیا تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا بھی یونیورسٹی میں تھا۔ بچے تو وہ بھی اب پیدا نہیں کرنا چاہے گا مگر اللہ کے کاموں کا کیا پتا۔'' میں نے سوچا۔

''سمیر سے بات تو کرنا پڑے گی مگر کس طرح؟ یہ تو ظاہر ہے کہ مجھے ہی سوچنا ہے۔'' ذہن میں آیا تھا کہ ہارون سے کہوں کہ اس سے بات کرے مگر میری بات ہے، میں اپنی اولاد سے خود کہوں تو بہتر ہے۔

''جب تک ہم اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر لیتے، تب تک ہم دونوں ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے، دفتر میں بھی دو اجنبیوں کی طرح رہیں گے۔'' میں نے اس سے کہا تھا۔

''میری طرف سے تو فیصلہ کر کے ہی سوال کیا گیا تھا، اب تو فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔'' ہارون نے کہا تھا۔

''ہاں دفتر میں اجنبیوں کی طرح رہنے والی بات کچھ عجیب سی ہے۔''

بالکل ایسا ہی ہوا تھا جیسا کہ اس نے کہا تھا، دو دن ہم دفتر میں ایک دوسرے سے نہیں ملے تو اس حوالے سے کئی چہ مگوئیاں ہوئیں، کچھ بے تکلف دوستوں نے تو پوچھ بھی لیا کہ کیا معاملہ ہے۔ اس پر میں نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی کہ دفتر میں اجنبیت کا مظاہرہ کرنا اور پھر کل کلاں کو شادی کرنے سے کئی طرح کی افواہیں جنم لیں گی۔ اس سے اگلے دن سے مجھے چند دن چائنیز وفد کے ساتھ رہنا تھا، اس کے بعد میں

اور وہ اپنا لنچ اکٹھے کرنے کے معمول کو جاری رکھیں گے تاکہ لوگوں کے کان نہ کھڑے ہو جائیں۔

''ہم اس شادی کو کتنا خفیہ رکھ سکیں گے؟'' عجیب سا سوال تھا مگر میں نے بے اختیاری میں پوچھ لیا تھا۔

''کیوں؟ خفیہ کیوں رکھنا ہے؟ کوئی گناہ کا کام تو نہیں۔ دوستی ہماری علی الاعلان ہے اور شادی کو چھپانا ہے؟''

''یونہی، مجھے سوچ کر جھجک محسوس ہوتی ہے.....''

''تم شرماتی ہوئی کتنی اچھی لگ رہی ہو، میں تمہیں دیکھ رہا ہوں زارا۔'' وہ بے دھیانی میں آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ کوئی اور صورتِ حال ہوتی اور اس سے قبل وہ اپنے اندر کی کیفیات کا اظہار نہ کر چکا ہوتا تو میں اس کے ہاتھ تھام کر اسے معافی مانگنے سے منع کرتی۔ جیسے کہ ہم پہلے دوستی میں کرتے تھے۔ اب ہر چیز میں گہری سوچ کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''آپ نے ان دنوں کہیں بیرونِ ملک کا سفر کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا تھا۔

''نہیں۔''

''میں کچھ ٹیسٹ لکھ رہا ہوں، مجھے شک ہے کہ آپ کو کوئی بہت شدید انفیکشن ہے..... ایک سی ٹی اسکین بھی لکھا ہے، سب کچھ ایمرجنسی میں ٹسٹ ہو گا، اس کی رپورٹیں ملیں تو مجھ سے فون پر رابطہ کریں۔''

ڈاکٹر نے ٹیسٹوں کی ایک فہرست مجھے پکڑائی اور میں اسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ بخار کے لیے سویرے گھر سے دوا لے کر نکلی تھی اس لیے بخار کا زور کم تھا مگر جسم اور بالخصوص سینے کا درد، الامان۔ اسپتال کے ویٹنگ ایریا میں بیٹھے ہوئے میں یوں کانپ رہی تھی جیسے کوئی سردی سے کانپ رہا ہو، کمزوری حد سے سوا تھی، میں نے نرس سے درخواست کی کہ وہ میرے ٹیسٹ فوری کروا دے کیونکہ میں بہت تکلیف میں تھی۔ کھانس، کھانس کر میرا برا حال تھا، ارد گرد بیٹھے ہوئے دو تین لوگوں نے میری نرس سے بات چیت کو سنا اور اس سے کہا کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا اگر مجھے پہلے ٹیسٹ کے لیے لے جایا جاتا۔ سی ٹی اسکین آخری ٹیسٹ تھا، اس کے بعد مجھے باہر بیٹھ کر انتظار کرنا تھا۔

''آپ سب لوگ یہاں سے اٹھ جائیں.....'' نرس نے مائیک میں کہا تھا۔ ''سوائے اس سبز لباس والی خاتون کے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا کہ کون سی خاتون سبز لباس میں تھی۔

''آپ بیٹھی رہیں۔'' نرس نے مائیک میں بول کر اشارہ کیا، میں نے اپنے عقب میں دیکھا، کوئی سبز لباس والی خاتون نہ تھی۔ ''آپ میڈم، جو مڑ کر دیکھ رہی ہیں۔'' اس کا اشارہ واضح میری طرف تھا۔ ''آپ بیٹھی رہیں۔'' میری سوالیہ نظر کے جواب میں اس نے تصدیق کی۔ لوگ دور ہٹ گئے تھے۔ ''ان خاتون پر غالباً اسی وائرس کا حملہ ہوا ہے جس کا تذکرہ آج کل ہم ٹیلی وژن اور اخباروں میں دیکھ اور سن رہے ہیں، اس لیے باقی تمام لوگ فاصلے پر چلے جائیں مگر آپ لوگ یہاں سے باہر نہیں نکلیں گے، یہ خاتون چونکہ بہت کھانس رہی ہیں اس لیے امکان غالب ہے کہ آپ میں سے کافی لوگ اس وائرس کو نگل چکے ہوں گے۔ احتیاطاً، آپ لوگ اپنے ہاتھوں کو اپنے ناک اور منہ سے بلکہ چہروں سے دور رکھیں، اپنے لباس کو بھی نہ چھوئیں.....'' وہ بولے جا رہی تھی اور میں لمحوں میں اس سارے ہجوم میں یوں ہو گئی تھی جیسے کہ میں سنگسار کی جا رہی ہوں۔ مجھے چکر آ رہے تھے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

ہوش اور نیم بے ہوشی میں، میں نے خود کو جس جگہ پایا وہ جگہ کسی مردہ خانے جیسی تھی، میں وہاں تنہا تھی اور فاصلے پر کھڑے ہوئے چند لوگ نہ صرف ماسک پہنے ہوئے تھے بلکہ ان کے سروں پر کنٹوپ اور جسم پر پوری پی ای کٹ PE kit تھی۔ ذرا ذرا فاصلے پر چند اور لوگ بھی تھے، سب لوگوں کو دور، دور رکھا گیا تھا اور تین طرف سے پردے ڈالے گئے تھے۔

''آپ چین گئی تھیں؟'' مجھ سے سوال کیا گیا تھا۔

''نہیں، مگر میرا کچھ چینی لوگوں سے رابطہ ہوا ہے ان دنوں۔'' میرا جسم جیسے جکڑا ہوا تھا، مجھے طاقت والی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

''آپ کے پھیپھڑے بہت متاثر ہوئے ہیں، کافی دنوں سے وائرس آپ کے جسم میں موجود ہے۔''
مجھے بری خبر سنائی گئی۔
''ان دنوں آپ کا کسی اور سے رابطہ تو نہیں ہوا، قریبی رابطہ۔''
''ہوا ہے.....'' مجھے یاد آیا، اس روز سمیر آیا تھا اور وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹا رہا تھا، وہ ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرنا چاہ رہا تھا..... اس کے بعد ہم اکٹھے مال گئے تھے، ایک ہی گاڑی میں، میں بہت کھانس رہی تھی۔ اس کے بعد میری اس سے بات ہوئی تھی فون پر تو وہ بھی بہت کھانس رہا تھا، میں نے نرس کو سب بتایا تھا۔
''اپنے بیٹے کا فون نمبر دیں، وہ کسی کے ساتھ رہتا ہے؟'' سوال کیا گیا مگر مجھ سے بات بھی نہیں کی گئی۔ اس کے ساتھ اس کی عیسائی گرل فرینڈ تھی، سامی جا چکی تھی، اس کی اپنے خاوند سے صلح ہوگئی تھی۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

جب تک سمیر تک رسائی کی گئی تب تک سمیر اور اس کی گرل فرینڈ کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی، وہ تین دن سے بخار میں پھنک رہے تھے اور انہیں کوئی سرا نہیں مل رہا تھا کہ ان کی ایسی حالت کیوں تھی۔ انہیں اسپتال منتقل کیا گیا تھا اور جب تک ان کے مرض کی شدت کی تشخیص ہوئی تب تک میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کھو چکی تھی..... سمیر طبی امداد دیر سے ملنے کے باعث وائرس کے حملے سے جانبر نہ ہو سکا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ بھی اس سے اگلے روز اس سے جا ملی تھی اور میں اس قیدِ تنہائی میں بے خبر پڑی رہ گئی تھی۔ کورونا وائرس، جس کے بارے میں اس وقت تک دنیا واقف بھی نہ ہوئی تھی اور چین کے ایک صوبے میں اس کے متاثرین کی اطلاع تھی۔ وہ سفر کر کے کہاں اس خطے میں پہنچ گیا تھا، اور میں اس کے اولین متاثرین میں تھی۔ ہمارے چینی وفد کے ارکان بھی مختلف اسپتالوں میں زیرِ علاج تھے، خون کے نمونوں سے ہی انفکشن کی تصدیق ہوئی تھی کہ اس وقت تک کورونا کی ٹیسٹنگ کٹ بھی میسر نہ تھی۔
جب تک میں گھر لوٹی تو میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ اگر سلمان کی اماں اس سے پہلے نہ مر جاتیں تو اس کے مرنے کا سن کر مر ہی جاتیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹروں کی کوششوں سے میں زندہ بچ گئی تھی مگر میں زندہ کہاں تھی..... ایک جسم رہ گیا تھا جس کی ضروریات ہیں اور دماغ آکسیجن کی کمی سے متاثر ہوا تو جسمانی نظام میں کئی طرح کے خلل ڈال گیا۔ کبھی دورے پڑنے لگتے اور کبھی سارا جسم سُن ہو جاتا۔ دن رات کی ڈیوٹی پر نرسیں آتی اور میری دیکھ بھال کرتی ہیں..... وہ جنہیں دعویٰ محبت تھا، انہیں شاید محبت سے زیادہ ضرورت تھی اور اب میں ناکارہ ہو چکی تھی۔ جانتی ہوں کہ یہ چند گھڑیوں، دنوں یا ہفتوں کا معاملہ ہے کہ عمر کی پونجی ختم ہو جائے گی۔
اب مجھے تڑپ پیدا ہوئی ہے کہ کاش کوئی مجھے وہاں واپس لے جائے جہاں سے میں بڑی شان سے یہ سوچ کر نکلی تھی کہ میں دنیا تسخیر کرنے جا رہی ہوں۔ دنیا تو کیا سر ہوتی، تہی دامنی میں وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر کسی کو نہ اتا ہے نہ پتا پاکستان کا، میری شناخت بے شناختی والی ہے۔ جس پاسپورٹ کی خاطر میں نے سب کچھ تج دیا تھا، اس پاسپورٹ پر میرے اپنے وطن کا ہی ویزا نہیں ہے کیونکہ میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔
اس غیر وطن نے کبھی محبت ہی نہیں ہوئی اور یہاں کی مٹی کبھی اپنی لگی ہی نہیں اور وہ مٹی جو اپنی تھی، اسے اپنا سمجھا ہی نہیں۔ اس دھرتی ماں میں تو پھر بھی فراخیِ داماں ہے کہ وہاں پہنچ جاؤں تو وہ اپنی آغوش میں سمیٹ لے گی مگر وہاں پہنچوں کیسے اب؟ کون ہے جسے یہ وصیت کروں کہ مجھے واپس وہاں لے جا کر اس مٹی میں ملانا دینا جس مٹی میں میرے سارے پیاروں کے وجود ہیں۔ وہ مٹی جس میں وفا ہے، جو اپنے حقیقی چاہنے والوں کو پردیس سے کھینچ کر بھی اپنے وجود میں سمو لیتی ہے۔ یہی میرا نصیب ٹھہرا، اسی دیارِ غیر کی مٹی۔ اب مجھے فرشتۂ اجل کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔

یہ دل قربان تمہارے

تسلیم شیخ

''زندگی میں کبھی، کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب دل دغا کرنے پر اکساتا ہے اور پھر دغا کر کے ہر قربانی کو آگ میں جھونکنے کو دل کرتا ہے مگر افسوس مجبوریوں کی قد آور دیواریں ہمارے خوابوں کے سامنے حائل ہو جاتی ہیں۔'' انیلا بیڈ پر چت لیٹی کمرے کی چھت کو تکتے ہوئے اپنی ہی لے میں بولی۔ ماہین نے جو موبائل فون پر اپنی دوستوں سے گپ شپ کر رہی تھی بہن کا فلسفہ سن کر یک دم اسے دیکھا اور پورے کمرے کا جائزہ لیا کہ کمرے میں تو کوئی بھی نہیں تھا ان دونوں کے علاوہ، نہ ہی آپی کے پاس موبائل تھا جو یہ

ہو کہ موبائل استعمال کر رہی ہے تو پھر یہ کس سے بات کر رہی ہے۔ حیرانی آنکھوں میں امڈ آئی۔ ایک ابرو تعجب سے اٹھاتے ہوئے اس کی بات پر غور کرنے لگی اور پھر گویا ہوئی۔

''کیا فلسفہ جھاڑا ہے آپی، آپ نے تو کمال کر دیا۔ خیر تو ہے؟'' ماہین نے بڑی آپی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''میں نے کچھ نہیں کہا، تمہیں پتا نہیں کیا سنائی دیا ہے۔'' ماہین نے جواب دیا۔

''یہی جو آپ نے ابھی کہا ہے..... یہ جو دل نے دغا دیا یا نہ دیا۔ اف یہ کیا الا بلا آپ بولی ہیں۔ گہرائی میں ڈوبی ہوئی باتیں..... مجھے تو کبھی آپ کی ان گہری باتوں کی سمجھ نہیں آئی۔'' ماہین نے اپنی گردن کو نفی میں ہلاتے ہوئے کج روی سے کہا۔ وہ فون بند کر چکی تھی۔

انیلا نے خود کو سنبھالا اور ابھی جواب دینے ہی لگی تھی کہ اذان شروع ہو گئی۔ اپنا دوپٹا درست کرتے ہوئے اٹھی۔ وضو کیا اور بڑی سی چادر اوڑھے فوراً جائے نماز پکڑلی گویا بس اب کوئی اور بات نہیں ہو گی۔

نماز پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

''میرے پیارے اللہ جی! میں نہیں جانتی میرے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔ بے شک تو دلوں کی باتیں جاننے والا ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ جو میرے دل میں ہے وہ مجھے عطا کر، میں آپ سے بس یہی دعا مانگتی ہوں جو میرے لیے بہتر ہے اور جو میری آنکھوں اور دل کی ٹھنڈک بنے۔ اسے میرا ساتھی بنا دے۔ میرا دل جو بے چین ہے۔ اسے سکون عطا کر..... میرے حق میں بہتر کر۔ بے شک میرے اللہ تو سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔'' بہ آواز بلند دعا کر کے ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا اور مصلیٰ لپیٹ لیا اس بات سے بے خبر کہ ماہین کمرے میں ہی تھی۔

''آپی کیا آپ اظہر بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔'' ماہین نے انیلا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ وہ یہ بات تب سے نوٹ کر رہی تھی... جب سے انیلا کا رشتہ اظہر سے ہوا ہے۔ انیلا تب سے مرجھائی ہوئی اور بہت بے چین دکھائی دے رہی تھی جبکہ لڑکیوں کی بات پکی ہو تو وہ پھولے نہیں سماتیں مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ دکھائی دے رہا تھا۔

اظہر، ماہین اور انیلا کی آپا کا جیٹھ تھا۔ کروڑوں کی جائداد تھی۔ کاروبار کو اظہر نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔ مظہر جو ماہین اور انیلا کا بڑا بہنوئی تھا۔ وہ تو بس کھانا اور پیسے کو اڑانا ہی جانتا تھا۔ شوہر کی عیاشی انیلا کی آپا کو چبھتی تھی۔ فارغ بیٹھے بھی کھانا آسان نہیں ہوتا ہے دو لوگوں کے لیے نا کہ جب بچے ہو جائیں تو ایک، ایک پیسہ ساس اور جیٹھ سے مانگنا گوارا کسے ہوتا ہے۔ اور جب جیٹھانی آ گئی تو وہ تو لات مار کر گھر سے باہر کرے گی۔ اسی لیے آپا نے اس کے لیے سوچا۔

جیٹھ کے لیے باہر سے لڑکی ڈھونڈنے سے اچھا ہے کہ وہ اپنی سیدھی سادی بہن کو لے آئے۔ نہ جانے آنے والی کیسی ہو۔ کہیں اسے گھر سے ہی بے دخل نہ کر دے۔ بڑی عمر کے جیٹھ کے لیے اس نے اپنی بہن کی کم عمری بھی نہ دیکھی۔ بہن پر تو وہ رعب ڈال سکتی تھی لیکن باہر سے آئی ہوئی لڑکی پر رعب نہیں ڈال سکتی تھی۔ اپنی سسرال میں اپنے پاؤں جمانے کے لیے اس نے بہن سے قربانی مانگی اور کافی رونا مچایا۔ انیلا تو ویسے ہی کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ بڑی بہن نے نہ جانے کیا ماں باپ سے کہا۔ وہ بھی بے حد خوش تھے اور خوشی، خوشی اس رشتے کو قبول بھی کر لیا۔

بڑی بہن اور والدین کے چہرے پر خوشی دیکھ کر اس نے ہاں تو کر دی۔ مگر دل تھا کہ بے چین ہی تھا اور آنکھیں ویرانیوں میں ڈوبی معلوم ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

یکا یک ماہین نے گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ دونوں کی عمروں کا بہت فرق ہے۔

''ارے بھئی جب ہاتھ میں پیسہ ہو تو عمر کا فرق کیا کرے گا اور ویسے بھی انیلا کو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ جو آتا ہے، انکار کر کے چلا جاتا ہے۔ ارے سادگی کو کوئی نہیں دیکھتا۔ بس لڑکی فیشن کرنے والی ہو۔ شوخ رنگ پہنے، لڑکوں کو یہی سب تو پسند ہوتا

ہے۔ جو یہ کرتی نہیں۔ ایسے میں اگر یہ رشتہ آ گیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔'' آپا نے ایسی باتیں کی کہ انیلا اور ماہین کا دل کٹ کے رہ گیا۔

''آپا آپ کا جیٹھ لڑکا تو نہیں ہے۔'' ماہین نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''لڑکا نہیں ہے۔ مگر اس کا پیسہ دیکھ کر آج بھی لوگ خود اپنی بیٹی دینے کو تیار ہیں۔ یہ تو میں ہوں کہ بہن کے لیے قربانی دے رہی ہوں اور اپنی ساس کو منایا ہے کہ میری سگھڑ بہن لے آئیں۔ پہننا، اوڑھنا نہیں آتا تو کیا ہوا۔ پیسہ ہوگا تو آ جائے گا سب۔'' انیلا بڑی سمجھداری سے بولی۔ امی تو خوش ہو گئیں۔

''قربانی آپ دے رہی ہیں یا انیلا آپی؟'' ماہین نے تاسف سے سوال کیا۔

''لو یہ کون سا قربانی دے رہی ہے۔ اتنا اچھا سیلڈ، ادب آداب والا جیٹھ ہے میرا۔ قربانی تو وہ دے رہا۔ اتنا کماؤ ہے اور ایک عام لڑکی سے شادی کرے گا۔ جو پرائیویٹ بی اے اور عام سی شکل صورت والی ہے۔ اور پندرہ سال کا ہی تو فرق ہے دونوں میں۔'' بڑی بہن نے ناک منہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

''تف ہے آپا۔ انیلا آپی آپ کی بہن ہے کوئی اور نہیں اور نہ ہی سوتیلی بہن جو آپ ایسا انداز اپنائے ہوئے ہیں۔'' ماہین کو تو غصہ آ گیا۔ وہ یک دم انیلا کی طرف گھومتے ہوئے بولی۔ ''آپ بول کیوں نہیں رہیں آپی۔ آپا کیا کہہ رہی ہیں آپ کے بارے میں۔ انکار کر دیں۔''

''امی دیکھ لیں، یہ میرے خلاف بھڑکا رہی ہے۔'' آپا نے ڈراما کرنا شروع کر دیا۔ انیلا خاموشی سے سبزی کاٹتی رہی۔ کچھ نہ بولی۔ ماہین کو امی جی سے خوب ڈانٹ پڑی کہ جب اسے مسئلہ نہیں تو تمہیں کیا ہے۔ ماہین پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

''ہاں کیا ہوا، کچھ نہیں۔ ایسا تو نہیں۔ میں خوش ہوں اس رشتے سے۔'' آج وہ اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی۔ انیلا کو رشتہ طے ہونے کے مراحل یاد آ گئے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماہین کو کسی بات کا پتا چلے اور وہ پھر امی اور آپی کے سر ہو جائے۔ مگر آج ماہین نے اس کے دل کی بات جان ہی لی تھی جبھی تو یہ سوال کر دیا تھا۔

''کیا..... کیا بات ہے۔ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' انیلا گھبرائی ہوئی آواز میں..... ماہین سے پوچھنے لگی جو ابھی، ابھی کمرے میں آئی تھی۔

''یہی دیکھ رہی ہوں کہ کوئی تو ایسی بات ہے جو مجھ سے صیغۂ راز میں رکھی جا رہی ہے۔'' ماتھے پر تیوری چڑھائے ماہین مسلسل بہن کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''کوئی بات ہی نہیں ہے تم ایسے ہی جاسوسوں کی طرح جاسوسی کر رہی ہو۔ کچھ ہاتھ نہیں آنے والا۔'' انیلا یہ کہہ کر اٹھی اور بیڈ پر رکھے کپڑے درست کرنے لگی۔

''کچھ تو ہے۔'' ماہین کی سوئی اب بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

انیلا اب کی بار ماہین کی طرف دیکھے بنا تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اور ماہین کو سوچوں میں چھوڑ گئی۔

☆☆☆

''السلام علیکم۔'' آذر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔ انیلا جو اپنے سسرال والوں کے کھانے کے لیے لوازمات بنا رہی تھی۔ آذر کی آواز سے اس کے ہاتھ تھم گئے۔

''وعلیکم السلام۔'' انیلا نے دھیمے سے جواب دیا۔

''کیسی ہیں۔ کیا کر رہی ہیں؟'' آذر نے انیلا کے چہرے کو بغور دیکھ کر اس کا حال احوال پوچھا اور ساتھ ہی انیلا کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا ہو گیا۔ انیلا کا چہرہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے اوڑھے ہوئے فیروزی رنگ کے دوپٹے کو کھینچ کر ماتھے تک لے آئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آذر سے اپنی ویران آنکھیں اور چہرے پر پھیلی سوگواری چھپا رہی ہو۔ آذر کی نگاہوں کی تپش اس کے وجود پر پڑ رہی تھی۔

آذر سینے پر بازو باندھے انیلا کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ بغیر میک اپ کے ہی آذر کو وہ بے حد پیاری

''اب میں اتنا ہی برا لگنے لگ گیا ہوں کہ اپنا حال بھی بتانے گوارا نہیں کر رہی ہیں۔''

''میں نے کب کہا کہ آپ برے لگنے لگے ہیں۔'' انیلا نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ انیلا کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش صاف سنائی دی۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ کچھ پل دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دروازے کی ٹھرتھراہٹ سے دونوں بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگ گئے۔ مگر کچن کے دروازے سے کوئی اندر نہ آیا۔ اب کی بار دونوں نے گھبرا کر کچن کے دروازے پر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔

''لگتا ہے کسی نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔'' انیلا نے گھبراہٹ میں اپنی انگلیاں مڑورتے ہوئے کہا۔

''ہم نے ایسی کوئی بات ہی نہیں کی کہ کوئی سن لے تو ہمیں پریشانی ہو۔'' آذر نے ہولے سے کہا۔ جسے انیلا نے سن لیا تھا۔

''اگر آپ مجھ سے واقعی محبت کرتے ہیں تو خدارا خاموش ہو جائیں اور کسی سے کچھ نہ کہیے گا۔ پلیز۔'' انیلا نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

''مجھے کچھ کہنے کے قابل چھوڑا ہے کیا۔'' آذر نے انیلا کے جڑے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے بیچارگی میں سوال کیا۔

انیلا نے اپنے ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کی مگر آذر کے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ ہاتھ نہ چھڑوا سکی۔

''میرے ہاتھوں کو چھوڑ دیں۔ مجھے رسوا نہ کریں۔'' انیلا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔

''تم ویسے نہ سہی۔ مگر محبت میں تو مضبوط ہوتیں۔ کاش تم آپا سے کہتیں کہ تمہیں آذر سے محبت ہے اور آذر کو تم سے۔ کاش تم اپنے لیے، میرے لیے بولتیں انیلا۔'' آذر نے اس کے لرزتے وجود پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور واپس پلٹ گیا۔ ابھی اس کا ایک پاؤں

''ہم لڑکیاں محبت میں مضبوط ہی ہوتی ہیں۔ محبت مضبوط بناتی ہے مگر ایک بات، اپنوں کی خوشی کی خاطر محبت کمزور بھی ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ اپنوں کی محبت میں قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔''

''یہ کیسی قربانی ہے۔ جو میری سانسوں کی ڈور مجھ سے چھیننے کے درپے ہے۔'' آذر کے دل کی ٹیس انیلا کو اپنے اندر چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے آذر کی طرف سے رخ موڑ لیا اور کچھ نہ بولی۔ آذر واپس پلٹ گیا تھا۔

☆☆☆

''بابا آپ قربانی کے جانور کب لائیں گے۔'' ماہین نے اپنے بابا کے ساتھ بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''جب آذر کے پاس وقت ہوگا۔'' بابا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''اور آذر کے پاس آپ کے لیے وقت ہی وقت ہے۔'' وہ اچانک ہی وارد ہوا اور پیار سے ماہین کے سر پر ہلکی سے چپت لگاتے ہوئے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ چچا جان اس کے ساتھ جا کر ہی قربانی کا جانور لے کر آتے ہیں۔

''آذر بھائی اب آپ بھی قربان ہو جائیں۔'' ماہین نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا فضول بات کر رہی ہو ماہین۔ بھائی سے ایسے کہتے ہیں۔'' بابا نے ماہین کو ڈپٹتے ہوئے گھور کر دیکھا۔

''او ہو بابا جان۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اب ان کی شادی کر دینی چاہیے۔ شادی کرنا بھی تو مرد کے لیے قربانی کا بکرا بننا ہی ہوتا ہے ناں۔'' ماہین نے چہک کر کہا۔ بابا جان اور آذر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

''میں تو ایک بکری کے لیے قربان ہونا چاہتا تھا مگر وہ بکری مانی نہیں، مجھے قربان کرنے کے لیے۔'' انیلا کو آتے ہوئے دیکھ کر آذر بولا۔ انیلا کے ہاتھ سے

چائے کی ٹرے گرتے، گرتے بچی۔

''دھیان سے بیٹا۔'' بابا جان فکرمندی سے بولے۔

''جی بابا جان!'' انیلا نے چائے کا ایک کپ بابا کو پکڑایا اور دوسرا آذر کو۔ اس نے آذر کی جانب دیکھنے سے اجتناب کیا۔ وہ محبت میں کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ وہ تو بس اپنے خونی رشتوں کے لیے مضبوط رہنا چاہتی تھی۔ آذر بھی اگرچہ اس کا اپنا تھا بلکہ تایا زاد تھا۔ قریبی تھا مگر کیا کرے۔ ماں باپ اور بڑی بہن سے بڑھ کر نہ تھا۔

''کون ہے وہ بکری؟'' ماہین کرنٹ کھا کر آذر کی طرف پلٹی۔

''مذاق کر رہا تھا۔'' آذر نے ماہین کی ناک زور سے دباتے ہوئے جواب دیا۔

''انیلا کی شادی کے بعد ہم ڈھونڈیں گے چاند سی لڑکی اپنے بیٹے کے لیے۔ کاش بھائی بھابی زندہ ہوتے۔ تو یہ کام وہ خود اپنے مبارک ہاتھوں سے کرتے۔'' بابا جان کہتے ہوئے رنجیدہ ہو گئے۔

''آپ بھی تو میرے بابا ہیں ناں۔'' آذر آج کل خود ماں باپ کی کمی بہت محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ دونوں ہوتے تو اس کی پسند اس کی ہوتی، کسی اور کی نہ ہوتی۔

آذر، انیلا کا تایا زاد تھا۔ اس کی دو بہنیں تھی۔ جو والدین کے ساتھ ہی ایک کار ایکسیڈنٹ میں وفات پا گئیں۔ آذر کو اس کے چچا نے ہی پالا تھا۔ چچی اور انیلا کی بڑی بہن فاکیہ آپا۔ دونوں ہی سڑیل مزاج کی تھیں۔ دونوں کو آذر ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ جبکہ ماہین اور انیلا کی آذر سے خوب بنتی تھی۔ آذر جب جوان ہوا تو چچی نے کہا۔ وہ علیحدہ ہو جائے۔ وہ نہیں چاہتیں کہ آذر کی وجہ سے ان کی بیٹیوں کی عزت پر بات آئے۔ انہوں نے آذر کو کافی سنائیں۔ ماہین، ماں اور بڑی بہن سے لڑی کہ وہ دونوں غلط کر رہی ہیں۔ مگر وہ دونوں نہ مانیں۔ آذر کو بہت اچھی نوکری مل گئی تھی۔ فلیٹ اور گاڑی بھی دفتر سے مل رہی تھی اس کے پاس سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو ماں باپ کا پیار نہیں تھا اور جو تھوڑی سی امید تھی کہ اپنی محبت کو پالے گا تو وہ بھی نہ رہی۔ چند دنوں بعد انیلا کسی اور کی ہونے والی تھی۔ انیلا اس کے لیے جنگ لڑ سکتی تھی۔ محبت میں تو بہت طاقت ہوتی ہے۔ انسان پوری دنیا سے ٹکرا جاتا ہے محبت کو پانے کے لیے۔ مگر وہ نہیں ٹکرائی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آذر کو اس کی ماں اور بہن ذلیل کریں۔ جس طرح اسے گھر سے ذلیل کر کے نکالا تھا۔ وہ اب یہ سب دوبارہ نہیں دُہرانا چاہتی تھی۔ وہ آذر کو اذیت نہیں دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''چلیں کیا آپ دونوں نے سوگواریت مچا رکھی ہے۔ یہ شادی والا گھر ہے۔ رونا دھونا کس بات کا ہو رہا ہے۔'' چچی (انیلا کی ماں) کمرے سے باہر نکلیں تو سامنے آذر اور اپنے شوہر کو ایک دوسرے کو گلے لگے روتے ہوئے دیکھا تو ماتھے پر تیوری چڑھائے دونوں کو باتیں سناتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

''امی آپ کے لیے چائے لاؤں۔'' انیلا نہیں چاہتی تھی کہ ماں کی توپوں کا رخ آذر کی طرف ہو۔ اس لیے اس نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں بنا دو۔ پتا نہیں سو کر اٹھوں تو سر درد کیوں ہونے لگتا ہے۔'' رقیہ بیگم نے اپنا سر دباتے ہوئے کہا۔

''ٹھک ٹھک ٹھک۔'' دروازہ اتنی زور سے پیٹا گیا کہ وہاں موجود سبھی لوگ ہڑبڑا گئے۔

''ارے جاؤ دیکھو کون بخت ہے۔ جسے دروازہ کھٹکھٹانے کی بھی تمیز نہیں ہے۔'' رقیہ بیگم کوفت سے بولیں۔ ماہین اٹھنے ہی لگی تھی کہ آذر نے اس سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ میں دیکھتا ہوں۔''

دروازہ کھولا تو سامنے آپا بھیری شیرنی کی طرح اندر داخل ہوئیں۔

''ہاں بولو۔ کیا کہا تم نے اظہر سے۔'' انہوں نے انیلا کے دونوں بازوؤں کو زور سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اظہر کو بھلا کیا کہا؟'' بڑی بہن کے تیور دیکھ کر انیلا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیران تو سب تھے کہ آخر ہوا کیا ہے۔

''اظہر نے تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے اور میں تم سے پوچھنے آئی ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟'' آپا تو لگتا تھا آج سارے حساب درست کرنے والی تھیں۔

''ہائے میں مرگئی۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ تو اِدھر سے بہت خوش گیا تھا دو دن پہلے۔ اب ایسا کیا ہوا کہ اس نے انکار ہی کر دیا۔'' رقیہ بیگم اپنا سر پیٹتے ہوئے بولیں۔

''اس سے پوچھیں۔ جب وہ پرسوں آیا تھا تو کیا کہا تھا انیلا نے اس سے۔'' بڑی آپا خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ''اب کوئی عزت نہیں رہی ہماری خاندان میں۔''

انیلا نے آذر کی طرف دیکھا۔ آذر نے معصومیت سے کندھے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو کہ نہ تو مجھے پتا ہے اور نہ میں نے کچھ کیا ہے۔ انیلا نے آذر کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ جہاں سکون تھا۔ جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو۔

''یقین کریں آپی۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ کا جیٹھ پرسوں آیا تھا کہ نہیں۔ میری نہ تو کوئی بات ہوئی اور نہ ہی کوئی ملاقات۔ میں امی کی قسم کھاتی ہوں۔'' انیلا یہ کہہ کر رونے لگ گئی۔

''آپی آپ جب کچن میں تھیں۔ تب اظہر بھائی اور میں کچن کی طرف گئے تھے۔ میں اظہر بھائی کو کچن کا دروازہ دکھا کر واپس مڑ گئی تھی۔ آپ کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کیا اظہر بھائی سے؟'' ماہین نے حیرانی سے سب بتا کر سوال کیا تو انیلا اور آذر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آذر نے اسے خاموش ہی رہنے کا اشارہ کیا۔

اور ابھی وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف مجرمانہ دیکھ ہی رہے تھے کہ رقیہ بیگم بولیں اور بس پھر مسلسل بولتی ہی چلی گئیں۔

''کیا منہ دکھاؤں گی میں برادری میں کہ نکاح سے دو دن پہلے بیٹی کے رشتے سے جواب دے دیا گیا۔ وجہ کیا بتاؤں گی۔ کون کرے گا میری معصوم بچی کے ساتھ شادی۔'' چچا جان بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''میں کروں گا انیلا سے شادی۔ میں اپنے چچا کے لیے قربانی دینے کو تیار ہوں۔'' چچی کی آنکھیں حیرت سے باہر کو آگئیں۔

چچا جان نے فوراً اٹھ کر بھتیجے کو گلے لگا لیا اور چومنے لگے۔

''تم سچ میں انیلا سے شادی کرو گے؟'' آپا نے طنزیہ سوال کیا۔

آذر بہت ہینڈسم تھا۔ کئی رشتوں کو اس نے انکار کر دیا تھا اور دولت مند بے حد خوب صورت لڑکیوں کے رشتے ریجیکٹ کر کے اب وہ انیلا سے شادی کرنے پر آمادہ تھا تو حیران تو ہونا ہی تھا۔

''میرے چچا جان نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں ان کی عزت بچانے کے لیے اور چچی جان کو لوگوں کے طعنوں سے بچانے کے لیے انیلا سے شادی کروں گا۔ اور اپنے رشتے ہی قربانی مانگتے ہیں اور میں اپنوں کے لیے یہ قربانی دینے کو تیار ہوں۔'' چچی جان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جسے وہ کھوٹا سمجھتی تھیں۔ آج وہ انہیں ہیرا لگا۔

رقیہ بیگم بھاگ کر آذر کے پاؤں کی طرف جھکیں۔ آذر گڑبڑا گیا۔

''چچی جان یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے کندھوں سے پکڑ کر انہیں تھاما۔

رقیہ بیگم نے آذر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بولیں۔

''بیٹا مجھے معاف کر دو۔ میں تو ہمیشہ تمہیں کوستی ہی تھی۔ تمہاری ماں سے جیلس ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا دیا اور مجھے نہ دیا۔ پیسے میں بھی وہ مجھ سے بڑھ کر تھی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میرے حسد کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی مگر آج تم میری عزت بچانے کے لیے خود کو قربان کر رہے ہو۔ میں صدقے جاؤں تم پر۔ مجھے معاف کر دو بیٹا۔'' وہ آبدیدہ تھیں۔

''ایسی باتیں نہ کریں چچی جان۔ رات گئی بات گئی۔'' آذر اب مزید باتوں کو کرید کر رنجیدہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وجہ وہ جانتا تھا۔ مگر کیا فائدہ تھا باتوں کو بڑھانے کا۔

''جاؤ ماہین بیٹا مٹھائی لاؤ، بھائی کا منہ میٹھا کرواؤ۔'' رقیہ بیگم چہکتے ہوئے بولیں اور ساتھ ہی آذر کی بلائیں لینے لگیں۔

آذر نے مسکراتے ہوئے انیلا کی طرف دیکھا اور انیلا پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

''اچھا تو میرے لیے قربانی دی ہے۔'' اسی تاریخ کو انیلا اور آذر کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ سب بہت خوش تھے۔ آذر نے اپنے فلیٹ کو گلاب کے پھولوں سے سجا رکھا تھا۔ پورے فلیٹ میں گلاب کے پھولوں کی مہک آرہی تھی۔ کمرے کی مسہری کی ڈیکوریشن جس نے بھی دیکھی۔ وہ واہ، واہ کرنے لگا۔ سب کے جانے کے بعد جب آذر، انیلا کے پاس کمرے میں آیا۔ ابھی دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس پر کشنز کی برسات ہونے لگی۔

''یہ تم نے کیا چکر چلایا؟'' انیلا کشن مارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ دو دن بے حد مصروف گزرے تھے۔ انیلا کی آذر سے بات چیت نہ ہو پائی تھی۔ بلکہ سامنا بھی تب ہی ہوا۔ جب وہ دولہا بنا اس کے کمرے میں آیا تھا۔

''ہاں تو قربانی ہی دی ہے مجھ معصوم سے بکرے نے۔'' آذر معصومیت سے آگے بڑھا اور بیڈ پر کھڑی انیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔

''محبت کو پا کر کیسی قربانی؟'' انیلا نے شکوہ کیا۔

''بھئی جتنی آہوں، سسکیوں سے محبت ملی ہے تو پھر یہی کہوں گا ناں کہ قربانی دے کر خوب صورت بکری ملی ہے۔'' آذر ہولے سے انیلا کے قریب ہو کر بولا تو انیلا کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا ہو گیا۔

''اظہر نے اس دن ہماری باتیں سن لی تھی؟'' انیلا نے بات بدل کر سوال کیا۔

''ہاں اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں اور پھر اس نے مجھ سے بات کی اور کہا کہ میں اسے سچ، سچ بتا دوں کہ اگر میں تم سے محبت کرتا ہوں .... تو وہ پیچھے ہٹ جائے گا۔ ویسے بھی وہ تمہیں یہی بتانے آیا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہیں تو وہ دوسری شادی کرے گا۔ ورنہ تم انکار کر دو۔'' آذر نے تفصیل بتائی۔

''کیا کہا؟ اظہر شادی شدہ تھا۔ مجھے تو آپا نے نہیں بتایا۔'' انیلا حیرت کے ساتھ ساتھ غصے میں بولی۔

''کیونکہ آپا کو بھی تب ہی پتا چلا تھا جب اس نے انکار کیا تھا۔ وہ اپنی کلاس فیلو کو پسند کرتا تھا۔ اس کی کلاس فیلو کی زبردستی شادی ہو گئی تھی کہیں اور۔ اس سے اس کے دو بچے تھے۔ اظہر نے جب گھر میں بات کی تو اس کی ماں نے کہا کہ وہ دو بچوں کی ماں سے اس کی شادی ہرگز نہیں کریں گی۔ بچے یتیم تھے۔ اظہر اچھا نیک آدمی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے اتنے سالوں میں شادی نہیں کی کیونکہ میں اسے بھول نہیں پایا تھا۔ اب وہ جیسی بھی ہے۔ مجھے قبول ہے۔ اس لڑکی کو سہارا چاہیے تھا اور بچوں کے سر پر باپ کا سایہ۔ ویسے بھی اظہر کی عمر زیادہ تھی۔ اس لیے اس نے ماں سے چھپ کر شادی کر لی۔ اظہر نے ماں کو بہت منایا مگر وہ نہ مانیں۔ اظہر تمہارے لیے کبھی مانا ہی نہیں تھا۔ یہ تو اس کی ماں اور تمہاری بڑی آپا نے زبردستی کی۔ ورنہ وہ یہی کہتا تھا کہ تم اس سے بہت چھوٹی ہو۔ وہ تمہارے ساتھ ظلم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو بس ایک بار تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ جب اس نے ہماری باتیں سنیں تو وہ خوش ہو گیا۔ اس نے سارا الزام انکار کرنے کا اپنے سر ہی لے لیا۔ اور اس نے پھر مجھ سے کہا کہ میں آگے بڑھ کر تمہارا ہاتھ تھام لوں اور دیکھ لو میں نے تمہارا ہاتھ تھام لیا۔'' آذر نے تفصیلاً ساری رُوداد سنائی۔ انیلا کچھ اور پوچھنے ہی لگی تھی کہ آذر نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

''بس اب کسی کی کوئی بات نہیں۔ اب بس ہماری باتیں اور ہم.....''

آذر نے آخری لفظ کہہ کر انیلا کے کان میں سرگوشی کی تو اس کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ گلاب کے پھولوں کی مہک نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

❁❁❁

سلسلے وار ناول

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت . . . اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے . . . کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں . . . غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے . . . لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے . . . اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے

ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے

وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے

pklibrary.com

pklibrary.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمائم عالمہ بن رہی تھی، وہ اور عالی جامعہ میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں۔ عمائم کو آج کل کچھ کال اور ایس ایم ایس آرہے تھے جو اس کی زندگی میں آنے والے ہر حادثے کی پیشگی اطلاع دے دیتے تھے، عمائم بچپن سے دیکھتی آئی تھی اُسے دو لوگوں سے چھپایا جاتا تھا۔ بابا صاحب اور امو جان اور تیسری شخصیت دادی پھپو۔ بابا صاحب کا گھرانا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت چل رہا تھا۔ امی، احتشام اور اذان میں دوریاں چاہتی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ بسمہ چاچی، عمائم کو کہتی ہیں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے خسارے یاد آتے ہیں۔ عمائم، نورس کے ساتھ ٹریم کے گھر تقریب میں جاتی ہے تو نورس اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے ایک لڑکی عمائم کو ایک پارسل دیتی ہے کہ یہ نوٹس ہیں تم نورس کو دے دینا۔ پولیس راستے میں گاڑی روکتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں ایس پی اذان کی کزن ہوں تو آفیسر اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ گھر واپس آتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے کہ منع کیا تھا ناں جانے سے۔ صبح عمائم کے کمرے سے وہ پیکٹ غائب تھا۔ کرن، عمائم کو بتاتی ہے کہ جب وہ مہندی کی رات عمائم کو پیکٹ دے کر واپس آئی تو ٹیرس پر اس نے نورس کو دیکھا تھا وہ کسی ضروری کام سے نہیں گئی تھی۔ ٹریم بتاتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی ہے، عمائم، نورس سے کہتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی۔ وہ بے قصور تھی تو نورس کہتی ہے کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ بے قصور تھی یا گناہ گار..... عمائم، اُم رومان کو جو اسے کھانا دینے آتی ہے باتھ روم میں بند کر کے باہر نکلتی ہے اور ایک لڑکی سے بات کر کے اپنا گاؤن اور کارڈ چینج کر کے جامعہ سے باہر نکل آتی ہے۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے تو وہ اپنی الماری میں دیکھتی ہے تو کپڑوں کے نیچے سے وہ پیکٹ مل جاتا ہے۔ عمائم، نورس سے ملنے جاتی ہے تو نورس اس کی بہت تعریف کرتی ہے اور اسے آفر کرتی ہے کہ اگر وہ نورس کے ساتھ کام کرے گی تو وہ اسے جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر بنا دے گی اور اس کو وہ کلپ دکھاتی ہے کہ کس طرح وہ جامعہ سے بھاگ نکلی تھی۔ عمائم کہتی ہے میں اتنی بھاری ذمے داری نہیں اٹھا سکتی..... عمائم، نورس کو بتاتی ہے کہ وہ پیکٹ مل گیا ہے لیکن پیکٹ سے برآمد چیزیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ یہ سامان بدل گیا ہے۔ عمائم جامعہ سے واپس جانے کے لیے نکلتی ہے تو احتشام اسے لفٹ دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ برطانوی نژاد کرن کی لاش ان کی جامعہ کے بیک سائڈ گیٹ سے ملی ہے۔ عالی، کرن کی والدہ سے سوالات کرتی ہے اس رات کے بارے میں تو پتا چلتا ہے کہ کرن نے شاید راستے میں کسی کو لفٹ دی تھی۔ نورس، کرن کے گھر تعزیت کرنے آتی ہے تو عمائم کے ساتھ نورس اور عالی بھی حیران رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ تائی امی کو گھر ڈراپ کر کے جامعہ آتی ہیں تو فٹ پاتھ پر ایک بظاہر بزرگ بیٹھا تھا جسے عالی کوئی رقعہ دیتی ہے تو وہ اپنی ڈگ اتار کر سامنے کی بلڈنگ میں چلا جاتا ہے، عمائم جب عالی سے پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اسے اس نے دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔ عمائم واپس وہاں جاتی ہے تو اسے وہ نوٹ ملتا ہے جس پر لکھا تھا کہ میدان خالی ہے۔ جامعہ میں الیکٹریشن آتا ہے تو عمائم اس کے پیچھے جاتی ہے اور اس کو ایک آلہ دیوار میں نصب کرتے دیکھ کر سوچتی ہے کہ نورس کی جان کو خطرہ ہے۔ تائی امی بتاتی ہیں کہ ایمان نے کہا کہ میں امو جان کی نعمت کی وجہ جانے بغیر پیچھے نہیں ہٹوں گا اور بابا صاحب نے کہا ہے کہ ہمیں عمائم کی خوشی مقدم ہے۔ عمائم کے دل کو بابا صاحب کی باتیں لگی تھیں۔ ایمان، عمائم سے اس کا جواب جاننا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میری رائے تائی امی کے پاس محفوظ ہے۔ ایمان، عمائم کو بتاتا ہے کہ امو نے اس فیصلے پر خاموشی اختیار کی ہے اور خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ لہٰذا اب جلد ہی منگنی ہوگی۔ حریم، عمائم پر منگنی کو لے کر غصہ کرتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اور کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ بسمہ، عمائم کو بتاتی ہے کہ امو کو جیل میں سے کسی نے فون کیا تھا اس لیے وہ تیار ہوئی ہیں۔ احتشام، عمائم کو کہتا ہے کہ یہ منگنی زیادہ دیر چلتی نظر نہیں آتی۔ دادی، عمائم کو کہتی ہیں کہ مجھے دادی نہ کہا کرو..... میں تمہاری ماں کی ماں ہوں اور عمائم یہ حوالہ جان کر بہت خوش ہوتی ہے لیکن دادی اسے کہتی ہیں کہ ابھی یہ بات کسی کو پتا نہیں چلنی چاہیے اور بابا صاحب اس کے لیے وہی فیصلہ کریں گے جو اس کے لیے بہتر ہوگا۔ عمائم کو میسج آتا ہے کہ ایمان دور اندیش نہیں ہے اور اسے ایسے شخص کا ہاتھ تھامنا چاہیے جو دور اندیش ہو۔ امو کی طبیعت خراب ہوتی ہے احتشام ان کو اسپتال لے کر جاتا ہے، احتشام سے امو کہتی ہیں کہ ان کا ضمیر انہیں سکون نہیں لینے دیتا۔ احتشام، عمائم سے کہتا ہے کہ تمہاری جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر کی جان کو خطرہ ہے لیکن وہ سیکیورٹی کی آفر ٹھکرا چکی ہے اگر وہ اسے راضی کر لے تو ان کی آفر برقرار ہے۔ عمائم کی ایمان سے منگنی ہو جاتی ہے، عمائم رات کو ماہم کو بے حال دیکھتی ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایمان کے لیے اتنا آگے چلی گئی۔ ایمان، عمائم سے ڈنر پر چلنے کے لیے کہتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اسے منگنی کے بعد فون پر باتیں کرنا پسند نہیں ہے۔ نورس، عمائم کو بتاتی ہے کہ اس نے کرن سے لفٹ لی تھی لیکن پوچھ گچھ کی وجہ سے یہ بات سب سے چھپائی تھی۔ احتشام اور اذان کو بریفنگ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک نجی نمائش میں دہشت گردی کی بامتوقع اطلاعات ہیں۔ بسمہ، عمائم کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ انہوں نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا۔ عمائم اس بات پر یقین نہیں کرتی، اذان اور روشان، عمائم کی منگنی پر احتشام کے رویے پر حیران تھے۔ اذان، احتشام سے کہتا ہے کہ وہ ایمان کو سب بتا دے لیکن وہ اس بات پر کان نہیں دھرتا۔ احتشام کو بہت پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ عمائم کو سب چھوت سمجھتے ہیں تو وہ اس کی طرف

اپنے جھکاؤ کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ احتشام کی ماں اسے بتاتی ہے کہ ان سے ایک گناہ ہوا تھا اور وہ آج بھی اس کی گرفت میں ہیں تو احتشام کہتا ہے کہ کیا ہم کفارہ ادا نہیں کر سکتے تو وہ کہتی ہیں کہ اس گناہ کا کوئی کفارہ نہیں ہے، اسے اموسے بچالو یہی کفارہ ہے۔ صبیح آنے پر عمائم، ایمان سے معذرت کرنے جاتی ہے تو اموسی کی بات سن کر حیران رہ جاتی ہے، وہ ایمان سے کہہ رہی تھیں کہ اس فیصلے سے ماہم، تم، عمائم اور احتشام کوئی بھی خوش نہیں۔ عمامہ سے عمائم تک یہ داستان مت دُہراؤ اتنا کہہ کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ سب اموکو اسپتال لے کر جاتے ہیں تو کرن کی مما مسز ابرار (سونیا) ان کے گھر آ کر عمائم سے کہتی ہیں کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ عمائم، ان کے جانے کے بعد خود کو کمرے میں بند کر لیتی ہے تو حریم، احتشام کو بلاتی ہے اور اسے بتاتی ہے لیکن وہ اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور واپس چلا جاتا ہے تو حریم چابیاں ڈھونڈنے جاتی ہے۔ حریم کے جاتے ہی احتشام ایک اوزار کے ذریعے کمرے کا لاک کھول کر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سونیا گھر واپس آ کر ابرار کو بتاتی ہے کہ عمائم کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا اور وہ ثبوت مانگ رہی ہے۔ عمائم کو احتشام سمجھاتا ہے کہ اس معاملے میں گلی گرہوں کو ذہانت سے کھولو گی تو ساری الجھنوں کا حل پالو گی لیکن عمائم ان اجنبی راہوں پر چلنے کو تیار نہ تھی۔ ماما، ماہم کو دیکھتی ہیں تو ان کے ذہن کے پردے پر ماضی کے کردار واضح ہو جاتے ہیں لیکن یہ اپنی اور پرائی اولاد کا فرق تھا کہ آج وہ چاہتی تھیں سب کچھ ماہم کی مرضی کے مطابق ہو جائے۔ احتشام، ماہم سے کہتا ہے کہ محبت ایثار کا جذبہ ہے۔ ماہم کو اس کی بات سمجھ آ گئی تھی۔ تائی امی، عمائم سے اس عورت کے بارے میں پوچھتی ہیں تو وہ بتاتی ہے کہ وہ کرن کی مما مسز ابرار تھیں۔ تائی امی کہتی ہیں کہ اب شادی کی تیاری کرو کیونکہ ایمان کو جلدی ہے۔ آمنہ، ایمان سے کہتی ہے کہ عمائم کے دو بڑے عیبوں کے ساتھ زندگی کیسے گزارو گے تو ایمان ششدر رہ جاتا ہے۔ جیل والوں سے ملاقات کے بعد بڑوں کی میٹنگ ہوتی ہے تو حریم یہ سن کر خوش ہوتی ہے اور احتشام کو بتاتی ہے کہ شادی کی ڈیٹ تو فکس ہو گئی ہے مگر دادی اس سے خوش نہیں ہیں۔ ایمان، احتشام سے کہتا ہے کہ اس شادی کو رکوانے کے لیے اسے اس کی مدد درکار ہے۔ سونیا، ابرار سے کہتی ہے کہ عمائم کو خود ٹھکرایا اور کرن کو تقدیر نے ہم سے جدا کر دیا۔ ایمان شادی سے انکار کر دیتا ہے۔ عمائم کو پوچھنے پر بسمہ بتاتی ہے کہ جیل سے اس کے دو ماموں، بسمہ کے شوہر اور ایمان کے والد آ رہے ہیں۔ بسمہ اسے بتاتی ہے کہ عمامہ (عمائم کی ماں) کے قتل میں وہ دونوں جیل میں تھے اور بہت عرصے تک طاہر، بسمہ کو ہی گناہ گار گردانتا رہا کیونکہ اس کی بہن کی شہ پر عمامہ نے غلط قدم اٹھایا اور کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد جب وہ واپس آئی تو تم اس کی گود میں تھیں اور تمہاری دادی نے کہا کہ تم ان کے بیٹے کی اولاد نہیں..... پھر اسے گناہ کبیرہ کا مرتکب ٹھہرا کر اس کے بھائیوں نے اس کا جنازہ بھی نہیں اٹھایا پھر جیل والوں کو تمہارے اس گھر میں رہنے پر اعتراض تھا۔ اسی لیے ان کا پورشن الگ کر لیا گیا۔ پھر ایمان کی تم سے منگنی کی خواہش پر تقی بھائی کے فون کرنے پر بھابی راضی ہوئیں۔ پھر جب ایمان کو اس پوری کہانی کی بھنک پڑی تو اس نے منگنی توڑ دی۔ عمائم، نانی سے عمامہ کے گناہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ بتاتی ہیں کہ وہ اپنے پھوپا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ عمائم کو اپنے شرمناک حوالے پر رونا آیا تھا۔ احتشام، عمائم کو بتاتا ہے کہ اس کے بہت پوچھنے پر جب اس کی ماں نے بتایا تو وہ اپنے باپ کی قبر پر گیا اور وہیں قریب ہی عمامہ کی بھی قبر تھی۔ وہ عمائم کو سمجھاتا ہے کہ تصویر کا ایک رخ دیکھ کر فیصلہ نہیں کرتے۔ تائی امی، عمائم کو نمائش میں جانے سے منع کر دیتی ہیں۔ طاہر، عمائم سے اچھے سے مل کر سب کے خدشات غلط ثابت کر دیتا ہے۔ طاہ، تقی سے کہتی ہے کہ عمامہ کی بیٹی بہت پیاری ہے اور اس کی بھابی نے بہت اچھی تربیت کی ہے۔ تقی بتاتا ہے کہ احتشام نے کہا تھا کہ میں نے سب کو راضی کر لیا ہے اور اپنی محبت ہار آیا ہوں۔ ایمان، عمائم سے معافی مانگتا ہے تو وہ معاف کر دیتی ہے۔ تقی، عمائم سے کہتا ہے کہ بیٹیوں کو عمائم کے جیسے ہونا چاہیے فرمانبردار..... عمائم، ثریم سے کہتی ہے کہ اسے تائی امی نے منع کر دیا ہے اور وہ لوگ بھی نہ جائیں نمائش میں جس پر وہ بہت ناراض ہوتی ہے۔ عمائم کے پاس مسیح آتا ہے اور وہ اسے ملنے کے لیے کہتا ہے تو عمائم کہتی ہے کہ میرے بلانے پر تمہیں آنا ہوگا۔ اس پر اوکے کا میسج آتا ہے۔ فضا میں ایک دم بارود کی بُو محسوس ہوئی تھی۔ فورٹ پارک میں نمائش میں ہونے والے بم دھماکے میں عالی، نورس اور ثریم اور کافی طالبات جاں بحق ہو گئیں۔ اس خبر سے ہی عمائم کو حائلہ کے جرنلسٹ ہونے کا پتا چلا۔ عمائم کو لینے سونیا آئی ہے تو تقی اور طاہر اسے کہتے ہیں کہ وہ کہاں سے دعوے دار ہو گئی لیکن عمائم گھما کر گھر سے نکل جاتی ہے۔ وہ سیدھی جامعہ جاتی ہے وہاں اسے احتشام ملتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم وہاں تھوڑی دیر رکتیں تو مجھے تمہیں اتنی بھی کہانی نہ سنانی پڑتی پھر وہ عمائم کو بیس سال پہلے کی روداد سناتا ہے۔ صوفی صالح کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی حافظ قرآن تھی۔ عمامہ، شام سے ملنے آتی ہے تو وہ اسے واپس جانے کو کہتا ہے صوفی صاحب اسے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ کہیں جانے کے لیے شام کو کہنے گئی ہوگی۔ طاہرہ، ساس کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ عمامہ ان کی نظروں کے سامنے رہے، جس پر وہ کہتی ہیں کہ شام کا رشتہ ان کی بہن نے فیقہ کے لیے دیا تھا۔ لیکن عمامہ اپنی پسند سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ شام کی غیر موجودگی میں اس کا رشتہ فیقہ سے طے ہو کر کارڈ بھی چھپوا کر بانٹ دیے اس پر عمامہ، شام کو منانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تمہارے باپ کے سر پر رکھے عمامے اور

اپنی عزت پیاری ہے۔ تم واپس لوٹ جاؤ۔ طاہ (بھاوج) عمامہ کو کہتی ہے کہ شام بھی تمہیں بہت چاہتا ہے، وہ اسے مجبور کرے گی تو وہ ضرور بولے گا۔ عمامہ، طاہ کے ذریعے شام کو بلاتی ہے اور اس کو سول میرج کے لیے راضی کرتی ہے ساری بات فیقہ سن لیتی ہے۔ عمامہ آنے والے فون پر کہتی ہے صوفی صالح کی بیٹی عمامہ حادثاتی موت کا شکار ہوگئی ہے، آپ بارات مت لائیے گا۔ عمامہ کو یہ بات کرتے طاہرہ سن لیتی ہیں، وہ اس پر غصہ کرتی ہیں وہ صوفی صالح سے کہتی ہیں ہم نے جلد بازی کرلی۔ فرخ (منگیتر عمامہ) اور اس کے بہنوئی کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے جس میں بہنوئی کی ڈیتھ ہوجاتی ہے، دونوں شادیاں نامعلوم مدت کے لیے کینسل ہوگئیں۔ شمسہ بھابی، عمامہ کو کہتی ہیں کہ طاہ سے دور رہو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ عمامہ کا کالج میں ایڈمشن ہوتا ہے تو دادی کہتی ہیں کہ وہ کوئی چاند چڑھائے گی۔ عمامہ کو کالج چھوڑنے شام جاتا ہے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوجاتا ہے اور ایک آدمی ملتا ہے جو عمامہ کے لیے گھٹیا الفاظ استعمال کرتا ہے اور شام کے پوچھنے پر خود کو اس کا باپ بتاتا ہے۔ منصور سیال (شام کا باپ) ایک لالچی آدمی ہے۔ سونیا کے ساتھ عمامہ کالج میں جلد ایڈجسٹ ہوجاتی ہے۔ سونیا جب عمامہ کے ساتھ گھر آتی ہے تو دادی کو وہ بالکل پسند نہیں آتی۔ عمامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ کا یہ حشر کیسے ہوا وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ پہلے بہت خوب صورت تھی۔ تقی، شام کو بتاتے ہیں کہ فیکٹری کے سامنے پلاٹ کا جو کیس تھا وہ ہم ہار گئے ہیں اور وہ پلاٹ منصور سیال نے لیا ہے اور اب وہ ان کے مقابل آکر بدلہ لینا چاہتا ہے کیونکہ صوفی صالح نے رابعہ (شام کی ماں) کے ساتھ منصور سیال کے سلوک کی وجہ سے اسے جیل کی شکل دکھائی تھی۔ اور وہ شام کو خود لے آئے تھے۔ تاج بیگم (دادی) شام سے کہتی ہیں کہ وہ تین مہینے کے بعد فیقہ سے اس کی شادی کردیں گی وہ تیار رہے۔ سونیا، عمامہ کو فون کر کے کہتی ہے وہ فیقہ کی برین واشنگ کر کے اس کو صحیح اور غلط فیصلے کی پہچان کروا کر اس کی دوسری جگہ شادی کروادے گی۔ وہ ابھی بات کر رہی ہوتی ہے کہ فون کٹ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فون پھر بجتا ہے تو فون پر سونیا کے دھوکے میں شام کے باپ منصور سے کہتی ہے کہ وہ شام کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ طاہ، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس نے منصور اور اس کی باتیں سن لی تھیں۔ طاہر اور (وکیل) بسمہ ہمدانی کو منصور ہوٹل میں چائے پیتے دیکھ لیتا ہے۔ منصور سیال، شام سے دوبارہ بیس ہزار روپے لیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ صالح کی بہن سے شادی کر کے اپنے جذبات اور زندگی کے ساتھ کیوں کھیل رہے ہو پھر وہ صوفی صالح کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ عمامہ اور شام کی شادی کردیں۔ طاہر اپنی پسند کو لے کر گھوم پھر سکتا ہے تو میرا بیٹا کیا گناہ کر رہا ہے۔ سونیا کالج نہیں آرہی تھی تو عمامہ فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی ہے اور اپنے آنے کا کہتی ہے پھر بڑی مشکل سے وہ اجازت لیتی ہے تو دادی کہتی ہیں کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جاؤ لیکن طاہرہ، شام کو فون کر کے بلا لیتی ہیں۔ سونیا اس کے آنے سے بہت خوش ہوتی ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس کی بہن کو محبت ہوگئی ہے۔ عمامہ کہتی ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے..... پھر وہ چونکتی ہے کیا تم دونوں کو ایک ہی بندے سے محبت ہوگئی ہے۔ سونیا، طاہر سے مارکیٹ میں ملتی ہے تو منصور سیال اسے دیکھ لیتا ہے اور پھر صوفی صالح کو فون کر کے کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا وہ، وہ لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرتا پھر رہا ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ میں نے اپنا رستہ بدل لیا ہے۔ سونیا، عمامہ کو اپنے منگیتر سے ملواتی ہے تو تقی جو عمامہ کو لینے آتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے اور عمامہ پر غصہ کرتا ہے۔ فیقہ، سونیا کا نمبر عمامہ کی ڈائری سے لے کر اسے فون کر کے مدد کرنے کا کہتی ہے سونیا، فیقہ کی مدد کرنے کی ہامی بھرتی ہے اور پھر اس کا حلیہ بدل دیتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ یہ احسان اتار سکتی ہیں۔ شام اور فیقہ کا جوڑ نہیں ہے اور وہ ایک بہت زبردست پروپوزل لائی ہے لیکن دادی اس کی بات ماننے سے انکار کردیتی ہیں کہ ہمارے ہاں بچپن کے رشتے توڑے نہیں جاتے۔ شام، عمامہ کے استفسار پر کہتا ہے کہ تمہارے علاوہ کوئی بھی ہو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ صوفی صالح، طاہر سے لڑکی کے بارے میں پوچھتے ہیں اور ایڈووکیٹ ہمدانی کی بیٹی بسمہ کا سونیا کی بہن ہونے کا سن کر فوراً اس کی شادی طے کردیتے ہیں۔ عمامہ، سونیا سے کہتی ہے کہ محبت حق نہیں مقدر ہوتی ہے اور اس نے محبت اور عزت کی جنگ میں عزت کو جیت لیا ہے۔ شام کو دیکھ کر عمامہ کا ساکت ہونا..... تقی کو بہت عجیب لگتا ہے۔ شام، طاہرہ (عمامہ کی ماں) سے معافی مانگتا ہے کہ میں نے عمامہ کا دل توڑا ہے۔ میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ طاہرہ کہتی ہیں کہ تم اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کرو وہ تمہارے رستے میں کبھی نہیں آئے گی۔ حالانکہ ابھی دو دن پہلے ہی وہ صوفی صالح کے پاس گئی تھیں کہ کسی طرح وہ یہ شادی رکوادیں۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کردیا تھا کہ میں زبان دے چکا ہوں، وہ میری بیٹی جیسی بہن ہے میں اس کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتا۔ تقی کے پوچھنے پر طاہ اسے بتاتی ہے کہ شام اور عمامہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور اس نے جب بتانا چاہا تو تقی نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ طاہ، رافعہ کو بتاتی ہے کہ تقی کو پتا چل گیا ہے لیکن اب کیا فائدہ یہ بات عمامہ سن لیتی ہے۔ نکاح کے بعد شام، عمامہ سے کہتا ہے کہ "میں خود کو مار آیا ہوں....." شام، فیقہ سے کہتا ہے کہ میں آپ سے مخلص ہوں اور کبھی آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔ اور آپ سے بھی یہی امید رکھتا ہوں۔ طاہرہ، عمامہ سے کہتی ہیں کہ تم کبھی شام کی راہوں میں نہیں آؤ گی۔ طاہر کے کالج نہ جاسکنے پر شام، عمامہ کو ٹیک کرنے چلا گیا اور واپسی پر دادی کو پتا چلتا ہے تو وہ عمامہ کی درگت بنا ڈالتی ہیں۔ طاہرہ، دادی کو بتاتی ہیں کہ تقی کے کہنے پر شام، عمامہ کو لینے گیا تھا، وہ

اپنی مرضی سے اس کے ساتھ نہیں آئی۔ بسمہ کو دادی کا یوں عمامہ کو مارنا اور بے عزت کرنا اچھا نہیں لگتا وہ طاہر سے شکایت کرتی ہے۔ دادی طاہر کے ان سے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ میں اپنی اولاد کی اولاد کو ڈانٹ نہیں سکتی۔ طاہر، دادی کو جھڑکانے کے بعد اب ساری بات نمک، مرچ لگا کر شام کو بتاتی ہے۔ سونیا، بسمہ سے کہتی ہے کہ وہ مگرمچھوں سے بیر نہ لگائے اور طاہر کو شکایت کا موقع نہ دے۔ سونیا ابرار کے لیے سنجیدہ ہے پر ڈیڈی نہیں مانتے۔ شام، خالہ سے کسی ملازمہ کا کہتا ہے کہ گھر کی صفائی ہو سکے تو دادی، عمامہ سے کہہ کر صفائی کرواتی ہیں۔ عمامہ، شام کے پورشن میں جا کر صفائی کرتی ہے تو وہاں اسے کوئی چیز متاثر نہیں کرتی سوائے شام اور فیقہ کی تصویر کے۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر:20

''اور ابھی کم ہی وقت بچا ہے۔ آگے کیسے چلے گا؟'' شام نے متفکر انداز میں کہا تھا۔ میز پر پڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اور ''پوآ'' کی ٹکیوں سے ساری بھاپ اڑ چکی تھی۔ اس نے چائے پی تھی اور نہ ہی کیک کی ٹکیوں کو چکھا تھا۔ وہ کچھ الجھا ہوا متفکر لگ رہا تھا۔

فیقہ اسے بغور دیکھتی رہی تھی۔ کیا وہ اس کے لیے پریشان تھا یا پریشان ہونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا؟ نہ چاہتے ہوئے بھی فیقہ ڈبل مائنڈڈ ضرور ہو جاتی تھی۔

''میں گھر چلوں گی..... اور کل سے وہاں رہوں گی.....'' فیقہ نے سرد پڑتے ہوئے کہا..... اچانک پچھلی طرف سے ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

''لیکن مسئلہ تو ہنوز وہی ہے گھر کی صفائی وغیرہ..... کھانا وانا.....'' وہ اپنے کپڑوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ نہیں کر سکا تھا جو مشین سے ابل رہے تھے۔ پہلے یہ سب کام طاہرہ آپا کے ذمے تھے۔ وہی اس کے پورشن کی صفائی کرواتی تھیں۔ بلاناغہ ہر روز..... اس کے کپڑوں کی دھلائی، ان کو استری کرنا پھر آ کے الماریوں میں ترتیب سے سیٹ کرنا سب کام طاہرہ آپا کے ذمے تھے۔ بعد میں فیقہ نے انہیں خود منع کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں کسی اور کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ سو طاہرہ اس کی ناگواری محسوس کر کے خود ہی پیچھے ہٹ گئی تھیں۔

فیقہ کو یہ تو نہیں پتا تھا کہ پرٹینیسی پیریڈ میں ڈاکٹر اسے بالکل بیڈ سے لگا دے گی۔ کیونکہ اس کی شروعات میں ہی کچھ پیچیدگیاں تھیں..... سو پہلے دن سے ڈاکٹر نے محتاط رہنے کو کہا تھا۔

اور اب وہ گھر کے کام کر سکتی تھی اور نہ کچن وغیرہ کو دیکھ سکتی تھی۔ اسی لیے سارا نظام الٹا پڑا تھا۔ ورنہ شام کے کام وہ اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ حتیٰ کہ نوکرانی تک کو اپنی راجدھانی میں داخل نہ ہونے دیتی۔

وہ شام کے معاملے میں انتہا درجے کی حساس ہو چکی تھی۔ اور کچھ طاہبہ اسے ہراساں کرتی چوکنا رہنے پر فورس کرتی تھی۔

''خوب صورت شوہروں پر کڑی نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ انہیں پھسلتے دیر نہیں لگتی۔ پھر شام کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ وہ تو پہلے سے عمامہ کے ساتھ.....'' طاہبہ کی ادھوری بات کا مفہوم وہ اچھی طرح سے سمجھتی تھی۔ اسی لیے کسی بھی قسم کا رسک لینے سے ڈرتی تھی۔

''خالہ کہہ تو رہی ہیں ملازمہ کا بندوبست ہو جائے گا۔'' شام نے آہستگی سے بتایا۔ فیقہ نے فوراً انکار کر دیا تھا۔ ان کے گھر میں نوکروں کا ایسا رواج نہیں تھا۔ کیونکہ اماں پسند نہیں کرتی تھیں یہ تو بہت مجبوری کے باعث ایک جز وقتی ملازمہ آتی تھی۔ کیونکہ صالح بھیا بھی ملازمہ کے حق میں نہیں تھے گھر کی باتیں باہر بتاتی تھیں۔

پھر ایک دو لڑکی رکھیں تو دنوں میں ''ڈھنگ'' دکھانے لگیں۔ کبھی طاہر کے گرد گھومتی کبھی تقی اور شام کے..... یہ بہت پہلے کی بات تھی۔ اماں نے فوراً ہٹا دیا۔

تب سے ملازمہ وہ چھان پھٹک کر رکھتی تھیں۔ اسی لیے کوئی قابلِ بھروسا ملتی نہیں تھی۔ فیقہ کے شدت سے

انکار کرنے پر شام خاموش رہ گیا تھا۔

''میں کچھ نہ کچھ کرلوں گی.....'' اس نے تب تو کہہ دیا تھا لیکن اس دعوے پر قائم نہ رہ سکی۔

پھر طاہرہ بھی اپنے مشوروں کے ساتھ اسے ڈرانے سے باز نہیں آتی تھی۔

''اس کلموہی چاندی کا پتا ہے.....؟ سارے محلے کو نچائے رکھا..... ہر کوئی اس کے پیچھے لگا تھا..... اسی چاندی سوغات کے قبیلے کی ساری ''کبوتریاں'' ہیں۔ سب نے ایک، ایک گھر سنبھال رکھا ہے، کوئی ضرورت نہیں، ماسی آتی تو ہے، اسی سے گزارہ کرلو.....'' وہ طاہرہ کے خدشات کو سمجھتی تھی۔ اور ماسی سے کیسے گزارہ کرتی؟ وہ تو پہلے ہی ہزار بیماریوں کا بوجھ اٹھائے جیسا تیسا کام کرتی اور نکل جاتی۔

فیقہ کو فل ٹائم ملازمہ چاہیے تھی۔ یہاں بھی طاہرہ نے اپنی خدمات پیش کی تھیں..... اور اپنے زرخیز دماغ سے بڑا آسان حل پیش کیا۔

''میں تو خود تمہاری ذمے داریوں کو سنبھال لیتی۔ لیکن جانتی ہو ناں بچے، تقی اور پھر میری بھی طبیعت خراب..... بلقیس کے بھی مسائل اپنی جگہ ہیں، دادی میں ایسی طاقت نہیں..... اور اماں کے اپنے بے حساب کام ہیں۔ میرا مشورہ لو تو عمامہ سے مطلب نکال لو..... غصہ نہ کرنا، میری بات پر غور کرو..... شام منہ اندھیرے جاتا ہے اور رات گئے لوٹتا ہے۔ سارا دن تم بھی اکیلی ہوتی ہو، عمامہ بھی فارغ ہے۔ وہ سارا کام بھی کرلے گی اور کچن بھی دیکھے گی۔ بعد میں بچے بھی سنبھال لے گی۔ اب پہلا سا طنطنہ اس میں نہیں..... بابا یا دادی کہیں گی تو انکار نہیں کرے گی۔ تمہارا کام نکل جائے گا بعد میں چھٹی کروا دینا.....'' طاہرہ کو قائل کرنا آتا تھا..... ایسے، ایسے دلائل دیتی کہ بندہ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہتا..... فیقہ کو اس کی باتیں دل کو لگی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ رسک لینے سے ڈرتی تھی۔

اماں سے کہا تو چاندی آگئی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں..... دونوں نے تین، تین دن کام کیا اور فارغ ہوگئیں۔ پھر ماسی اپنی بیوہ بیٹی کو لے کر آگئی تھی۔ وہ ساتھ چار بدتمیز بچے بھی اٹھا لاتی۔ فیقہ سے وہ بھی برداشت نہ ہوئی۔ غرض ایک ہفتے میں آٹھ نوکر آئے اور گئے..... کوئی بھی جم کر نہ دیا تھا۔

بعد میں دادی کو بھی طاہرہ کا مشورہ بھا گیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے از خود بات کرلی تھی۔ وہ بھلا کیا کہتے؟ خاموش ہوگئے۔ تاہم طاہرہ نے بہت اعتراض کیا تھا۔

''عمامہ کسی کی نوکر نہیں..... خدمتیں کرتی پھرے۔'' وہ پہلی مرتبہ شوہر کے سامنے برہم ہوئی تھیں۔

''اپنوں کے کام آنے سے نوکر نہیں بنتے..... بسمہ نئی نویلی بہو ہے پھر غیروں سے لائے ہیں، اونچے باپ کی بیٹی ہے، اس سے کام کرواتے اچھے نہیں لگتے۔ عمامہ اگر اپنی پھوپی کے کام آجائے گی تو کوئی حرج نہیں.....'' صوفی صالح نے دھیمی آواز میں سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ طاہرہ ناراضی سے انہیں دیکھتی رہیں۔

''آپ سب کچھ بھول گئے.....؟'' ان کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔ ''عام حالات ہوتے تو میں کبھی نہ انکار کرتی۔ لیکن گزشتہ معاملات کو سوچتے ہوئے یہ مناسب نہیں۔'' وہ شوہر کو گہرائی میں اتر کر ''نزاکتوں'' کا بتا نہیں سکی تھیں۔ اپنی ساس سے انہیں امید نہیں تھی کہ وہ اور معاملوں پر غور کرتیں۔ وہ بلا کی خود غرض تھیں..... اب بھی بس اپنی ''غرض'' کو سوچ رہی تھیں..... انہیں صرف فیقہ کا ''وقت'' نکالنا تھا۔ طاہرہ کا ہر اعتراض ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اور عمامہ کو مخصوص اوقات کے لیے پابند کر دیا گیا۔ عمامہ شاید بہت شدت سے فیقہ کی نوکرانی بننے سے انکار کر دیتی لیکن جب بابا نے کہا تو اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔ صرف ڈیڑھ مہینے کی بات تھی۔ پوروں پر گنتے ہی ختم ہو جاتے۔

اور ویسے بھی شام کو ہر بات سے لاتعلق رکھا گیا تھا۔ سو عمامہ مطمئن تھی۔

اور اس وقت فیقہ کہہ رہی تھی..... میں کچھ نہ کچھ کرلوں گی..... شام نے وضاحت نہیں لی کہ ''کچھ نہ کچھ'' میں وہ کیا کرلے گی؟ غالباً گھر کی کسی خاتون سے ''خدمات'' حاصل کرلے گی.....؟ یا جو بھی..... اس کو متفکر ہونے کی

ضرورت نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر مزید فیقہ کے پاس بیٹھا تھا اور پھر چل پڑا۔ فیقہ نے کہا تھا، وہ ایک گھنٹے تک آجاتی ہے۔ سو وہ اپنے پورشن کی طرف آنے لگا۔ گیلری سے گزرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر غیر ارادتاً نگاہ زینے پر پھسلتی کارنر والے کمرے اور اس کے بند دریچے تک گئی تھی..... وہ دریچہ جس میں عمامہ بیٹھ کر نیچے کی کارروائیاں ملاحظہ کرتی تھی۔ یا کچھ گنگناتی تھی۔ تب اس کے کھلے گھنگرالے بال چہرے پر بکھر، بکھر جاتے۔ یا جب وہ کسی سے خفا ہوتی تب وہاں بیٹھ جاتی۔ منہ بسور کر، غصے میں، جب تک کوئی منا نہ لیتا۔ نیچے نہیں آتی تھی۔

اس کا دل چاہا..... وہ زینہ چڑھے اور دریچہ کھٹکھٹائے۔ وہ اپنی خالہ کی اس فضول گوئی پر عمامہ سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اور اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا فیصلہ کرلیا ہے۔ لیکن عمامہ کہیں نظر آتی تو تب، دکھائی دیتی تو تب..... وہ چلتے، چلتے باہر نکل آیا۔

سبز باڑ کی دوسری طرف اس کا پورشن تھا..... اس کے اندر عجیب سا اداسی بھرا سناٹا ابھرا تھا۔ دل چاہ رہا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بہت دور نکل جائے..... اتنی دور جہاں کوئی رشتہ، کوئی احساس نہ ہو۔ نہ پیروں کی زنجیر بنے..... نہ رستوں کی دیوار بنے..... لیکن یہ ممکن تھا کیا؟ شاید نہیں.....

وہ چلتا ہوا گرل کے پاس آگیا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں تعجب ابھرا۔ وہاں منال کھڑا تھا۔ بڑی خوب صورتی سے ''پر'' پھیلائے ہوئے شام کی آنکھوں میں تحیر پھیلتا گیا۔ منال کتنے عرصے بعد یہاں آیا تھا۔ شاید دس ماہ بعد..... وہ شام سے ناراض تھا۔ اس طرف نہیں آتا تھا۔ پھر آج کیوں.....؟ شام چلتا ہوا اندر آگیا اور پھر چمکتے دمکتے صاف ستھرے پورشن کو دیکھ کر اسے بہت سی چیزوں کی سمجھ آگئی تھی۔ کوئی بتاتا نہ بتاتا۔ عمامہ نظر آتی یا نہ آتی..... پھر بھی اسے ہر جگہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی خوشبو بتا رہی تھی۔ وہ یہاں آئی تھی۔ شام کے اندر ایک احساس ابھرا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا..... لاجوردی کنٹھے والا منال بھی پر پھیلائے بتا رہا تھا۔ ''عمامہ یہاں آئی تھی۔'' اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھونچال آگیا۔

☆☆☆

''مجھے بسمہ نے بتایا اور مجھے یقین نہیں آیا۔ کیا تم واقعی فیقہ کی ''کنیز'' بنی ہوئی ہو.....؟'' سونیا نے فون پر ہی بے ساختہ اس کے لتے لیے تھے۔

''عمامہ شہزادی! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ عشق میں دل تو گیا، کیا دماغ بھی چلا گیا.....؟'' اسے ہرگز یقین نہیں آرہا تھا۔ اور غصہ بھی بہت تھا۔ عمامہ بھلا کیا جواب دیتی؟ اسے وضاحتیں دینا، دلائل پیش کرنا سب کچھ بھول گیا۔ اسے تو اپنا آپ بھی بھول گیا تھا۔ کیا وہ وہی عمامہ تھی، شہزادیوں سی، فلیپر، بیل ٹائم، پینٹ نما پاجامے پہنتی..... بال بناتی، آنکھوں میں کاجل لگاتی..... ہر وقت نک سک سے تیار رہتی، اسے سنگار کا اتنا شوق تھا لیکن اماں کرنے نہیں دیتی تھیں۔ اور اب زبردستی اماں اسے بال بنانے اور کپڑے بدلنے کے لیے بھیجتی تھیں۔ اور عمامہ پہروں سوچتی رہتی تھی کہ وہ یہ سب کرکے کیا کرے۔

''میں کہتی ہوں، اس جاب سے ریزائن کرو..... ابھی کے ابھی.....'' سونیا کا انداز وارننگ دینے والا تھا۔ عمامہ جھنجلا گئی۔

''کیسی باتیں کرتی ہو..... صرف ایک مہینے کی بات ہے، ویسے بھی کوئی بڑا کام نہیں.....'' اس نے دلیل دینے والے انداز میں کہا تھا۔ سونیا جیسے چمک ہی پڑی۔

''وہ مہارانی کوئی نوکر رکھ لیتی، تم ہی الو کی دم ملی ہوئی ہو، جب چاہو استعمال کرو.....'' سونیا کا بس نہیں چل رہا تھا۔ عمامہ کی آکے گردن ہی مروڑ دیتی۔ بسمہ کو بھی عمامہ پر ایسا ہی غصہ تھا۔

''فیقہ میری پھپھو ہے سونیا! اور اس وقت تکلیف میں ہے، ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتا رکھی تھی۔ مجھے تو اب پتا چلا

ہے۔ کافی سیریس کنڈیشن ہو سکتی ہے اگر بے احتیاطی ہوئی تو....." عمامہ نے بڑے تفکر کے عالم میں بتایا تھا۔ سونیا دوسری طرف اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ جیسے عمامہ کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

"اور پھر فیقہ کے رشتے سے شام تمہارا پھوپا ہوا ناں..... اس کا بھی خیال رکھا کرو..... بیچارے کی بیمار بیوی ہے۔ اس کا خیال نہیں رکھ سکتی....." سونیا دانت پیس کر چیخی تھی۔ عمامہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"اُف..... پھوپا تو نہ کہو....." اس نے تکلیف سے آنکھیں میچ لی تھیں۔ سونیا نے بے ساختہ کہا۔

"وہ تو تمہارا بڑا شکر گزار ہوگا۔"

"شام کو پتا نہیں..... میں اس کی موجودگی میں نہیں جاتی....." عمامہ نے دھیمی آواز میں بتایا۔ سونیا کا پھر سے میٹر گھوم گیا۔

"یعنی نیکی کر کے دریا میں ڈال رہی ہو....."

"کیا نیکی اور کیا احسان.....؟ تم مجھے پاگل کہو گی یا اینٹ اٹھا کر مارو گی..... فیقہ چاہے بولے یا نہ بولے..... ان دنوں وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ دل سے بہت قریب....." عمامہ نے آنکھیں موند کر ایک وجد کے عالم میں کہا تھا۔ دوسری طرف سونیا غرا کر رہ گئی تھی۔ بلکہ اپنے بال نوچنے لگی تھی۔

"ظاہر ہے وہ تمہارے ہونے والے کزن کو جنم دینے والی ہے۔" وہ دہاڑی تھی۔

"نہیں..... وہ شام کے بچے کو پیدا کرنے والی ہے۔ اور مجھے اس بچے کا بہت انتظار ہے....." اس نے سابقہ جذب بھرے لہجے میں سونیا کو پھر سے "کرلانے" پر مجبور کر دیا تھا۔

"تمہارا کوئی علاج نہیں عمامہ! ہو بھی نہیں سکتا....." آخر میں اس نے بس اتنا ہی کہا۔

"تمہیں کیا خبر، اس میں کتنا سرور ہے....." عمامہ کے جذب میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"محبوب کے بچے پالنے میں.....؟" سونیا نے گہرے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں..... شام کے کسی کام آنے میں..... وہ کچھ دنوں سے بہت پریشان تھا۔ اس کی روٹین ڈسٹرب تھی۔ لیکن اب وہ مطمئن ہے تو مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔ میں اس کے سکون کا باعث ہوں....." عمامہ نے نرم لہجے میں وضاحت دی تھی۔

"لیکن اسے کون سا پتا ہے؟ اور نہ فیقہ بتائے گی۔ تاکہ تمہارا گراف اس کی نگاہ میں کبھی نہ بڑھے....." سونیا نے ٹھیک نکتہ اٹھایا تھا۔ عمامہ کچھ پل کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

"شام پر "جتا" کر مجھے کوئی انعام نہیں چاہیے....." اس کی آواز دھیمی تھی۔

"تمہیں واقعی ایک "لاعلاج" مرض لاحق ہے عمامہ....." سونیا بھنائی تھی۔ "کبھی اس "غریب" کو بھی یاد کر لیا کرو، جس کی تم منگیتر ہو..... بدقسمتی سے۔" اس کا انداز پھر سے طنزیہ ہو گیا تھا۔

"کون؟" وہ بے خیالی میں بولی۔

"فرخ..... اور کون.....؟" سونیا نے جتلایا۔ "حد ہے، تمہیں فرخ بھول گیا۔"

"مجھے یاد ہی کب تھا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"کیا میں یاد دلا دوں.....؟" سونیا کا انداز خفگی میں ڈوبا تھا۔ "پیچھے مڑ، مڑ کر کیوں دیکھتی ہوں عمامہ.....! آگے دیکھو، منزل تمہاری آگے ہے۔ کیا تم مجھ سے سیکھنا نہیں چاہتیں..... جو تمہارا نہیں اسے مت دیکھو، جو تمہارا ہے اسے دیکھو....."

"تم نہیں سمجھو گی سونیا! میں آگے دیکھتی ہوں نہ پیچھے..... میں کچھ بھی نہیں دیکھتی..... دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ میرے اندر سے امنگ ختم ہو گئی ہے۔" وہ کہہ نہیں سکی تھی۔ کچھ باتیں کبھی بھی نہیں جا سکتیں۔

فون بند ہوگیا تو عمامہ وہیں بے دم سی بیٹھ گئی۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر، ٹھنڈے فرش پر، کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح۔

پھر جانے کتنا وقت گزر گیا۔ عمامہ کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ فون کی گھنٹی دوبارہ بجی تو وہ چونکی۔ اس نے سنبھل کر فون اٹھایا تھا۔ دوسری طرف جو آواز سنائی دی تھی اسے سن کر وہ لمحے بھر کے لیے بھونچکا رہ گئی تھی۔ اتنے بہت سے مہینوں بعد اس نے پھر سے بڑی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فون کر لیا تھا۔ عمامہ کا دماغ سنسنا اٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ بڑی مکارانہ حلاوت سے پوچھ رہا تھا۔

''پہچانا نہیں عمامہ! کیا اپنا تعارف کروا دوں.....؟''

''کیوں فون کیا ہے؟'' اس نے بمشکل اپنے کپکپاتے لہجے پر قابو پا کر کہا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی کچھ خوفزدہ ہوگئی تھی۔ گیلری دور تک ویران تھی۔ بچے اسکول جا چکے تھے اور بھابیاں انہیں بھیج کر پھر سے آرام فرما رہی تھیں۔

''ایک بدنصیب باپ کیوں فون کرے گا؟ اپنا غم بتانے کے لیے..... اپنا دکھ شیئر کرنے کے لیے..... مجھ بدبخت کی حکایت سننے والا کوئی نہیں..... کسے کہوں.....؟ کسے بتاؤں؟ میرا بیٹا تو پرایا سمجھو۔'' منصور نے ایسا رونا مچایا کہ عمامہ گھبرا اٹھی۔

''کیا ہوا.....؟'' اس نے دبی، دبی آواز میں پوچھا۔

''یہ پوچھو، کیا نہیں ہوا؟ میرے منہ پر جوتی ماری۔ مجھے فٹے منہ نہیں پوچھا۔ چھپ چھپا کر شام نے بیاہ رچا لیا۔ مجھے بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ ارے، میں اس کا باپ تو تھا ناں..... مجھے بلایا تک نہیں..... آخر میری بھی کوئی برادری ہے، رشتے دار مجھے طعنے مارتے رہے۔ اکلوتا بیٹا، جس نے کبھی مجھے گھاس نہیں ڈالی۔ منہ نہیں لگایا۔'' وہ اونچی آواز میں رونے لگا تھا یا رونے کا ڈراما کر رہا تھا۔ عمامہ سمجھ نہیں سکی تھی لیکن وہ گھبرا ضرور رہی تھی۔

''اور میں تو گیا بھاڑ میں..... مجھے تو تمہارا غم مارے ڈال رہا ہے۔ بڑا بے وفا اور بدعہد نکلا شام..... اس نے تمہارا دل توڑ دیا۔ تمہارے جذبات کو مجروح کر دیا..... دیکھنا بڑا خوار ہوگا۔ بڑا ذلیل ہوگا..... خود بھی خوش نہیں رہے گا۔ اس نے تمہیں ٹھکرایا ہے زمانہ اسے ٹھکرائے گا۔ بہت پچھتائے گا سکھ نہیں پائے گا۔'' منصور نان اسٹاپ... بددعاؤں پر اتر آیا تھا۔ عمامہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ بے ساختہ چیخی آواز میں چیخی تھی۔

''اللہ نہ کرے، شام کبھی دکھ پائے، غم اٹھائے، خوار ہو.....'' اس کی جان نکل گئی تھی۔ دوسری طرف واویلا کرتا منصور لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا تھا۔ وہ جو سمجھ رہا تھا شام کے خلاف عمامہ کو بھڑکا کر اس کی ہمدردیاں بٹورے گا۔ اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

''اس نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا.....'' منصور گڑبڑا کر بولا۔

''اس نے میرے ساتھ برا بھی نہیں کیا.....'' اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

''تم اگر کوشش کرتیں کچھ ہمت سے کام لے کر اس ''بے ہمت'' کو جرأت دلاتیں۔ اسے اپنے بڑھیا مکار دادی کے ''احسانات'' تلے سے نکالنے میں مدد کرتیں تو میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔'' منصور نے اپنی طرف سے بھرپور ساتھ دینے اور خلوص جتانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ لیکن عمامہ کے اگلے جواب پر اس کا منہ اچانک بند ہوگیا تھا۔

''میں تقدیر کے سامنے بے بس تھی۔'' اس کی آواز مدھم پڑ گئی تھی۔ منصور نے بے ساختہ اس کی بات کاٹی تھی۔

''تقدیر نگوں ہو جاتی ہے۔'' منصور نے عجلت میں کہا۔

''تقدیر نگوں ہوتی نہیں، کر دیتی ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔ منصور لمحہ بھر کے لیے چپ سا ہوگیا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتا.....''

''مگر میں ایسا سمجھتی ہوں.....'' اس نے دھیمی آواز میں جتایا تھا..... ''میری جنگ نصیب کے ساتھ نہیں تھی۔ اپنے دل کے ساتھ تھی۔ میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے۔'' عمامہ نے بڑے صبر اور ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ دوسری طرف منصور بھونچکا رہ گیا۔

''اور میں آپ سے استدعا کرتی ہوں۔ آئندہ اس موضوع پر یا کسی بھی وجہ سے مجھے کال مت کیجیے گا۔ یہ آپ کے حق میں بھی اچھا ہوگا۔'' اس نے منصور کی مزید کوئی بات سنے بغیر کال کاٹ دی تھی۔ اور خود ایسے طویل سانس لینے لگی تھی۔ جیسے میلوں کا سفر کر کے آئی ہو۔ اس کے انگ، انگ میں صدیوں کی تھکاوٹ اتر آئی تھی۔

☆☆☆

عمامہ نے اپنی زندگی کے کتابچے میں ایک جگہ لکھا تھا۔

وہ دن سخت حبس بھرے گرما کے انتہائی گرم ترین، چلچلاتی دھوپ میں ملفوف، سخت کڑے اور شدید بیزار کن دن تھے۔ تب منال بھی سارا دن مور پنکھ کے بوٹے تلے سر نیہوڑے سوتے رہتے۔ امرود کی شاخوں کے نیچے پرندے اونگھتے رہتے۔ انہی دنوں میں کالونی کی مین لائن کا بڑا پائپ پھٹ گیا۔ جس سے سرکاری پانی پوری کالونی کو سپلائی ہوتا تھا۔ ان دنوں شاز، شاز ہی لوگوں کے گھروں میں ڈائی موٹریں تھیں۔ بس عمامہ اور کیپٹن صاحب کے گھر ''پمپ'' موجود تھے۔ باقی لوگ کالونی سے باہر نہر کے کناروں پر لگے نلکوں سے پانی لاتے تھے۔

عمامہ کی سہیلیاں نازی، کنول اور فہمی وغیرہ بھی ''پن گھٹ'' پر بوتلیں اور کین بھرنے جاتیں..... عمامہ کو گھر سے اجازت نہیں تھی۔ ویسے بھی ان کے گھر پانی کی سہولت موجود تھی۔

اس دن بڑے دنوں بعد نازی، عمامہ کی ہزار ''لاتعلقی'' کے باوجود چلی آئی۔ جب سے عمامہ کی زندگی میں سونیا آئی تھی عمامہ کالونی کی سہیلیوں سے خود ہی دور ہوگئی تھی۔ ویسے بھی نازی وغیرہ سے اس کا مزاج نہیں ملتا تھا اور مزاج تو سونیا سے بھی نہیں ملتا تھا۔ مگر سونیا کی بات کچھ اور تھی۔ اس دن نازی نے عمامہ کو بڑا مجبور کیا۔

''گھر میں بوند برابر پانی نہیں..... کنول اور فہمی کے بھائی سویرے ہی بوتلیں بھر لائے تھے۔ وہ دونوں تو نہیں جائیں گی۔ پلیز میرے ساتھ چلو..... میں اکیلی ہوں، رستہ بھی سنسان ہے۔'' نازی کی منت پر عمامہ چپ سی کر گئی تھی۔ وہ اچھے دنوں کی ساتھی تھی۔ بہت پہلے عمامہ کی واحد سہیلی نازی تھی۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنے آتی تھی اور وہ مل کر سب اسکول جاتی تھیں۔ نازی ویسے بھی اماں کے ساتھ بہت سے کام کروا جاتی تھی۔ لیکن جب سے اس کے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں اس نے آنا کم کر دیا۔ لیکن عمامہ اس کے ساتھ نہر تک نہیں جا سکتی تھی کیونکہ اسے گھر سے اجازت نہیں تھی۔

اس نے اپنی مجبوری بتا کر جب انکار کرنا چاہا تو اماں اچانک اندر آ گئیں۔ انہوں نے عمامہ سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''چلی جاؤ عمامہ! اندر سے بڑی چادر لے لو..... تھوڑا دل بہل جائے گا۔'' طاہرہ کے کہنے پر عمامہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ گو کہ ابھی دوپہر کا وقت نہیں تھا پھر بھی باہر بلا کی گرمی تھی۔ اماں کبھی اتنی گرمی میں محض پانی لینے اسے نازی کے ہمراہ نہ بھیجتیں۔ لیکن جانے کیوں.....؟ شاید عمامہ کے وجود کی خاموشی سے گھبرا کر یا اس کی ذات پر چھائے جمود کی وجہ سے..... وہ چاہتی تھیں اس کے اندر لگے خاموشی کے تالے ٹوٹ جائیں۔ سناٹے ختم ہوں، وہ سہیلیوں کے گھروں میں جانے کی ضد ہی کرے۔ لڑائی کرے، جھگڑا کرے، وہ پہلی سی عمامہ بن جائے۔ لیکن وہ پہلی سی عمامہ کیسے بن جاتی.....؟ پہلی سی عمامہ بننے کے لیے تو پھر سے بہت طویل اور لمبا سفر درکار تھا۔ اور وہ زادِ سفر کہاں سے لاتی؟

''اماں! میں کیسے؟ دادی غصہ کریں گی..... اور بھائی وغیرہ.....؟'' اس نے خوفزدہ انداز میں کہا تھا۔

''کچھ نہیں کہیں گی۔ تم جاؤ.....'' انہوں نے خود ہی چادر..... بھی لا کر دی۔ عام حالات میں وہ اسے گھر سے کبھی نہ نکلنے دیتیں۔ لیکن شاید وہ چاہتی تھیں عمامہ، نازی کے ہمراہ کچھ وقت گزار لے تاکہ اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑے۔ آج کل سونیا بھی تو نہیں آ رہی تھی اور بسمہ بھی میکے میں مقیم تھی۔ سو عمامہ انہیں بہت ہی گھٹی، گھٹی لگتی۔ کیونکہ

ان دونوں سے اس کی بہت دوستی تھی۔ اور اب نازی کو دیکھ کر طاہرہ کو امید کی کرن دکھائی دی تھی۔ انہوں نے عمامہ کو گھاٹ پر بھیجنے کی اجازت دے دی تھی۔ کالونی سے کچھ باہر، نہر کے کنارے تک..... کوئی زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ لیکن آمد و رفت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

وہ نازی کے ہمراہ بے دلی سے چلی آئی۔ دو کین عمامہ نے پکڑ رکھے تھے اور دو نازی نے۔ وہ دنیا جہاں کے شکوے کرتی، ناراضی دکھاتی، عمامہ کی بے مروتی پر چوٹ کرتی، ڈھیروں باتوں کے دوران مطلوبہ جگہ تک پہنچ گئی تھیں۔ پھر پانی بھی بھر لیا اور عمامہ نے اپنی لاتعلقی پر معذرت بھی کر لی تھی۔

جب وہ کین اٹھائے ہانپتی ہوئی واپس پلٹ رہی تھیں۔ یہ تب کی بات ہے، عمامہ کو دور سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ جانی پہچانی سی کار..... جو اُن کے قریب سے گزر گئی۔ بہت تیزی کے ساتھ لیکن پھر اسی تیزی کے ساتھ ریورس بھی ہوئی۔

عمامہ اور نازی جیسے اچھل پڑی تھیں..... پھر دونوں نے ہی کار اور کار والے کو پہچان لیا تھا۔ نازی کی جیسے جان میں جان آئی تھی اور عمامہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

کیونکہ کار سے شام باہر نکل رہا تھا۔ بہت جلدی اور تیزی میں..... اس کے تاثرات بڑے عجیب اور حیران کُن تھے۔ اس نے نازی اور عمامہ کے ہاتھ سے ''کین'' پکڑ کر ڈگی میں رکھے۔ پھر کار کا دروازہ کھول دیا۔ نازی بخوشی کار میں گھس گئی تھی۔ اتنی بھاری بوتلوں کو اٹھا کر گھر تک پہنچنا کوئی آسان نہیں تھا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اور عمامہ بھی گم صم سی نازی کے ہمراہ بیٹھ گئی۔ جبکہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اور نازی کے گھر تک پہنچ کر اسے اتارنے کے بعد کوئی سولہ مرتبہ وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔

''عمامہ! تم یہاں.....؟ مجھے یقین نہیں آ رہا..... اتنی سنسان جگہ پر، کیا ضرورت تھی عمامہ! پھر یہ بھاری کین اٹھا کر پیدل جانا حد ہے عمامہ.....'' شام کی بے یقینی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ جانے وہ عمامہ سے مخاطب تھا یا خود سے؟ وہ سمجھ ہی نہیں سکی۔ کیا اسے وضاحت دینی چاہیے تھی؟ وہ خود سے نہیں آئی۔

''اگر لقی یا طاہر دیکھ لیتے۔ بھرکس نکال دیتے تمہارا.....'' وہ اب بھی خود کلامی کر رہا تھا۔ وہ براہ راست عمامہ سے مخاطب نہیں تھا۔

''کالونی میں کوئی دیکھ لیتا تو سو طرح کی باتیں بن جاتیں..... صوفی صالح صبحانی کی بیٹی پانی بھرنے جا رہی تھی۔'' اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی خود سے مخاطب تھا۔ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی عمامہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ عمامہ کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ کوئی کر سکتا تھا ایسا ''ضبطِ عشق.....؟'' کوئی کر سکتا تھا نگاہ کو اس طرح سے قابو.....؟

''اماں نے بھیجا تھا۔ نازی اکیلی تھی اس لیے..... میں خود سے نہیں آئی۔'' عمامہ کو کہنا ہی پڑا۔ وضاحت دینی ہی پڑی۔

''طاہرہ آپا نے.....! حیرت سی حیرت ہے۔'' وہ بے یقینی سے چونک کر بڑبڑایا۔ پھر دوبارہ اس کی بڑبڑاہٹ نہیں ابھری۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اسی خاموشی میں مختصر سفر کٹا..... کار گیٹ سے کچھ فاصلے پر غیر ارادتاً رک گئی۔ عمامہ بے خیالی میں اتری..... اور اپنے دھیان میں آگے بڑھی تھی۔ پھر پیچھے سے اسے ہلکی سی آواز آئی تھی۔ عمامہ ٹھٹک گئی، رک گئی، پلٹ گئی، تھم گئی، ٹھہر گئی۔

وہ کار سے باہر سر جھکائے کھڑا تھا۔ اور اس کا چہرہ دھوپ کی حدت سے تپ رہا تھا۔ سرخ آگ سا..... اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ناقابلِ فہم سے..... وہ ماتھے سے چپکے، گیلے بال ہٹا کر بول رہا تھا۔

''میں نے سوچ لیا ہے۔ بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں تمہاری زندگی کو مشکل نہیں بنانا چاہتا۔ تمہاری زندگی سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ تمہیں دوبارہ نظر نہیں آؤں گا۔'' وہ نگاہ جھکائے اب بھی ''ضبطِ عشق'' کے پل صراط پر کھڑا تھا۔

عمامہ کی کھلی آنکھوں میں دھوپ ہی دھوپ بھر گئی تھی۔ اس نے گلابی آنکھوں کو مسل، مسل کر دیکھا۔ پھر بھی

دھوپ اس کی آنکھوں میں بھرتی جارہی تھی۔

''میں فیصلہ کر چکا ہوں، میری وجہ سے تم تکلیف سے گزرو، یہ مجھے گوارا نہیں.....'' شام کی بھیگی پیشانی پر گیلے بال اب بھی چپک رہے تھے۔ نوکیلی پلکوں کے سائے تلے سحر انگیز آنکھوں میں کیا تھا؟ عمامہ دیکھ نہ سکی۔

''اور تم تکلیف سے گزرتی ہو..... مجھے دیکھ کر۔ بلکہ ''ہمیں'' دیکھ کر..... ہماری یہاں موجودگی تمہاری آئندہ کی زندگی کو بوجھل بنائے یہ میں کبھی نہیں چاہوں گا۔ میں جلدی الگ گھر بنالوں گا..... تب تم خالہ اور خالہ جیسی باقی عورتوں کی ''بکواس'' سے آزاد ہو جاؤ گی..... کوئی بھی تم پر انگلی نہیں اٹھائے گا۔ کوئی بھی تمہیں تکلیف نہیں دے گا۔''

اسے شام کی بوجھل آواز پھر سے سنائی دی تھی۔ عمامہ کے دل کو ''دھکا'' لگا بڑے زور کا دھکا..... بڑا تکلیف دہ دھکا۔

عمامہ کی دھوپ بھری آنکھوں میں جلن بھرتی چلی گئی۔

''تو کیا وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانے والا تھا؟ اس کے گھر سے دور بہت دور..... عمامہ کی نگاہوں سے دور.....؟'' اس کا دل جیسے کھائی میں گر پڑا۔ اس نے یہ تو کبھی نہیں چاہا تھا..... وہ یہاں ہمیشہ رہتا..... چاہے فیقہ کے ساتھ ہی سہی.....

''صرف کچھ مہینے برداشت کرنا ہوگا۔ تھوڑا سا وقت..... پھر شاید ہماری زندگیوں میں سکون آجائے.....'' شام کے لہجے کا بوجھل پن بڑھتا جارہا تھا، بڑھتا جارہا تھا۔

''اور میں چاہتا ہوں..... تم ہمیشہ خوش رہو..... اتنا مسکراؤ کہ مسکراہٹ بھی تنگ پڑ جائے..... اتنا ہنسو کے تمہارے باپ کے گھر کی اونچی فصیلوں میں شہنائیاں گونج اٹھیں..... تم زندگی کا لمحہ، لمحہ جیو کہ تمہیں زندہ رہنا ہے کیونکہ زندگی تمہارے اندر دھڑکتی ہے۔'' اس کی دھیمی آواز ہلکی ہو کر بالکل معدوم ہو گئی تھی۔ پھر وہ بے آواز قدموں سے پلٹ گیا تھا۔ عمامہ اسے پلٹتا دیکھتی رہی..... وہ جاتا رہا..... رستہ دھول اڑاتا رہا۔

عمامہ کھڑی رہی..... دھوپ پھیلتی رہی۔

محبت اور بارش ایک جیسی ہوتی ہے، دونوں ہی یادگار ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ بارش ساتھ رہ کر جسم بھگوتی ہے اور محبت دور رہ کر بھی آنکھیں بھگوتی ہے۔

اور عمامہ صالح صبحانی کو کڑی دھوپ میں گرتی ''شام محبت'' کی بارش پور، پور بھگو رہی تھی۔

☆☆☆

اور عمامہ نے اپنی ''کتاب حیات'' کے ایک صفحے پر کچھ اس طرح سے لکھا تھا۔

''سانس کا سفر ختم ہو جاتا ہے لیکن آس کا سفر باقی رہتا ہے، یہ ہی وہ سفر ہے جو انسان کو متحرک رکھتا ہے اور متحرک ہونا زندگی کی علامت ہے۔ یہ علامت رگوں میں خون کی طرح دوڑتی رہے تو انسان مایوس نہیں ہوتا..... چاہے سانس کا سفر ختم ہی کیوں نہ ہو جائے.....'' وہ چکنی سی گولڈن صفحات والی ڈائری میں سنہرا قلم رکھ کر سبز دریچے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ''پنیا سوت'' کی نمکاہٹ چمک رہی تھی۔ یہ بادامی سنہری جھیل سی گہری آنکھیں نہیں تھیں۔ بلکہ ایسا تالاب تھا جس میں سوت سے پانی آتا تھا۔ کبھی ختم ہی نہ ہوتا۔ آئے چلا جاتا..... بہے چلے جاتا۔

''اور محبت کوئی ''حادثہ'' نہیں..... ایک واقعہ ہے کیونکہ حادثے بھول بھی جاتے ہیں لیکن واقعے بھلانے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہیں..... گزرا ہوا واقعہ گزرتا ہی تو نہیں ہے بلکہ وہ یاد بن کر بار، بار گزرتا ہے۔'' اور محبت ایسا واقعہ تھا جو یاد بن کر بار، بار گزرتا تھا۔ اس یاد میں بھی ایک سرور تھا، ایک لذت تھی، اِک چاشنی تھی..... اِک لطف تھا۔

وہ سبز دریچے میں پہروں کھڑی رہتی..... اور سکون اس کی آنکھوں میں کروٹیں لینے کے لیے ترستا تھا۔

ان دنوں عمامہ کی مصروفیات کا صرف ایک ہی دائرہ تھا۔ فیقہ کا گھر اور فیقہ کا خیال..... وہ دن بھر شام کے پورشن میں رہتی..... گھر کا کام کرتی، کچن کو سنبھالتی، کھانا بناتی اور سرِ شام اپنے پورشن میں لوٹ آتی۔ فیقہ اور اس کے

درمیان بہت کم گفتگو ہوتی تھی۔ عمامہ کو لگتا تھا، فیقہ اسے پہروں خاموشی سے دیکھتی ہے اور دیکھ کر تھکتی نہیں۔

عمامہ کو فیقہ کے دیکھنے سے الجھن نہیں ہوتی تھی..... اور نہ وہ فیقہ کی چوری کو پکڑتی..... بس خاموشی سے اپنا کام کیے جاتی تھی۔ پھر کچھ دن مزید کھسکے تو دادی نے طابہ کو بازار بھیجا..... اور وہ چھوٹے بچوں کا ڈھیر سا سامان اٹھائے لدی پھندی سی گھر آئی تھی۔

گھر کی ساری خواتین نے باجماعت ''بچگانہ شاپنگ'' دیکھی تھی۔ سب کی آنکھوں میں شوق اور اشتیاق تھا جبکہ عمامہ کے ''شوق'' اور ''اشتیاق'' کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ ایک، ایک روئی جیسے نرم کپڑے کو چھوتی اور گالوں سے لگاتی..... کھلونے، فیڈر، کپڑے ان میں سب سے زیادہ خوب صورت چیز دو عدد پنگوڑے تھے۔ بہت ہی پیارے، فرل اور جھالروں سے سجے..... جن میں گھنگھنے اور میوزک بھی لگے تھے۔ ایک جیسے دو گہوارے کیوں تھے؟ عمامہ سمجھ نہ سکی..... شاید ایک پنگوڑا طابہ بھابی اپنے آنے والے بچے کے لیے لائی تھی۔

عمامہ کا شوق اشتیاق بڑھتا رہا..... اور گلابی، گلابی دو نومولود اس کی آنکھوں میں عکس بناتے رہے۔ دونوں پنگوڑوں میں دو خوب صورت بچے قلقاریاں مارتے عمامہ کو بے چین کر دیتے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ دونوں جھولے فیقہ کے پورشن میں سجا دیے گئے۔ عمامہ تب بھی نہ سمجھ سکی۔ تاہم حیران ضرور ہوئی تھی۔ فیقہ سے ایسی بے تکلفی نہیں تھی جو پوچھ سکتی اور اماں سے جھجک کے باعث سوال نہ کر سکی۔ لیکن اسے آنے والے نومولود کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ وہ ایک، ایک دن کو انگلیوں پر گنتی تھی۔ مگر گرما کے دن طویل بہت تھے۔ گزرتے ہی نہیں تھے۔

وہ بھی حبس بھری اِک بوجھل سی رات تھی۔ سبز دریچے میں کھڑی عمامہ نے آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ سارا آسمان ستاروں سے خالی تھا۔ جانے ستارے کہاں گئے تھے؟ وہ بے چینی سے دریچے سے ہٹ گئی تھی۔ ایسے ہی دل بے قرار ہوا تو نیچے آ گئی۔

گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ سب لوگ شیخوپورہ گئے تھے۔ قدسیہ کا جانے کس چیز کا آپریشن ہوا تھا..... وہاں سے اطلاع آئی تو بابا سمیت سب لوگ چلے گئے۔ ابھی تک واپسی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ دادی اور طابہ گھر میں تھیں لیکن اپنے، اپنے کمروں میں آرام کر رہی تھیں۔

عمامہ نے کچن میں جھانکا اور چائے بنانے کے ارادے سے اندر آ گئی۔ جب وہ چائے بنا رہی تھی تو اس کی سوچوں کی اڑان شیخوپورہ تک جا رہی تھی۔ جیسے ہی فرخ کا خیال آتا، عمامہ کا دل ڈوب سا جاتا، دل میں وحشت سی بھر جاتی۔

اسی بے خیالی میں ساس پین اٹھایا تو ہاتھ سے پھسل گیا۔ اور اچانک گرما گرم چائے عمامہ کے پیروں کو بری طرح سے جلا گئی۔ وہ اونچی آواز میں چیخنے لگی۔ درد کی شدت نے اسے بلند آواز میں رونے پر مجبور کر دیا تھا۔

دونوں پیر جلن کی شدت سے پہلے انتہائی سرخ ہوئے پھر ان پر بڑے، بڑے آبلے سے پڑنے لگے۔ عمامہ فرش پر بیٹھ کر دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی تھی۔ جانے درد زیادہ تھا یا اسے رونے کا بہانہ چاہیے تھا۔ وہ ایسی اذیت سے رو رہی تھی جیسے قرنوں کے جوار بھاٹے کو اندر سے باہر نکالنا چاہتی ہو۔ یا پھر صحراؤں میں بارش کا طوفان آ گیا ہو۔ یا پھر شہر دل کی گلیوں میں ماتم بپا ہو۔

اس کے رونے میں ایک ایسی ہی اذیت اور کرب امڈ رہا تھا اور اس کی دردناک چیخوں کی آواز کھڑکی کے کھلے کواڑوں سے باہر تک نہیں، دور، دور تک جا رہی تھی۔ اتنی دور کہ کوئی ستاروں سے خالی آسمان پر سکون تلاش کرتا، بری طرح سے ٹھٹک گیا تھا۔ پھر جیسے ہی چیخوں کا اندازہ ہوا ساری احتیاط کو بھاڑ میں جھونک کر اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔

چند فرلانگ کے فاصلے کو تیزی سے طے کرتے ہوئے اس کے دل میں ہر آخری برا خیال سب سے پہلے آ رہا تھا۔ یہ آواز عمامہ کی آواز تھی۔ وہ لاکھوں میں پہچان لیتا۔

عمامہ بڑے کرب ناک انداز میں چیخ رہی تھی۔ یا تو عمامہ نے خود کو نقصان پہنچاتے ہوئے خودکشی کر لی تھی یا خودکشی کرنے کی کوشش کے بعد ''کرب'' اور ''درد'' سے چلّا رہی تھی؟ یا پھر عمامہ کسی ''حادثے'' کا شکار ہو چکی تھی؟

اس کا دماغ جیسے ''بند'' ہونے لگا۔ اندر خوف، وسوسوں اور خدشات کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ وہ عمامہ کی چیخوں سے سمت کا اندازہ کرتا کچن کی طرف آیا۔ اسے عمامہ فرش پر بیٹھی اونچی آواز میں روتی دکھائی دی تھی۔ شام کی جیسے جان میں جان آ گئی۔ وہ بڑی تکلیف کا شکار نہیں تھی۔ صد شکر کہ اس کے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ پھر بھی عمامہ کے پیروں کی حالت قابلِ تسلی نہیں تھی۔ وہ جلن اور درد کی شدت سے رو رہی تھی۔ اس کا وجود جھٹکے کھا رہا تھا۔

لیکن جیسے ہی اس نے شام کو اپنے قریب بیٹھے دیکھا۔ اس کا جھٹکے کھاتا وجود تھم گیا۔ اس کی چیخوں کا حلق گھٹ گیا۔ اور وہ کسی چابی کی گڑیا یا روبوٹ کی طرح چپ کر گئی۔ جیسے اس میں سانس بھی باقی نہ ہو۔ جیسے اس میں جان بھی باقی نہ ہو۔ اس کا وجود جم گیا تھا۔ جیسے کوئی برفیلا گلیشیئر ہو..... اور وہ برف کے مجسمے کی طرح ساکت تھی۔ بے سانس تھی۔ اور شام ہر چیز سے لاتعلق ہو کر اس کے پیروں پر جھکا زخم اور آبلوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

پھر وہ اٹھا اور جانے کس، کس کیبنٹ سے ڈھونڈ، ڈھانڈ کر برنال نکال لایا۔ روئی کی مدد سے پیر صاف کیے، برنال لگائی..... پھر خود ہی چولھا جلا کر گرم دودھ میں پتی ڈال کر چائے بنائی..... کسی دراز سے پین کلر نکال لایا اور زبردستی عمامہ کو کھلائی۔

وہ اتنا لمبا چوڑا تردد نہ بھی کرتا..... تب بھی عمامہ کا درد اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر ختم ہو چکا تھا، بالکل ختم..... جیسے اسے کوئی تکلیف تھی ہی نہیں..... پیروں پر کوئی آبلہ نہیں پڑا تھا۔ اور وہ کچھ دیر پہلے بالکل بھی چیخ، چیخ کر رو نہیں رہی تھی۔ اور جب وہ بینڈیج کر کے فارغ ہوا تو فکرمندی سے بولا۔

''درد تو نہیں ہو رہا؟''

''نہیں.....'' اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ شام اپنی جگہ سے اٹھا۔ نیچے سے برتن اٹھائے، فرش صاف کیا..... پھر اس کے قریب آیا۔

''اٹھو، عمامہ! اندر چلو..... کیا تم چل سکو گی.....؟'' وہ تھوڑا جھک کر دوزانو ہوا تھا۔ لیکن اس نے عمامہ کو اٹھانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ عمامہ کو زمین سے خود ہی اٹھنا تھا، اپنے ہی سہارے پر..... عمامہ کو پاتال سے بھی خود ہی اٹھنا تھا اپنے ہی سہارے پر..... اگر وہ ہاتھ بڑھا لیتا تو عمامہ کو چھو لیتا..... وہ عمامہ کو چھونے کا گناہ کیسے کرتا.....؟ لیکن یہ بات عمامہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس لیے شام کے ان ہاتھوں کو دیکھتی رہی..... جو اس کی مدد کے لیے..... اسے اٹھانے کے لیے آگے نہیں بڑھے تھے..... بلکہ اس کے گھٹنوں پر ہی دھرے تھے۔ اس کے اپنے گھٹنوں پر..... جو کبھی نہ عمامہ کو سہارا دیتے۔

عمامہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''تمہارے ساتھ؟ بھلا کیسے چل سکو گی.....؟'' اس کا لہجہ ذومعنی تھا۔ انداز بھی معنی خیز تھا..... لیکن اس کا سر خمیدہ تھا۔ وہ اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ مدھم آواز، بوجھل لہجہ..... غم زدہ الفاظ..... شام ٹھٹک گیا، سمجھ گیا وہ سب سمجھتا تھا جو کچھ عمامہ کہہ دیتی یا جو کچھ اپنے اندر سمیٹ لیتی۔

وہ گہری سانس کھینچتا کھڑکی سے بکھری باہر رات کی رانی کی خوشبو کو محسوس کرتا رہا۔ وہ لمبی، لمبی سانس بھرتا رہا۔

''تمہارے ساتھ چلنا تو محال ہے..... بڑا محال.....'' عمامہ جیسے زیرِ لب بڑبڑائی تھی۔ شام کی سماعتیں سن ہونے لگیں اس کے پاس لفظ ختم ہو گئے تھے۔ لیکن لفظ کہاں ختم ہوئے تھے۔

وہ رات کی رانی کو اپنے اندر اتارتا رہا..... وہ بوجھل اور پُرنم آواز میں دل کا نوحہ سناتا رہا۔

''زندگی کے کاسے میں سارے سکے اپنی مرضی کے نہیں گرتے عمامہ! ہم کتنی ہی منتوں کے دیے جلا لیں.....

وقت اپنی مرضی کی چال چلتا ہے۔ صرف تقدیر کے اشارے پر..... اور منت پوری نہ ہونے پر دل دیے کے مانند جلتا ہی چلا جاتا ہے۔''

عمامہ کی آنکھیں اور سماعتیں ساکت ہوگئی تھیں۔ شام کے لہجے کی کربناکی اس کے من میں سوراخ کررہی تھی۔

''قریب سے سر جھکا کر گزر جاؤں تو اجنبی نہ سمجھنا..... ادب کے کچھ اصول، کچھ قوانین بھی ہوتے ہیں.....''

اس کی آواز مدھم ہوکر بالکل معدوم ہوگئی تھی۔

عمامہ پلاسٹر آف پیرس کے مجسمے میں بدل گئی۔ معاً دروازے پر آہٹ ہوئی..... دونوں نے چونک کر گردنیں گھما کر دیکھا تھا۔ وہاں دادی اور طابہ کھڑی تھیں اور ان کے پیچھے فیقہ کھڑی تھی۔ انگشت بدنداں، حیران، ششدر، متحیر اور اس کے تاثرات اتنے عجیب تھے کہ حد نہیں..... وہ زہر بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے یقین نہ آرہا ہو۔

اور شام ڈرانہ جھجکا..... بڑے مضبوط قدموں سے چلتا ہوا دادی کے قریب آیا..... پھر طابہ سے مخاطب ہوا۔

''عمامہ کے پیر جل گئے ہیں بھابی..... اسے کمرے تک چھوڑ آئیں.....'' طابہ نے معنی خیزی سے سر ہلایا پھر فٹافٹ عمامہ کو سہارا دیتے پہنچ گئی..... وہ جو دادی اور فیقہ کو دیکھ کر سہم گئی تھی فوراً طابہ کا سہارا پاکر اٹھ گئی..... وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہونا چاہتی تھی۔

دادی سارا غصہ یا ناگواری ضبط کرتی نہ جانے کیسے اپنی زبان پر قابو پاسکی تھیں۔ تاہم فیقہ خاموش نہیں رہ سکی۔ جب شام اس کے قریب سے گزرنے لگا تب وہ زیرلب بڑبڑائی۔

''عمامہ کے پاؤں جل گئے اور فرسٹ ایڈ دینے کے لیے تمہیں اطلاع بھجوائی گئی۔ گھر میں باقی لوگ کیا مرگئے تھے؟'' اس کا لہجہ دھیما مگر بلا کا سلگتا ہوا تھا۔ شام لمحہ بھر کے لیے رک گیا تھا۔ جیسے فیقہ کے لہجے کی چبھن پر غور کررہا تھا۔ پھر جیسے اس کی آنکھوں میں ناگواریت کی لہر ابھر گئی تھی۔ اس کے ماتھے کی گلابی رگ پھڑکنے لگی۔

''اس کا جواب گھر کے باقی لوگوں سے مانگیں..... اور مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے سے احتیاط برتیں..... اور ایک بات کو سمجھ لیں..... رویے، لفظ اور انداز بڑی جگہوں پر نقصان سے دوچار کردیتے ہیں۔ میری نرمی کو کمزوری سمجھنا حماقت ہے اور میری خاموشی مصلحت کے سوا کچھ بھی نہیں..... ہر بات کا جواب میرے پاس موجود ہے۔ اور میں ہر رویے اور انداز کو سمجھتا ہوں..... کیونکہ رویے، موسموں کی طرح محسوس ہوتے ہیں اور ان سے نبٹنے کے لیے لہجوں کے لباس بدلنے پڑتے ہیں..... یاد رکھیے گا فیقہ..... ! کسی کو اس حد تک مت آزمایا جائے کہ اسے رویوں سے نبٹنے کے لیے لہجوں کا لباس بدلنا پڑے۔'' شام ڈھکے چھپے لفظوں میں فیقہ کو بہت کچھ باور کرواتا اس کے قریب سے گزر گیا تھا جبکہ فیقہ سن سی شام کے لہجے میں چھپی واضح ہوتی ''تنبیہ'' کو سمجھ کر ساکت رہ گئی تھی۔

☆☆☆

چکنے صفحات والی سنہری ڈائری کے اگلے صفحات میں کچھ یوں لکھا تھا۔

''محبت تو پتوں کی سائیں، سائیں کی طرح ہوتی ہے نہ دکھائی دیتی ہے، نہ پکڑ میں آتی ہے۔ بس حصار میں لے لیتی ہے۔'' اور وہ محبت کے حصار میں تھی۔ بھلا کیسے نکلتی.....؟ کبھی محبت نے بھی اپنا حصار توڑا تھا کیا؟

سبز دریچے میں کھڑی عمامہ ہاتھوں کے کٹوروں میں اپنا چہرہ لیے پہروں نیلے آسمان کو تکا کرتی..... کبھی آسمان کی وسعتوں میں اپنا مقدر ڈھونڈتی اور کبھی محبت..... اس کی تلاش لامحدود تھی..... سونا کام لوٹتی۔

پھر جب تھک جاتی تو سونیا کے روبرو ہوتی..... اور کبھی کالج کے اس خاص الخاص الہ آبادی امرود کی سوکھی شاخوں کو دیکھتی جو جانے کس کی ''نظرِ بد'' کے حصار میں آکر سوکھ گیا تھا۔ جس کے سارے پتے جھڑ گئے تھے اور اس کا پھل گر گیا تھا۔ کتنے میٹھے اور مشہور امرود تھے..... لڑکیاں کچے ہی چبا جاتیں۔

اور اب سوکھا، ٹنڈ منڈ اور بے شاخ کھڑا تھا۔

یوم آزادی کے حوالے سے ایک چونکا دینے والی تحریر ..... حفصہ بٹ عدن، ٹوبہ ٹیک سنگھ

وہ بڑی سہانی میٹھی کرنوں والی صبح تھی۔ سورج نکلتے ہی دل کا آفتاب بھی چمکنے لگا تھا۔ وہ دن کچھ ایسا ہی تھا کہ سال کے تین سو چونسٹھ دن اس ایک دن پر قربان، اس کی حرمت پر نثار.....

ہر سرکاری ادارے کی طرح ہمارے ادارے میں بھی جشن آزادی منایا جا رہا تھا۔ وہی سبز ہلالی پرچم، جھنڈیوں کی رنگا رنگ قطاریں، شاندار سجاوٹ سے مزین اسٹیج، سفید پوشاک اوڑھے ڈائس، عمدہ ساؤنڈ سسٹم، ہال میں دور تک پھیلی گلابی کرسیاں، میڈیا، سب کچھ وہی روایتی تھا جو ہر جشن کا خاصہ ہوتا ہے۔

ہر چہرہ شاد تھا، روشن تھا، آزدی کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ جنت نہیں تھی۔ وہ جنت ہی تو تھی۔ کسی کو کوئی رنج نہ تھا۔ سب اپنے، اپنے آنسو تکیوں کے نیچے دفن کر آئے تھے یا پھر سینے میں کہیں چھپائے بیٹھے، آزاد ہونے کی انوکھی خوشی منا رہے تھے۔ ہر طرف ہنسی تھی، قہقہے تھے۔ آج بس ایک ہی رنگ تھا، محبت کا رنگ، آزادی کا رنگ، ہریالی اور خوش حالی کا رنگ، پاکستان کا رنگ.....

ریکارڈ چلانے والے نے کوئی دُھن چھیڑ رکھی تھی۔ پوری محفل پر ایک الگ سی کیفیت طاری تھی۔ موسیقی کا مدھر سا ارتعاش اور مہمانوں کی کھسر پھسر، کوئی مائیک میں ہیلو، ہیلو کر رہا تھا، کوئی چھوٹی بچیوں کے ہاتھوں میں ہرے اور سفید فیتے لپیٹ رہا تھا، اسٹیج سیکرٹری صاحبہ ہر ایک دو منٹ بعد، صفحے پر قلم گھسیٹنے لگتی تھیں۔

اب وہ مہمانانِ خصوصی بھی آ گئے جن کا انتظار تھا۔ سیکرٹری صاحبہ ڈائس پر آ کھڑی ہوئیں۔ وطن کے ساتھ، ساتھ مہمانانِ گرامی کی شان میں قصیدے پڑھنے لگیں۔ خدا، خدا کر کے تقریب کا آغاز ہو گیا۔

تلاوت، نعت، ملی نغمہ پھر ملی نغمہ، تقریر پھر تقریر پھر ملی نغمہ پھر انگریزی میں تقریر جو ہر کسی کے شعور سے ہوتی لاشعور میں داخل ہوئی اور خواہ مخواہ ہی بہت سوں کے سینے اس فخر سے پھیل گئے کہ ''ہم انگریزی بھی سمجھ سکتے ہیں۔''

اس تقریب میں ہم بھی پیش، پیش تھے۔ تقریب کے اختتام پر تین عدد سندیں اپنے نام بھی کر لیں مگر وہ سوگواری! کہاں سے آ ٹپکی تھی؟ یہ تو میری دل و جان سے پسندیدہ تقریب تھی۔ ملی نغموں کی طرز میں میرے گلے کے سُر تھے، ان کے الفاظ میں میری زباں

عمامہ شیڈ تلے بیٹھ کر پہروں اسے تکا کرتی..... اسے امرود کی بدنصیبی پر رونا آتا..... جب وہ ہرا بھرا پھل دار پیڑ تھا تو سب کی نگاہوں کے حصار میں رہتا..... اور اب اسے دیکھنا بھی کوئی گوارا نہیں کرتا تھا۔

اس دن بھی عمامہ، تقی بھائی کا انتظار کر رہی تھی..... اور سونیا سڑک کے پار کونے میں لگی ریڑھی سے بھنے ہوئے چنے لینے لمحہ بھر کے لیے گئی تھی یہ تب کی بات ہے..... یہ لمحہ بھر کی بات ہے۔

عمامہ کا سارا دھیان بے شاخوں والے ننگے امرود کے پیڑ کی طرف تھا..... جو عمامہ کی طرح ہی ویران اور اجاڑ لگتا..... معاً کسی کے پرانے اسکوٹر کی بھدی آواز آئی۔ عمامہ نے چونک کر عقب میں دیکھا تھا۔ پھر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اپنی جگہ سے بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ''ہراس'' بھر گیا۔ وہ بے یقینی سے منصور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو فاتحانہ انداز میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ عمامہ کا رنگ فق ہو گیا۔

''آپ.....؟ یہاں.....'' عمامہ کے حلق سے پھنسی، پھنسی آواز نکلی تھی۔ وہ منصور کی دیدہ دلیری پر حیران تھی۔ کیسی جرأت کے ساتھ وہ عمامہ کے کالج پہنچ گیا تھا۔ کتنا ڈھیٹ آدمی تھا۔ چاہے جتنا مرضی پیچھا چھڑوانے کی کوشش کی جاتی..... یہ جان کو آ جاتا تھا۔

''تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا ہوں.....'' اس نے آنکھوں میں بمشکل خلوص بھر کر کہا تھا۔ عمامہ کا لہجہ ایک دم روکھا اور کھردرا ہو گیا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی.....'' عمامہ نے ناگواری چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

''کیوں ضرورت نہیں تھی.....؟ مجھے تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ تمہارے دل کی چوٹ کا غم مجھے بھلائے نہیں بھولتا۔ شام میرے ہاتھ آئے تو سہی..... تمہیں ٹھکرانے کا، تمہارا دل توڑنے کا پورا حساب لوں گا.....'' اس نے پوری ہمدردی اور خلوص ظاہر کرنے پر زور لگا دیا تھا۔ عمامہ تلخی سے چیخ کر بولی۔

تھی، محبت تھی، جوش، ولولہ، عزم، حوصلہ، امید اور خواب تھے۔ پھر یہ اداسی کیسی تھی؟ ایک چادر تن گئی تھی جس نے باہر کی رونق میری نگاہوں سے اوجھل کر دی تھی۔ کچھ ہیولے تھے، جن کی داد، حوصلہ افزائی مجھے مل رہی تھی۔

کوئی دور بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ کچھ تو تھا ان نگاہوں میں، کوئی دکھ، کوئی کسک، کوئی کرب، دوبارہ جینے کی امنگ، آزادی کے جشن کا ٹھہرا سا سکوت، کچھ یادیں ان لمحوں کی جب کبھی وہ بھی وہ بھی اسٹیج پر اسی طرح کھڑا داد وصول کرتا ہوگا، خوشی سے جھومتا، انگلیوں سے جیت کا نشان بناتا ہوگا، سبز سبز جھنڈیوں اور ہلالی پرچم کے بیچ، اس کا دل بھی میری طرح باغ باغ ہوتا ہوگا۔

میں نیچے اتر آئی۔ وہ نظریں میری برداشت سے باہر تھیں۔ کوئی تھا، جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا، جس سے میرا اصول رشتہ تھا، احساس کا رشتہ، انسانیت کا رشتہ، پاکستانیت کا رشتہ!

اب اتنا شور تھا کوئی نقارہ بجانے والا نقارہ بجاتا تو اتنی بھیڑ میں کہیں آواز دب جاتی..... پورے ہال میں بھگدڑ تھی۔

وہاں سکون تھا، جہاں وہ بیٹھا تھا۔ وہاں ہمیشہ سکون ہی رہتا تھا، کوئی کسی کو تنگ نہیں کرتا تھا، خاموشی رہتی تھی۔ جی ہاں! جشن کے دن بھی، آزادی کے دن بھی وہاں کے باسی، ماضی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔

وہ اولڈ ایج ہوم کا ایک کمرا تھا جو راہداری سے مجھے نظر آرہا تھا۔ سامنے والے بستر پر بیٹھا بوڑھا اضطراب سے بیٹھ جاتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پرچم تھا جسے وہ چومتا تھا۔ کبھی چلنے لگتا اور کبھی لیٹ جاتا تھا مگر اس کی نظریں مجھے کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں چہرے نہیں پڑھ سکتی تھی، دماغ میں چلنے والی جنگ کو نہیں دیکھ سکتی تھی مگر احساس کر سکتی تھی، بس وہی کر پائی۔ اکتا کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے گہری سانس لے کر اپنی اعزازی سندیں بے فکری سے بیگ میں ڈال دیں۔

''میڈم نے کہا تھا اس بار تقریب اولڈ ایج ہوم میں رکھواتے ہیں تاکہ یہ بوڑھے بیچارے بھی تھوڑی تفریح لے سکیں، اکیلے رہ، رہ کر اکتا جاتے ہیں۔'' کوئی میرے عقب میں کسی کو بتا رہا تھا۔ میری نظریں پورے ہال میں اولڈ ایج ہوم کے بوڑھوں کو تلاش کرنے لگیں۔ جانے وہ کہاں تھے.....!

''آپ کو تردد کرنے کی ضرورت نہیں..... اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتی ہوں..... شام نے مجھے ٹھکرایا نہیں۔'' وہ جیسے چیخ پڑی تھی۔

''اور آپ کو یہاں آنا بھی نہیں چاہیے تھا.....'' عمامہ کے انداز ملاحظہ کر کے منصور کو بھی ملامت اور ہمدردی کا چولا اتارنا پڑا..... اسے سمجھ آگئی تھی۔ عمامہ اب اس کی ''چکنی'' باتوں میں آنے والی نہیں تھی۔ سو منصور کو بھی رنگ بدلتے دیر نہیں لگی۔ اسے تو ''گھی'' نکالنے سے غرض تھی۔ چاہے ٹیڑھی انگلیوں سے نکلتا، چاہے سیدھی..... اور اسے یہ بھی لگ رہا تھا..... عمامہ کا ٹوٹا دل جڑنے کے قریب تھا اور وہ شام کی بے وفائی سے سمجھوتا کر چکی تھی جو کہ منصور کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہیں تھا..... عمامہ کا ''سنبھلنا'' اس کے لیے سوائے خسارے کے کچھ نہیں تھا۔ وہ تیزی سے اپنے شاطر دماغ کو بروئے کام لگا تا رہا۔

''اور آئندہ یہاں آنے کی غلطی مت کیجیے گا..... آپ شام کے والد ہیں، اس تک محدود رہیں..... ورنہ میں تقی بھائی اور طاہر بھائی کو بتا دوں گی..... اور آپ میرے ان دو بھائیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان دونوں کو صرف ایک ہی زبان میں بات کرنا آتی ہے۔'' عمامہ کا غصے اور غیظ کے مارے برا حال ہو گیا تھا۔ آخر یہ آدمی بار، بار کیا جتانے کی کوشش کرتا تھا یہ کہ شام نے عمامہ کو ٹھکرا کر اس کی توہین کی تھی یا پھر عمامہ کی پھوپی کو اس پر فوقیت دی تھی؟ اس کا مارے توہین اور خفت کے برا حال ہو گیا۔

''اچھا، تو تم مجھے دھمکی دے رہی ہو.....؟ اپنے بھائیوں کا ڈراوا دے رہی ہو.....؟'' منصور کی شاطر آنکھوں میں غصہ بھر گیا..... اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ بھویں کھنچ گئی تھیں۔ نتھنے پھول گئے تھے..... وہ ساری مصنوعی شائستگی کا چولا اتار گیا تھا۔

''یہ دھمکی نہیں، میں عمل بھی کروں گی.....'' جانے عمامہ میں کیسی ہمت آگئی تھی۔ وہ جیسے تن کر بولی۔

''اوہ..... تو تم مجھے اپنے بھائیوں سے مرواؤ گی..... میری ''کُٹ'' لگواؤ گی.....'' اس کے استہزائیہ انداز میں طنز بھرتا گیا تھا۔ وہ جتاتی قسم کا قہقہہ لگا کر لطف لیتا رہا۔

''بڑی باہمت لڑکی ہو.....'' منصور نے جیسے اسے سراہا۔

''یہاں سے چلے جائیں آپ..... ورنہ بہت برا ہوگا.....'' عمامہ نے وارننگ دی..... منصور کو اور بھی لطف آیا۔

''کتنا برا ہوگا.....؟'' اس نے بہت ہی مزہ لیتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ چہرے پر سختی آ گئی۔ اور آنکھوں میں غیظ بھر گیا۔ اس کے چہرے پر خطرناک قسم کے تاثر ابھر آئے تھے۔ ایسے تاثر جو کسی انسان کے نہیں ہو سکتے تھے۔ جو کسی شیطان کے ضرور ہو سکتے تھے۔

''تمہاری یہ دھمکی بڑی مہنگی پڑے گی..... یاد رکھنا عمامہ!'' اس کا لہجہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا تھا۔ عمامہ اچانک سہم سی گئی۔ پہلے والی بہادری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اسے منصور کے ''رنگ'' نرالے لگ رہے تھے۔ اس کے لہجے میں بھی کوئی عام دھمکی نہیں تھی۔ عمامہ اندر تک سنسنا گئی تھی۔

''تم دیکھنا، میں کرتا کیا ہوں.....'' پھر وہ چہرے پر ہاتھ پھیرتا اسکوٹر کی طرف مڑا۔ اس نے زہر بھری آخری نگاہ عمامہ پر ڈالی اور دھمکی دیتا وہاں سے دفعان ہو گیا۔ عمامہ کے سر سے جیسے بلا ٹلی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر رہ گئی تھی۔ سونیا کے آنے تک عمامہ کے حواس ٹھکانے نہیں آئے تھے۔ پھر جب سونیا نے حواس باختہ ہو کر عمامہ کا کندھا ہلا کر پوچھا..... تب وہ بے ساختہ چونک گئی تھی۔

''کون تھا یہ آدمی عمامہ! تمہارے پاس کیا کر رہا تھا؟'' غالباً اس نے دور سے عمامہ کے پاس اسے کھڑے دیکھ لیا تھا..... اور اندازہ بھی کر لیا تھا کہ گفتگو نارمل نہیں تھی۔

''یہ شام کا بے غیرت باپ تھا..... اور شام ٹھیک ہی اسے غیرت کہتا ہے۔'' اس نے تلخی سے سر جھٹک کر بتایا۔ ابھی تک دماغ سنسنا رہا تھا۔ اسے شام کی ''تنبیہہ'' اور ٹوکنے کی وجہ اب سمجھ آئی تھی۔ وہ کیوں عمامہ کو منع کرتا تھا کہ منصور سے دور رہو..... اور عمامہ نے بھی صرف دو مرتبہ منصور کی انجانے میں کال سننے کا گناہ کیا تھا۔ وہ جانتی نہیں تھی۔ کبھی، کبھی انجانے میں کیے جانے والے گناہ بھی پیچھا پکڑ لیتے ہیں۔

''مگر اس آدمی کا تم سے کیا کام.....؟'' سونیا نے حیرانی سے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے، یہ اب مجھے بلیک میل کرے گا.....'' عمامہ نے ہاتھ مسلتے ہوئے گہرے تفکر سے کہا..... اس کے اندر اضطراب کا جوار بھاٹا اٹھنے لگا تھا۔ اسے منصور کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

''کیوں.....؟'' سونیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''اس کیوں کا میرے پاس جواب نہیں.....'' وہ تھکے، تھکے انداز میں بولی۔ سونیا کے ماتھے پر سلوٹ سی ابھر آئی۔

''ارے، کیوں پریشان ہوتی ہو؟ اس آدمی کی ایسی جرأت.....''

''تم نہیں جانتیں..... یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔'' عمامہ اندر سے بہت خوفزدہ تھی۔ منصور کے سامنے خاصی بہادری کا مظاہرہ کر لیا تھا..... لیکن اب نظر آ رہا تھا کہ کس بھاؤ کیا بک رہا ہے؟ اسے دانتوں پسینہ آنے لگا۔

منصور بہت خبیث تھا اور اپنی خباثت میں ہر حد تک جا سکتا تھا۔ وہ عمامہ کے لیے ہر قسم کی مشکل کا پہاڑ کھڑا کر سکتا تھا۔

''عمامہ.....! تم ڈرو نہیں..... ایسے لوگ اندر سے کمزور ہوتے ہیں۔'' سونیا نے اسے ہراساں دیکھ کر تسلی دی تھی۔ گو کہ عمامہ کے منہ سے تفصیل سن کر وہ خود بھی کچھ متفکر ہو گئی تھی۔

''تم اگر کہو..... تو میں ڈیڈی سے مشورہ کروں؟ اس آدمی کو کسی کیس میں پھنسوا کر اندر کروا دیتے ہیں۔'' سونیا ایسے ہی جذباتی مشورے دے سکتی تھی۔ عمامہ نے فوراً انکار کر دیا۔

''نہیں..... اس کی ضرورت نہیں..... میں نے اسے ڈراوا تو دیا ہے..... امید ہے، سمجھ جائے گا.....'' اس نے

قدرے مطمئن ہو کر کہا گو کہ وہ کچھ حد تک اندر سے مضطرب تھی پھر بھی اسے منصور کی ہمت کا اندازہ تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا تھا؟ بھائیوں کو عمامہ کے خلاف اکساتا؟ اور جواباً وہ عمامہ کو تو کچھ نہ کہتے بلکہ منصور کا منہ توڑ کر رکھ دیتے۔

عمامہ کو امید ہی نہیں تھی کہ منصور اس سے بڑھ کر کچھ کر سکتا تھا۔ سو وہ خاصی پُرسکون ہو چکی تھی۔ اور اس کا سکون بس اگلے دو دن تک قائم رہا تھا۔

دو دن بعد وہ ہوا جو اس کے تصور سے کہیں بہت بڑھ کے تھا..... وہ جیسے دم بخود ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دادی ہمیشہ کی طرح تخت پر براجمان تھیں..... اور کھجور کی ٹوکری میں بھرے ''پنیالے'' گن رہی تھیں..... یہ عنابی رنگ کا جامن کے قد برابر بڑا ہوتا تھا اور رسیلا میوہ ہوتا تھا۔ لذت اور ذائقے میں بھی لاجواب.....

دادی سب کا حصہ الگ کر رہی تھیں..... وہ اسی طرح گھر کے فروٹ کو برابر بچوں اور بڑوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ کچھ کالونی میں بھی بانٹ دیتیں..... یہ ان کی واحد اچھی عادت تھی جو طاہرہ بھی پسند کرتیں۔

قریب ہی طاہر صوفے پر نیم دراز تھا۔ اور دادی کی نظر بچا کر کبھی بسمہ کو پنیالا اٹھا کر دے مارتا اور کبھی عمامہ کو..... اب کی دفعہ نشانہ چوکا اور تقی کو جا لگا..... وہ عمامہ یا بسمہ تو تھا نہیں..... جو گھور کر خاموش ہو جاتا..... اس نے قریب آ کر طاہر کا کان مروڑ دیا تھا۔

''اوچھے ہتھکنڈوں سے لڑکیوں کو ''چونکانا'' چھوڑ دو.....'' تقی نے اس کے سر پر چپت بھی لگائی..... طاہر ذرا سا جھینپ گیا۔

''لڑکیوں کو نہیں..... میں نے تو تمہیں پنیالا مارا ہے.....'' وہ صاف مکر گیا۔

''مجھے نہیں، تم نے بسمہ اور عمامہ کو مارا تھا۔'' تقی کی نگاہیں بھی عقابی تھیں۔ طاہر خفیف سا ہو گیا۔ پھر چمک کر بولا۔

''بسمہ میری بیوی اور عمامہ بہن ہے..... میں دونوں کو مارنے کا ''حق'' رکھتا ہوں.....'' اپنے تئیں تو اس نے بڑے پتے کا پوائنٹ مارا تھا۔ لیکن تقی نے اس کا ریکارڈ لگا دیا..... اس کی بات پکڑ کر خوب ''بے عزتی'' فرمائی۔

''بے شرم، بیوی اور بہن کو مارنے کی بات کرتے ہو.....؟ اور اس پر ٹھونک بھی بجاتے ہو..... بڑے بے غیرت ہو۔'' طاہر کی جیسے خوب ہی ''دھلائی'' ہو گئی تھی۔ بیچارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

''تمہیں تو وکیلوں کی طرح ''نکتے'' پکڑنے کی عادت ہے۔'' طاہر نے کلس کر کہا۔

''وکیل ہمارے گھر میں ہیں..... مفت میں کچھ تو اثر لیں گے۔'' تقی نے عمامہ کے ساتھ مصروف بسمہ کو بھی چھیڑا تھا۔

وہ دونوں ان کی نوک جھوک سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

''رہنے دو، پھر کسی کام کے نہیں رہو گے.....'' طاہر نے جیسے دہائی دی تھی۔ ''آدھے ''کھسک'' نہ گئے تو کہنا.....''

''کیا واقعی.....؟'' تقی نے خاصا لطف لیا۔ جبکہ بسمہ نے طاہر کو گھور کر دیکھا تھا۔

''تو اور کیا.....؟'' طاہر نے شد و مد میں سر ہلایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا..... ہمارے گھر میں آدھے مینگلوں کی ''بھرتی'' جاری ہے۔'' تقی نے اندر آتی طاہ کو بھی لپیٹ میں لیا تھا۔

''ادھر بھی کچھ دماغی پُرزے ڈھیلے ہیں.....'' اس نے طاہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ تقی کو گھور کر رہ گئی تھی۔ حد تھی، اسے پاگل کہا جا رہا تھا۔ اوپر سے بسمہ اور عمامہ کی ہنسی..... طاہ کو شدید اہانت محسوس ہوئی..... وہ ذرا، ذرا سی بات پر بے عزتی محسوس کرتی تھی۔ اس وقت بھی تقی کے مذاق کو غلط پیرائے میں لے لیا تھا۔

''پاگلوں کو پاگل ہی ملتے ہیں.....'' طاہ نے جل کر جواب دیا تھا۔ طاہر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''چلو جی، حساب برابر ہوا..... طاہ بھابی نے بدلہ اتار لیا۔''

''انتقام لے کر یہ پُرچین ہو جاتی ہے۔'' تقی نے بھی ''جتا'' کر کہا۔ اسے طاہبہ کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی۔ بات آئی گئی تو کرتی نہیں تھی۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں کو پکڑ کر کڑھتی رہتی۔ پھر حساب بھی برابر کرتی۔

''میں نے کس سے انتقام لیا ہے؟'' طاہبہ کو شدید غصہ آیا۔ اس الزام پر وہ تڑپ اٹھی۔

''جہاں ہاتھ پڑے، کم بھی نہیں کرتی ہو۔'' تقی نے بھی طنز کیا..... اتنے سالوں کا ساتھ تھا، وہ اس کی عادتوں سے خوب واقف تھا۔ طاہر نے بات بگڑتی دیکھ کر تقی کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

''اِدھر بھی کچھ لوگ لگائی بجھائی سے باز نہیں آتے۔ گھر کا ماحول خراب کرتے ہیں.....'' طاہر نے بسمہ کو پھر گھسیٹا..... وہ اسے گھور کر رہ گئی۔ وہ گزشتہ دنوں کا حوالہ دے رہا تھا۔

''مبالغہ مت کرو طاہر!'' بسمہ نے بے ساختہ گھورا۔ ''یہ نہ ہو میں جناب کے کچے چٹھے بھی کھول دوں۔''

''مبالغہ آمیزی تمہارا شعبہ ہے، میرا نہیں۔'' اس نے بسمہ کی ''وکالت'' پر گہری چوٹ کی تھی۔

''جب سے آپ میرے پلے پڑے ہیں..... میرے سارے شعبے چھوٹ گئے۔'' بسمہ بری طرح تلملائی..... دادی نے کڑی نگاہ سے بسمہ کو گھورا۔ جانے کس خاندان کی ہے..... بے شرم، بدلحاظ، تمیز، ادب چھو کر نہیں گزرا۔

''تو یہ اس لڑکی کی زبان، شوہر سے کس طرح بات کرتی ہے؟'' انہوں نے پنیالوں کی ٹوکری تخت کے نیچے کھسکائی تھی۔

''اتنی لمبی زبان ہے اس کی۔'' اب کہ وہ اونچی آواز میں بولیں۔ طاہر کی سماعتیں خاصی تیز تھیں۔ اس نے فوراً سن لیا تھا۔

''تو کاٹ دیں دادی.....! آپ کو اجازت ہے۔''

''لو، مجھے اپنے سفید بالوں میں خاک ڈلوانی ہے۔ پرائی لڑکیوں سے بے عزتی کرواؤں.....؟'' دادی نے بھنا کر کہا۔

''کسی کی مجال ہے.....؟'' طاہر نے ٹھونک بجائی۔

''میں ایسی ہی بھلی..... یہ کل کی لڑکیاں تو ذرا لحاظ نہیں کرتیں.....'' دادی نے ہاتھ جھاڑے تھے۔ بسمہ چونک گئی..... وہ بار، بار طاہر پر کیا جتا رہی تھیں.....؟ یہ کہ بسمہ بہت بدلحاظ تھی؟ دادی کی عزت نہیں کرتی تھی؟ اسے بہت دکھ ہوا۔

''طاہبہ کی بس ایک ہی بہو لا جواب ہے۔'' انہوں نے طاہبہ کو پیار سے دیکھا تھا۔ جہاں طاہبہ اس عزت افزائی پر اتر آئی تھی وہیں تقی اور طاہر گلا کھنکھار کر رہ گئے تھے۔

''آپ حکم تو کریں دادی! ہم ایک، ایک آپ کی پسند سے شادی پھڑکا لیتے ہیں۔'' طاہر نے بسمہ کو پھر چڑایا تھا۔ اب کے وہ مسکرا بھی نہیں سکی تھی..... اس کا دل دادی سے کھٹا پڑ گیا تھا۔

''تمہارے ارادے نیک نہیں لگتے.....'' تقی کا انداز معنی خیز ہو گیا..... ''ویسے کوئی اور نگاہ میں ہے؟''

''میری بات تمہارے دل کو بھی لگی ہے۔ ظاہر کر دیا نہ کرو.....'' طاہر نے الٹا اس پر چڑھائی کر دی تھی۔ تقی ذرا سا گیا۔

''توبہ کرو، ہم ایک ہی بھگتا لیں، کافی ہے۔'' وہ طاہبہ کی گھوریوں کو برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اس لیے مصنوعی خوف کو ظاہر کرتا اٹھ گیا۔ طاہر بھی ہنستا ہوا اس کے پیچھے زینہ چڑھ گیا تھا۔

عمامہ اور بسمہ بھی مسکرا دیں۔ بڑے دنوں بعد بھائیوں کی نوک جھوک سے کثافت اترتی محسوس ہوئی تھی۔ عمامہ کا مزاج اچھا ہو گیا تھا جبکہ بسمہ مصنوعی خفگی سے کہہ رہی تھی۔

''تمہارا بھائی کسی دن پٹے گا مجھ سے۔'' دادی کو اس کی بات پر جھٹکا لگا تھا۔ آخر عشق کے زور پر آئی تھی نامراد..... دادی نے جیسے ششدر ہو کر اپنی انگلی ناک پر رکھی تھی۔ اور پھر بسمہ کو گھور کر دیکھا۔

''اب یہی تو کسر رہ گئی ہے۔ توبہ، توبہ.....'' انہوں نے کلے پیٹ ڈالے..... بسمہ چونکی پھر اپنا سر پیٹ کر رہ گئی۔

''اُف..... انہوں نے سن لیا.....'' اس نے آنکھیں میچ کر کہا عمامہ بمشکل اپنی ہنسی چھپا سکی۔ ان کی کھسر پھسر پر دادی نے غصے میں پہلو بدلا تھا۔ معاً طاہبہ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ تینوں ہی چونک گئیں۔

(جاری ہے)

رانا بوتا

قانتہ رابعہ

عاقب کی آمد نے دنیا کی آبادی میں ایک نقطہ بلکہ ایک نفس کا اضافہ کر دیا..... شکل صورت، رنگت ہر چیز باقی بہن، بھائیوں سے مکمل جدا تھی۔ ناک، بہن بھائیوں جیسی کھڑی نہ آنکھیں گہری..... پھینی سی ناک پر آنکھیں جیسے دو سیاہ بٹن کسی نے رکھ دیے ہوں۔ پیدائشی طور پر اس کے حالات عجیب و غریب تھے..... اماں نے دودھ دیا تو پی لیا، نہ دیا تو چوبیس گھنٹے بھی بن مانگے بن روئے گزر جاتے۔

کچھ بڑا ہوا تو چھت کو تک رہا ہے تو گھنٹا بھر دیدے ایک ہی جگہ پر گڑ جاتے..... ہنسنے پر آتا تو کئی، کئی منٹ قل قل کرتے قہقہے حلق سے ابلتے..... اگر ہنسنے کا ارادہ نہیں تو بھلے سارا زمانہ گدگدیاں کرتا رہے مگر شکل پر ایسا تاثر جیسے گوتم بدھ نروان حاصل..... کرنے سے پہلے..... نک، نک دیدم دم نہ کشیدم)

کھانے میں ابلے آلو پسند آگئے تو ہفتہ بھر آلوؤں کے نام..... بھلے اس کے بعد چار ماہ آلوؤں کی شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرے..... یہی معاملہ لباس کا تھا۔ سال دو سال تو کوئی سمجھ ہی نہیں پایا..... کبھی سردیوں میں نیکر شرٹ میں دن اور رات گزر رہے ہیں تو کبھی گرمیوں میں سارے جہان کی زبان گرمی سے باہر نکل رہی ہوتی

pklibrary.com

اور وہ آرام سے..... ''بلی کب کی لی ہوتی ہے'' کیا بنے گا.....'' سے بے خبر کوئی کہانی، رسالہ اور کچھ نہیں تو اسکول کی نصابی کتب پڑھنے میں مصروف..... کبھی ایک ہفتہ عقل مندوں کو مات کرنے کا آتا..... ایسے' ایسے دانشمندانہ جملے بساط سے بڑھ کر بولے جاتے کہ سنجھو عبقریوں کے بھی کان کٹ رہے ہیں اور کبھی معمولی سی بات بھی پلے نہ باندھ پاتا..... ایسی بونگیاں مارتا کہ سننے والوں کا سر شرم سے جھک جاتا۔

یہ تھے رانا عاقب سہیل جن کو پیدائش کے بعد سال ڈیڑھ کے اندر، اندر کسی نے ''رانا۔بوتا'' کا خطاب دے دیا تھا۔ پانچ سات سال کی عمر تک ہر آئے گئے سے پوچھتے رہے۔

''بوتا.....'' کسے کہتے ہیں؟'' سوال میں تجسس' شوق سب کچھ ہی شامل ہوتا..... کسی کی طرف سے جواب آتا۔

''تمہاری بے تحاشا لمبی گردن کی وجہ سے شاید بوتا کہا جاتا ہے.....''

اب یہ کون بتائے کہ بوتا ہوتا کیا ہے؟ کوئی دل بہلانے کو سمجھدار کہتا تو کوئی آنکھیں بند کر کے غیبی لغت پر نظر ڈالتا اور ارشاد فرماتا..... ''بھلا مانس.....''

''یعنی میں آپ سب کے خیال میں بھلا مانس ہوں؟'' سات سالہ رانا عاقب کو بات ہضم نہ ہوتی..... وہ تو بھلا کرے اسکول میں جب استاد نذیر علوی صاحب نے پوری کلاس پر پابندی عائد کر دی کہ ''خبردار آج کے بعد اسے کوئی بوتا نہ کہے..... اور اگر کوئی کہے گا تو اسکول سے اخراج کا کاغذی پُرزہ ہمراہ لے جانا نہ بھولے.....'' پھر صحیح معنوں میں عاقب کے دونوں کان کھڑے ہوئے دل دھڑ؟ دھڑ کرتا پسلیوں سے باہر نکلا..... اسکول گیٹ سے اسکول ویگن تک پہنچنے کے گیارہ قدموں میں اسے کلاس کے نسبتاً غبی سے بچے نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''یار تمہیں نہیں علم، بوتا کسے کہتے ہیں؟ کمال ہے تمہاری شکل دیکھتے ہی اونٹ یاد آجاتا ہے اور اونٹ کے بچے کو ''بوتا'' کہا جاتا ہے.....'' اب اللہ ہی جانے بتانے والے نے درست بتایا یا غلط..... لیکن اس دن کے بعد اسے کسی نے رانا بوتا کہا نہ اس نے دوبارہ اس لفظ کے اسرار و رموز جاننے کی کوشش کی۔ تعلیمی میدان میں کبھی جھنڈے گاڑتا تو کبھی چاروں شانے چت نیچے آن گرتا..... دن کے بعد کیلنڈر سے سال گزرتے گئے اور عاقب سہیل ایک خوب صورت قد آور تعلیم یافتہ' بردبار ... اور باشعور انسان کے روپ میں دنیا کے سامنے تھا..... کبھی کامیابی کبھی ناکامی کا منہ دیکھتے، دیکھتے اس نے زندگی کی تیس سیڑھیاں عبور کر لیں..... اِدھر اُدھر کی نوکریوں کے بعد اس کی قسمت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بیرون ملک روانہ کیا۔

اپنے ملک سے جاتے ہوئے اپنے تئیں نکمی عادات بھی چھوڑ گیا۔ بیرون ملک میں ہر پاکستانی کو تیر کی طرح سیدھا ہونا پڑتا ہے سو عاقب بھی ہو گیا۔ نوکری کے بعد فلیٹ میں آتا..... فلیٹ میں ہی دو دوست اور تھے..... دوست تھے یا نہیں مگر ہم سفر ضرور تھے..... ایک کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا دوسرے کا ملک کے اچھے بیوروکریٹ گھرانے سے..... ماں، باپ کے کسی فیصلے کو قبول نہ کرنے کی سزا دینے کے لیے ملک، گھر بار سب چھوڑ آیا۔ کھلی آنکھوں سے دن رات عاقب کے طور اطوار دیکھتا..... اس کا رہن، سہن، طور طریقے گفتگو کا انداز سب اچھے لگے تو بند آنکھوں سے بھی اسی کے متعلق سوچنے لگا..... ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا..... اپنی چچازاد بہن کے لیے عاقب کا جوڑ بہترین لگا..... عاقب کو خبر دیے بغیر چپکے، چپکے اس کی درجن بھر وڈیوز کھانے پینے کی، اندر باہر کی سرگرمیوں کی اس کا بائیوڈیٹا ارسال کیا تو چند ہی دنوں کے اندر، اندر شرف قبولیت پا گیا اور اس کی شادی سدرہ مجتبیٰ سے طے پا گئی۔

جوڑ آسمانوں پر بنتے ہیں مگر سارے ہی سدا ساتھ رہنے کے لیے نہیں ہوتے۔ کچھ ٹوٹ جانے کے لیے ہوتے ہیں۔ چار دن، چار ماہ، چار سال آخر کب تک ٹوٹنے والے رشتے ٹوٹ ہی جاتے ہیں..... جیسے دس ہزار کا ڈنر سیٹ لو یا ایک لاکھ دس ہزار کا..... جس برتن نے ٹوٹنا ہے وہ استعمال سے پہلے بھی ٹوٹ سکتا ہے بالکل

ایسے ہی سدرہ مجتبیٰ کے ساتھ ہوا۔ ذہین فطین، بردبار، سلیقہ شعار لیکن یہ کوئی طے شدہ فارمولا نہیں کہ ذہانت کے بل بوتے پر گھر بسائے جاسکتے ہیں۔ ایسے ہوتا تو دنیا میں کبھی کسی ذہین کا گھر برباد نہ ہوتا بلکہ شاید برباد ہی ذہین ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ گھروں کو آباد کرنے اور رشتوں کو جوڑنے کے لیے ذہانت کوئی ایلفی نہیں کہ جوڑ سکے..... زندگی کے دوسرے میدانوں میں بلاشبہ ذہانت بگڑے کام سنوار سکتی ہے وگرنہ اسکول، کالج کے ہر امتحان میں ذہانت کی وجہ سے دھڑ، دھڑ، دھڑ سیڑھیاں چڑھنے بلکہ پھلانگنے والی سدرہ مجتبیٰ شادی کے فوری بعد اوندھے منہ کے بل کیوں گرتی؟ چاروں شانے چت۔

ولیمے کے بعد گھر واپسی پر سدرہ نے سونے کی چوڑیاں اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیں۔ اس کے بعد جتنے ماہ سسرال رہی اس نے نہیں پہنیں۔ ساس نے پوچھا، جیٹھانی نے سوال کیا، چہ مگوئیاں ہوئیں وہ سونی کلائیوں سے ہی رہی..... کسی نے سمجھا اسے پسند نہیں، کسی نے جانا نازک سے بازو اتنی بھاری بھرکم چوڑیاں کیسے برداشت کریں..... کسی نے تکا لگایا پڑھائیوں، کمائیوں میں زندگی گزری ہے عادی نہیں ہوگی۔ یہ تو شادی کے ڈیڑھ دو ماہ بعد جب سدرہ مجتبیٰ کا دولھا عاقب سہیل جدہ واپسی کے لیے ٹکٹ لے کر آیا تو ساتھ میں کورٹ کچہری کی طرف سے کاغذ بھی تھا۔

پانچ تولے سونا اور دو لاکھ روپے جس کا نصف ایک لاکھ روپے ہوتے ہیں حق مہر کے عوض پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن سدرہ مجتبیٰ کی ڈیڑھ ماہ کی ازدواجی زندگی کے خاتمے کی شروعات.....

دستخط کرتے کرواتے سدرہ کے ہاتھ کانپے نہ آنکھ میں آنسو کا موتی چمکا..... بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے کاغذ وصول کرلیا۔

''باقی دو کاغذات تمہیں ایک، ایک ماہ کے وقفے سے وصول ہوجائیں گے.....'' گھر کے افراد کو سکتے کی کیفیت میں دیکھ کر عاقب سہیل نے لب کشائی کی۔

سدرہ مجتبیٰ نے ''اچھا جی'' کہے بغیر کاغذات کی تہ لگائی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گھر بھر میں بھونچال آگیا..... کوئی زور، زور سے بول رہا تھا تو کوئی اسے پاگل قرار دے رہا تھا کوئی اس کے پانچ، اونچے لمبے چوڑے بھائیوں، ان کے عہدوں اور اثر رسوخ سے ڈرا رہا تھا تو کوئی برادری، محلے، حلقۂ احباب میں..... ''کیا منہ دکھائیں گے؟'' جیسے سوال کا کوڑا برسنے سے ڈر کے رو رہا تھا..... بلکہ رو رہی تھی۔ عاقب کی ماں پورے شہر کی معروف شخصیت..... ''کیا جواب دوں گی؟ کس، کس کا منہ بند کروں گی؟'' سوچ کے دہل جانے والے بین ڈال رہی تھیں، واسطے دے رہی تھیں۔ اس نئے شادی شدہ جوڑے کی ہولناک علیحدگی...ان کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔

''یہ کیا ہوا.....؟''

''فیصلہ بدلا نہیں جاسکتا.....؟''

فیصلہ بدلا گیا نہ اس فیصلے میں دراڑ آئی اور عاقب سہیل ہفتہ کے اندر، اندر جدہ روانہ ہوگیا..... تین ہفتوں کے بعد دوسری طلاق بھی سدرہ مجتبیٰ کو موصول ہوگئی مگر میکے میں..... سسرال میں نہیں..... ساس نے اسے فوری میکے کی تیاری میں مصروف دیکھا تو منت سماجت کی رک جانے کی۔ اس نے تحمل سے جواب دیا۔

''آنٹی پہلی طلاق کے بعد بلکہ دوسری طلاق کے بعد رہنے کا جواز صرف اس صورت میں بنتا ہے کہ شوہر، بیوی کے پاس موجود ہو..... شوہر اگر کوسوں میل دور ہو تو پھر رہنے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں.....'' اپنا زیور، کپڑا سب وہیں چھوڑ کے وہ میکے چلی گئی..... سدرہ مجتبیٰ کی سسرال میں سے ایک، ایک کا دل لرزتا کانپتا ہی رہا۔ کہیں باہر نکلیں تو بدمعاش مسٹنڈے اچانک فائرنگ نہ کردیں..... راتوں کو اٹھ، اٹھ کر چونکتے..... چھت پر سے بلی بھی گزرتی تو کلیجا منہ کو آتا..... ڈھاٹا باندھے گلا گھونٹ کے مارنے والے، چھرا گھونپنے والے، اخبار جن کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ بھری عدالتوں میں بیوی کے رشتے داروں نے فائرنگ کر دی..... سابقہ شوہر نے تیزاب پھینک دیا..... ان بھلے مانسوں نے تو ایک فون کال کر کے یہ بھی نہ پوچھا کہ ہماری بیٹی کو طلاق کیوں دی؟ اسی خون خشک ہونے

کے عالم میں تیسری طلاق بھی مل گئی۔ پانچ ماہ اور دو دن کی ازدواجی زندگی..... (اب خدا جانے تھی بھی کہ نہیں) کا خاتمہ ہو گیا۔

تین طلاقوں کی تکمیل کے بعد دو دن، چار دن یہاں تک کہ دو ماہ گزر گئے..... کچھ نہ ہوا..... عاقب سہیل کے گھر والوں کا ڈر خوف بھی آہستہ، آہستہ ختم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ نارمل روٹین میں آ گئے..... سب زندگی کی بھول بھلیوں میں مگن تھے کہ عاقب سہیل کا فون آ گیا۔

''ابا جی سدرہ کے بھائی آ رہے ہیں سامان لینے..... فہرست کے مطابق سارا سامان دے دیجیے گا۔''

''کیا.....؟'' ابا جی کو شاید اس جملے کی توقع نہیں تھی۔ ''کون سا سامان؟''

''ابا جی جہیز کا سارا سامان الف سے لے کر یے تک..... سارا ویسے کا ویسا ہی ان کے حوالے کر دیجیے..... اور بلکہ.....'' وہ رکا..... ہکلایا..... ''بلکہ بری کے کپڑے زیور بھی۔ حق مہر میں نے ادا کر دیا تھا اس وقت.....''

''بری کے کپڑے؟ زیور؟ تم پاگل ہو گئے ہو؟ عقل گھاس چرنے گئی ہے؟ چار دن رہی بی نہیں اور زیور، کپڑا اس کے حوالے کر دیں، بڑے دیالو ہو رہے ہو۔''

''چلیں پورا زیور نہ دیں حق مہر کا تو دینا ہی پڑے گا ناں جو لکھا ہے..... اور وہ دینا ہی پڑے گا ہر صورت میں۔'' عاقب سہیل نے کہا۔

''کیا دھونس دھمکی دی ہے اس کے بھائیوں نے؟'' ابا کے کان کھڑے ہوئے۔

''نہیں، اس کے بھائیوں نے ایک لفظ نہیں کہا یہ دھونس دھمکی تو مجھے خدا نے دی ہے قرآن میں.....'' عاقب سہیل ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

''یہ آپ جانے دیں قصور کس کا تھا میرا یا اس کا..... بہر حال ہم دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے تھے تو الگ ہو گئے لیکن الگ ہونے کے طریقوں سے ایک طریقہ قرآن نے سمجھایا ہے جو ہمارے ہاں فساد اور قتل و غارت کا موجب بنتا ہے کہ ہم اس طریقے کے بجائے اپنے طریقے پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں..... اللہ نے قرآن میں کہا ہے..... تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم رخصتی کے وقت بیویوں سے وہ چیزیں واپس لے لو جو تم انہیں دے چکے ہو.....'' اب آپ ہی بتائیں میں اسے منہ دکھائی میں بریسلیٹ دے چکا ہوں حق مہر کی رقم فوری ادا کر چکا تھا۔ کیا اسے واپس لے لوں.....''

''نہیں..... نہیں اسے کیسے لے سکتے ہو؟'' ابا ٹھنڈے پڑ گئے.....

''اور یہ بھی بتا دیں..... جب اللہ نے یہ کہہ دیا یہ تمہارے لیے حلال نہیں..... جو چیز حلال نہیں ہوتی..... دوسرے لفظوں میں کیا وہ حرام نہیں ہوتی؟ جیسے شراب حرام، زنا حرام ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ بھی حرام ہی ہے اور آپ تو خود اسلامیات کے استاد رہے ہیں ابا جی، حرام کاموں کے ارتکاب سے مسئلے پیدا ہوتے ہیں جو بگڑتے ہیں؟ یا سنورتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے..... بات سمجھ گیا ہوں.....'' ابا جی نے فون بند کر دیا تھا..... ساتھ ہی دونوں آنکھیں بھی موند لیں..... بہت آرام سے تحمل سے ان چیزوں کی فہرست بنانا تھی جو اسے دے چکے تھے..... تاکہ علیحدگی کے غم میں سامان ہڑپ کرنے کا غم شامل نہ ہو سکے..... رشتہ نہیں نبھ سکتا تو برداشت ہو جائے گا کہ تقدیر کا لکھا تھا..... لیکن محنت، محبت اور مشقت سے بھیجا سامان واپس نہ گیا تو وہی ہوگا جو اخباروں کی روز، روز کی خبروں میں ہوتا ہے..... اس سے بچنے کے لیے ہی رب نے شاید لڑکے والوں کی طرف سے دیے گئے سامان کو واپس نہ لینے کی تلقین کی ہے کہ بہت سے دکھوں کا مداوا بن سکے..... اور وہی بات قرآن بھی روز پڑھتے ترجمہ بھی نظر سے گزرتا تھا مگر پہلی سورۃ میں اس حکم پر کبھی غور ہی نہیں کیا کہ اللہ نے تو صاف، صاف کہہ دیا..... ولا یحل لھم ان کے لیے حلال نہیں کہ طلاق دے کے لڑکی سے سامان واپس لے لیں..... جو چیز حلال نہیں وہ تو ظاہر ہے حرام ہی ہے..... تو کیا وہ حرام کے مرتکب ہو رہے تھے؟ لاشعوری طور پر ان کے ہاتھ کانوں سے جا لگے تھے۔

❁❁❁

ناولٹ

نائیکہ

عقیلہ حق

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے سارے بدن میں خون کی جگہ تیزاب بہہ رہا ہو، اس کے وجود پر ہزاروں، لاکھوں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ شہد کی مکھیاں اس کا گوشت نوچ رہی ہوں، ایک سیاہ اژدھا اس کے جسم کے گرد اپنی پوری طاقت کے ساتھ لپٹا اس کی آنکھوں میں اپنا پھن مار رہا ہو۔

وہ پاگلوں کی طرح اپنا بدن نوچ رہا تھا، اس کی آنکھیں پتھرسی ہوگئی تھیں۔ وہ بار، بار اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

اس نے بے بس وجود کے ساتھ اس کی طرف

دیکھا۔ میک اپ سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ، ہاتھوں میں بھری، بھری چوڑیاں، بستر پر پڑی کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے اس کی رات کی کہانی سنا رہے تھے۔ اس نے ایک ادا سے سینے پر پڑی چوٹی کو پیچھے دھکیلا، رات کا سوٹ سلیقے سے تہ کر کے بیگ میں رکھا، مرجھائے ہوئے پھولوں کو سرہانے رکھ کر وہ اس کی طرف مڑی۔

''تو اجازت جناب!''

وہ جو بری طرح اپنے جسم کو نوچ رہا تھا، اپنے ہاتھوں سے اپنا گریبان پھاڑ چکا تھا اب خاموش ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے اس کی آنکھوں میں بڑے تفاخر سے دیکھا اُس کے لبوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ آئی اس نے بیگ ہاتھ میں لیا، شانوں پر نزاکت سے دوپٹا پھیلایا دایاں ہاتھ اٹھا کر اسے الوداع کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلنے لگی۔

اسے باہر نکلتا دیکھ کر وہ جیسے اپنے حواسوں میں آ گیا۔

''رکو.....!'' اس کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔ وہ جو دہلیز کے پار اپنے پاؤں رکھ چکی تھی۔ اس نے پلٹ کر صدیوں کی مسافت طے کیے اس بوڑھے کو دیکھا جس کا پورا وجود کپکپا رہا تھا لیکن وہ بظاہر جوان تھا۔

''کیوں؟'' اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

☆☆☆

''مولوی صاحب، مسجد کے وظیفے سے گزارہ مشکل ہو گیا ہے اب کلثوم بھی ماشاء اللہ جوجھویں سال میں لگ گئی ہے، اس کی بھی بڑی فکر ہے مجھے..... کچھ بچتا ہی نہیں تو میں اس کے لیے کہاں سے جمع کروں۔'' رابعہ بی بی نے مولوی عبدالشکور کو رات کے سالن کے ساتھ سادی روٹی ناشتے میں دیتے ہوئے فکرمند لہجے میں کہا۔

''اللہ پاک بڑا کارساز ہے، پانچوں وقت مسجد کی امامت و مدرسے میں بچوں کو ناظرہ پڑھا کر جو وظیفہ ملتا ہے، وہ میں آپ کو دے دیتا ہوں.....'' مولوی صاحب نے یاسیت سے زیادہ شرمندہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

''نہ، نہ مولوی صاحب، اللہ نہ کرے میں آپ سے شکایت نہیں کر رہی، میں اپنے نصیب پر شاکر ہوں، پہلے تو میں محلے کے بچوں کو قرآن پڑھا کر کچھ کر لیتی تھی لیکن جب سے یہ شوگر کی بیماری ہوئی ہے لگتا ہے ہاتھ پیروں میں جان ہی نہیں رہی ہے۔ دوپہر کو نہ سوؤں تو سر میں ایک گولا سا بننے لگتا ہے ایسا لگتا ہے چکرا کر..... بے ہوش ہو جاؤں گی.....'' رابعہ بی بی نے کہا۔

''میں آپ کی تکلیف کو سمجھتا ہوں، ورنہ زندگی بھر آپ نے میرا برابر ساتھ دیا ہے، اب دونوں بڑے بیٹے بھی اپنی دینی تعلیم کے لیے دوسرے شہروں میں رہ رہے ہیں..... خیر اب میں ایسا کرتا ہوں ویسے بھی کئی لوگ کافی دنوں سے مجھ سے کہہ رہے ہیں... اپنے بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کے لیے تو میں اب ظہر کے بعد گھر نہیں آیا کروں گا بلکہ ان بچوں کو قرآن پاک تجوید کے ساتھ پڑھا دیا کروں گا۔'' عبدالشکور نے چائے کا گھونٹ بھر کر خالی پیالی زمین پر رکھتے ہوئے کہا اور کھڑے ہو گئے کہ فجر کی اذان کا وقت قریب تھا اور ان کو اذان دینی تھی۔

☆☆☆

''یار بیوی تو روز کے سالن، روٹی کی طرح ہوتی ہے، کوئی اور چوائس ہی نہیں بھوک لگی تو یہی سالن، روٹی ہے کھانا ہے کھاؤ ورنہ بھوکے سو جاؤ..... اور بھوکے پیٹ کسے نیند آتی ہے تو کھانا ہی پڑتا ہے پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن.....'' اسد ان مردوں میں سے تھا کہ دو چار دن بعد اسے باہر سویٹ ڈش کھانی ہی پڑتی۔

اور باہر کے کھانوں کی کیا بات ہے سادہ سے سلاد کو بھی ایسے سجا کر پیش کرتے ہیں کہ فوراً ہی منہ سے واہ نکلتا ہے۔

اور وہ کبھی دوست احباب کے ساتھ کسی ایسی جگہ نکل جاتا جہاں کا صرف مینیو کارڈ دیکھ کر ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور وہ سوچتا اس دو عالم کی نعمتوں میں سے کس کا انتخاب کروں اس لمحے اس کا دل چاہتا کاش! اے کاش.....!

☆☆☆

اور اسد..... اسد تو تھا ہی ان مردوں میں سے کہ دو چار دن گھر کی دال روٹی کھانے کے بعد وہ باہر کی رکابی میں ضرور جھانکتا ورنہ اسے ایسا لگتا کہ اس کا معدہ خراب ہو گیا، اسے ایسا لگتا کہ اب جو گھر کا سالن کھایا تو الٹیاں لگ جائیں گی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو بچوں کی شامت آجاتی یا اٹھتے بیٹھتے بیوی سے الجھتا رہتا اور پھر باہر کا فاسٹ فوڈ ہی اس کا موڈ اور منہ کا مزہ صحیح کرتا۔

☆☆☆

ایک دفعہ میں نے پڑھا تھا زنا ایک طرح کا قرض ہوتا ہے جو اگر تم لو گے تو تمہاری بہن یا بیٹی کو ادا کرنا پڑے گا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ میں کیا لکھ رہی ہوں، ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے۔ گناہ کوئی کرے اور سزا کوئی اور بھگتے..... بالکل صحیح..... سو فیصد صحیح..... پہلے میں بھی یہی سوچتی رہتی تھی..... لیکن اب.....

☆☆☆

''اماں، ابا نہیں آئے۔'' کلثوم نے ظہر کی نماز پڑھ کر جائے نماز تہ کرتے ہوئے رابعہ بی بی سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا، اب وہ فجر کے علاوہ باقی کی چار نمازیں پڑھا کر ہی گھر آیا کریں گے۔''

''کیوں اماں اور ابا کا کھانا؟'' کلثوم کو باپ کے کھانے کی فکر ہوئی۔

رابعہ بی بی اس کی بے چینی پر مسکرا دیں، بیٹیاں آخر بیٹیاں ہوتی ہیں۔

''بیٹا..... اگر وہ تمہارے ابا ہیں تو میرے بھی سر کا تاج ہیں، میں دوپہر کا کھانا ساتھ کر دیتی ہوں۔ بس ان کو کچھ بچوں کو الگ سے پڑھانا ہوتا ہے۔ اس لیے ظہر کے بعد اب گھر نہیں آتے.....'' رابعہ بی بی نے معصوم کلثوم کو سمجھایا۔

''اور بتاؤ تمہاری منزل کا کیا ہوا، تمہارے ابا کہہ رہے تھے وہ کسی بھی دن، تمہاری منزل (جب بچے قرآن حفظ کر رہے ہوتے ہیں تو اُن کے حفظ شدہ پاروں کو منزل کہا جاتا ہے لہٰذا اگلے سبق کے ساتھ وہ پچھلا بھی یاد کرتے ہیں اور اپنے استاد کو سناتے ہیں) سنیں گے۔''

''ہاں..... ہاں اماں منزل تو میری پکی ہے گیارھویں پارے تک پکی، پکی یاد ہے۔''

''شاباش میرا بچہ اب میں تھوڑی دیر لیٹوں گی اور تم اپنی منزل یاد کرو.....

کلثوم ایک بہت سیدھی سادی معصوم نوعمر لڑکی تھی۔ جس نے نہ کبھی موسیقی سنی اور نہ ہی کبھی ٹی وی دیکھا، اسکول کبھی گئی نہیں، ملانی جی (رابعہ بی بی) نے گھر میں ہی اسے اردو پڑھنا اور لکھنا سکھا دی تھی اور اب وہ خیر سے قرآن پاک حفظ کر رہی تھی اور پھر مولوی صاحب اور ملانی جی کی خواہش تھی کہ اسے عالمہ کا کورس کروائیں۔

اور کلثوم..... اس نے کبھی نہ نہیں کیا اور نہ ہی نہ کہنا اسے آتا تھا۔

کاش! کاش ملانی جی کسی بات پر ''نہ'' کہنا بھی سکھا دیتیں۔

☆☆☆

''بھائی اس دعوت پر کوئی کمپرومائز نہیں ہوگا۔ اور دعوت بھی ڈٹ کر کم از کم تین دن کی ہونی چاہیے۔'' اصولاً تو دعوتیں شادی کے بعد ہی ہوتی ہیں۔ لیکن اسد جس بات پر بضد تھا وہ دعوت مس فروٹ کی دعوت اور شادی سے پہلے والی دعوت تھی۔

''ابے یار..... ویسے میں مجرا ہوگا دل بھر کر انجوائے کرنا اب..... اتنی مصروفیات میں سے کیسے ٹائم نکالوں.....'' حارث جز بز تھا۔

''تم پاگل ہو گئے ہو حارث، وہاں کیا انجوائے ہوگا بیویاں بغل میں آکر بیٹھ جائیں گی کسی کو داد زیادہ دے دو یا بڑا نوٹ نچھاور کر دو تو ہفتہ بھر گھر میں کل، کل اور ماتم ہی ہوگا۔ نہ بھئی نہ مجرا، مجرا ہوتا ہے اور.....'' اسد نے داہنی آنکھ دبا کر قہقہہ لگایا اور پھر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگانے لگے۔

☆☆☆

''ملانی جی میرے دوست ہیں بلکہ دوست کے ساتھ ایک بہت نیک، نمازی، پرہیز گار آدمی میری ان سے بہت اچھی دعا سلام ہے، ان کے بھتیجے کا یہاں

اپنے شہر میں کالج میں داخلہ ہوا ہے، وہ چاہتے ہیں ہماری چھت پر جو کمرا خالی پڑا ہے ہم اس لڑکے اور اس کے ایک دوست کو کرایے پر دے دیں۔ اس طرح ایک مستقل آمدنی کا بھی آسرا ہو جائے گا..... زینے کا دروازہ ہم بند کر دیں گے اور باہر کے زینے سے ان کی آمد و رفت ہوگی، کسی قسم کی بے پردگی بھی نہیں ہوگی، اب بتایئے آپ کی کیا رائے ہے۔'' مولوی عبدالشکور ہمیشہ اپنی بیوی سے ضرور مشورہ کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے، یہ ہی ہمارا دین ہے۔

''جیسے آپ کی مرضی مولوی صاحب، آپ مرد ہیں باہر بہت سارے لوگوں سے ملتے ہیں، آپ کا تجربہ بہت زیادہ ہے جو آپ مناسب سمجھیں جو آپ کی مرضی ہو۔'' رابعہ بی بی نے حسب سابق وہی جواب دیا جو وہ ہمیشہ دیتی رہی تھیں۔

☆☆☆

''حارث اپنے بھائی کی شادی کی تیاری کے لیے تین دن کے لیے کراچی جا رہا ہے، مجھ سے بھی بہت ضد کر رہا تھا تو میں نے کہا ٹھیک ہے چلا چلوں گا۔'' اسد نے ٹی وی دیکھتے، دیکھتے بالکل سرسری سے انداز میں بیوی کو بتایا۔

فرح نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ حارث کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کراچی میں برائڈل سوٹ بہت اچھے ملتے ہیں اس کے اپنے تعلقات تھے حارث کی فیملی سے لیکن اسد کے باہر کے کھانے کے شوق سے بھی وہ خوب واقف تھی۔

وہ بیوی ہی کیا جو شوہر کے دل میں ہوتے شور کو نہ سن سکے۔

''کب آؤ گے.....؟'' اس نے دل پر صبر کر کے بہت تحمل سے پوچھا۔

''بس دو تین دن میں.....''

وہ خاموش ہو گئی..... خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

☆☆☆

''یار کیا لڑکی تھی..... مکھن ملائی، خستہ کچوری.....'' اسد نے زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے حارث سے کہا۔

''خدا کی قسم مزہ آ گیا باہر کے فروٹ بہت چکھے لیکن یہ تو یار پوری فروٹ چاٹ تھی۔ حسین، معصوم، دلربا اور.....''

''بس کر یار..... بس کر ابھی ایک اور بکنگ بھی ہے۔ پوچھوں گا میڈم سے ایسی کیا تجھے مکھن ملائی بھیج دی کہ تیری رال ابھی تک ٹپک رہی ہے۔'' حارث ہنسا۔ اور اسد نے سرور سے آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''عورتیں آج سے پہلے میری نظر میں دو قسم کی ہوتی تھیں، ایک وہ جنہیں بیویاں بنا کر بچے پیدا کروائے جاتے تھے اور دوسری رات کی رانیاں جو رات کو حسین بناتی ہیں اور صبح ان کا..... مکروہ چہرہ دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن میں غلط تھا..... عورت کی ایک قسم اور ہوتی ہے جو پورے کے پورے مرد کو ڈھیر کر دیتی ہیں، مات دے دیتی ہیں اور ہاتھی کی طرح..... بدمست مرد، شیر کی طرح دھاڑتا مرد ان کے آگے ڈھیر ہو جاتا ہے۔ کل رات میری ملاقات اس خطرناک عورت سے ہوئی تھی جس کی اداؤں نے دلربائی نے مجھ جیسے شاطر مرد کو مات دے کر اپنے قدموں میں بٹھا لیا تھا۔ وہ عورت..... نہیں وہ لڑکی..... نہیں لڑکی نہیں موم کی گڑیا..... نہیں دم دم کی گڑیا نہیں جنت کی حور..... نہیں جنت کی حوریں تو پھر کون تھی وہ۔'' اسد اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا۔

''کون تھی وہ.....؟''

☆☆☆

وہ دونوں لڑکے اوپر والے کمرے میں آ گئے، اندر والے زینے کے دروازے پر کنڈی لگا دی گئی..... ان کا آنا جانا باہر ہی سے تھا۔ یوں مولوی صاحب کے گھر میں بھی ایک معقول رقم آنے لگی۔

حارث اور کمال..... دونوں لڑکے آرام سے رہ رہے تھے۔ حارث تو پڑھنے... لکھنے والا لڑکا تھا لیکن کمال، اسے لکھنے پڑھنے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس سال بھی وہ جب بی اے میں فیل ہوا تو اس کے ابا نے اسے غصے میں گھر سے ہی نکال دیا اور پھر وہ اپنے

دوست کے ساتھ یہاں چلا آیا۔ اور دکھاوے کے لیے کالج میں داخلہ بھی لے لیا..... کمال کو علم کی طلب نہ تھی اسے جس چیز کی طلب تھی، وہ ان گلی کوچوں میں آرام سے مل جاتی تھی۔

جب چھٹیوں کا وقت آیا تو حارث اپنے گھر چلا گیا لیکن کمال کو تو یہیں رہنا تھا کیونکہ بی اے پاس کے کیے بغیر وہ گھر نہیں جا سکتا تھا..... سو اس نے محلے میں تعلقات بڑھانے شروع کر دیے کسی کو سودا سلف لا دیا، کسی کے بچے کو اسکول سے لے آیا اور رابعہ بی بی جنہیں سارا محلہ ملانی جی کہتا تھا روز صبح ان کا دروازہ کھٹکھٹا کر وہ ضرور پوچھتا۔

''ملانی جی میرے لائق کوئی خدمت.....؟''

☆☆☆

وہ تپتی دوپہر تھی، بجلی چلی گئی تھی، وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ کھڑا ہوا تو اس کی نظریں محلے کے گھروں کو کھوجنے لگیں۔ اور پھر اچانک اس کی نظر مولوی صاحب کے صحن پر پڑی اور وہ ششدر رہ گیا۔

وہ چودہ، پندرہ سال کی لڑکی، چہرے پر بلا کی معصومیت تھی، نئی جوانی میں قدم رکھتا بدن، وہ کپڑے نچوڑ، نچوڑ کر الگنی پر پھیلا رہی تھی، بقیہ کپڑے اس نے کندھے پر ڈالے ہوئے تھے، جن سے پانی ٹپک، ٹپک کر اس کی کمر کو بھگو رہا تھا، لان کی قمیص اس معصوم، ان چھوئے بدن سے چپکی ہوئی تھی۔

وہ کلثوم تھی، جس نے کبھی ٹی وی نہیں دیکھا تھا، کبھی گانا نہیں سنا تھا، وہ معصوم سی لڑکی کلثوم تھی جس کے بھائی عالم کے کورس کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے..... جس کے ابا مولوی عبدالشکور پانچوں وقت مسجد میں اذان دیتے اور امامت کرواتے، وہ کلثوم تھی جس کی اماں ابھی اسے قرآن یاد کروا کر سوئی تھیں۔

کمال حیران تھا، ایسا قیمتی اور نایاب ہیرا گھر میں موجود ہے اور وہ دوسرے گھروں میں جھانک رہا ہے، یہ تو وہی بات ہوئی بغل میں بچہ اور شہر میں ڈھنڈورا.....

''اتنے عرصے سے یہاں رہ رہا ہوں لعنت ہو مجھ پر کہ میں اس ہیرے کو نہ دیکھ سکا.....''

''کلثوم..... بیٹا کلثوم.....'' وہ جو اپنے آپ کو لعنت ملامت میں مصروف تھا آواز پر چونک گیا، وہ ملانی جی کی آواز پر اندر جا چکی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ بھیڑیا اسے تاک چکا ہے۔

''کلثوم..... اچھا نام ہے۔'' کمال نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے..... اپنے آپ سے کہا اور آنکھیں موند لیں خواب دیکھنے کے لیے۔

کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ کمال کیا خواب دیکھنا چاہتا ہے، نہیں ناں.....

☆☆☆

ملانی جی، کیا سارا محلہ ہی اس کے اچھے اخلاق کا گرویدہ ہو چکا تھا۔

ایک دن جب وہ ملانی جی کو سودا دینے آیا تو کلثوم جو باورچی خانے میں کھڑی تھی اس نے جلدی سے پیٹھ کر لی..... ''نہ جانے کیوں آج اماں دروازے پر نہیں گئیں اور اسے اندر بلا لیا ہے۔'' کلثوم اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔

اسے لگا کوئی باورچی خانے کے دروازے پر کھڑا اسی کو تک رہا ہے..... عورت میں میرے اللہ پاک نے خاصیت رکھی ہے کہ اگر کوئی مرد ہزاروں کے مجمعے میں بھی اسے دیکھ رہا ہو تو اس کی نظر سیدھی دیکھنے والے پر جا پڑتی ہے اور وہ نظر کی نوعیت بھی پہچان لیتی ہے کہ کون اسے کس نظر سے دیکھ رہا ہے اور یہاں تو صرف ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا۔

وہ پلٹی..... وہ اسے پُراشتیاق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم بہت خوب صورت ہو۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

جو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ اس نے اپنے گھر میں دیکھ لیا۔ ایک مرد کی نگاہ میں لو دیتی وارفتگی..... اسے اپنا سارا وجود سلگتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بھاگ کر صحن میں گئی تاکہ پانی کے ڈرم سے پانی لے کر اپنے سلگتے چہرے اور دہکتے دل کو کچھ سمجھا سکے۔

اس نے ڈونگا بھر کر سارا پانی اپنے اوپر ڈال دیا..... اور کمال چھت پر کھڑا مسکرا رہا تھا..... تیر نشانے

پر لگا تھا۔ وہ گھاگ شکاری تھا، وہ جانتا تھا اس کا نشانہ خطا نہیں ہوسکتا اور اس کا نشانہ واقعی خطا نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

آم کے کچے بور جیسی لڑکی کلثوم، اسے لگتا کہ اس کا سارا بدن بولنے لگا ہے..... روٹی پکاتی تو روٹی مسکرا کر کہتی۔ ''تم بہت خوب صورت ہو.....'' مرد بڑی ظالم چیز ہے ایک نظر سے برسوں۔ کی سوئی ہوئی عورت کو جگا دیتا ہے، ایک گہری نگاہ سے دل کی دنیا پلٹ دیتا ہے۔

کلثوم گھر میں کام کرتے، آتے جاتے..... بے ساختہ اوپر کی طرف دیکھتی تو اسے لگتا وہ کھڑا ہے اور دھیمے سے گنگنا رہا ہے کہ ''تم بہت خوب صورت ہو۔'' نظروں کے تبادلے ہونے لگے۔

گھر میں رکھی ہر چیز پلنگ، پانی کا ڈرم، پلیٹیں، جگ حتیٰ کے نماز کا دوپٹا بھی کہنے لگا، چھیڑنے لگا۔۔ گدگدانے لگا کہ ''تم بہت خوب صورت ہو۔''

کمال کی ایک نظر اور ہزار بار بولے ایک جملے نے مولوی عبدالشکور کی حافظہ بیٹی کو جگا دیا۔ ایک عورت بنا دیا ایسی عورت جو مرد کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتی ہے جس کا دل چاہتا ہے کہ کوئی اس سے بار، بار کہے ''تم بہت خوب صورت ہو۔''

مولوی صاحب چالیس دن کے چلے پر گئے ہوئے تھے کہ ملانی جی کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ کلثوم کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور ملانی جی درد سے تڑپ رہی تھیں..... اور پہلی دفعہ وہ بھاگ کر اوپر سے کمال کو بلا لائی۔

کمال، ملانی جی کو ڈاکٹر کے ہاں لے گیا، گھر لا کر ان کو دوائی دے کر اس نے کلثوم سے کہا۔ ''اب یہ سو جائیں گی۔ دوسری خوراک چار بجے دینی ہے لیکن مجھ سے پوچھ کر دینا۔''

''آپ سے کیسے پوچھوں گی.....؟'' کلثوم معصومیت کی انتہا پر تھی۔

''اوپر آجانا.....'' کمال نے آہستگی سے کہا۔ وہ چلا گیا لیکن دوائی، دروازے، کھڑکیاں، زینہ، زینے پر لگا گیٹ، گیٹ پر لگی کنڈی بار، بار کہتی رہی۔ ''اوپر آجانا۔''

ملانی جی گہری نیند سو رہی تھیں۔ ان کو دوسری خوراک دینی تھی..... وہ اوپر جانا نہیں چاہتی تھی وہ ملانی جی کے برابر والے پلنگ پر تکیہ رکھ کر لیٹ گئی لیکن بستر کی چادر، تکیہ، پلنگ سب سرگوشیاں کرنے لگے۔ ''اوپر آجانا۔''

''اوپر آجانا۔''

''اوپر آجاؤ.....'' اس کے تکیے نے کہا۔

''اوپر کیوں نہیں جا رہیں.....؟'' چادر چلائی۔

''کیا اوپر نہیں جاؤ گی.....'' اس کا دوپٹا سکا اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور پھر وہ اوپر چلی ہی گئی۔

☆☆☆

''وہ چار بج گئے ہیں لیکن اماں اٹھ ہی نہیں رہیں دوائی دینی ہے ناں.....'' کلثوم نے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں ابھی وہ نہیں اٹھیں گی، انہیں تم آرام کرنے دو، تم اندر آجاؤ۔'' وہ اپنے بستر سے کھڑا ہوا۔

''نہیں، اندر نہیں جاؤ۔'' اس کے اندر سے کسی نے سختی سے روکا۔

''اندر مت جانا پلیز.....'' دوپٹا سکا۔

''کیا تم اندر چلی جاؤ گی.....؟'' سر پر جمی چادر نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں جاؤ..... نہیں جاؤ..... نہیں جاؤ.....'' چاروں طرف سے صدائیں بلند ہونے لگیں وہ گھبرا گئی اور ان آوازوں سے بچنے کے لیے بھاگ کر کمرے کے اندر چلی ہی گئی اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ ساری صدائیں دروازے سے لپٹ کر رونے لگیں۔

اس نے ایک نظر کمرے پر ڈالی اور پھر بند دروازے کو حیرت سے دیکھا کہ یہ کب بند ہوا۔

اور جب وہ لوٹی تو معصوم کلی سے وہ پھول بن چکی تھی، اس کے معصوم دل و دماغ کو پتا ہی نہیں تھا کہ کیا لٹا آئی۔ ہاں کچھ نہ جانتے ہوئے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ایک سرور تھا، ایک خمار تھا جو اس پر چھایا ہوا تھا اور دل تھا کہ عجب طرح سے بے چین تھا۔

پھر تقریباً دو ہفتے کمال، ملانی جی کو دوائی کے ساتھ نیند کی گولیاں کھلاتا رہا اور کلثوم بند کمرے کی بھول

بھلیوں میں کھوتی چلی گئی۔

ملانی جی تو ٹھیک ہوگئیں لیکن جب ایک چیز کی لت لگ جائے تو چھٹنا بہت مشکل ہوتا ہے کلثوم کو کمال کی قربت اچھی لگتی لیکن اس قربت کے کیا نتائج نکلیں گے، یہ وہ تیرہ، چودہ سال کی کلثوم نہیں جانتی تھی کیونکہ کمال نے کہا تھا۔

''دیکھو تم کو تو تمہاری امی کہیں جانے نہیں دیتیں نہ تم ٹی وی دیکھ سکتی ہو'' وہ اسے موبائل پر عجیب کرشمے دکھاتا، وہ حیران ہوتی تو کہتا۔ ''ارے بھئی یہ سب ہوتا ہے..... اب تم ہم دوست بن گئے ہیں ناں..... ارے ہم کچھ کر تو نہیں رہے، ہم تو تفریح کر رہے ہیں اور سمجھو ایک قسم کا کھیل ہی ہے۔''

معصوم کلثوم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ واقعی وہ اس سے کھیل ہی تو رہا تھا، تفریح ہی تو لے رہا تھا۔

☆☆☆

محلے میں کمال کی بڑی عزت تھی سب اس کی شرافت کے گرویدہ تھے، اکثر نماز بھی جماعت سے پڑھتا اور جب جماعت سے پڑھتا تو اس کی پوری کوشش ہوتی کہ پہلی صف میں کھڑا ہو۔

محلے میں نظریں جھکا کر چلتا بڑوں کا ادب کرتا، بچوں کا خیال رکھتا..... اور گھریلو خواتین کو سودا سلف لا دیتا۔ سب ہی لوگ اسے پسند کرتے تھے۔

☆☆☆

کلثوم کے جسم میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی تھی وہ اپنے آپ کو چادر میں چھپائے رکھتی کچھ اس کی سمجھ میں آتا اور کچھ نہیں آتا..... مولوی صاحب نے بھی اسے باہر کی ہوا نہیں لگنے دی تھی لیکن گھر کی چار دیواری، چادر میں لپٹے، لپٹے اس نے ایک دنیا دیکھ لی تھی۔

جب بھی موقع لگتا کمال اس کے لیے کبھی برگر کبھی چھولے چاٹ لا دیتا اور وہ چھپ چھپ کر کھا لیتی۔ اب مولوی صاحب کے دونوں بیٹے واپس آ چکے تھے اب کلثوم کا اوپر آنا اور کمال کا یوں نیچے جانا ناممکن تھا..... ویسے بھی کمال جی بھر کے سیراب ہو چکا تھا۔ کلثوم چادر میں لپٹی اپنے وجود کے اندر ہوتی تبدیلیوں کو برداشت کر رہی تھی..... کہ ایک دن موقع دیکھ کر کمال چلا آیا۔

''میں جا رہا ہوں کلثوم.....''

''کیوں..... کہاں.....؟''

''تمہارے رشتے کے لیے امی اور ابا کو لینے جا رہا ہوں.....''

''لیکن مجھے تو پتا نہیں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا ہو رہا ہے کلثوم؟''

''یہ دیکھو.....'' کلثوم نے اپنے جسم پر سے چادر ہٹا دی۔ کمال جانتا تھا، وہ ہونے والی تبدیلیوں سے واقف تھا۔

''ارے کچھ نہیں ہوا، ایسا ہوتا ہے، تم آج کل کھا پی بھی تو بہت رہی ہو ناں..... تو ایسا تو ہوتا ہے۔ بس تم کسی کو بتانا نہیں میرے بارے میں..... کوئی کچھ بھی پوچھے میرا نام نہیں لینا.....'' کمال نے عیاری اور چالاکی کی ہر حد پار کرتے ہوئے اسے تاکید کی۔

''میرا نام نہیں لوگی ناں.....؟ سمجھ گئی ہو ناں اور ہاں کبھی..... کسی کو نہیں بتانا تم میرے سامنے بھی آئی ہو۔'' کمال نے اس کی ٹھوڑی اپنی انگلی سے اوپر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں پر بوسہ دیتے ہوئے تصدیق چاہی۔

اور اس نے تصدیق کر دی۔

''نہیں لوں گی، کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔''

بالآخر کمال چلا گیا اور کلثوم چار دیواری میں چادر لپیٹے اس کا انتظار کرنے لگی اور جس دن چادر کی یہ چار دیواری ہٹی تو گویا زلزلہ ہی آ گیا۔

مولوی عبدالشکور اس بات کی تاب ہی نہ لا سکے اور ان کا دل بند ہو گیا۔ بھائیوں نے ڈنڈوں، لاتوں، گھونسوں سے اسے چار چوٹ کی مار لگائی۔

اس لٹیرے کا نام پوچھا جو اُن کی چار دیواری میں چادر کا تقدس پامال کرتا رہا لیکن کلثوم پٹتی رہی ایک لفظ نہ بولی۔

اور پھر اس کی ماں کی منت سماجت کو نہ مانتے ہوئے اس کا بڑا بھائی بالوں سے گھسیٹتا اسے دروازے تک لایا اور کہا۔

''تجھ جیسی آوارہ..... بدبخت..... خبیث، ذلیل اور آبرو باختہ کے لیے ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہیں۔'' اور دوسرے بھائی نے کمر پر زور سے لات مار کر اسے رات کی تاریکی میں گھسیٹتے ہوئے قریبی سنسان علاقے میں پھینک دیا۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن پھر اس کی کمر میں شدید درد کی لہر اٹھی اور اس کا سر چکرایا اور وہ گرتی چلی گئی۔

☆☆☆

پچھلی رات کا نشہ نہیں اترا تھا آج پھر حارث نے اس کے لیے سیج سجادی.....

جب کبھی اس کے لیے سیج سجتی اسد بہت شان سے اندر داخل ہوتا، وہ مانگتا نہیں تھا، چھین لیتا تھا، وہ پوری رات اپنی برتری قائم رکھتا، اس بازاری حسن کے وہ سارے داؤ پیچ جانتا تھا۔

وہ گھاگ شکاری تھا، بہت آرام سے شکار کرتا تھا۔ جب وہ اپنے سجائے ہوئے ایک رات کے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اس کو ایک انفرادیت کا احساس ہوا، اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، کہیں کوئی نئی بات، کوئی خاص بات نہیں تھی تو پھر خاص بات کہاں تھی..... اوہو..... خاص بات اس ایک رات کی دلہن میں تھی۔ صبح ہی حارث نے کہا کہ میڈم نے کہا تھا۔ ''بہت نوازش ہے کہ آپ کے دوست کو ہمارا تحفہ پسند آیا۔ اس رات بھی ہم ان کے لیے ایسا تحفہ بھیجیں گے کہ وہ دنیا بھول جائیں گے۔''

اور حارث حیرت زدہ تھا آخر اسد کو دنیا بھلانے کی ہمت کس میں ہے..... ذرا میں بھی تو دیکھوں.....

''احتیاط کرنا اسد، میڈم نے کہا تھا ہماری انگشتری میں دو ہی بیش قیمت نگینے ہیں اور وہ دونوں ہی ہم آپ کے دوست کو پیش کر رہے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ اسے اس حجلۂ عروسی میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسد نشے میں دھت اس کے قریب آیا..... وہ نگینہ نہیں تھی ماہتاب تھی۔ کہکشاں تھی..... دلنواز تھی..... دلربا تھی۔

اس نے بہت سی راتیں ان ایک رات کی دلہنوں کے ساتھ گزاری تھیں۔ سب ایک جیسی ہوتی ہیں..... میک اپ سے لتھڑے چہرے ایک جیسی ادائیں۔ اور ایک جیسے انداز.....

رات کے اندھیرے میں تو گزارہ ہو جاتا لیکن صبح کی روشنی میں ان کے چہروں سے کراہیت آتی، سیکڑوں مردوں کی خوشبو آتی۔ لیکن اس میں کوئی خاص بات تھی..... ایسی بات جو پہلے کسی میں نہیں تھی۔

وہ بازار سے آئی تھی..... اس کے سامنے سجی سنوری کھڑی تھی لیکن وہ بازاری نہیں تھی۔

اسد جیسے عیاش بندے نے پہلی نظر میں بھانپ لیا تھا۔ اس کے اندر ایک تمکنت تھی۔ ایک غرور تھا۔ تمکنت، غرور مگر کس چیز کا.....؟'' اسد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

''ہم کھڑے، کھڑے تھک گئے، کیا آپ بیٹھنے کو نہیں کہیں گے۔'' سرخ گلاب کے غرارہ سوٹ میں نفاست سے کیا ہوا میک اپ، انتہائی نفیس زیورات، بول چال انتہائی مہذب، ادائیں کافرانہ، الفاظ دلبرانہ..... اسد کو اپنی شکست سی نظر آنے لگی۔

''اگر میں بیٹھنے کو نہ کہوں تو.....'' اسد نے سگریٹ کا دھواں اس کے منہ پر اڑاتے ہوئے کہا۔

''تو بندی آپ کی غلام ہے۔''

اُف اس جملے نے تو اسد کو بے دام لوٹ لیا..... سب کو معلوم ہے مرد گھر میں شریف، خاندانی بیوی اپنے بچوں کی ماں کو چھوڑ کر ان بازاری عورتوں کے پاس کیوں جاتے ہیں۔

اس لیے جاتے ہیں کہ وہ عورتیں، مردوں کے پیروں میں بلا چون و چرا... بیٹھ جاتی ہیں، برابری کا دعویٰ نہیں کرتیں..... بندی بن کر مرد کو تخت پر بٹھا دیتی ہیں اور ان کی یہ ادا مرد کو لوٹ لیتی ہے، پامال کر دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ مرد یہ جملہ سننے کے لیے جیب میں محبت کے کھوٹے سکے ڈالے در بدر پھرتا ہے، کبھی سیڑھیاں چڑھتا ہے اور کبھی سیڑھیاں پھلانگتا ہے..... کاش بیویاں یہ بھید جان لیں..... کاش!

''تمکنت حسین اور شائستہ کلام کی مالک ہے یہ۔'' اسد نے اپنے آپ سے کہا۔

اسد نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ جیت گئی۔

''دیکھیے صاحب! اب آپ کہیں گے عورت ہوتے ہوئے کسی مرد کو اس طرح گھور، گھور کر کیوں دیکھ رہی ہو... تو جناب جب سامنے کھڑا مرد اتنا خوب صورت ہو تو عورت اپنے اصول بخوشی توڑ دیتی ہے۔''

''بیٹھ جاؤ.....'' اسد نے اسے ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔ ''اور یہ بتاؤ یہ بات تم کتنے مردوں سے کہہ چکی ہو؟''

''جتنی بار آپ عورتوں سے پوچھ چکے ہیں.....''

چہرے پر قاتلانہ مسکراہٹ سجائے اس نے برجستہ کہا۔

''تم بہت ہوشیار عورت ہو۔''

''یہ ہوشیاری آپ ہی کی دین ہے۔'' اس کا لہجہ گنگنایا، وہ مسکرا رہی تھی، اس کی مسکراہٹ میں ایک اسرار تھا، کوئی بگولہ تھا، جو اسد کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ اسد الجھ رہا تھا۔

اس کی پازیب کی کھنک مسحور کن تھی..... اس کی ادائیں دلبرانہ تھیں..... اسد نیم دراز تھا وہ اس کے قریب تھی۔

''آپ کا سر دبا دوں.....؟'' اس نے اپنے حنائی ہاتھ اس پیشانی پر رکھے وہ خاموش رہا لیکن آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

اسد جو کبھی مات نہیں کھاتا تھا لیکن آج اسے لگ رہا تھا کہ وہ مات کھا جائے گا..... وہ عورت پُراسراری تھی، کسی دیومالائی کہانی کا کردار لگ رہی تھی۔

''تم اپنا نام بتاؤ.....'' اس نے پوچھا۔

''آپ بھی جانتے ہیں کہ ہر رات ہمارا الگ نام ہوتا سو نام پوچھ کر آپ کیا کریں گے؟''

''جاؤ تم اپنا میک اپ صاف کرو، مجھے وحشت ہو رہی ہے تمہارے میک اپ زدہ وجود سے۔'' اسد نے ہسٹریائی انداز میں اسے دھکا دیا۔

وہ آرام سے بستر سے اتری پنوں سے اٹکا دوپٹا اتار کر کرسی پر ڈالا اپنا نائٹ سوٹ نکالا اور باتھ روم میں چلی گئی۔

اس نے منہ دھویا، بالوں کو کھول کر چوٹی میں بل

نظم

زمیں بھر گئی لہو میں
اپنے بچھڑے لمحوں میں
یہ جان کر بھی تم خاموش ہو
مسلمانو! کیا تم خود فراموش ہو
قبلہ اوّل پکارے! امہ کو
تم پہچانو اپنے دشمن کو
دشمن کرتا ہے طاقت پہ غرور
اور تم میدانوں سے دور
چمن اجڑے اب جنازے ہیں
ملبوں میں دبے آشیانے ہیں
معصوموں کی شہادت، اولاد کا غم
دیکھ کے ہر دردمند آنکھ نم
طاقت ہوتے ہوئے بھی خاموش ہو
آخر تم سب کیوں بے ہوش ہو
جذبے حریت کے ختم نہ ہوں گے
غیروں کے لیے دل نرم نہ ہوں گے
قصۂ نمرود سے کیوں نا آشنا ہو
ان پرندوں سے ہی غیرت لے لو
بے ضمیرو! تم سب پر لعنت ہو
مائیں بہنیں لڑیں خود اپنی جنگ
اور کافروں پر کریں زندگی تنگ
کیسے مسلم ہو، کیسے رہبر ہو
واللہ! تم سب پر تعجب ہو

کاوش: سیدہ عروبہ، حیدرآباد

غزل

اس نے دل کا حال بتانا چھوڑ دیا
ہم نے بھی گہرائی میں جانا چھوڑ دیا
جب اس کو ہی دوری کا احساس نہیں
ہم نے بھی احساس دلانا چھوڑ دیا
میں نے کہا راستے ہیں دشوار بہت
اس نے تب سے ساتھ نبھانا چھوڑ دیا
جب یہ کہا کہ کرنا یاد دعاؤں میں
اس نے دعا میں ہاتھ اٹھانا چھوڑ دیا

از: فہمیدہ فرخندہ، ملتان

ڈالے اور واش روم سے باہر آ گئی۔ اب اس کے چہرے پر حسن نہیں تھا، سوز تھا، دکھ تھا، حسرت تھی۔ بیچارگی تھی۔ اسد اسے ایک ٹک دیکھتا رہ گیا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا اصل چہرہ آپ کو تکلیف دے گا لیکن آپ کی مرضی۔" اس نے شکستگی سے کہا اور کمرے کی لائٹ بجھا دی۔

☆☆☆

"بیگم صاب میں اپنی سواری چھوڑ کر آ رہا تھا تو یہ لڑکی زخموں سے چور روڈ پر پڑی تھی۔" رکشا والے نے فلاحی ادارے کی منتظمہ سے کہا۔

"کون ہو تم.....؟" وہ خاموش رہی۔

"گھر سے بھاگی ہو یا نکالی گئی ہو....."

وہ خاموش رہی۔

"دیکھو بھئی اس طرح خاموش کھڑی رہو گی، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی تو میں تم کو نہیں رکھ سکوں گی، میں پولیس کو فون کر دوں گی وہ خود ہی تمہارے ورثا کو تلاش کرے گی۔" فاطمہ باجی کافی سخت خاتون تھیں۔

"ایک منٹ فاطمہ..... پلیز ایک منٹ پتا نہیں کن حالات سے گزری ہے..... ذرا اسے بیٹھنے تو دو....." مسز علی جو اس ادارے کی ٹرسٹی تھیں نے پیچھے سے آ کر اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ادارے کی سربراہ کو نرمی سے ٹوکا۔

"السلام علیکم..... مسز علی کیسی ہیں آپ؟ آج اتنی صبح، صبح....."

فاطمہ باجی کے لہجے میں فوراً شہد گھل گیا۔

"بس کچھ نہیں آفس جا رہی تھی تو سوچا ان تمام خواتین سے ملتی چلوں لیکن بات اب سمجھ آئی کہ یہ بچی تمہارے سوالوں کے کٹہرے میں کھڑی تھی اس لیے اللہ پاک نے مدد کے لیے مجھے بھیج دیا۔ میرے خیال سے یہ ابھی ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں ہے تم اسے کمرا دو۔ پھر بعد میں بات کریں گے۔" مسز علی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے فاطمہ کو تاکید کی۔

"میڈم روم تو کوئی نہیں ہے میں کامن میں ہی اس کے لیے بستر لگوا دیتی ہوں۔" فاطمہ نے اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور اندر کی طرف چلی گئی اور ماسی اس کے پیچھے تیزی سے بھاگی۔

یہ عورتوں کی فلاح و بہبود کا ایک ادارہ تھا جو..... بے سہارا، لاوارث خواتین کو پناہ دیتا تھا، حکومت کے ساتھ، ساتھ مختلف این جی اوز بھی اس کا خیال رکھتی تھیں لیکن مسز علی اس کی ایک میجر سپورٹر تھیں۔

☆☆☆

عورتیں اس سے بہت سی باتیں کرتیں۔ "کون سا مہینہ ہے..... میاں کہاں ہیں..... میاں مر گیا یا زندہ ہے؟ یا پھر میاں ہے ہی نہیں..... کہیں طلاق دے کر گھر سے تو نہیں نکال دیا۔ میکے میں کون، کون ہے؟" وغیرہ، وغیرہ.....

لیکن وہ خاموش رہتی اور یک، ٹک سب کو دیکھتی رہتی اس نے یہی تاثر دیا کہ وہ یادداشت کھو چکی ہے۔ عورتیں اس کی کم عمری پر ترس کھاتیں۔

مسز علی ہر دوسرے دن چلی آتیں..... خاص کر اس کا حال پوچھتیں۔

جواں سال، شہابی رنگ، ستواں ناک، رسیلے ہونٹ اور ہونٹوں کے نیچے چمکتا سیاہ تل..... گھٹنوں کو چھوتے سیاہ بال، صاف شفاف صراحی دار گردن..... مسز علی کو وہ بہت اچھی لگتی۔ انہوں نے اس کے لیے گائنا کالوجسٹ کا بھی انتظام کر دیا تھا۔

ویسے تو یہاں رہنے والی سب ہی عورتیں اس کا خیال رکھتیں۔ وہ پندرہ، سولہ سال کی بہت معصوم اور حسین لڑکی، ایک جان کو اپنے اندر سینجالے خاموش بیٹھی رہتی۔ اس کے بارے میں سب کو تجسس تھا، خاص طور پر یہ سوال اٹھتا وہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ؟

شادی شدہ ہے تو مرد کہاں ہے؟ غیر شادی شدہ ہے تو یہ گناہ کس کا ہے؟

ہر عورت مختلف انداز سے تقریباً یہی سوال روز پوچھتی لیکن وہ خاموش رہتی۔

اس کے پاس بولنے کے لیے لفظ نہیں تھے۔ وہ ٹکر، ٹکر سب کو دیکھتی رہتی۔

وہ بھلا کیا بولتی.....؟ کیسے بولتی..... بولنے کو کچھ بھی تو نہیں رہا تھا۔

لیکن ہاں یہ بات سب نے نوٹ کی تھی کہ جب بھی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کر روتی اور روتی رہتی۔

☆☆☆

صدمے دو طرح کے... ہوتے ہیں ایک وہ جو انسان کے وجود کو ریزہ، ریزہ کر دیتے ہیں۔ امید اور آس سب توڑ دیتے ہیں، اعصاب شل اور زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور صدمے کی دوسری قسم انسان کو کھڑا کر دیتی ہے اسے ہمت دیتی ہے، اس سے کہتی ہے پیچھے مڑ کر مت دیکھ، آگے دیکھ، قدم اٹھا کر کچھ کر.....

اور گھٹنوں میں سر دیے روتے ہوئے وہ بھی اکثر یہی سوچتی مجھے کچھ کرنا ہے، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا ویسے بھی پیچھے اس کے لیے ایک قبر تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی، دو دن پہلے اس کے ہاں بیٹی نے جنم لیا تھا۔ ننھی، منی، گلابی سی معصوم بیٹی نے.....

''یہ گناہ کے بدلے فرشتے کہاں سے آجاتے ہیں۔'' وہ گود میں بیٹی کو لیے تکتی رہتی اور اپنے آپ سے باتیں کرتی۔

بیٹی تو وہ بھی تھی۔ معصوم، حافظ، فرمانبردار بیٹی..... بیٹی تو باپ کا مان ہوتی ہے..... بھائیوں کا فخر ہوتی ہے اور وہ.....

☆☆☆

''اماں یہ کتنی پیاری ہے ناں ابوبکر نے ننھی سی بہن کو گود میں لیتے ہوئے اشتیاق سے کہا تھا۔

''ہاں، ہاں بہت پیاری ہے، بس اسے سائیکل پر بٹھا کر ذرا صحن کی سیر کراؤ..... میں کھانا پکالوں۔''

ملانی جی جلدی، جلدی، آٹا گوندھنے لگ جاتیں اور دونوں بھائی اسے سائیکل پر چکر دلاتے، ایک کلثوم کو پکڑ لیتا اور دوسرا سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیتا۔

اور وہ مزے سے صحن میں سائیکل پر بیٹھی چکر لیتی رہتی۔

کبھی وہ دونوں بھائی اس کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلتے، وہ جلدی، جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھپ جاتی اور جب دونوں بھائی آوازیں دیتے، دیتے تھکنے لگتے تو وہ چھت پر بنے چھوٹے سے کمرے سے ہنستا ہوا اپنا چہرہ دکھاتی اور کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ دونوں بھائی اسے دیکھ کر خوش ہو جاتے۔ اسے گود میں اٹھا لیتے اور پھر ملانی جی ان تینوں کی نظر اتارا کرتیں۔

لیکن ایک دن وہ چھت پر ایسی گئی کہ نہ وہ بھائیوں کو منہ دکھانے کے قابل رہی اور نہ ہی ملانی جی نے اس کی نظر اتاری..... ہاں جب سب کو پتا چلا کہ وہ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ چھپ کر چھت پر چلی جاتی ہے، اس کو ڈر بھی نہیں لگتا..... اس دن..... دونوں بھائیوں نے اس کو بہت مارا، ڈنڈے، گھونسے، لاتیں، ملانی جی بچانے آئیں تو ان کو بھی زور سے دھکا دیا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا ناپاک وجود ویرانے میں پھینک کر آئے۔ اور اب ایک اور بیٹی.....

وہ بھی تو بیٹی تھی..... مولوی عبدالشکور کی بیٹی.....

یہ بھی تو بیٹی ہے، اس کا دل چاہتا اس ننھی بچی کا گلا گھونٹ دے لیکن وہ ٹکر، ٹکر اسے دیکھتی رہتی۔

وہ جب سے اس ادارے میں آئی تھی خاموش رہتی، اس نے کبھی کسی سے بات نہیں کی تھی ادارے کی سربراہ فاطمہ باجی اس سے بیزار ہو چکی تھیں۔

میڈم اکثر آتیں سب ہی ان کا انتظار کرتے تھے کیونکہ وہ سب کے لیے تحفے، پھل اور بہت ساری چیزیں لاتی تھیں۔ لیکن کبھی وہ ان کے آنے پر بھی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرتی، وہ خود اس کے پاس آتیں..... اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھتیں۔

''بیٹی کیسی طبیعت ہے؟''

وہ بیٹی تو کہتیں لیکن ان کے ہاتھوں میں ممتا کا لمس نہیں ہوتا..... ان کے لہجے میں گرمی اور حدت نہ ہوتی۔

کلثوم خاموش رہتی.....

پھر ایک دن فاطمہ باجی نے اس سے کہا۔ ''اب اس کی بیٹی بھی ہو چکی ہے، وہ صحت مند ہے، لہٰذا اسے یہاں سے جانا ہوگا۔'' وہ چپ رہی..... وہ کیا بولتی؟ اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لیکن پتا نہیں کیسے اس روز بھی مسز علی آ گئیں۔

''بیٹی یہ تمہیں اب نہ۔ تمہارے گھر بھیجنا چاہتے ہیں، تمہارا گھر کہاں ہے؟'' انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''گھر.....؟'' اس کے لب کپکپائے۔ کون سا گھر..... وہی گھر جہاں سے وہ بے رحمانہ پیٹ کر نکالی گئی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ بس پھوٹ، پھوٹ کر رو دی مسز علی خاموش بیٹھی رہیں، بس اسے رونے دیا۔ دل بھر کر..... یہاں تک کہ اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس کی زبان موٹی اور کھردری ہو گئی اور چادر کا پلو گیلا ہو گیا۔

''تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اپنی بیٹیوں کی طرح رکھوں گی، یہ لوگ آج یا کل تم کو جانے کو کہہ دیں گے۔ پھر تم اس ننھی جان کو لے کر کہاں در، در بھٹکتی پھرو گی میری کوئی بیٹی نہیں ہے، میں تم کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گی۔ وہ خاموش رہی اور اس کا سامان مسز علی کی گاڑی میں رکھ دیا گیا۔

اس کی بیٹی ان کی گود میں تھی۔

''کیا نام رکھا تم نے اس کا.....'' مسز علی نے بچی کے گلابی گالوں کو آہستہ انگلیوں سے سہلاتے پوچھا۔

''کوئی نام نہیں رکھا.....'' اس کا لہجہ آزردہ تھا۔

''اماں یہ چھوٹی، چھوٹی سی چوڑیاں کس کی ہیں۔'' کلثوم نے سونے کی دو چھوٹی چوڑیوں کو اپنی تین انگلیوں میں پھنساتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹا یہ سونے کی چوڑیاں تمہاری ہیں..... مولوی صاحب نے بہت محبت سے جب تم پیدا ہوئی تھیں ناں تو بنوائی تھیں، کتنی دفعہ اچھا برا وقت آیا ایک دفعہ تو میں نے مولوی صاحب سے کہا، آپ کی طبیعت بہت خراب ہے اور آپ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے علاج نہیں کروا رہے ہیں ان چوڑیوں کو بیچ دیں تو مولوی صاحب خفا ہو گئے، کہنے لگے خبردار جو آپ نے ایسی بات کہی یہ میری بیٹی کی چوڑیاں ہیں..... ان کو کبھی ہاتھ نہ لگانا..... تو بیٹا پھر میں نے سنبھال کر رکھ لیں، اب تم تو بڑی ہو گئی ہو..... یہ میں نے اپنی نواسی کے لیے رکھی ہیں..... جب خیر سے اللہ پاک تمہارا نصیب کھولے گا اور تمہاری شادی ہو گی تو تمہاری بیٹی کو دوں گی یہ چوڑیاں.....''

ملائی جی نے اس کے ہاتھ سے چوڑیاں لے کر حفاظت سے الماری میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اللہ میری بیٹی.....'' اور وہ شرم سے لال ہو گئی۔

''اور تمہارا کیا نام ہے؟'' کلثوم جو اپنی بیٹی کی خالی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے ماضی کے جھولوں میں جھول رہی تھی جیسے حقیقت میں واپس آ گئی۔

''میرا نام..... پتا نہیں..... پہلے میں بیٹی تھی، بہن تھی، اب میں خاک ہوں.....'' اس کا لہجہ بھیگنے لگا۔

''کیوں بھئی کیوں خاک ہو، اتنی پیاری چاند سی تمہاری بیٹی اور تم تو خود بھی چاند کا ٹکڑا ہو ماشاء اللہ بس میں نے فیصلہ کر لیا آج سے اس ننھی پری کا نام ہے گلاب..... ٹھیک ہے، ہے بھی تو گلاب کی طرح.....'' مسز علی نے گھر میں داخل ہو کر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور تم چاند ہو..... آج سے تم میرے گھر کا چاند ہو۔''

اور پھر انہوں نے واقعی اس کا بہت خیال رکھا، ننھی گلاب کو سنبھالنے کے لیے ایک ملازمہ رکھ دی۔ مسز علی نے اسے چھت دی، محبت دی، مان دی وہ تو ان کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اب سب اسے چاند کہتے تھے۔

مسز علی کی کوئی بیٹی نہیں تھی یہ انہوں نے سچ کہا تھا۔ لیکن ان کے پاس بہت ساری لڑکیاں تھیں۔

لاوارث، زمانے کی ٹھکرائی ہوئی، مجبور، پریشاں، تنہا، گھر سے بھاگی ہوئی، گھر سے نکالی ہوئی بیوہ یا بے آبرو.....

وہ سب دیکھتی لیکن خاموش رہتی، وہ سمجھ چکی تھی وہ اصل میں کیا کرتی ہیں؟ لیکن وہ خاموش رہتی۔

وہ سب لڑکیاں بہت خوش رہتیں، اچھے کپڑے پہنتیں، سلیقے سے میک اپ کرتیں، ہنستی بولتیں، رات کے اندھیروں میں اکثر گم ہو جاتیں لیکن سورج کی پہلی کرن وہ کاشانۂ نسا میں دیکھتیں۔

کاشانۂ نسا مسز علی کے گھر کا نام کاشانۂ نسا تھا۔

چھ ماہ میں جب اس کی طبیعت سنبھل گئی اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تو ایک دن اس نے اپنے دل کا بوجھ ان کے سامنے ہلکا کر دیا۔ انہیں الف سے لے کر ی تک سب سنا دیا اور پھر واپسی کا ارادہ کیا۔

مسز علی نے بہت خاموشی اور تحمل سے اس کی کہانی سنی اور کہا۔

''تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ لیکن یاد رکھنا اس گھر میں رہنے والی ہر لڑکی کی ایک کہانی ہے، ان میں سے کئی گھروں کو واپس لوٹیں لیکن نکال دی گئیں جو دروازے ایک دفعہ بند ہو جائیں تو وہ پھر نہیں کھلتے، ان دروازوں کو کھٹکھٹانے کی اجازت نہیں..... ان دروازوں کے پیچھے تم جیسی لڑکیوں کے سوئم اور چالیسویں ہو چکے..... ہوتے ہیں... تم چار دیواری اور چادر میں لپٹی ہوئی پلی تھیں لیکن تمہارے ہی گھر میں تمہاری عصمت کی چادر کو تار، تار کر دیا گیا اور تم کو اور تمہارے ماں، باپ کو پتا تک نہیں چلا..... جو کھیل تمہارے ساتھ کھیلا گیا وہ گناہ تھا گناہِ کبیرہ..... اب تم باہر نکلو گی تو ہر قدم پر ایک کمال تمہارے لیے دوشالہ (بہت قیمتی شال) لیے کھڑا ہو گا..... وہ پہلے تمہارے سر سے عصمت کی چادر اتارے گا اور اس چادر کے بدلے تمہارے کندھے پر دوشالہ ڈال دے گا..... یہاں پر قدم، قدم پر کمال کھڑے ہیں کس، کس سے بچو گی، اس ایک بچی کو تو شاید سنبھال لو گی لیکن بہت سارے گناہوں کا بوجھ کیسے اٹھاؤ گی؟'' انہوں نے ذرا توقف کیا۔

''میری بات مانوں ایک دفعہ اپنے اندر سے مولوی عبدالشکور کی بیٹی کو نکال دو، اپنے اندر کی عورت کا گلا گھونٹ دو۔ ضمیر کو خاموش کروا دو..... ماضی کو کوڑے دان میں ڈالو..... لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو..... میری بات پر یقین کرو میں نے بہت دنیا دیکھی ہے، ایک دفعہ بند ہوا دروازہ کبھی نہیں کھلتا۔ جس پر دروازہ بند ہوتا ہے اس کی قبر کھود دی جاتی ہے۔ اور اس قبر پر بھی گھر والے صرف نفرت سے تھوکتے ہی ہیں' میں... اب تم کو سہارا دے رہی ہوں، تم یہاں آرام سے رہو..... گلاب آرام سے رہے گی، بڑے سے اسکول میں پڑھے گی، محفوظ ہو گی..... بس بدلے میں تم کو ہر رات نیا نام رکھنا ہو گا.....'' مسز علی کا لہجہ سرد اور الفاظ بے حد سخت تھے۔ لیکن وہ سمجھ گئی اور پھر خود ہی اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

دور کہیں سے اذان کی آواز آ رہی تھی لیکن آج اذان کی آواز سن کر وہ روئی نہیں..... کانوں پر ہاتھ نہیں رکھا، بڑے سکون سے اذان کی آواز سنی اور پھر وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

وہ کم عمر لڑکی پندرہ سال کی عمر میں وہ ایک بچی کی ماں تھی۔

اس کے چہرے پر بلا کا سوگوار حسن تھا۔ معصومیت تھی..... آنکھوں کی اداسی اس کا اضافی حسن تھا۔ گھٹنوں کو چھوتے بال..... وہ کائنات کی سب سے حسین اور کم عمر لڑکی تھی۔ اور مسز علی کو اس سے بہت سی امیدیں تھیں۔

☆☆☆

''دیکھو چاند یہ بھی ایک کاروبار ہے.....'' انہوں نے اس کا نرم و ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''کاروبار.....؟ یہ کیسا کاروبار ہے.....'' وہ تڑپ اٹھی۔

مسز علی نے اس کی ٹریننگ کی ذمے داری خود لے لی۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اسے ہر کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ اسے انگریزی زبان سکھائی گئی۔ ماڈرن دنیا کے آرائش و زیبائش کے طریقے بتائے گئے۔ نازو انداز..... نخرے..... ادائیں..... مسکراہٹیں..... معصومیت، حسن، ادائیں، طرح داری، بہترین لباس وہ چھا گئی۔ جب پہلی دفعہ وہ جانے لگی تو وہ جز بز تھی..... آخر تھی تو شریفوں کا خون ناں.....

مسز علی نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور پھر مسکراتے ہوئے اسے محبت سے سمجھایا۔

''دیکھو کال گرل اور طوائف میں فرق ہوتا ہے، طوائفیں سب کو میسر ہوتی ہیں، ایک ٹھیلے والے سے لے کر ایک بزنس مین تک ان کے پاس چلا جاتا ہے۔ لیکن کال گرل کا واسطہ مہذب اور اچھے مردوں سے پڑتا ہے اور وہ بھی کبھی، کبھی..... بس یہ بھی ایک کاروبار ہے۔ باہر بھیڑیے کھڑے ہیں تمہارا گوشت نوچنے کے لیے لیکن یہاں تم کو چھت اور ہر قسم کا عیش اور تحفظ میسر ہے۔ ان بڑے لوگوں کے پاس جاؤ گی جو معاشرے میں اثر رسوخ رکھتے ہیں تو تمہارے بھی تعلقات بنیں گے..... جو آگے چل کر تمہارے کام آئیں.....'' چاند (کلثوم) نے سر جھکا کر اپنی رہبر کی بات سنی۔ وائیں

آنکھ کے کونے میں اٹکا آنسو بے دردی سے پونچھا اور کھڑی ہوگئی۔

گلاب اسکول جانے لگی تھی اور اس کی اپنی زندگی آرام دہ بستر پر مچلتا سانپ بن گئی۔

اب کلثوم سارے شہر میں چاند کے نام سے مشہور تھی۔ بڑے، بڑے امرا اور عہدیداروں کے پاس جاتی تھی۔ کم عمری میں یہاں آئی تھی تو ہر چیز جلدی سیکھ لی۔

مسز علی اب بیمار رہنے لگی تھیں، چاند (کلثوم) نے ان کا سارا کاروبار سنبھال لیا تھا بلکہ نئی آنے والی لڑکیوں کو ٹریننگ دیتی اور کس کو کہاں بھیجنا ہے اس کا بھی وہی فیصلہ کرتی۔

گلاب، گلاب کے پھول کی طرح حسین تھی، نرم و نازک سی گلاب میٹرک میں تھی اور چاند (کلثوم) کو اس کی پڑھائی کی ہر وقت فکر رہتی کیونکہ وہ جانتی تھی لاعلمی کتنی بری چیز ہوتی ہے۔

لڑکیوں کو تعلیم یافتہ اور زمانے کے رنگ ڈھنگ سے ایک حد تک واقف ضرور ہونا چاہیے ورنہ زمانہ جو ان کے ساتھ کرتا ہے۔ چاند (کلثوم) کے پاس ایک حقیقی مثال تو وہ خود تھی۔ وہ اس طرح خوش رہتی... جیسے اس کو کوئی غم ہی نہیں ہو..... لیکن اس کا دل مولوی عبدالشکور گھر میں ہی بھٹکتا رہتا۔

لیکن اس کو ماسک لگانا آ گیا تھا، وہ چہرے پر اطمینان سکون اور بے پروائی کا ماسک چڑھائے رکھتی..... اور یہ ماسک اس کی ضرورت بھی تھا اور مجبوری بھی۔

☆☆☆

رات بھر وہ اس اسرار بھری عورت میں گم ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ بے چین سا تھا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کی سرخ آنکھیں اور سوگوار چہرہ سب سے الگ تھا۔ اسد دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس نے اس کا نام کیوں نہیں پوچھا۔

وہ غلط ہی بتاتی..... لیکن پکارنے کے لیے کوئی نام تو ہوتا۔

''ہم کو اجازت دیجیے صاحب، ہمارا اور آپ کا ساتھ رات کے اندھیرے تک ہی تھا، صبح کی روشنی ہمارے لیے نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جانے کی اجازت طلب کی.....

اسد نے بے ساختہ کہا۔

''اپنا نام تو بتا دو..... چاہے غلط ہی تم کو یاد کرنے کے لیے.....'' اس کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

''میرا نام.....'' وہ ہنسی۔

جب وہ ہنسی تو ایک نائیکہ ہی لگی ''ہمارے پیشے کا اصول ہے کہ ہم اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے لیکن تم کو.....'' وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب آئی..... اس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھوں سے دباؤ ڈالا ایک پر اسراری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''تم کو اسد کمال..... ہاں تم کو میں آج پہلی بار اپنا اصلی نام ضرور بتاؤں گی۔ میں کلثوم ہوں مولوی... عبدالشکور کی حافظہ بیٹی..... جس کو تم نے کوٹھے پر بٹھا دیا۔ نائیکہ بنا دیا۔''

اسد کمال کو لگا جیسے اس کا پورا وجود فالج زدہ ہوگیا ہو۔ اس نے خوف زدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا..... وہی چہرہ وہی لب، وہی معصومیت لگ نہیں رہا تھا کہ سولہ سال سے ہوس کے بھیڑیے اس کے وجود کو نوچ رہے ہیں۔

''میں سوچ رہی تھی تم نے میری اوقات بدل دی، مجھ کو مولوی کی بیٹی سے طوائف بنا دیا۔ پوری رات، تم کو میری کوئی ادا، کوئی بات، کوئی انداز یاد نہیں آیا۔ تم کو میری آنکھوں کا دکھ اور میرے ہاتھوں کی نرماہٹ نے کچھ احساس نہیں دلایا۔ اسد کمال تم مرد ہو..... اور میں ایک عورت ہوں، عورت اپنی زندگی میں آئے پہلے مرد کو کبھی نہیں بھولتی اور مرد اس طرح بھولتا ہے کہ اس کے پورے وجود کو تھوک دیتا ہے۔ کسی نالی میں کسی گٹر میں تھوک دیتا ہے اور پھر وہ عورت گندے پانی میں بہتی ہوئی کسی اور گٹر میں گر جاتی ہے۔ بلکہ خود ایک گٹر بن جاتی ہے۔''

اسد کمال کا وجود لرز رہا تھا۔ لیکن وہ اسی طرح چپا،

چبا کر بولتی رہی۔ اس عورت نے تھوڑی دیر پہلے بستر میں اسے مات دی تھی اور اب سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں جانتی تھی اسد کمال تم جیسے مرد ایک عورت پر گزارہ نہیں کر سکتے۔ تم ایک نہ ایک دن میرے پاس آؤ گے، سولہ سال سے میں تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ مجھے تم کو یہ بھی تو بتانا تھا کہ تم جو میرے وجود میں چھوڑ کر گئے تھے وہ کون ہے؟ وہ کیا ہے، لڑکی یا لڑکا.....''

اسد کی زبان گنگ اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور وہ حسرت زدہ آنکھوں سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا، جسے اس نے بہت آسانی سے پامال کیا تھا..... ایک بار نہیں بار، بار پامال کیا تھا۔

جس کی معصومیت کو یاد کر کے اکثر دوستوں کی محفل میں قہقہے لگایا کرتا تھا۔ آج وہ عورت ایک معصوم، بھولی بھالی لڑکی نہیں..... بلکہ زمانے کی برتی ہوئی ایک ایسی... پُراعتماد عورت ہے، جس کے سامنے کوئی طوفان نہیں ٹھہر سکتا۔

اسد کمال ہق دق اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اس کا وجود کپکپا رہا تھا، دماغ میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا یہ بے پروائی سے سامان سمیٹتی عورت نہیں بلکہ بارود سے بھرا ٹرک ہے اور کسی بھی لمحے اس کمرے میں ایک دھماکا ہوگا اور اس کا وجود پاش، پاش ہو جائے گا۔

''اسد کمال.....'' بیگ کی زپ لگاتے، لگاتے وہ پلٹی..... ''میں دلہن بن کر کسی کے پاس نہیں جاتی لیکن جب۔ جب تمہارا دوست میرے پاس آیا بکنگ کے لیے تو میں پہچان گئی اور جب کسی بات کے دوران۔ تمہارا نام لیا تو میرا وجود ناچ اٹھا۔ اس دن کے لیے میں نے بہت انتظار کیا ہے سولہ سال اسد کمال سولہ سال..... میں کسی کے لیے نہیں کھڑی ہوتی لیکن تمہیں دیکھتے ہی پہچان گئی تھی کیونکہ مقتول کبھی اپنے قاتل کو نہیں بھولتا۔'' وہ رکی۔

''مرد بادشاہ ہوتا ہے اور جب وہ اپنی پامال کی ہوئی عورت کو دوبارہ ایک بھاری قیمت دے کر خریدتا ہے تو بہت چھوٹا ہو جاتا ہے۔ تم بھی چھوٹے ہو گئے، بہت چھوٹے ہے ناں..... خیر اسد کمال اب میں چلتی ہوں تمہارا اور ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔''

''رکو.....'' وہ کمرے سے نکل ہی رہی تھی کہ پیچھے سے اسد کمال نے آواز دی۔

وہ رک گئی مگر پلٹی نہیں۔

''وہ بچہ ہے یا بچی..... کہاں ہے؟''

''وہ لڑکی ہے.....'' کلثوم نے جھٹ سے کہا۔ اسد کمال کا جسم زلزلے کی زد میں تھا۔

''اور وہ تمہاری بیٹی ہے اسد کمال..... نہیں..... وہ ہماری بیٹی ہے۔''

''ہماری بیٹی.....؟'' کلثوم کے منہ سے... سرسراتا ہوا نکلا۔ اب کلثوم ایسے ہنسی جیسے ایک نائیکہ ہنستی ہے۔ جیسے ناگن ڈسنے کے بعد..... اس نے اسد کمال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت سرد لہجے میں کہا۔

''وہ بچی کل تمہارے ساتھ تھی اور آج تمہارے دوست کے کمرے میں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسد کمال کو ایسا لگا جیسے ساتوں آسمان اس کے سر پر آ گرے ہوں۔ جیسے وہ پاتال میں گر گیا ہو۔ وہ بھاگ کر کمرے سے نکلا اور زور، زور سے برابر والے کمرے کا دروازہ پیٹنے لگا۔

وہ پاگلوں کی طرح اپنا جسم نوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھر کی ہو گئی تھیں وہ بار، بار اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

وہ رو رہا تھا بند کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ رہا تھا۔

''دروازہ کھولو اندر میری بیٹی.....''

''دروازہ کھولو اندر میری بیٹی.....''

وہ چیخ رہا تھا، رو رہا تھا، کلثوم نے پلٹ کر اسے دیکھا اور کہا۔

''اپنے دوست سے کہنا اسے جلدی بھجوا دے شام کو اس کی ایک اور بکنگ ہے۔'' اور پھر وہ دہلیز پار کر گئی۔

اور اسد کمال بے دم ہو کر اس دروازے کے باہر ڈھیر ہو گیا۔ جس بند دروازے کے پیچھے اس کی بیٹی اس کے دوست کے رحم و کرم پر تھی۔

❁❁❁

پیاسے رنگ

فرح ریاض چیمہ

''کوا باری، باری کنکریاں ڈالتا گیا اور دھیرے، دھیرے پانی گھڑے کے اوپر آ گیا۔ کوے نے جی بھر کے ٹھنڈا پانی پیا اور اڑ گیا۔'' وہ ذرا رکی۔

''نتیجہ..... خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔'' حیا اپنے بیٹے کو ٹیسٹ یاد کروا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ رات کا کھانا بھی بنانے میں مصروف تھی۔ وہ بے حد عجلت میں تھی بلکہ روز ہی ہوتی تھی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا اذان جو بہت ہی فرمانبردار اور سمجھدار بچہ تھا۔ اکثر ایسی باتیں کرتا کہ سننے والا دنگ رہ جاتا کہ آخر دس سالہ بچہ اتنی گہری بات کیسے بول سکتا ہے۔ آج بھی اس نے کچھ ایسا ہی کہہ دیا۔

''لیکن..... امی کوّے نے پانی کیسے پیا..... سارا پانی تو کنکریاں پی گئی ہوں گی، کوا پیاسا ہی رہ گیا ہوگا ناں.....''

پریشر ککر کی سیٹی زور سے بجی اور حیا حیرت سے

اپنے بیٹے کی بات پر غور کرنے لگی۔

"نہیں بیٹا..... ہم نے تو ہمیشہ سے یہی پڑھا ہے کہ کوّے نے جی بھر کر پانی پیا تھا..... اس نے ہمت نہیں ہاری اور اللہ نے اس کی محنت کا صلہ بھی دیا..... چلو اپنا بیگ پیک کرو، مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ تمہارے بابا آتے ہی ہوں گے، ان کے آنے سے پہلے وضو کر کے نماز کے لیے تیار ہو جاؤ..... شاباش جلدی جاؤ میرا اچھا بیٹا....."

"ٹھیک ہے امی جاتا ہوں....."

☆☆☆

"زبردست..... نمک مرچ سب ٹھیک ہے۔ ذائقے دار مٹن قورمہ بنا ہے..... اب ذرا بریانی کا دم بھی کھول دوں..... مہک تو بہت اچھی ہے..... ارے واہ..... کمال کر دیا حیا تو نے..... تو کسی شیف سے کم تھوڑی ہے۔" حیا نے نکھرے، نکھرے چاول دیکھ کر خود ہی اپنے آپ کو خوب سراہا۔

"آج تو شاہ میر انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔ اب جلدی سے کباب بھی تل لوں پھر رائتہ تو میرے بائیں ہاتھ کی مار ہے....." اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

حیا شادی سے پہلے اتنی گھڑا اور پھرتیلی نہیں تھی۔ دن چڑھے جاگنے والی، گھر بھر کی لاڈلی اور ناز، نخرے دکھانے والی خوش شکل سی حیا اپنے آپ میں مگن رہتی۔ یہ سب سلیقہ اور ہنر تو اس نے شادی کے بعد ہی سیکھا تھا۔ شاید یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ سیکھنا پڑا تھا۔ اکثر ہی لڑکیاں شادی کے بعد ہی زیادہ تر گھر داری سیکھتی ہیں۔

"حیا..... شاہ میر اچھا انسان نہیں ہے۔ انسانوں کی عادات اور صفات خاندان کا پتا دیتی ہیں۔ ہماری خالہ نے بھی کٹھن زندگی گزاری ہے خالو کے ساتھ..... بدمزاجی، کرخت رویہ اور عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کو خود پر واجب سمجھنا۔ یہی سب کچھ تو ہیں ان کی خاندانی صفات..... شاہ میر بھی بالکل ویسا ہی ہے۔ تم نہیں سہہ پاؤ گی یہ سب....."

دعا..... حیا کی چھوٹی بہن تھی لیکن بڑوں کی طرح سمجھا رہی تھی۔

"میری پیاری گڑیا تم اتنی فکر نہ کیا کرو..... ہماری معصوم سی خالہ کو ہنر ہی نہیں ہوگا کہ ایسے مردوں کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں۔ میرے پاس ہنر بھی ہے اور پیار کرنے والا دل بھی....." بے حد نرم لہجے میں کہتے ہوئے دعا کی گردن کے گرد بانہیں ڈال کر حیا خوشی سے جھومنے لگی اور دعا کو بھی نہ چاہتے ہوئے مسکرانا پڑا۔

شاہ میر کے بارے میں دعا کا اندازہ کس حد تک درست تھا۔ حیا نے شادی کے اوائل ایام میں ہی دیکھ لیا تھا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے سے کوسوں دور رہتی تھی۔ بھلی چنگی چیز میں بھی نقص نکالنے سے باز نہ رہتا اور اچھے سے اچھے کھانے میں بھی عیب نکالتا رہتا۔ سب سے بڑا عیب اس کی نظر میں یہ ہوتا کہ کھانا حیا کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔

"تم سے اچھا کھانا تو میرے آفس کا باورچی بنا لیتا ہے۔ تمہارے بنے کھانے پر کوئی رنگ ہے نہ روپ....." ہر روز ایسی ہی جلی کٹی سنا کر وہ بیچاری نئی دلہن کا دل دکھاتا اور وہ گھنٹوں کمرے میں بیٹھی روتی رہتی۔

بناؤ سنگار کر کے حیا اور بھی دلکش لگتی آخر کو نئی نویلی جو تھی لیکن شاہ میر کے منہ سے آج تک کبھی تعریف کے دو بول نہ سن سکی۔ وہ اسے نظر بھر کے دیکھتا ہی کب تھا۔ ہر وقت اکھڑا، اکھڑا سا رہتا اور ماتھے پر تیوری کے جیسے مستقل بل پڑ گئے تھے۔ جو بھی دیکھتا یہی کہتا..... چاند اور سورج کی جوڑی ہے، وہ کتنی پیاری تھی، بالکل چاند کی طرح روشن چہرہ اور ٹھنڈے مزاج کی مالک..... جبکہ شاہ میر سورج کی طرح گرم اور ہر وقت اپنے آپ میں ہی جلنے والا۔

دو سال بعد حیا کی گود بھر گئی تھی، خدا نے چاند سا بیٹا دیا تھا اور جب بھی وہ شاہ میر کے تپتے رویے سے پریشان ہوتی تو اذان کی ننھی، ننھی کلکاریاں اس کے

چہرے پر پھر سے مسکراہٹ بکھیر دیتیں۔

ایک اذان کا وجود ہی تھا جس نے حیا کو اس گھر میں جما دیا تھا یا یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ باندھ کے رکھ دیا تھا۔ شاہ میر کا دل جیتنے کے لیے حیا نے خود کو سر سے لے کر پاؤں تک بدل کر رکھ دیا تھا۔ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، اوڑھنا، بچھونا..... ہر چیز میں حیا کی شخصی آزادی ختم ہو چکی تھی۔ اس کا دل جیتنے کے لیے حیا نے ہر وہ کام کیا جو وہ پسند کرتا تھا۔ اور آخر کار اسے جگہ مل ہی گئی تھی لیکن صرف اذان کی ماں کے روپ میں۔ بھلے ہی شاہ میر آج بھی اتنا ہی بدمزاج اور اکھڑ تھا لیکن اب اپنے بیٹے کے سامنے اپنے الفاظ کا چناؤ خوب دیکھ بھال کر کرتا۔ اذان اسے بہت عزیز تھا، وہ اسے دل و جان سے پیار کرتا..... لیکن انوکھی بات یہ تھی کہ اذان اپنے خاندانی اطوار و مزاج سے مختلف تھا۔ دو مختلف چیزوں میں وہی چیز سبقت لے جاتی ہے جو طاقت رکھتی ہو..... مثبت طاقت اور وہ طاقت حیا میں تھی اس کی خوش اخلاقی، محبت کرنے والا دل، منکسر المزاجی شاہ میر کی بدمزاجی اور بد اخلاقی سے کہیں بڑھ کر تھی۔ یہی حیا کی سب سے بڑی طاقت تھی جس محنت اور لگن سے اس نے اپنے گھر کو سینچا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن یہ سنگدل شوہر بھی بدل جائے گا اور وہ بھی اس کی محبت کی قدر کرے گا۔ اسی یقین کو پالتے، پالتے اس نے اپنی زندگی کے بارہ سال اسی انتظار میں گزار دیے تھے..... یہ شکر تھا کہ روپے پیسے کی ریل پیل تھی لیکن دولت ہر چیز کا مداوا نہیں کر سکتی۔ شاہ میر اپنے باپ کے کہے چند جملے ہمیشہ ذہن میں رکھتا جو انہوں نے اس کی شادی سے دو روز پہلے اسے بٹھا کر کہے تھے۔

''دیکھو بیٹا..... بیوی چاہے جتنی حسین ہو، گھڑ ہو یا خدمت گزار..... مگر تم اپنی روایات پر عمل کرتے ہوئے کبھی اسے سر اٹھانے نہیں دینا تم اس کے سر کے تاج ہو تو بس تاج ہی بنے رہنا..... تم سمجھ

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اگست 2021ء کی جھلکیاں

آئینہ ماضی
اردو ادب کا ایک بڑا نام جو وقت کی گرد میں ڈھک گیا

تیغ براں
ایک حسن پرست، مقبول شاعر کا تذکرہ

باحجاب صدر
غیر مسلم ملک کی دیندار صدر جو کبھی فٹ پاتھ پر پتھارے لگاتی تھی

گیت کے میت
فلم نگر کے تین اہم نام جو پاکستان کی پہچان کہلائے

لاوارث
ایک لاچار باپ کی دکھ بھری سچ بیانی جسے بیٹا چھوڑ گیا مگر کیوں؟

اور بھی ڈھیر ساری سچ بیانی، سچے قصے، انوکھے واقعات جو سرگزشت کی پہچان ہیں

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے

رہے ہو ناں....." اور آج شاہ میر اپنی خاندانی روایات یا پھر بوگس روایات نبھانے میں اپنا آپ خود برباد کر رہا تھا۔

"امی میں تیار ہو گیا....." وضو کر کے سر پر ٹوپی پہنے اذان اپنے بابا کا انتظار کرنے لگا۔

"افوہ، آج میٹھے میں تو کچھ بنایا ہی نہیں..... وہ کچن میں مصروف تھی۔ وہ اپنے دس سالہ بیٹے کو بہت پیار سے تکنے لگی۔ خیر کوئی بات نہیں..... کھانا اتنا لذیذ ہے کہ شاہ میر میری تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور میٹھے کی طرف دھیان ہی نہیں جائے گا....." کچن کی شدید گرمی میں کھانا بناتے، بناتے حیا پسینے میں بھیگ چکی تھی۔

"اذان بیٹا..... آپ تیار ہیں.....؟" اپنے بابا کی آواز سن کر اذان چونکنا ہو گیا۔

"جی بابا، میں تیار ہوں....."

سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگی ہوئی، گرمی سے بے حال دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھتے ہوئے حیا اسی وقت کچن سے باہر آئی۔

"آپ نماز پڑھ کر آجائیں، تب تک میں کھانا لگاتی ہوں..... آج ہر چیز آپ کی پسند کی بنائی ہے میں نے، بہت ہی مزیدار....." مگر شاہ میر..... نے حیا کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

"کیا کیا بنایا ہے.....؟" بے حد اترائی ہوئی نظروں سے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ خود کو عطر لگا رہا تھا۔

"جی..... وہ..... مٹن قورمہ بنایا ہے، بریانی، کباب اور رائتہ، سب کچھ بہت ہی لذیذ....." اس نے پھر حیا کو ٹوک دیا اور سوالیہ نگاہوں سے اسے بغور دیکھا۔

"میٹھے میں کیا ہے؟" شاہ میر کے سوال پر حیا نے اپنے سوکھے گلے کو بمشکل تر کیا۔

"کل اذان کا ٹیسٹ ہے ناں اسے پڑھانے میں کافی وقت لگ گیا۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں....." حیا نے جس قدر محنت سے اس کے لیے کھانا بنایا تھا، شاہ میر نے ایک ہی پل میں اس پر پانی پھینک دیا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی تو کرتا تھا، کوئی نہ کوئی کمی ڈھونڈ ہی لیتا۔

"چلو بیٹا نماز کے لیے دیر ہو رہی ہے..... ہماری واپسی تک میٹھا بن جانا چاہیے۔" حیا کی محنت کو سراہے بغیر یا حکم نامہ جاری کر کے وہ اپنے بیٹے کے ساتھ مسجد کی طرف چلا گیا۔ حیا خالی اور خشک آنکھوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی..... جیسے اس کی روشن آنکھوں کے تمام دیپ بجھ چکے ہوں۔

"کیا خاندانی رنگ اتنے پکے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی انہیں کھرچ نہیں سکتا..... اگر رنگ بدنما ہو تو اسے چھپانے کے لیے، دلوں کو لبھانے والا دلکش رنگ کیا جا سکتا ہے۔ نہ جانے کیوں کچھ لوگ خاندانی روایات کو قائم رکھنا سب سے اہم سمجھتے ہیں یا ان کو قائم رکھنا ان کے خون میں ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی بدنما کیوں نہ لگیں۔ میں نے تو خلوصِ نیت سے اس کی خدمت کی تھی۔ اس کی شریکِ حیات ہونے کے ناتے..... صرف ایک باعزت مقام ہی تو چاہا تھا پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا، اسے اپنے بیٹے کی بات یاد آگئی ہو سکتا ہے کہ کوا سچ مچ اتنی محنت کے باوجود پیاسا ہی رہ گیا ہو....."

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا..... خدا محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے، مجھے بھی صلہ ملے گا..... چاہے کسی اور روپ میں ہی سہی....."

حیا خیالوں میں گم تھی کہ اسی لمحے اس کا چاند سا فرمانبردار بیٹا گھر میں داخل ہوا اور فرطِ محبت سے اپنی ماں کے دامن سے لپٹ گیا۔

"امی دیکھیں میں آپ کے لیے کتنی مزیدار مٹھائی لایا ہوں، ہم سب مل کر کھائیں گے۔" اس کے ہاتھ میں گڑ اور خشک میووں سے بنی خستہ مٹھائی تھی۔ شکر تھا کہ اس کا بیٹا ان کی فضول روایات میں نہیں پڑا تھا۔ حیا اپنے سارے غم بھول گئی۔

❁❁❁

بیماری کی جڑ

انعم توصیف

''اللہ..... اللہ!'' لیاقت صاحب آہستہ آواز میں اللہ کا نام لیتے ہوئے کرسی سے لڑھک کر زمین بوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اپنے سینے کے بائیں جانب رکھے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ دل کو پکڑے ہوئے ہوں کہ کہیں وہ سینہ پھاڑ کر باہر ہی نہ آجائے۔ ان کا وجود پسینے سے شرابور تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں انہوں نے اوپر چڑھالی تھیں یا خود ہی اوپر ہوگئی تھیں، یہ کہنا ذرا مشکل تھا۔ دھڑام کی آواز سن کر ان کی بیوی عابدہ بیگم، چھوٹی بہن بٹو اور بیٹا ببلو بھاگتے ہوئے لاؤنج کی جانب بڑھے۔

''بھائی جان..... ! کیا ہوا.....؟'' بٹو نے ان کو زمین پر گرا دیکھ کر دروازے سے ہی آواز لگائی۔

''اصغر..... ! اصغر کو فون..... لگا.....'' عابدہ بیگم نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ببلو کو اپنے دیور کو فون کرنے کو کہا۔

''ایمبولینس..... بھابی پہلے ایمبولنس کو فون..... ہائے میرا پیارا بھائی.....''

''ہائے میرا سہاگ! میں کہیں کی نہ رہی۔'' دونوں

خواتین نے روایتی انداز اپناتے ہوئے رونا شروع کردیا تھا۔ گھر سے باہر جاتی آوازوں کو سن کر کئی لوگ گھر میں آگئے تھے۔ ہر دیکھنے والے کو گمان ہو رہا تھا جیسے لیاقت صاحب دوسری دنیا سدھار چکے ہوں۔

"چچی! ہمت سے کام لیں....." ہمسائے نے آگے بڑھ کر لیاقت صاحب کو ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہا تو عابدہ بیگم اور بٹو کی دہاڑ سن کر وہ آگے بڑھ نہ سکا۔

"کاہے کی ہمت..... میرا میاں نہیں رہا..... تم کہہ رہے ہو ہمت سے....."

"کوئی ہاتھ مت لگانا میرے بھائی جان کو....."

"لو بھئی! بول تو ایسے رہی ہے جیسے چھوت کی بیماری ہو....." محلے کی سب سے مشہور شخصیت رضیہ خالہ نے جل کر کہا۔

"بڑے اچھے انسان تھے....."

"بڑے ہی بے ضرر سے..... اپنے کام سے کام رکھنے والے....."

"کام وام تو اب چھوڑ ہی چکے تھے۔ اصغر نے جو دکان سنبھال لی تھی ان کی....."

"اب تو بس پورا دن یہ ہوتے تھے اور ان کے ہاتھ میں....."

گھر کے اندر ان کے گرد کھڑے مرد اور عورتیں ان کو مُردہ سمجھ کر ان کے بارے میں دل کھول کر گفتگو کر رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے بھائی جان کو.....؟" تیزی سے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اصغر نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بمشکل کہا اور ان کی جانب دوڑا۔ گلی کے نکڑ پر موجود اپنی کریانے کی دکان سے بھاگتے ہوئے آنے میں اسے پانچ منٹ ہی لگے تھے۔

"ایمبولنس..... کسی نے ایمبولنس کو فون کیا؟"

"چاچو! میں نے کردیا ہے۔ مجھے چھپا کی ایمبولنس پر لکھا نمبر یاد تھا۔" ہبلو نے چھوٹا ہونے کے باوجود اس ساری صورتِ حال میں خود پر قابو رکھتے ہوئے بردباری سے کہا۔

لیاقت صاحب بے سدھ پڑے تھے۔ عابدہ بیگم اور بٹو کے رونے کی آواز اب بین میں تبدیل ہو چکی تھی۔

اس سے پہلے کہ اصغر ان کو چپ کراتا، سائرن کی آواز سن کر وہ دروازے کی جانب دوڑا۔

"نہیں..... نہیں لے کر جاؤ میرے بھائی جان کو....." دو رضا کار لیاقت صاحب کو اسٹریچر پر ڈالنے لگے تو بٹو چلائی۔ وہ دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"بی بی! آپ کے بھائی حیات ہیں۔ ہمت سے کام لو۔" ایک رضا کار نے کوفت سے کہا تو بٹو اور عابدہ بیگم نے اپنے نادیدہ آنسو دوپٹے اور قمیص کے دامن سے صاف کیے۔

"ہائے! میرا تو گلا تک سوکھ گیا۔ کم بخت پہلے ہی آجاتے۔ میں تو سمجھی کہ میں بیوہ ہوگئی۔ چل ہبلو! فریج سے ٹھنڈا پانی لا کر پلا۔" اپنے برابر میں بیٹھے ہبلو کے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے عابدہ بیگم نے غصے سے کہا۔ محلے والوں کی دبی، دبی ہنسی ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔

"بٹو تم بھابی کا خیال رکھنا۔ میں اسپتال پہنچ کر فون کردوں گا۔"

ان کے باہر نکلتے ہی محلے والوں نے بھی اپنے، اپنے گھروں کا رخ کرلیا۔

"بھائی! پچھلی بار کی طرح بھائی جان اس بار بھی آجائیں گے ٹھیک ہو کر..... بے فکر رہو۔ فضول میں اتنا گلا پھاڑا میں نے۔" بٹو نے بیزاری سے کہا۔

"پچھلی بار....." ہبلو نے اتنا سنا اور جس جگہ لیاقت صاحب گرے تھے۔ وہاں کا رخ کیا۔ دو منٹ بعد ہی وہ اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اس کا باپ کیوں بے ہوش ہوا تھا۔

☆☆☆

"میرے بھائی جان کیسے ہیں.....؟" شعبۂ حادثات کے باہر کھڑا اصغر وارڈ بوائے کو کمرے سے باہر آتا دیکھ کر اُن کی طرف لپکا۔

"آپ یہ درد کا انجکشن لے کر آئیں....." اصغر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ایک پرچہ اس کی جانب بڑھایا۔

اسپتال آکر ایک انجکشن لگتے ہی لیاقت صاحب کو "معجزاتی طور" پر ہوش آچکا تھا۔ وہ کوشش کرنے کے

باوجود بھی اب بے ہوش نہیں ہو پا رہے تھے۔ البتہ ہلکی آواز میں ڈاکٹر کی باتوں کا جواب دے کر وہ خود کو باور کرانا چاہ رہے تھے کہ ان کو دل کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے۔ ان کی کیفیات جان کر ڈاکٹر نے نرس سے کچھ کہا۔ چند سیکنڈز بعد نرس ایک گولی لے کر وہاں آئی اور لیاقت صاحب کو کھلا دی۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے ان کا کاندھا تھپتھپایا۔

"میرے دل میں بہت درد ہے ڈاکٹر صاحب۔" ڈاکٹر کو آگے بڑھتا دیکھ کر لیاقت صاحب بیماری بھول کر زور سے چلّائے۔ ڈاکٹر نے سر جھٹکتے ہوئے پرچے پر کچھ لکھا اور آگے بڑھ گیا۔ لیاقت صاحب کے اطمینان کے لیے ان کے تین چار ٹیسٹ کروائے گئے تھے۔ جس پر وہ خاصے مطمئن دکھائی دیے۔

☆☆☆

تین گھنٹوں سے اصغر بیچارہ وارڈ کے باہر پریشان حال بیٹھا تھا۔ بڑے بھائی نے اسے باپ بن کر پالا تھا اور اب وہ بھی اولاد بن کر ان کی خدمت کرتا تھا۔

"اللہ میرے بھائی جان کو سلامت رکھنا۔" آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے نم آنکھوں سے اس نے بنا لب ہلائے دعا کی۔ ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے ڈاکٹر کی ہدایت پر وارڈ کے اندر بلا لیا گیا۔

"آپ کے بھائی اب بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔ یہ دوائیاں ہم نے لکھ دی ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر وہ دل کا مسئلہ....." اصغر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کے بھائی کو کوئی دل کا مسئلہ نہیں ہے۔ گیس کی وجہ سے یہ درد اٹھا تھا۔ اور پھر بے ہوشی بھی جانے کیسی تھی جو..... خیر کھانے پینے میں احتیاط کروائیں۔ چہل قدمی کی عادت ڈلوائیں۔" ڈاکٹر کی بات سن کر لیاقت صاحب دل مسوس کے رہ گئے۔

☆☆☆

"رب کا شکر ہے جو آپ گھر آ گئے۔ ورنہ ہم تو سمجھے تھے بس اب آپ کے مرنے کا ہی کھانا کھائیں گے۔" عابدہ بیگم نے اپنی بے تکان بولنے کی عادت سے مجبور ہو کر کہا۔

"بھائی جان! پتا ہے میں اتنا روئی کہ....."

"ہاں..... اوہ تو مجھے پتا چل ہی رہا تھا....."

"کیا مطلب؟" وہ دونوں ایک ساتھ بولیں۔

"کچھ نہیں۔ تم دونوں کھانا لگاؤ مجھے بھوک لگی ہے۔"

"کھانا تو ہم کھا ہی لیں گے۔ لیکن بھائی جان! آپ یہ بتائیں کہ جس وقت آپ بے ہوش ہوئے آپ اس وقت کیا کر رہے تھے؟" بلو کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اصغر نے سختی سے پوچھا تو لیاقت صاحب کی تو سٹی ہی گم ہو گئی۔

"وہ..... میں..... وہ..... مجھے یاد نہیں آ رہا۔" انہوں نے بھرپور اداکاری کی۔

"آپ دماغ پر زور نہ ڈالیے۔ میں دکھا دیتا ہوں۔" اصغر نے ہاتھ میں پکڑا موبائل بھائی کے سامنے کیا جس پر یوٹیوب چینل پر ایک ویڈیو چل رہی تھی۔ جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "دل کا دورہ پڑنے کی علامتیں۔"

"ابھی کچھ دن پہلے ہی پھیپھڑوں کی خرابی کی علامتیں دیکھ کر بھی ہم سب کی دوڑیں لگوا دی تھیں آپ نے اور اب....."

"اصغر.....! اپنے بھائی پر شک کرے گا اب تو....."

"مجھے شک نہیں یقین ہو گیا ہے اب..... یہ ویڈیوز دیکھ، دیکھ کر آپ وہم کے مریض بن چکے ہیں۔ پورا دن بس موبائل..... کل سے آپ میرے ساتھ دکان پر چلیں گے۔"

"میری عمر کہاں ہے اب.....؟"

"میں نے آپ کے آرام کے لیے اپنے اوپر کام کی ذمے داری لی تھی۔ اس لیے نہیں کہ آپ یہ سب کریں۔ خیر ڈاکٹر نے آپ کو ویسے بھی چہل قدمی کا کہا ہے۔ گھر سے باہر نکلیں گے۔ تب ہی چہل قدمی ممکن ہے۔"

"تمہیں پتا نہیں ہے۔ ایک منٹ لگتا ہے انسان کو مرنے میں....."

"بلو! یہ فون اٹھا اور ابھی کے ابھی اس "بیماری کی جڑ" کو بیچ آتے ہیں....." اصغر نے آنکھ مارتے ہوئے بلو سے کہا اور موبائل فون اٹھا کر وہ دونوں کمرے سے باہر نکلنے لگے۔

"ارے سنو تو سہی....."

لیاقت صاحب ان دونوں کو آوازیں دیتے رہ گئے اور وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

صراطِ عشق

دلشاد نسیم

قسط نمبر 2

موجِ صبا ، اے جانِ سحر میں یہاں پہ ہوں
تُو آ کے میرے دل میں اتر میں یہاں پہ ہوں
کیوں بے کلی سے پھر رہا ہے تُو گلی گلی
اے آسماں کے چاند اتر میں یہاں پہ ہوں

انسان کی خود مختاری... اس کے عقلِ کل ہونے کا غرور بسا اوقات فریب کے تانے بانے بُننے لگتا ہے... اور یہ تانے بانے ریشم کے نہیں , مکڑی کا جال ہوتے ہیں... مگر اس بات کو سمجھنے تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہو...

"صراطِ عشق" ایسے ہی خود ساختہ، فریبی تانوں بانوں سے بندھی ایک کہانی ہے... جو کہیں کہیں سے سچ بھی ہے اور کہیں پر زیبِ داستاں کے لئے کورے کاغذ پر رنگین لفظوں سے کشیدہ کاری کرنے کی جسارت بھی کی ہے...

یہ ارادوں اور خوابوں کے ٹوٹنے کی کہانی ہے...

محبت میں جینے اور محبت میں مرمٹنے کی کہانی...

محبت کی اگلی حد... جب محبوب پاس نہیں مگر آنکھ اس کے خواب دیکھنے لگتی ہو... وہ کہاں ہے کس حال میں ہے، جاننے لگتی ہو...

ممتا کی آفاقی محبت... دنیاوی محبوب کی فرقت کی کسک... کچھ ملنے اور بہت کچھ کھونے کا المناک قصہ ہے... یہ داستانِ عشق...

اس پل صراطِ عشق پہ لایا ہے مجھ کو دل
اب پھونک پھونک کر مجھے رکھنا ہے ہر قدم

pklibrary.com

pklibrary.com

ارزش کے پاس کوئی اور حل نہیں تھا۔ اس کو دیر بدیر اس پھندے میں سر دینا ہی تھا۔
''باؤ جی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے تھوڑی سی آزادی چاہیے میں روم جانا چاہتا ہوں۔ اٹلی، پیرس، یہ میرا خواب ہے۔''
''تو بیوی کے ساتھ جانے میں کیا مسئلہ ہے؟''
''بے جی..... بیوی ساتھ ہو تو کئی لحاظ سے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ابھی تو میں دوستوں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں اور دوستوں کے ساتھ تو کہیں بھی رہنے، کچھ بھی کھانے کا مسئلہ نہیں ہوتا۔''
''ارزش ٹھیک کہہ رہا ہے حمیدہ بیگم۔''
ارزش کے سینے سے جیسے بھاری پتھر اترا۔ اس نے آسودہ سانس لی اور مسکرایا۔
ناشتے کے دوران وہ بہت ہلکا پھلکا رہا۔ واپسی پر اس نے گھر سے کار نکالی اور ایک جگہ رک کر کال ملائی۔
''ہیلو السلام علیکم ماموں جان۔ جا رہا ہوں بلکہ راستے میں ہوں۔''
''خیر سے جاؤ۔'' ولایت احمد نے کہا۔
سامنے چائے کے چھوٹے، چھوٹے گھونٹ بھرتی نین تارہ کو پتا چل گیا کہ یہ کال ارزش کی ہے..... اس نے بے نیازی دکھانی چاہی اسی اداکاری میں اس نے گرم چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر لیا۔ گرم چائے زبان ہی نہیں اس کے حلق تک کو جلا گئی۔ اس نے اس تکلیف کو بھی حلق میں اتار لیا۔
فون بند ہوا۔ ارزش نے غیر ارادی طور پر نین تارہ کو کال ملا دی۔
''ارزش کی کال ہوگی۔ واپس اکیڈمی جا رہا ہے ناں۔''
ولایت احمد نے کہا۔ نین نے کال اٹینڈ کر لی۔
''ہیلو!''
''شکر ہے تم نے فون سن لیا۔ ورنہ میں سوچ رہا تھا شاید تم کال بھی نہیں سنو گی۔''
''ناشتا کر رہے ہیں ہم سب۔ بابا بھی اور امی بھی۔''
''اوہ تو سب ساتھ بیٹھے ہیں۔''
''جی۔''
رضوانہ اور ولایت بظاہر نین تارہ کو دیکھ نہیں رہے تھے مگر دراصل دیکھ ہی رہے تھے۔ پوری توجہ اسی کی طرف تھی۔
''اب تو ناراض نہیں ہو ناں۔''
''نہیں۔''
''میں نے سوچا کال کر کے جانے کا بتا دوں ورنہ تم منہ بسور کے بیٹھی رہو گی۔'' ارزش کا جی چاہا شرارت سے کچھ اور کہے لیکن اس نے سوچا سب کے ساتھ بیٹھ کر وہ ہوں، ہاں ہی کرتی رہے گی۔ بہتر ہے فون بند ہی کر دے۔
''اچھا خدا حافظ۔''
''خدا حافظ۔''
نین تارہ بھی یونی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ جلدی میں تھی۔ کرسی سے اٹھتے، اٹھتے اس نے باپ کی یہ بات سنی۔
''کل بھائی جی کہہ رہے تھے اکیڈمی کے بعد رخصتی کر دیں گے۔''
رضوانہ کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے اور نین تارہ کا چہرہ سپاٹ۔
☆.....☆.....☆
ارزش اکیڈمی پہنچ گیا۔ عبداللہ اگلے دن آیا۔ اکیڈمی میں قرآن خوانی کے بعد دعا کا اہتمام تھا۔ سب افسردہ

تھے۔ حتیٰ کہ آکاش پر چمکتا چاند بھی اس لیے جاتی تاریخوں والا چاند ملگجا، اداس اکیڈمی کے ہر فرد کی طرح۔

''عبداللہ یار۔ زندگی یہاں ختم تو نہیں ہو جاتی ناں۔'' ارزش نے اسے حوصلہ دینے کی خاطر کہا۔

''یہ جو حادثے ہوتے ہیں ناں اسپیڈ بریکر کی طرح ہوتے ہیں۔ ہماری بھی دوڑتی بھاگتی زندگی کی گاڑی کو ایک لمحہ رک کر سنبھلنا ہوتا ہے۔ اور پھر وہی رفتار، وہی بھاگ دوڑ۔'' متین الزماں نے بہت متانت سے زندگانی کا فلسفہ بیان کیا۔

''کبھی کبھی اسپیڈ بریکر گاڑی الٹ دیتا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' ارزش نے کہنا شروع کیا۔

''تیری بے حسی کو سلام ہے۔'' عبداللہ نے خفگی سے کہا۔

''دیکھ میں نے یہ کب کہا کہ یہ معمولی دکھ ہے۔ لیکن اب مل گیا ناں۔ اسی کے ساتھ رہنا ہے تو ساتھ رکھو مگر ہنسی خوشی۔''

''تو اور تیرا فلسفۂ حیات۔'' گلزار خان سر پکڑ کے رہ گیا۔

''عبداللہ اسے بددعا دے۔ اسے بھی محبت ہو اور پھر وہ نہ رہے۔'' عبداللہ نے بے ساختہ گلزار کا گریبان پکڑ لیا، چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ آنکھیں کچھ رونے اور کچھ غصے سے چمکدار سرخ ہو رہی تھیں پھر کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اس نے دھکا دے کر دکھ سے کہا۔

''تم دوست ہو یا دشمن۔''

''آئی ایم سوری!'' گلزار خان واقعی شرمندہ ہو رہا تھا۔

''اللہ کو کیا پتا تو نے کس دل سے کہا ہے وہ تو سن لیتا ہے جانے کون سی قبولیت کی گھڑی ہو۔'' عبداللہ نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''وہ رب ہے، رب سنتا ہے۔ اسے معلوم ہے ہماری نیتوں کا حال سمجھتا ہے ہمارے حق میں بہتر ہو تب ہی مانتا ہے۔'' متین الزماں نے پھر متانت کا ثبوت دیا۔

''تو پھر میری معصوم زینب کی بے وقت موت کی وجہ کیا ہے۔ پوچھو ناں رب سے۔ اس نے مجھے یہ دکھ کیوں دیا؟''

''دیکھ میرے دوست دعا مانگنا ہمارا فرض ہے..... منظوری ہونہ ہو۔ اختیار تو صرف اللہ کو ہے۔ وہ چاہے کسی گناہ گار کی دعائیں قبول کر لے، چاہے کسی زاہد کی دعا رد کر دے۔ یہ ہی تو زندگی ہے۔ موت اور حیات کے تانے بانے سے جڑی وہ اتنی ہی زندگی لکھوا کر لائی ہو۔'' متین الزماں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ جیسے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو۔

''پھر یہ بھی تو ممکن ہے وہ اس بیماری کے ساتھ جیتی رہتی اور تکلیف میں رہتی تو تم خود کہتے اس کی تکلیف مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اللہ نے اسے پردہ.....'' ارزش نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ عبداللہ کو یاد آ گیا۔ پچھلی ملاقات میں زینب کی ماں نے اس سے یہی کہا تھا۔

''اب تو میں دعا کرتی ہوں اگر میری بیٹی کو آرام نہیں آتا۔ صحت نہیں ہوتی تو اللہ اس کو پردہ دے، دے۔ مجھ سے اس کی تکلیف، اس کا کراہنا دیکھا نہیں جاتا۔''

''نہیں مامی ایسا مت کہیں، وہ کم سے کم نظر تو آتی ہے ناں۔'' وہ کس طرح تڑپا تھا۔

ارزش نے اس کی خاموشی توڑی اس کے پاس چلا گیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ گویا تسلی دی۔

''تو ہمیں غلط نہ سمجھنا۔ تیری قسم ہم تیرا غم دل سے محسوس کر رہے ہیں۔''

عبداللہ سے برداشت نہ ہوا۔ ارزش کے گلے لگ گیا۔ ارزش نے ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط کر دی۔ متین الزماں اور گلزار خان نے بھی عبداللہ کے کندھے پر اپنے، اپنے ہاتھ رکھ کر اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

''آئندہ ایسی بددعا کسی کو نہ دینا..... کسی کو بھی۔'' عبداللہ نے گلزار سے کہا۔

گلزار مسکرا دیا ایک کان پکڑ کے سر جھکا کے کھڑا ہو گیا۔ عبداللہ نے اس کے کان والا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لگا غم ٹھہر گیا ہے۔

اور ٹھہر ہی گیا ہو گا جب وقت نہیں رکتا تو جذبے کیسے رک سکتے ہیں۔ ہم روز نیا کھاتے ہیں، نیا لباس پہنتے ہیں، بال بناتے ہیں۔ کسی نہ کسی کی بات پر مسکراتے بھی ہیں تو اس کا مطلب ہے وقت اپنی گرد احساسات پر ڈال رہا ہے۔ گئے دن کے سورج پر چاند اور چاند پر نئے سورج کی روشنی پڑ رہی تھی۔ سورج کی روشنی جیسی ہی حسین آنکھوں والی لڑکی صوفیہ، عبداللہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سارا دن حویلی میں دکانداروں کا رش لگا رہتا۔ بے جی تو بازار جانے سے رہیں بہترین سے بہترین کپڑا اور زیورات لیے دکاندار خود آ رہے تھے۔ حویلی کا ایک ہی ایک بیٹا بے جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا، کیا نہ خرید لیں۔

ایک، ایک چیز انہوں نے نین تارہ سے پوچھ کے لی۔

رضوانہ بہت خوش تھیں۔ سفید حویلی کی بہو ہونا کوئی عام بات نہیں تھی۔ پورے گاؤں میں سکہ چلتا تھا۔ مزارعے باؤ جی سے پوچھ کے اجناس کی قیمت لگاتے۔ وہ تو باؤ جی اتنے نرم دل تھے کہ ہر شخص سے رحم کا معاملہ رکھتے ورنہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنے بارتبہ ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھاتا۔

ہر دوسرے روز نین تارہ کا صدقہ دیا جا رہا تھا۔ ولایت احمد کی تو اس میں جان تھی۔ رہی نین تارہ..... نین تارہ کا تو وہ گویا دین، ایمان تھا، یہ اور بات کہ ارزش گھر کی ان ساری باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ابھی منزل دور ہے۔ سول سروسز اکیڈمی اتنی آسانی سے جان کہاں چھوڑنے والی تھی۔

اکیڈمی شروع ہوئے ساڑھے آٹھ ماہ ہو چکے تھے۔ عبداللہ اس کا بہترین روم میٹ تھا۔ کاش زینب نے داغِ اجل نہ دیا ہوتا تو وہ خوش مزاج بھی ہوتا ہم مزاج بھی، ابھی صرف یہ کہا جا سکتا تھا کہ ایک ایسا دوست تھا جو تکلیف نہیں دیتا تھا۔ ارزش حسبِ عادت اور حسبِ ضرورت جلدی سو گیا۔ صبح کی پی ٹی ڈرل کسی صورت مس نہیں ہو سکتی تھی۔ اب تو آخری آخری دن تھے کہیں کوئی مشکل نہ آ جائے۔

یہ ارزش جانتا تھا کس طرح وقت گزار رہا ہے۔ کب وہ دن آئے گا جب وہ سی ایس ایس آفیسر کا سہرا اپنے سر پر سجا کے سفید حویلی کی بیٹھک میں دیوار گیر تصویر آویزاں کرے گا۔

عبداللہ شاید رات بھر جاگتا رہا تھا الارم کے بغیر ہی اٹھ گیا تھا۔

''جاگتے رہے ہو؟'' ارزش نے حیران ہوئے بغیر پوچھا۔

''ہوں۔'' اس نے سرسری سا کہا۔

''کیوں؟'' اس نے بے ساختہ سوال کیا۔

''مذاق تو نہیں اڑائے گا؟''

''میں اور تیرا مذاق..... کیا ہو گیا ہے یار۔'' ارزش نے گھڑی کو دیکھا۔ ابھی گراؤنڈ پہنچنے میں آدھا گھنٹا پڑا تھا۔

''میں صوفیہ سے عاجز آ گیا ہوں۔''

ارزش نے ایک آنکھ ذرا میچ کے ماتھے پر بل ڈال کر کچھ سوچا پھر بولا۔

''مطلب عاجز ہی آ گئے ہو؟''

عبداللہ نے واٹس ایپ کے میسج آن کر کے اسکرول چلا دیا، ڈھیروں پیغامات تھے۔ کیا لکھا تھا۔ یہ وہ پڑھ نہیں پایا۔

''اگر یہ کام ڈاکیے کو کرنا پڑتا تو وہ خودکشی کر لیتا۔''

''میں نے تم سے کہا تھا ناں میرا مذاق نہ اڑانا۔'' عبداللہ نے برا مان کے کہا۔

''یار مذاق.....'' ارزش کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ عبداللہ تلخی سے بولا۔

''تو جانتا ہے زینب سب کے لیے مر چکی ہے۔ مگر میرے لیے نہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ واش روم چلا گیا ارزش سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

گراؤنڈ میں سب جمع تھے۔ صوفیہ بھی تھی۔ حالانکہ ڈی ایم جی گروپ میں تھی، ارزش اور عبداللہ انکم ٹیکس میں تھے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے سب ساتھ تھے۔

''صوفیہ بھی ہے۔'' ارزش نے اشارے سے بتایا۔ عبداللہ نے اسے گھورا۔

''مجھے کیا دیکھ رہا ہے، صوفیہ کو دیکھ۔''

ارزش اور وہ دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے گراؤنڈ میں آ رہے تھے۔

''تم نے اس کو زینب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''کیوں نہیں..... سب پتا ہے اسے..... میرا درد بانٹنا چاہتی ہے۔'' ارزش نے ہونٹوں کو نیچے کی طرف لٹکا کر ہاں میں سر ہلایا۔

''لڑکی سمجھدار ہے۔'' دونوں نے مسکراہٹ کا تبادلہ کیا تھا۔

سارا دن عبداللہ سے مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ البتہ بے جی کی کال آئی۔

''کب آؤ گے؟'' وہی گھسا پٹا سوال۔

''بے جی پاکستان نائٹ کے بعد ہی آ سکوں گا۔'' وہی گھڑا گھڑایا جواب جوں، جوں اکیڈمی ختم ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا آہستہ، آہستہ اکیڈمی کا چارم بڑھتا جا رہا تھا۔

کافی پروبیشنرز تو جوڑوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ بس چند ایک تھے مجبوراً اپنے، اپنے حالات کے ہاتھوں..... ان میں سے ایک ارزش بھی تھا۔

☆.....☆.....☆

یونی کے بعد صدف اور نین تارہ اپنی، اپنی کار کا انتظار کر رہی تھیں۔ دونوں خاموشی سے چلتی قدرے سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔

''اور کتنا انتظار رہ گیا ہے؟'' صدف نے مسکرا کے پوچھا۔

''چند ماہ کا۔'' نین تارہ کے چہرے پر ستارے چمکنے لگے۔

''تیاریاں کہاں تک پہنچیں؟''

''almost مکمل ہیں۔''

''کیا تمہیں نہیں لگتا۔ یونی کے بعد شادی کرنی چاہیے تھی؟''

''یار کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن بے جی کو بہت شوق ہے۔''

''اور بے جی کے بیٹے کو؟''

اسی وقت صدف کے موبائل پر کال آ گئی اور ساتھ ہی نین تارہ کے موبائل پر بھی دونوں کے ڈرائیور عموماً ایک ہی وقت آیا کرتے تھے۔ بات ادھوری رہ گئی لیکن نین تارہ کے دل میں سما گئی۔ سارا رستہ وہ یہی سوچتی رہی۔

''کہیں ارزش صرف بے جی اور باؤ جی کی وجہ سے تو شادی نہیں کرنے لگا۔ اگر ایسا ہوا تو.....؟ شادی تو کرنی

ہے۔ آج نہیں تو کل۔ چلو آج خود سے ایک وعدہ کرتی ہوں۔ میں ارزش پر کبھی پابندی نہیں لگاؤں گی اس کی خواہش ہے کہ وہ باہر جائے..... تو جائے۔ میں بے جی کے پاس رہوں گی۔ اس کی جنت کے پاس اس کی خوشبو کے پاس اسے کبھی نہیں روکوں گی۔'' سوچا تو نین تارہ کے سینے پر سے بھاری پتھر ہٹ گیا۔ اسے لگا اس نے ارزش کو یہ فیصلہ سنا دیا ہے۔

ٹھیک اسی وقت اپنے ہاسٹل کے کمرے میں آکر سفید چادر پر نیم دراز ارزش کو پتا نہیں کیوں نین تارہ کا خیال آ گیا۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور نمبر ملا دیا۔

''تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔'' نین تارہ نے فون اٹھاتے ہی کہہ دیا۔

''میرے بارے میں؟ کیوں خیر ہے۔''

''ہماری لڑائیاں، ناراضیاں اپنی جگہ مگر ایک دوسرے کو یاد کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ جیسے ابھی تم نے مجھے یاد کیا۔'' وہ ہنس دی۔

''میں نے تمہیں کب یاد کیا ہے؟'' ارزش چونکا۔

''دستک یاد ہی تو ہوتی ہے۔ وہ چاہے گھر کے دروازے پر ہو یا ٹیلی فون کال کی صورت۔''

''تم میرے بارے میں کیا سوچ رہی تھیں؟''

نین تارہ ایک لمحے کو رکی۔ اس نے کچھ سوچا اور الٹا سوال داغ دیا۔

''تم نے کال کیوں کی ہے؟''

''کیونکہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تم مجھے یاد کر رہی تھیں اور مجھے پتا چل گیا۔'' ارزش نے محبت بھری بات بہت عام سے لہجے میں کر دی۔

نین تارہ، ارزش احمد کی اس سادگی بھری محبت پر کچھ بولی نہیں۔ اس کی خاموشی پر ارزش کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''سمجھ نہیں آ رہا بات کہاں سے شروع کروں۔'' نین تارہ نے گہری سانس لی۔

''وہاں سے شروع کرو جہاں سے لگے کہ تمہاری بات مجھے سمجھ میں آ جائے گی۔'' ارزش نے اطمینان سے کہا۔

''تم جانتے ہو ناں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

ارزش کی سانس بند ہونے لگی۔

''کرتی ہوں..... تو مطلب ایسا نہیں ہے کہ تمہارا جسم و روح میرے قبضے میں رہے گی۔ میں سوچ رہی تھی تم بڑوں کی بات مان لو۔'' تارہ نے سہولت سے کہا۔

''اور اگر میں یہ کہوں کہ مجھے علم نہیں ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا نہیں تو.....؟''

''دنیا میں بہت سے جوڑے بغیر محبت کے بہت خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔'' نین تارہ نے پھیکی ہنسی ہنس کے کہا۔

''میری بات سنو نین۔'' ارزش نے گلا صاف کیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

''مجھے باہر جانا ہے۔ چلا گیا تو؟''

وہ خاموش رہی۔ ارزش نے جان بوجھ کر باتوں کے درمیان وقفہ لیا تھا کہ شاید نین کچھ کہہ دے۔ مگر اس کی خاموشی کو ارزش نے ہی ختم کیا۔

''میرے جانے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''نہیں۔''

''اگر وہاں مجھے زیادہ عرصہ لگ گیا۔ مطلب سال دو سال یا پھر تین.....؟''
''مجھے پتا ہے تم ایسا نہیں کرو گے۔'' نین تارہ ہنس دی۔
''میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟'' ارزش احمد جھنجلا گیا۔
''کیونکہ جس درخت کی جڑیں ایک جگہ ہوں۔ وہ دوسری جگہ جا کر پھل کیسے دے سکتا ہے۔''
''تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو؟'' ارزش جھنجلا گیا۔
''تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو ارزش۔ میں اور تمہیں بلیک میل؟ میں نے تو ایک بات کی ہے۔ سمجھو تو خود کو بہلایا ہے۔ بے جی اور باؤ جی یہاں ہیں پاکستان میں، تمہیں دنیا کا کوئی شہر کیسے راس آ سکتا ہے اور اگر آ سکتا ہے تو میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔'' نین تارہ کی آواز بولتے، بولتے مدھم ہو گئی۔ آنسوؤں سے بھیگ گئی۔
''اچھا فرض کرو میں لوٹ آیا اپنے لیے، بے جی اور باؤ جی کے لیے۔ تمہارے لیے نہ لوٹا تو؟ تو کیا کرو گی؟'' ارزش نے طنزیہ کہا۔
''کبھی سوچا نہیں۔'' وہ برجستہ بولی۔
''تو سوچو۔ کچھ دیر کے لیے ہی سوچو۔''
''جیسے میرا نصیب۔'' نین تارہ نے لمبی سانس لی۔
اس نے فون رکھ دیا مگر ارزش کی پریشانی دُگنی ہو گئی۔ حالانکہ اس نے سوچا تھا کہ وہ واقعی بڑوں کی بات مان لے گا لیکن یہ نصیب۔ ارزش نے جھنجلا کر سوچا۔ اکیسویں صدی میں رہ کر بھی ہم لوگ چودہ سو سال پرانی بات کر رہے ہیں۔ نصیب اپنی جگہ مگر تدبیر، محنت، ارادہ، خواہش یہ سب لفظ حقیقت ہیں تو ہماری زندگی میں مقام رکھتے ہیں۔
اس نے بے دلی سے فون ایک طرف پھینکنے کے انداز میں رکھ دیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت بور ہو چکا ہے۔

قارئینِ بیرونِ ملک متوجہ ہوں

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ **بیرون ملک ڈاک خرچ** پر تقریباً **200 سے 250 فیصد** اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ **نومبر 2020** سے لاگو ہو گا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کر دی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

صبح یونی جانے سے کافی پہلے ہی صدف آدھمکی۔ خواہ مخواہ..... رضوانہ بیگم کو تو اپنی بیٹی کے علاوہ کوئی لڑکی اچھی ہی نہیں لگتی تھی۔ سو محتاط سے انداز میں نین تارہ کے سونے کے بارے میں بتایا کہ ''رات دیر سے سوتی ہے، آج کل دن بھر شاپنگ میں گزر جاتا ہے۔ لیکن اب تم آئی ہو تو اس کے کمرے میں جا کر جگا لو اسے۔''

''شکریہ آنٹی!'' صدف مسکراتی ہوئی نین تارہ کے کمرے میں چلی گئی۔

ولایت احمد نے جواب تک بظاہر اخبار پڑھ رہے تھے، اخبار نہ کر کے مسکرا کے بولے۔ اور یہ ان کی خاص عادت تھی بات چاہے خفگی کی ہو یا صلح صفائی کی ہمیشہ مسکرا کے ہی کرتے تھے۔

''رضوانہ آپ صدف کے آنے پر ناراضی کا اظہار کرتی ہیں؟'' رضوانہ بیگم نے پلٹ کے بے اعتنائی سے دیکھا۔

''اگر یہ آپ کا سوال ہے تب بھی اور اگر آپ نے جواب طلب کیا ہے تب بھی میرا جواب ہے۔'' ''ہاں کرتی ہوں، کرتی ہوں میں ناراضی کا اظہار۔ میں اپنی نین کے معاملے میں بہت وہ ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں ناں۔''

''حساس، پوزیسو۔'' ولایت احمد نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کے کہا۔

''ہاں پوزیسو ہوں۔ آپ خود سوچیں۔ اتنی پیاری لڑکی، اتنی اچھی قسمت، دنیا کا کیا ہے، نظریں لگاتی پھرتی ہے۔'' رضوانہ بیگم نے ناک چڑھائی۔

ولایت صاحب کا مسکراتا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''دعا کیا کریں کہ اللہ رب العزت اس کی قسمت بنائے رکھے۔ اس کی قسمت میں سکھ ہی سکھ ہوں۔ پتا نہیں مجھے کہنا چاہیے یا نہیں لیکن میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، بات کرتے، کرتے ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ نمی کو چھپانے کے لیے کمرے ہی سے نکل کے چلے گئے۔ رضوانہ بیگم نے آیت الکرسی پڑھ کر اس طرف پھونک ماری جس طرف صدف اپنی پیاری سہیلی سے ملنے اس کے کمرے میں گئی تھی۔

سوئی جاگی نین تارہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی گہری سیاہ آنکھیں نیم وا تھیں۔ بکھرے بال، چہرہ شہابی۔

''خیر سے آئی ہو صبح صبح؟'' نین تارہ نے سرہانے رکھا دوپٹا اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا۔ گلابی دوپٹا کم وبیش اس کے چہرے کی رنگت جیسا ہی لگ رہا تھا۔

''تمہارے بغیر دل ہی نہیں لگ رہا کیا کروں۔''

''دل کو کوئی معقول کام دے دو۔'' نین تارہ ہنس دی۔

''یار یہ کیا بات ہوئی۔'' صدف جھنجلائی۔

''کون سی.....؟'' نین تارہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہی کہ نکاح سے پہلے ہی تم مایوں بیٹھ گئی ہو۔'' صدف نے خفگی سے پوچھا۔

''تم ماں کو تو جانتی ہو ناں؟''

''جانتی ہوں۔ اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ لیکن تم مجھے بھی تو جانتی ہو۔ میں آج بھی سارا دن اکیلی پاگلوں کی طرح بیٹھی رہوں گی۔'' صدف روہانسی ہو رہی تھی۔

''اچھا میں فریش ہو کر آتی ہوں۔'' نین تارہ مسکرا دی۔

''تم ایسے ہی فریش لگ رہی ہو۔'' صدف نے بے ساختہ کہا۔

''ارے بابا برش تو کرنے دو۔ پھر چائے پیتے ہیں۔''

صدف کی خاموشی کو نین تارہ نے غنیمت سمجھا اور واش روم چلی گئی۔ صدف اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ بے وجہ فون آن آف کرتی وقت کو گھسیٹ رہی تھی کہ نین تارہ آ گئی۔ صاف ستھرا دھلا چہرہ صدف نے تحویت سے اسے دیکھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''دیکھ بھی رہی ہوں۔سوچ بھی رہی ہوں۔'' صدف نے مسکرا کر کہا۔
''کیا؟'' نین نے محویت سے اسے دیکھا۔
''ارزش بھائی تو بس ہر وقت تمہارا قصیدہ ہی کہتے رہتے ہوں گے۔'' اس نے کہا تو مسکراتی ہوئی نین بجھ گئی۔ پھر بھی سر ہلا کے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ ہاں کہہ کر اٹھی۔
''میں چائے کا کہہ کے آتی ہوں۔''
صدف نے جانے نہیں دیا۔
''کیا بات ہے نین، تم میری بات پر چپ ہو گئی ہو؟''
''تمہیں کیا بتاؤں، یہ جو کم بخت محبت ہوتی ہے ناں۔ کتنا بڑا امتحان لیتی ہے۔''
''مطلب؟'' صدف نے حیران ہو کر پوچھا۔
''مطلب یہ کہ جتنا میں اسے چاہتی ہوں۔ جی چاہتا ہے وہ بھی چاہے اتنا ہی نہیں اس سے بھی زیادہ لیکن ساری خواہشیں تکمیل کا درجہ کہاں پاتی ہیں۔ یہی کیا کم ہے۔ وہ میری قسمت میں لکھا جانے والا ہے۔''
''بیوقوف وہ تمہاری قسمت میں لکھا جانے والا نہیں بلکہ تمہاری بدقسمتی بننے والا ہے۔ تم دونوں نکاح کے بندھن میں بندھنے والے ہو تم کوئی اس کا اسکیچ بنا کے اپنی سائڈ ٹیبل میں نہیں رکھنے والی۔'' وہ طنزیہ بولی۔
''ہم چائے نہ پی لیں نہار منہ کتنی خطرناک باتیں کر رہی ہو تم۔''
''اپنی زندگی سے مت کھیلو پلیز۔''
''میری بات دل سے سننا، دماغ سے نہیں۔ میرے والدین کی بھی یہی آرزو ہے کہ ہم دونوں کی شادی ہو جائے اور ارزش کے والدین کی بھی۔ اور میری تو خیر ہے ہی۔ جب اتنے سارے لوگ رضامند ہوں ایک انکار سے اتنے دل ٹوٹتے ہوں تو اقرار کر کے سرخرو ہونا بہتر نہیں؟''
صدف نے کچھ لمحے سخت نظروں سے نین کو دیکھا اور پھر بولی۔ ''جاؤ چائے کا کہہ کر آ جاؤ۔''
نین بے ساختہ ہنس دی اور اگر اس کا رخ دروازے کی طرف نہ ہوتا تو وہ نین کی بھیگی آنکھیں ضرور دیکھ لیتی۔

☆.....☆.....☆

وہ رات مُرادوں والی رات تھی۔ ارزش اکیڈمی سے سرخرو ہو کر حویلی میں آیا تھا۔ گاؤں میں اب اِکا دُکا گھر ہی کچے دکھائی دیتے تھے لیکن رہن سہن ابھی تک شہری نہ ہو سکا تھا۔ ارزش کی سواری ڈھول اور فوجی بینڈ کے ساتھ ہی حویلی پہنچی تھی۔ جہاں بے جی ہلکے آسمانی رنگ کا مقیش کا دوپٹا سر پر اوڑھے اس کا بہت چاؤ سے انتظار کر رہی تھیں۔ پورے گاؤں کی دعوت تھی۔ کھلا کھانا جتنا جی چاہے کھاؤ۔ چاہو تو گھر بھی لے جاؤ۔ انہی کشادہ دل والوں کی حویلی میں ایک ہستی ایسی بھی تھی جس کا دل تیز آندھی کی زد میں آئی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے حواس کو قرار نہیں تھا۔ اس کا دماغ کسی انہونی کے ہو جانے کے ڈر سے پریشان تھا۔ بینائی مرتعش تھی۔ بے جی نے عشا کی نماز پڑھ کر اللہ سے التجا کی۔ گڑگڑا کر دعا مانگی۔ پتا نہیں کیوں جب سے ارزش احمد پیدا ہوا تھا۔ بے جی اس کے گمان سے نکل ہی نہ پائی تھیں۔ انہوں نے ارزش کی محبت میں اللہ کے حضور اتنے سجدے ادا کیے کہ ان کو ارزش کے حوالے سے بصیرت عطا ہو گئی۔
ارزش سارے دن کا تھکا ہارا سونے کی تیاری کر رہا تھا جب بے جی نے آ کر کمرا معطر کر دیا۔ ان کی مسکراہٹ، ان کی ممتا کی خوشبو ارزش کو سب کچھ بہت پیارا تھا۔
''مجھے بلا لیتیں بے جی آپ نے کیوں تکلیف کی؟''
''میرے بیٹے کے دل میں کیا چل رہا ہے؟'' انہوں نے ارزش کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔
''کیا چل رہا ہے بے جی؟'' ارزش نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا۔

''وہی تو پوچھ رہی ہوں۔''
وہ ہنس دیا۔
''میرے دل میں نہیں، بے جی گھر میں چل رہا ہے۔ میری شادی کی تیاریوں کا طوفان۔''
''تم..... خوش تو ہو ناں؟'' بے جی نے تم کہنے کے بعد قدرے توقف کیا اور پھر بولی تھیں۔
''بہت خوش ہوں۔'' ارزش اگر مسکرا کے یہ بات نہ کہتا تو بے جی پریشان ہو جاتیں۔
''آپ خوش ہیں..... باؤ جی خوش، ولایت ماموں، مامی اور آپ کو پتا ہے نین کتنی خوش ہے۔''
''اپنی خوشی کا بھی تو کچھ کہو۔'' بے جی نے ارزش کو سنجیدگی سے دیکھا۔
''سب سے پہلے میں نے اپنی خوشی کے بارے میں ہی تو کہا تھا۔ بے جی، میں واقعی بہت خوش ہوں۔''
بے جی نے اثبات میں سر ہلایا جیسے وہ ارزش کی بات کا یقین کرنا چاہ رہی تھیں۔
''اچھا تو پھر میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے..... ؟ اللہ خیر کرے۔''
''خیر ہی خیر ہے بے جی۔''
بے جی اٹھیں، جانے سے پہلے ارزش کو پیار کیا، سر چوما، بال سنوارے اور دعائیں دے کر چلی گئیں۔
''بے جی بھی ناں!'' اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ ''جانے کون کون سے وسوسے دل میں لیے گھبراتی رہتی ہیں۔''

☆.....☆.....☆

اس کی شادی کی تقریبات شروع تھیں۔ سفید حویلی مختلف رنگ کے قمقموں سے رنگین ہو رہی تھی۔ ولایت احمد اور رضوانہ بیگم کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ صبح شام نین کا صدقہ اتارا جا رہا تھا۔ نین بھی ساری باتیں بھول کے شادی کے ایک، ایک پل کو انجوائے کر رہی تھی۔ ڈھولک، ابٹن، مہندی، سبز، سنہری چوڑیاں صدف نے نین کی اتنی تصویریں اتاریں۔ جیسے وہ کسی ریاست کی شاہ زادی ہے اور صدف اس کی پزیرائی پر معمور کر دی گئی ہے۔
مہندی کی تقریب ایک ساتھ ہی ہونی تھی۔ سو وقتِ مقررہ پر باؤ جی چھوٹی سی بارات کی صورت ارزش احمد کو لے آئے، بے جی بہت کم گھر سے نکلا کرتی تھیں مگر اکلوتے بیٹے کی شادی کی رسومات تھیں تو ان کو باہر آنا ہی تھا۔
شہزادوں کی سی آن بان رکھنے والا ارزش احمد راؤ سلک کی شیروانی پہنے سفید کھڑے پاجامے میں واقعی شہزادہ لگ رہا تھا۔ رضوانہ بیگم اپنے ملنے جلنے والیوں میں سر اٹھا کر اترائی، اترائی پھر رہی تھیں۔ رسم سے پہلے نین تارہ بھی اسٹیج پر آ گئی تھی۔
گاؤں میں اگرچہ یہ رواج نہ تھا مگر بڑے لوگ بڑی باتیں گاؤں والے کم سے کم باؤ جی کو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔
نین تارہ حسن کا پیکر بنی زرد اور سبز لباس میں ایک، ایک قدم سج، سج کر رکھتی ارزش کی دل کی سرزمین پر اترنا چاہ رہی تھی۔ مگر ارزش کے دل کے دروازے مقفل نہ ہونے کے باوجود کھلتے نہ تھے۔
رسمیں ہوئیں۔ ارزش خوش دکھائی دے رہا تھا۔ کبھی، کبھی نین سے کوئی بات بھی کر لیتا جو بہت سارے لوگوں کی نظروں میں آئے جا رہا تھا۔
''اتنی بے شرمی اچھی نہیں ہوتی۔'' کسی خاتون نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔
''شہر کے پڑھے لکھے ہیں ناں۔ شہر اور گاؤں میں فرق تو ہوتا ہے۔''
''ساری شرم گھول کے پی گئے کیا شہر والے؟'' کسی دل جلی کی آواز آئی۔
صدف سن رہی تھی جھٹ نین کے کان میں پھونک آئی۔
''بات کیوں کر رہے ہو تم دونوں۔ چپ رہو۔ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔'' صدف تو کہہ کر چلی گئی۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' ارزش نے سرگوشی میں پوچھا۔
''چپ رہو۔'' نین آہستہ سے بولی۔
''اچھا۔'' ارزش نے سعادت مندی سے کہا۔
''یہی کہہ کر گئی ہے۔'' نین نے بتایا۔
''کیوں۔ اسے کیا پریشانی ہے میرے بولنے سے۔''
''اسے نہیں ہے لوگوں کو ہے۔''
''اصل میں.....''
''بس کرو۔ واقعی سب ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں۔'' نین تارہ نے حتمی سے انداز میں کہا۔
ارزش نے دیکھا واقعی سب حاضرین انہی کو دیکھ رہے تھے۔
''کتنا باتونی ہے۔'' صدف نے سوچا۔ پھر خود ہی ہنس دی۔ ''اچھا ہے نین خوش رہے گی۔''
شاندار تقریب بہت عمدگی سے انجام کو پہنچی تھی۔ سب مرد، عورتیں گھروں کو روانہ ہوئے اور نین تارہ اپنے والدین کے ساتھ اپنے گھر..... رات نین سونے لگی تو ارزش کے فون نے اسے حیران کر دیا۔
''خیر ہے۔ اس وقت تمہارا فون؟'' نین نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔
''اپنی نظر اتار لینا۔'' ارزش نے سنجیدگی سے کہا۔
''اچھا جی.....!'' وہ حیرت بھری خوشی سے بولی۔
''اگر نہیں اتاری تو پھر کل میں دونوں دن کی ایک ساتھ ہی نظر اتار لوں گا۔''
''اچھا جی!'' نین بے اندازہ خوشی و سرشاری کو چھپا کر بولی۔
''ہاں۔ تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ سارے لوگ ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں۔''
''کیا..... صرف اس لیے؟'' نین بجھ گئی۔
''نہیں۔ اس لیے بھی کہ مجھے بھی تم بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اب سو جاؤ have a sweet dreams۔'' ارزش نے فون رکھ دیا۔ نین کتنی ہی دیر تک بند فون سے کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتی رہی۔

☆.....☆.....☆

بارات کی دھوم دھام ہی الگ تھی اور نین تارہ اور ارزش ایک دوسرے کی قسمت بن گئے۔
رخصتی پر نین روئی نہ رضوانہ اور نہ ہی ولایت احمد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بیٹیوں کی بھلی تقدیر پر بھی کوئی روتا ہے، اللہ نہ کرے کوئی ماں، باپ روئیں۔ بے جی بہت خوش تھیں۔ نین تارہ ان کی آنکھوں کا تارہ تھی اور یہ نام بھی انہوں نے ہی رکھا تھا۔
ہزاروں، لاکھوں بار وہ ارزش کے کمرے میں آچکی تھی مگر آج اس کے کمرے میں پاؤں رکھتے ہوئے قدم ڈگمگا ہی گئے۔
احساسِ ملکیت بہت دلفریب احساس ہے۔ لیکن اس کے ساتھ، ساتھ ذمے داری بھی۔
مالک ہونا صرف مالک ہونا نہیں وہ بھی جیتی جاگتی سانس لیتی ملکیت کو سنبھال کر رکھنا، اس کا بوجھ اٹھانا۔ اس کے احساسات کا خیال رکھنا بھی لازم ہے۔ پیر تو ڈگمگانے ہی تھے۔
کمرا تازہ گلاب اور موتیے کے پھولوں سے سجا ہوا تھا۔
انتہائی مسحور کن خوشبو نے پورے ماحول پر سحر طاری کر رکھا تھا۔ تازہ پھولوں کی بنی سیج کا پردہ اٹھا کر اس کو بیڈ پر بٹھایا گیا۔ زرتار جوڑے کا بوجھ، وزنی زیورات اس پر پل، پل گزرتی رات..... جامد خاموشی میں دیوار پر لگی سنہری فریم والی گھڑی کی ٹک ٹک بھی بہت بھاری تھی۔ نین نے دیوار کی طرف دیکھا، گھڑی رات کا ایک بجا رہی

تھی۔ ارزش ابھی تک کمرے میں نہیں آیا تھا۔ شاید دوستوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

نین نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کچھ سوچنا چاہا مگر ذہن خالی سلیٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ پچھلی کوئی بات یاد ہی نہیں آ رہی تھی۔ یاد تھا تو اتنا کہ اس کو اپنے دولھا کے انتظار میں جاگنا ہے۔ کب تک..... کب تک؟ گھڑی کی سوئیوں کی ٹک، ٹک بھی اسی سوال کو دُہراتی ہوئی لگ رہی تھی۔

آہٹ ہوئی۔ جانے کیا بجا تھا۔ دروازہ کھلا اور نین نے گھڑی کے بجائے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہی ہوا جو کچھ دیر پہلے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ہوا تھا کئی بار کا دیکھا کمرا بھی نیا لگ رہا تھا اتنا نیا کہ اجنبی ہی محسوس ہونے لگا۔ اس کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ اب بھی لاکھوں، کروڑوں بار کا دیکھا ہوا ارزش تھا اور سینے میں دل اچھلے جا رہا تھا۔

''سوری۔'' اس نے آتے ہی بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں کہا۔ کئی گلاب اور موتیا کے پھول اس کی کمر کے نیچے آ کر مسلے گئے۔

''یار بیٹھک میں اتنے ملاقاتی تھے کہ میں تو ہاتھ ملا، ملا کر تھک گیا۔'' بات کرتے، کرتے اس نے نین تارہ کو دیکھا۔ وہ بلاشبہ خوب صورت لگ رہی تھی ویسے بھی جو عام دنوں میں وہ اتنی سادہ رہتی تھی کہ آج کے ہار سنگار نے اس کو دلکش ہی نہیں بہت حسین روپ بھی بخشا تھا۔ انوکھا روپ۔ اس پر اس کی محبت کی کامیابی۔

''پیاری ہو۔'' ارزش نے مسکرا کے کہا پھر یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''تمہیں یاد ہے ناں۔ ہماری وہ بات جو ایک دن ہم نے فون پر کی تھی۔''

''یاد ہے۔ مگر ابھی اس کو دُہرانے کا مقصد؟''

''ہے..... ہے مقصد۔'' ارزش نے اپنی کنپٹی سہلائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے دکھ ہو رہا ہے۔''

وہ دل ہی تو تھا کانچ جیسا نازک نین کا دل جو اس خوب صورت حسین رات میں ڈوبا ہوا تھا کہ چھن سے ٹوٹ گیا۔

''میں نے تم سے محبت کی ہے اور تمہیں اس محبت میں آزادی بھی کیا ہے..... تم جیسی خوب صورت دل اور حسن والی لڑکی کو مجھ جیسے کم ظرف سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تم تو..... تم۔''

''ارزش احمد!'' نین تارہ نے پہلی بار بہت محبت سے ارزش کا مکمل نام پکارا۔

''تقدیر کے فیصلوں پر حجت نہیں کرتے۔''

ارزش واپس پلٹا اور نین کے سامنے بیٹھ گیا۔ نین نے مسکرا کے سر جھکا لیا۔ سانس تیز چل رہی تھی۔ ارزش نے نین کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''ساتھ دو گی میرا؟''

''آخری سانس تک۔'' نین نے سرگوشی کی جیسے دم ابھی کے ابھی نکلنے والا ہے۔

ارزش نے نین کے ہاتھ پکڑے اور ہونٹوں سے لگا لیے۔

''کس قدر ملائم ہیں تمہارے ہاتھ۔'' ارزش کہہ کر ہنس دیا۔

''پہلی بار تھامے ہیں ناں۔''

نین بے ساختہ مسکرا دی۔ ارزش محویت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نین تو جیسے کہیں آسمانوں کی سیر کر رہی تھی۔ اس کی محبت سامنے تھی۔ جس کو ہاتھ بڑھا کر جب چاہے چھو سکتی تھی۔ پورے حق کے ساتھ.....

☆.....☆.....☆

''رضوانہ اپنے بیش قیمتی زیورات اتار کے سیف میں رکھ چکی تھی۔ ان کے انداز و اطوار سے لگ رہا تھا کہ وہ

بہت خوش ہیں۔ ولایت احمد، رضوانہ کا چہرہ بلکہ چہرے کی خوشی دیکھ رہے تھے۔

''آپ کو پتا ہے طیبہ کیا کہہ رہی تھی بے'' رضوانہ نے اپنا ڈریس ہینگر میں احتیاط سے سجایا اور الماری میں ہینگ کر دیا۔ وہ اپنی خالہ زاد بہن کی بات کر رہی تھیں۔ ولایت احمد نے دلچسپی سے ان کی طرف دیکھا اور یہ دلچسپی بھی محض رضوانہ کی دلجوئی کی خاطر تھی۔

''کہنے لگی تم نین کا دولھا ڈھونڈنے کوہ قاف گئی تھیں کیا؟ چاند سورج کی جوڑی ہے ماشاء اللہ۔'' ولایت صاحب مسکرا دیے تھے۔

''یہ تو قسمت ہے ہماری بیٹی کی۔ آپا نے کس چاہت سے نین کا ہاتھ مانگا تھا۔ انکار کیسے کرتے۔'' وہ کچھ جتاتے ہوئے بولے۔ ''آپ کو یاد ہے آپ نے آپا کے لیے کبھی اچھا گمان نہیں رکھا مگر آپا کا بڑا پن ہے کہ ساری باتیں محسوس کرنے کے باوجود انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔''

''اچھا اب آپ جتائیں گے؟'' رضوانہ خفا ہو گئیں۔

''نہیں، میں جتا نہیں رہا رضوانہ بیگم یہ احساس دلانا چاہ رہا ہوں کہ ہم جو کہتے ہیں جو سوچتے ہیں کاتب تقدیر اس سے کہیں خوب صورت قسمت لکھ رہا ہوتا ہے۔ سنہری قلم سے چمکیلی تحریر۔ اس لیے گمان کی نگاہوں کو بے لگام نہیں کرنا چاہیے۔'' ولایت احمد سنجیدہ ہو گئے۔ رضوانہ خاموش ہو گئیں۔

''چپ ہو گئی ہیں آپ؟''

رضوانہ ایک گہری سانس لے کر پاس ہی آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر ممتا بھری پریشانی تھی۔

''ولایت! ارزش ہماری بیٹی کو خوش تو رکھے گا ناں؟''

''آپ مجھ سے خوش ہیں؟'' انہوں نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔

رضوانہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ ان کا سر جھک گیا۔

''مطلب خوش رکھا ہوا ہے۔ جب کوئی یہ سوال کرے۔ محبت سے کہ میں نے تمہیں خوش رکھا ہے یا نہیں اور جواب دینے کے بجائے آنکھوں میں آنسو آ جائیں تو مطلب ہے بہت خوش رکھا ہوا ہے۔'' ولایت احمد ہنس دیے۔

''سچ بتاؤں؟'' رضوانہ روتے، روتے ہنس دیں۔

''میں جو اتنا غصہ کرتی ہوں، میرا راج، میری اکڑ، یہ سب اسی وجہ سے ہے۔ آپ میری ڈھال ہیں، مجھ سے محبت کرتے ہیں وہ ان کے ساتھ آ گئیں۔''

''جن سے محبت ہو ان کے پیاروں سے بھی محبت ہونی چاہیے۔'' ولایت احمد رضوانہ کا سر اپنے سینے پر رکھ کے مطمئن انداز میں ہنس دیے۔

☆.....☆.....☆

بے جی تو جوانی سے تہجد کے لیے اٹھا کرتی تھیں۔ اب تو ان پر بقیہ پانچ نمازوں کی طرح تہجد بھی فرض ہو چکی تھی۔ تو وہ یہ فرض نبھانے کے لیے اٹھی تھیں۔ باؤ جی نے بھی کروٹ لی اور مسکرا کے بیوی کو دیکھا۔ جس کے چہرے کا نور صبح کے اجالوں کی طرح دلکش تھا۔ حیات آفریں تھا۔

''کل کی تقریبات کی تھکن ہو گی۔ کچھ دیر اور سو لیتیں۔''

''آپ لیٹے رہیے۔ ابھی فجر نہیں ہوئی۔ میں جگا دوں گی۔'' بے جی ہنس دیں۔ بے جی اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی گئیں۔ باؤ جی بھی اٹھ گئے۔ ایک بار آنکھ کھل جاتی تو پھر ان سے سونا مشکل ہو جاتا۔ یہ ان کا مسئلہ تھا مگر وہ کسمندی سے کروٹ بدل کر لیٹے رہے۔

☆.....☆.....☆

بے جی نماز کے بعد تلاوت کر رہی تھیں۔ چوڑیوں کی آواز نے ان کی توجہ اس طرف کرائی۔ نئی دلہن سہاگ کی ساری خوشبوؤں سے نہائی سامنے کھڑی تھی۔ چہرے پر شرم کی لالی۔ سرخی مائل عنابی سوٹ میں نین کا رنگ اور کھل رہا تھا۔ مہندی والی کلائیوں میں مہندی لگانے والی نے ہتھیلیوں کی پشت سے لے کر کہنی کے جوڑ تک بہت خوب صورت نقش و نگاری کی تھی سونے اور کانچ کی چوڑیاں۔ کانوں میں بڑے' بڑے بالے۔ سر پر دوپٹا جمائے وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔

''چائے۔'' اس نے ایک خوشگوار کھنک کے ساتھ کہا اور نماز کی چوکی کے کنارے ٹک گئی۔ اور ٹرے بے جی کے سامنے رکھ دی۔

''تمہارا سفید حویلی میں آج پہلا دن ہے۔''

''لیکن آپ میری پھپھو تب سے ہیں جب میں پیدا ہوئی تھی۔''

بے جی مسکرا دیں۔ قرآن پاک میں ساٹن کا فیتہ لگا کے نشانی لگائی اور پوری طرح سے نین کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''ارزش احمد سو رہا ہے؟''

نین نے چائے کے کپ میں آدھی چمچ چینی گھولی اور بے جی کے سامنے رکھی۔

''شہری لوگ اتنی صبح کہاں اٹھتے ہیں بے جی۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''ایک بات بتاؤں؟'' بے جی نے محبت سے کہنا شروع کیا۔ نین بھی دلچسپی لے رہی تھی۔ ''ارزش باہر سے شہری ہوگا مگر اس کی روح شہری نہیں ہے۔ اس میں مٹی کی نرمی بھی ہے اور زرخیزی بھی۔ جن کی جڑیں سوندھی کچی مٹی میں دبی ہوں ان کی شاخیں ہمیشہ سرسبز رہتی ہیں۔''

''جی پھپھو۔'' نین مسکرا دی۔

ایسا ہی تھا۔ نین تارہ، ارزش احمد کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ نین کا پہلا اور آخری سچا کھرا عشق تھا۔ اس کو یاد ہے جب پہلی بار اس پر ارزش سے محبت کا انکشاف ہوا تھا تو وہ کتنا روئی تھی۔ وہ میٹرک میں تھی۔ اس کی کچی عمر تھی۔ تب تو شاید اسے معلوم ہی نہ ہو محبت کیا ہوتی ہے لیکن ایک شام اس کو پتا چلا کہ ارزش کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ تڑپ کے رہ گئی تھی۔ تین دن ارزش اسپتال رہا تھا۔ شکر ہے کوئی فریکچر نہیں تھا مگر اندرونی چوٹوں نے ڈاکٹرز، بے جی اور باؤ جی کے ساتھ، ساتھ ماموں جان کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ معصوم نین کی پریشانی کا تو کسی کو احساس کیا شعور بھی نہیں تھا۔ جب پہلی بار کورے ہاتھ اپنی کامیابی اور امی، بابا کے علاوہ کسی اور کے لیے اٹھے تھے۔ تب اس کے کان میں سرگوشی ہوئی۔ دل دھڑکا۔

''تمہیں ارزش احمد سے محبت ہو گئی ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' نین نے گھبرا کے خود کو جھٹکا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی میری ان باتوں کی عمر نہیں ہے۔ وہ۔ میرا کزن ہے ہم ساتھ کھیلے ہیں۔ اس کی تکلیف پر دل دکھ گیا اور بس۔''

لیکن اس اور بس کے وسوسے، کدال لے کر اس کے کمزور دل میں گوڈی کرنے لگے۔ وہ وسوسوں میں آتی جا رہی تھی۔ بس ہر وقت یہی فکر کر رہے تھے۔ ایسا نہ ہو جائے۔ ویسا نہ ہو جائے۔ ارزش کب آئے گا۔ وہ کیا کھاتا ہے۔ کون سی خوشبو پسند کرتا ہے۔ اور لاابالی ارزش کو گمان تک نہیں تھا کہ دو معصوم ہاتھ اس کے لیے روز دعا کر کے سوتے ہیں۔ وہ آنکھیں اسی کی راہ دیکھتی ہیں۔

پھر نین نے اسکیچز بنانے سیکھ لیے اس کی پنسل نے کچھ اور بنانے سے جیسے انکار ہی کر دیا ہو۔

(جاری ہے)

گرہ

سیما بنت عاصم

''آپ کچھ بھی کرلیں..... کچھ بھی کہہ لیں آپی..... مگر یہ یاد رکھیے گا کہ اب یہ شادی نہیں ہوسکتی.....'' سبطین کے الفاظ تھے یا بم دھماکا..... مجھے لگا منٹوں میں سب کچھ تہس نہس ہوکر رہ گیا..... میرے آس پاس دھواں ہی دھواں پھیلتا چلا گیا تھا۔

''میں نے ایک نظر سبطین پر ڈالی..... اس کا لہجہ و انداز شکستہ سا تھا۔ عجیب ٹوٹا بکھرا، بے ربط و پُرملال.....

''دو ہفتوں سے میں کیسا بوجھ اپنے دل و دماغ پر

لیے گھوم رہا ہوں..... یہ میں ہی جانتا ہوں..... سعدیہ نے نکاح کے اگلے ہی روز مجھے بتا دیا تھا کہ ماضی میں اس کا نہ صرف ایک مرد سے معاشقہ بلکہ ''تعلقات'' بھی رہے ہیں.....'' اس کے لہجے میں بلا کی یاسیت، آزردگی اور صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔ جبکہ میرے پیروں تلے سے زمین نکلتی چلی گئی تھی۔

کون نہیں جانتا..... کہ اس نکاح کا ثالثی کردار میں خود تھی۔ سبطین کی منکوحہ سعدیہ کی والدہ..... میڈم جہاں آرا میری ٹیچر رہ چکی تھیں۔ جبکہ اُن کی پوری فیملی سے میرے میکے کے دیرینہ تعلقات تھے..... یہی وجہ تھی کہ سبطین کے رشتے پر کسی غور و خوض یا چھان پھٹک کے تکلفات میں پڑے بغیر چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ٹھہرا تھا۔ سبطین اور سعدیہ کا دو ہفتے قبل نکاح ہوا تھا اور اب باقاعدہ رخصتی کے لیے تیاریوں کی غرض سے کچھ دن کی مہلت لی گئی تھی۔

ابھی رخصتی میں ایک ڈیڑھ ہفتہ باقی تھا۔ مگر یہ جانکاہ خبر..... میرے ہوش و حواس مختل ہوئے جاتے تھے..... اب کیا، کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے..... سعدیہ ایک تعلیم یافتہ گھرانے کی سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ جس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ جو سچ پوچھا جائے تو میرا دل ہی نہیں مان رہا تھا اس گھرانے کی بابت..... کوئی ایسی سوچ تو مجھے چھو کر بھی نہیں گزری تھی مگر سبطین کا سنجیدہ اور کڑوا انداز..... ابھی اس نکاح کو دن ہی کتنے گزرے تھے کچھ ہی دنوں میں کہانی یوں پلٹ جائے گی..... میرے وہم و گمان میں نہ تھا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات تھی جب سبطین کہیں سے بھولا بھٹکا میرے گھر آ نکلا..... اور ایک ذرا احوال پرسی کی دیر تھی..... وہ پھٹ پڑا۔

''جانے بھی دیجیے رباب آپی..... آپ کو تو کبھی اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کبھی کبھی خالہ کی ہی خبر لے لیں..... گھر کے سب حالات سے واقف ہیں آپ..... تب بھی ایسی بے خبری و بے حسی ایک بلاک میں رہتے ہوئے مہینوں گزر جاتے ہیں۔'' ایک دوسرے کی شکلیں دیکھے ہوئے۔''

میں شرم سے زمین میں گڑ گئی تھی۔ یونہی آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔ میرے سر پر گھر بھر کا بار تھا، احسن کے آفس سے آنے کے بعد اپنے معمولات تھے۔ مجھے اپنے ضروری کام بھی اتوار پر ٹالنے پڑتے۔ قدرت نے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ اور وہ کہاں ہاتھ آتے تھے۔ بیٹی ہوتی تو شاید کچھ بوجھ بٹا لیتی۔

سچ تو یہ تھا کہ شفیقہ خالہ کے گھر کو میرے قدم ہی نہ اٹھتے تھے۔ عجیب سا ماحول تھا۔ وہاں کا۔ مجھ سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ شفیقہ خالہ کے گھر کا شیرازہ بکھرا تھا تو ان کی بہو، بیٹی کی غیر ذمے داری و بگڑی روش کے سبب..... خود شفیقہ خالہ کی حالت گھر سے بڑھ کر نا گفتہ بہ تھی۔ سرتاپا بیماریوں کا مجسمہ، خدا جھوٹ نہ بلوائے ان کے گھر میں دن سوتے، راتیں جاگتی تھیں۔ شفیقہ خالہ فجر کے وقت دوا لے کر جو سوتیں تو شام گئے کی خبر لاتیں۔ اکلوتی بہو نے اپنی دنیا گھر کے اوپری پورشن میں بسا رکھی تھی۔ عبدالعزیز کی بے جوڑ بیوی..... کئی بھائیوں کی لاڈلی بہن تھی۔ وہ اسے حلق تک بھر کے رکھتے..... سو عبدالعزیز بھی بیوی کے لاڈ نخرے اٹھائے نہ تھکتا..... سو گھر کی طرف سے آنکھیں بند تھیں۔ اب رہی نیناں تو اس کے لیے اعلیٰ عہدے کا زعم کافی تھا۔ گھر میں بھی آفیسروں والی آن بان شان کبھی من میں سمائی تو دو چار سالن بنا کر فریز کر دیے..... ورنہ گھر ہوٹل سے چلتا تھا۔ دیگر کاموں کے لیے ایک ملازمہ شام ڈھلے آتی..... اس کی نگرانی کون کرتا..... الٹے سیدھے کام بھگتا یہ جا وہ جا..... سو شفیقہ خالہ کے گھر کا شیرازہ کیوں نہ بکھرتا۔ گھر بھر میں بدنظمی، انتشار، پھیلاوا..... یہی کچھ دیکھنے کو ملتا..... سچ تو یہ تھا کہ ان کے گھر کو ایک ذمے دار، سلجھی ہوئی بہو کی ضرورت تھی اور اس سے بھی کڑوا سچ یہ تھا کہ ان تمام بکھرے بگڑے معاملات کے باوجود..... عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی سبطین کے سر پر دوبارہ سہرا سجانے کا خیال کسی کو چھو کر بھی نہیں گزرتا تھا۔ اس کی زندگی ایک عورت کی کج ادائی... کا شکار تھی۔ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد اس کی بیوی نے اس سے خلع حاصل کر لی تھی۔ بیوی کی

اس بے وفائی و بے رحمانی پن سے عورت ذات پر سبطین کا بھروسا کمزور پڑ گیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ گھر کے بگڑے ہوئے حالات اور ناکام زندگی نے اس کے ذہن و دل کو منتشر کر دیا تھا۔ اس کے مزاج میں تند خوئی آسمانی تھی۔ اور یہ میں کیا، سب ہی جانتے تھے۔

اپنے تئیں، میں نے شفیقہ خالہ کے گھر کے بگڑے بکھرے ماحول کو سلجھانے، سبطین کی زندگی کو اِک نیا عنوان دینے کی خاطر یہ قدم اٹھایا تھا۔ بات اتنے خطرناک رخ پر جا نکلے گی۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔

میں سر تھام کے بیٹھ گئی..... میرے آس پاس خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں، کہاں جاؤں، کس سے کہوں..... احسن تو میری جان ہی کھا جاتے کہ بڑا انسانیت کا ابال اٹھتا ہے۔ اب بھگتو خود ہی اپنے لیل و نہار.....

☆☆☆

میرا اور کسی پر بس نہیں چلا تو کال کر کے سعدیہ کے کان اینٹھے..... وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی کہ سبطین نے اتنی قسمیں، واسطے اور دلاسے دیے کہ اسے اگلنا پڑا۔

''اس نے پوچھا اور تم نے پھوٹ دیا؟'' مجھے جتنا غصہ آ سکتا تھا..... آ گیا۔ ''مرد ایسی باتیں ہزار بہانوں سے پوچھتے ہیں..... اتنا بھی نہیں پتا تمہیں.....؟ وہ عورت کا ڈسا ہوا ہے..... اتنی آسانی سے اگلی عورت پر کیسے بھروسا کرے گا۔''

''بس میری نادانی یا کم عقلی ہی کہہ لیں۔ اب میرے فرشتے بھی کیا جانیں..... اس آدمی کے دماغ و مزاج کی اڑان.....'' اس نے معصومیت کی انتہا کر دی۔ اسے نادانی یا کم عقلی تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''اب ایسی بھی معصوم یا بچی نہیں ہو..... خیر سے ٹیچر لگی ہو اسکول میں..... بچوں کو..... اسکول میں کیا عقل دیتی ہو.....''

''خیر ایسے معصوم یا بھولے تو سبطین بھی نہیں ہیں۔'' وہ جلد ہی اصلیت پر اتر آئی۔ ''ایسی ہی.... بے اعتباری یا میرے کردار کے لیے کوئی شک و شبہ تھا تو یہ کرید نکاح سے پہلے کی جا سکتی تھی۔ رشتہ لاتے ہی..... ماما نے مجھے ان کے سامنے لا بٹھایا تھا۔ اور رشتہ طے ہونے سے نکاح تک ہزار چکر میرے گھر کے لگائے تھے۔ ہم سب کے لیے تو ان کا آپ کا کزن ہونا ہی کافی تھا..... شادی کے لیے جو بنیادی باتیں..... لازمی ہوتی ہیں وہ آپ کے بھروسے ہی جانچ کر بنا..... کسی چھان پھٹک کے ہامی بھری گئی تھی۔ سبطین جس کاروبار، لاکھوں کی مالیت کے مکان کی بات کرتے ہیں سب ان کے باپ کی کمائی ہے..... ان کا اپنا کیا ہے؟ نکاح پر سبطین نے جو انگوٹھی پہنائی، اس کی قلعی کچھ دن میں ہی اتر گئی۔ مجھ سے زور، زبردستی میری خطا اگلوانے کے بعد..... میری زندگی تنگ کر کے رکھ دی ہے۔ میرا موبائل اپنے قبضے میں کر لیا..... نیو سم کے ساتھ جو موبائل دیا ہے..... وہ بھی استعمال شدہ گھٹیا..... جاب پر بھی پابندی لگا دی اور اب اپنے دُکھڑے آپ کے کانوں میں اتار آئے ہیں۔'' اس کی بات ٹھیک ہی تھی..... سبطین کو اس کی بابت کوئی خدشہ..... یا وسوسہ تھا تو یہ کرید نکاح سے پہلے کی جانی نکاح سے اگلے روز اس استفسار کا کیا مطلب.....؟

اتنا تو میں بھی جانتی تھی۔ اپنے بھاری بھرکم وجود کے سبب سعدیہ کی شادی اک مسئلہ تھی۔ سعدیہ کا..... گھرانا..... اک خوش حال گھرانا تھا..... مس شہناز سینئر گورنمنٹ ٹیچر اور انکل توفیق..... ایجی سن کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائرڈ تھے۔ مس شہناز عرصے سے..... ہیرا لائز تھیں۔ ان کی مکمل خبر گیری اور دیکھ بھال سعدیہ کی ذمے داری تھی۔ سعدیہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ جو خیر سے سارے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ سعدیہ کی بابت ان دونوں کو ہی دھڑکے، وسوسے ستاتے کہ اس کی زندگی کہیں رشتوں کی بے حسی کی بھینٹ نہ چڑھ جائے..... یہی وجہ تھی کہ سبطین کی سابقہ

شادی کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ خود سبطین جب دل چاہے وہاں دھاوا بول دیتا۔

''نکاح سے اب تک آنے بہانے ہزار پھیرے وہ بھی اچانک میرا کردار ایسا ہی مشکوک ہے تو آپ ان سے پوچھیے۔ کبھی کوئی قابلِ گرفت بات ان کی نظر سے گزری ہے؟'' میرے ذہن میں اِک جھماکا سا ہوا..... چوبیس گھنٹے سعدیہ کی ڈیوٹی اس کی ماما کے ساتھ لگی رہتی..... اس کا اپنا کمرا بیرونی رخ پر کھلتے دروازے کے ساتھ تھا۔ دن بھر گھر میں ان دونوں کے سوا اک بھابی رہتی تھیں۔ جس کے لیے ہر روز میکا یاترا فرض تھی۔

منٹوں، سیکنڈوں میں سعدیہ کی پالیسی میری عقل میں سما گئی..... اب سعدیہ اتنی بھی کم عقل یا نادان نہیں تھی..... سبطین جذباتی و جلد باز لڑکا تھا۔ اور یہ سعدیہ بھی سمجھ گئی تھی۔ اپنے تئیں اس نے سبطین کے پھیرے منہ زور طوفانوں جیسے مزاج پر بند باندھے تھے۔ نکاح کا بندھن مضبوط بندھن ہوتا ہے۔ وہ کبھی حد بندیاں بھلا بیٹھتا تو سعدیہ کا بھید کھل ہی جانا تھا سو اس نے اپنی خطا پر بند باندھنے کو یہ پالیسی چلی تھی۔

''کم عمری کا دور..... نادانی و کم عقلی کا ہوتا ہے۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ سبطین جذباتی مگر نیک دل انسان ہیں، میں انہیں سمجھا، منالوں گی..... کہ یہ سب نادانی و کم عقلی کی باتیں تھیں..... اب تو وہی میرا سب کچھ ہیں.....'' سعدیہ نے بظاہر سہل سے انداز میں کہا تھا۔ مگر بات ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ اور منہ سے نکلی بات کمان سے نکلا تیر کہاں واپس آتے ہیں۔ سبطین کا سنجیدہ انداز..... یہ تو میں ہی جانتی..... سبطین کا مزاج بیڑھا تھا کسی مرد کے دل و دماغ میں پھنسی خلش کی پھانس سمجھا..... منا کر نکال دی جائے تو کیا ہی کہنے.....

میری سوچ اک نئے رخ پر سفر کرنے لگی تھی۔ اس نکاح میں عجلت کی وجہ تو یہی بنتی تھی کہ سعدیہ کا کوئی سیاہ کارنامہ منظرِ عام پر آنے کو تھا۔ جس پر پردہ ڈالنے کو سبطین کے رشتے کو نعمتِ خداوندی سمجھتے ہوئے آؤ دیکھا نہ تاؤ نکاح کا ملمع چڑھا دیا گیا تھا۔ بات صاف تھی، سمجھ میں ذرا تاخیر سے سمائی۔ اور ایسا ہوتا ہے ناں کہ جس بات کا سارے فسانے میں کہیں ذکر ہی نہ ہو..... وہی حاصلِ تحریر ٹھہرتی ہے۔

☆☆☆

یہ ان ہی الجھے بکھرے دنوں کی بات تھی کہ میرا ٹکراؤ فریدہ آپا سے ہوا..... اور اک میرے استفسار کی دیر تھی کہ فریدہ آپا پھٹ پڑیں..... بنا رکے میرے وہ لتے لیے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

''حد کرتی ہو..... رباب، انسان قدم اٹھاتا ہے تو دیوار سے بھی مشورہ کر ہی لیتا ہے..... تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے جو یہ بھی بھول گئیں کہ کتنے سال میں شفیقہ خالہ کے پڑوس میں رہ کر آئی ہوں..... ان کے لیل و نہار مجھ سے بڑھ کر کون جانے گا..... سبطین کی پہلی شادی سے پہلے اس کی بات اپنی فریحہ (بھانجی) سے بھی چلی تھی۔ اور بات شفیقہ خالہ تک ہو تو سر آنکھوں پر..... مگر ان کے گھرانے کا انتشار و کشمکش..... اللہ کی پناہ..... اے بی بی..... دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ سبطین کا گھر اجڑنے کے پیچھے جو بھی حقائق تھے وہ اللہ ہی جانے..... مگر میری آنکھوں دیکھی تو یہ رہی کہ سبطین ہو یا عبدالعزیز ان کی اپنی اوقات دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔ باپ کے مکان اور پیسے پر دیدے گاڑے بیٹھے ہیں خالو مختار نے بھلے وقتوں میں کاروبار کی نیت سے جو پلاٹ لیا تھا..... اس پر تالا پڑا منہ چڑاتا ہے۔ ریٹائرمنٹ پر گریجویٹی فکسڈ ڈیپازٹ کروا دی..... تو ان کی دوا دارو، دال دلیا چل رہا ہے۔ وہ خود شوگر، ہائی بلڈ پریشر کے مریض..... اس پر شفیقہ خالہ کی بیماری پر ہزاروں کا خرچ بنتی، بیٹے..... اگر مل کر باپ کے کاروبار کو کھڑا کر دیتے تو کاہے کو یہ لالے پڑتے.....؟ کوئی تو وجہ تھی کہ گھر کے بگڑے نظام کے باوجود بھی خالہ شفیقہ، سبطین کی دوسری شادی سے گریزاں تھیں۔ تم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میدان میں اتر آئیں..... کم از کم بندہ یہ تو دیکھتا ہے کہ لڑکے کا ماضی کیوں داغ دار ہے۔ لڑکے کی اپنی حیثیت کیا

ہے..... گھر کا خرچ، نیناں کی تنخواہ سے چلتا ہے۔ وہ سر چڑھ کر بولتی ہے تو اس کا ذمہ ان دونوں کی غیر ذمے داری ہے۔ باپ کا گھر..... کاروبار یا پیسے سے ہٹ کر ان کی اپنی کیا حیثیت ہے، کبھی پوچھنا ضرور۔"

ان کی باتوں سے میری آنکھیں چوپٹ کھل گئیں..... اک، اِک کر کے نظروں کے سامنے سے سارے پردے ہٹتے چلے گئے..... وہ جو کچھ کہہ رہی تھیں نظر بھی آرہا تھا۔ میری خطا یہ رہی کہ اس کی سابقہ زندگی کی ناکامی کے عقب میں چھپے حقائق کو کریدنے کی زحمت کیے بغیر..... سبطین کی غیر مستحکم حیثیت..... تک نہ پہنچ سکی۔

میرے زیرِ نظر تو بس شفیقہ خالہ کے گھر کا بگڑا، بکھرا نظام رہا..... مگر اس تمام الجھاؤ، بکھراؤ اور بگاڑ کا کریڈٹ صرف ایک سبطین ہی کو نہیں..... ان کی ہر اولاد کو جاتا تھا۔ شطرنج کے مہرے مقام چھوڑ دیں..... تو بساط بگڑ ہی جاتی ہے۔ مگر یہ بھی ٹھیک ہی تھا کہ انسان سوئی بھی لیتا ہے تو چھان پھٹک کر ہی لیتا ہے۔ اور کاش چھان پھٹک ہو ہی جاتی مگر ہائے ری قسمت..... مجھے رہ، رہ کر اپنی بے خبری، کوتاہی پر افسوس ہو رہا تھا۔ میرے فرشتوں کو بھی کیا خبر اس چھوٹی سی کوتاہی کے عقب میں اِک عظیم بگاڑ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ یہ نیا پار لگنے کی مجھے اب خود بھی امید نہیں تھی..... ڈر تو یہ تھا کہ یہ بگاڑ و انتشار بڑھا تو میرا نازک وجود زیرِ عتاب نہ آجائے' میں نے اس معاملے پر خاک ڈال کر ہاتھ جھاڑے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میرے ذہن کو الجھانے کو میرے اپنے جھنجٹ بہتیرے۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے اپنے ہی معاملات الجھائے رکھتے..... مجھے وقت ہی کہاں تھا۔ ان بکھیڑوں میں اپنا سر کھپانے کا..... سو سر جھٹک کر ہاتھ جھاڑے۔ سبطین اور سعدیہ کے درمیان کیا مذاکرات رہے..... سعدیہ نے اس سے کیا کہا تھا..... اور جانے ان دونوں کے درمیان کیا طے پایا..... سبطین شادی کا کارڈ لے کر آیا تو قدرے شانت سا تھا..... میں نے کریدنا چاہا تو اڑ گیا۔

بیاری دعا

"پیدا کیا انسان کو تاکہ وہ صرف عبادت کریں....." (القران)..... کل کے بچے آج کے اماں، ابا بن گئے اس ساری ہمہ ہمی میں کتنے خوش نصیب ہیں جن کو اول تا آخر اللہ ہمیشہ ہر حال میں یاد رہا۔ جبکہ مقصد تخلیق جن و انس فقط عبادت الٰہی ہے (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ) مگر ہم اس آیت کو بھول کر کس چکر میں پڑ گئے۔ اللہ ہم سب کو اس ہدایت سے نوازے۔ آخرت کی طالب.....

دعا گو: حدیث اختر، بہاول پور

ماں عظیم ہستی

خوابوں کی وادی میں ماں سے ملی
کھل اٹھی میں جب ماں مسکرا کر ملی
جب مجھے گلے لگایا نور کے ہالے نے
دلِ ناشاد کو مسرت گوناگوں و بے پناہ ملی
دنیا میں جو تھی دکھ درد تکلیف میں
خوابوں میں وہ صحت مند اور خوش ملی
دنیا میں جو تھی بظاہر دور، نہ آتی نظر
خوابوں میں بانہوں کے حصار میں ملی
جُدا ہو بھی جائے تو کہاں دور ہوتی ہے
ممتا کی مخصوص خوشبو اپنے اطراف ملی
کہتی تھی صبر و حوصلہ اور درگزر کرتے رہو
یہی باتیں خواب میں بھی سمجھاتی ملی
لاکھ درد سہے کوئی پہچان سکتا نہیں
یہ نظر خاص تو بس ماں کو ملی
ماں کی دعاؤں سے ہی خوشیاں ہیں تمام
ماں کیا گئی کوئی خوشی، خوشی نہ رہی
سر پر ہاتھ رکھ کر جو ماں دعا پیار دیتی
وہی محبت چاہت خواب میں دیتی ملی
کیسے کہہ دوں کہ ماں بچھڑ گئی مجھ سے
ماں جی تو ہر لمحہ نظروں کے سامنے ملی

دل کی پکار، از: ریما نور رضوان، کراچی

''جانے بھی دیجیے آپی..... دنیا ہے..... چلتا ہے..... ایسا ہی ہوتا ہے۔'' اور وہ ایسا ہی باظرف ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔

''سنو..... میں نے کہیں پڑھا تھا..... خدا تو بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے۔ اگر دنیا کے آدھے مرد بھی عورت کی خطا معاف کر دیں تو دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔''

''جانے دیں آپی..... کتابیں اور کتابوں کی باتیں..... دل کا بہلاوا..... اِک ڈھکوسلا ہوتی ہیں۔''

''اگر تم نے اپنا فیصلہ بدل ہی لیا ہے تو خلوصِ دل اور نیک نیتی کے ساتھ قدم اٹھانا..... میں تو بس اتنا کہنا چاہتی ہوں.....''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں..... سب کچھ یہاں.....'' اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ ''اس دل سے ہوتا ہے..... اور جب یہ دل خالی ہو جاتا ہے ناں تو انسان صفر ہو جاتا ہے۔''

''وہی تو میں کہتی ہوں یہ رشتے، ناتے، سب دلوں کے سودے ہوتے ہیں۔ دلوں میں اخلاص، نیتوں میں راستی نہ ہو تو..... رشتے کھوکھلے پڑ جاتے ہیں۔ کھوکھلے رشتوں کا بوجھ کوئی کہاں تک گھسیٹ سکتا ہے۔''

''او..... خیر ہے آپی جی..... عورت کو جوتی تلے دبا کر رکھنے کے لیے اس کی دکھتی رگ ہاتھ آ جانا بھی قسمت ہے..... ورنہ پیر کی جوتی سر کو چڑھ جاتی ہے۔ سعدیہ نے اپنی اسی خطا کے سبب مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کبھی میرے سامنے سر نہیں اٹھائے گی..... ہمیشہ میرے جوتے تلے دب کے رہے گی۔''

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھ پر سبطین کی نیت و ارادے واضح ہو گئے۔

سعدیہ کے منہ سے زبردستی..... اس کے کردار کی

[illegible]

بدو سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک جا پہنچی..... بات گھوم گھام کر وہیں آن رکتی کہ... گھر نیناں کی کمائی پر چلتا

جھانکتا ہے..... سبطین نے اپنی غیر مستحکم حیثیت کی بابت پردہ پوشی سے کام لیا تھا..... اس سب کا سرا اسی بات سے جا کر ملتا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہی تھا کہ اس کا ماضی داغ دار تھا..... دوسری طلاق کا ٹیگ اس کے مستقبل کو گہرے اندھیرے میں دھکیل دیتا..... اسی کا وجود لائق نفرین ٹھہرتا اب در پردہ حقائق کون کھنگالتا ہے۔ ان تمام باتوں کا سرا اسی ایک بات سے جا کر ملتا ہے کہ سعدیہ کو اس کی صفر حیثیت کے ساتھ منظور کرنے میں سبطین کے زیرِ نظر اس کی اپنی کمزوریاں تھیں۔ یہ اور بات کہ سعدیہ کے کردار کی کمزوری پکڑ کر اسے جوتی تلے دبا کر رکھنے کی سوچ نیت کا فتور ہی نہیں..... گھٹیا پن اور خباثت بھی تھی۔ دلوں کے سودے، نیت کی راستی پر استوار کیے جاتے ہیں..... سو مجھے یہ ناؤ ڈولتی ہی محسوس ہوتی تھی۔ سچ تو تھا کہ معاملہ اتنے خطرناک رخ پر جا نکلا تھا کہ مجھے ہاتھ جھاڑ لینے ہی میں اپنی نازک گردن کی عافیت نظر آئی۔ یہ اور بات کہ شادی کے بعد اس معاملے کا بگاڑ مجھے صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔

اک فاش غلطی کے اعتراف نے سعدیہ کی حیثیت دو کوڑی کی کر دی تھی۔ سبطین کے دل میں اس کے لیے گرہ پڑ گئی تھی۔ سبطین اور سعدیہ کی شادی جس وقت پر ہونا قرار پائی تھی، اسی وقت پر انجام پائی اور بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی نظر آتا تھا مگر جانے کیوں اِک عجیب سی خلش رہ، رہ کر دل میں چبھتی تھی کہ کچھ تھا تو جو غلط تھا اور غلط ہونے جا رہا تھا۔ اور یہ میں ہی جانتی تھی اور کبھی، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹی، چھوٹی باتیں مل کر اک بڑی بات کی وجہ بن جاتی ہیں۔ اور کبھی ان ہی چھوٹی، چھوٹی باتوں کے عقب میں ایک بڑی بات چھپی ہوتی ہے..... سبطین نے اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کے سبب سعدیہ کی اِک فاش غلطی دیا تو لی تھی

''جانے بھی دیجیے آپی..... دنیا ہے..... چلتا ہے..... ایسا ہی ہوتا ہے۔'' اور وہ ایسا ہی باظرف ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔

''سنو..... میں نے کہیں پڑھا تھا..... خدا تو بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے۔ اگر دنیا کے آدھے مرد بھی عورت کی خطا معاف کر دیں تو دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔''

''جانے دیں آپی..... کتابیں اور کتابوں کی باتیں..... دل کا بہلاوا..... اِک ڈھکوسلا ہوتی ہیں۔''

''اگر تم نے اپنا فیصلہ بدل ہی لیا ہے تو خلوصِ دل اور نیک نیتی کے ساتھ قدم اٹھانا..... میں تو بس اتنا کہنا چاہتی ہوں.....''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں..... سب کچھ یہاں.....'' اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔ ''اس دل سے ہوتا ہے..... اور جب یہ دل خالی ہو جاتا ہے ناں تو انسان صفر ہو جاتا ہے۔''

''وہی تو میں کہتی ہوں یہ رشتے، ناتے، سب دلوں کے سودے ہوتے ہیں۔ دلوں میں اخلاص، نیتوں میں راستی نہ ہو تو..... رشتے کھوکھلے پڑ جاتے ہیں۔ کھوکھلے رشتوں کا بوجھ کوئی کہاں تک گھسیٹ سکتا ہے۔''

''او..... خیر ہے آپی جی..... عورت کو جوتی تلے دبا کر رکھنے کے لیے اس کی دکھتی رگ ہاتھ آ جانا بھی قسمت ہے..... ورنہ پیر کی جوتی سر کو چڑھ جاتی ہے۔ سعدیہ نے اپنی اسی خطا کے سبب مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کبھی میرے سامنے سر نہیں اٹھائے گی..... ہمیشہ میرے جوتے تلے دب کے رہے گی۔''

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھ پر سبطین کی نیت و ارادے واضح ہو گئے۔

سعدیہ کے منہ سے زبردستی..... اس کے کردار کی کجی اگلوانے کے پس پردہ سبطین کی اپنی کمزوریاں تھیں..... پہلی بیوی نے اس کی چھاتی پر چڑھ کر فیصلہ لیا تھا..... وہ عورت ذات سے بھروسا کھو بیٹھا تھا۔ یہیں آ کر..... سعدیہ کی وہ بات درست ثابت ہو جاتی کہ دوسروں کے کیڑے چنتے اپنے گریبان میں کون جھانکتا ہے..... سبطین نے اپنی غیر مکمل حیثیت کی بابت پردہ پوشی سے کام لیا تھا..... اس سب کا سرا اسی بات سے جا کر ملتا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہی تھا کہ اس کا ماضی داغ دار تھا..... دوسری طلاق کا ٹیگ اس کے مستقبل کو گہرے اندھیرے میں دھکیل دیتا..... اسی کا وجود لائق نفرین ٹھہرتا اب در پردہ حقائق کون کھنگالتا ہے۔ ان تمام باتوں کا سرا اسی ایک بات سے جا کر ملتا ہے کہ سعدیہ کو اس کی صفر حیثیت کے ساتھ منظور کرنے میں سبطین کے زیرِ نظر اس کی اپنی کمزوریاں تھیں۔ یہ اور بات کہ سعدیہ کے کردار کی کمزوری پکڑ کر اسے جوتی تلے دبا کر رکھنے کی سوچ نیت کا فتور ہی نہیں..... گھٹیا پن اور خباثت بھی تھی۔ دلوں کے سودے، نیت کی راستی پر استوار کیے جاتے ہیں..... سو مجھے یہ ناؤ ڈولتی ہی محسوس ہوتی تھی۔ سچ تو تھا کہ معاملہ اتنے خطرناک رخ پر جا نکلا تھا کہ مجھے ہاتھ جھاڑ لینے ہی میں اپنی نازک گردن کی عافیت نظر آئی۔ یہ اور بات کہ شادی کے بعد اس معاملے کا بگاڑ مجھے صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔

اک فاش غلطی کے اعتراف نے سعدیہ کی حیثیت دو کوڑی کی کر دی تھی۔ سبطین کے دل میں اس کے لیے گرہ پڑ گئی تھی۔ سبطین اور سعدیہ کی شادی جس وقت پر ہونا قرار پائی تھی، اسی وقت پر انجام پائی اور بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی نظر آتا تھا مگر جانے کیوں اِک عجیب سی خلش رہ رہ کر دل میں چبھتی تھی کہ کچھ تھا تو جو غلط تھا اور غلط ہونے جا رہا تھا۔ اور یہ میں ہی جانتی تھی اور کبھی، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹی، چھوٹی باتیں مل کر اک بڑی بات کی وجہ بن جاتی ہیں۔ اور کبھی ان ہی چھوٹی، چھوٹی باتوں کے عقب میں ایک بڑی بات چھپی ہوتی ہے..... سبطین نے اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کے سبب سعدیہ کی اِک فاش غلطی دبا تو لی تھی مگر اس کے اندر کی خلش اپنی جگہ تھی۔ یہ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد کی بات تھی۔ سسرال کی رنجشیں وجہِ تنازع بنیں تو پہلا تنازع نند بھاوج کے درمیان ہوا۔ بات دو بدو سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک جا پہنچی..... بات گھوم گھام کر وہیں آن رکتی کہ..... گھر نیناں کی کمائی پر چلتا

تھا..... سو اس کا سکہ چلتا تھا۔ والدین کا جھکاؤ بھی اسی کی جانب رہتا سنا کہ نیناں نے چاقو تک اٹھالیا کہ ان دونوں نے گھر نہ چھوڑا تو وہ اپنی جان لے، لے گی۔ سبطین کو سعدیہ سمیت بھاگتے ہی بن پڑی۔

مجھے سب سن کر افسوس ہوا..... شفیقہ خالہ کی کال میرے پاس آئی..... وہ سبطین کے لیے مضطرب تھیں جو بوریا بستر اٹھا کر سعدیہ کے سنگ سسرال جا پڑا تھا..... میں نے سمجھانے بجھانے کو دونوں کو بلایا۔ ماں، باپ کے بڑھاپے کا واسطہ دیا..... تو وہ اپنے دُکھڑے لے کر بیٹھ گئے۔

''عبدالعزیز اور نیناں، باپ کی جاگیر پر صرف اپنا حق سمجھتے ہیں۔ کبھی تو وہ عبدالعزیز، ہمارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دینے پر تلا بیٹھا ہے..... مان لیجیے کہ یہ عبدالعزیز اور نیناں کا ہمارے قدم اکھاڑنے کا پلان تھا..... ذرا سی بات کو فساد بنا کر ہمیں گھر سے نکالنے کو دھمکانا۔'' سعدیہ بلا کی بدزبان تھی۔

''چلو یونہی سہی..... تو تم کیوں ان سے کنارہ کشی کر کے ان کے ارادے مضبوط کر رہی ہو..... گھر پر جتنا حق ان کا ہے اتنا ہی تمہارا بھی ہے۔ اتنی ذرا، ذرا سی رنجشوں کا سرا پکڑ کر بیٹھ گئیں تو چل پڑی گاڑی.....'' میں نے سہل لفظوں میں سمجھ لیا۔ اِدھر سعدیہ کی وہی اک رٹ کہ جب تک نیناں اس گھر میں ہے وہ وہاں نہیں جائے گی..... ورنہ یہ فسادات ہوتے رہیں گے۔

''اب یوں تو نہ کہو..... کہ سارا قصور اسی کا ہے۔ تم نے بھی تو حد کر دی..... نیناں کا گلا دبوچ کر اسے دیوار سے لگا دیا..... اگر بیچ بچاؤ نہ ہوتا تو تم جان ہی لے لیتیں اس کی؟'' مجھے سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی..... کہاں لحیم شحیم سعدیہ اور کہاں دھان پان سی نیناں..... بات سعدیہ کی اپنی غلطی پر آئی تو وہ بات گھما گئی۔

''آپ نیناں کو کیا کم سمجھتی ہیں، گھر بھر پر اسی کی حکومت ہے..... پائی، پائی کا حساب رکھتی ہے۔ شادی میں پیسہ اس کا لگا تھا..... ولیمے کے اگلے دن ساری سلامی اس کے کھیسے میں چلی گئی۔ پائی، پائی کا حساب کیا.....''

اب میں کہتی کیا بھلی لگتی کہ جب شادی میں پیسہ نیناں کا لگا تھا تو اتنا تو اس کا حق بنتا تھا۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''سعدیہ سسرال میں اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے، ماں، باپ کے بڑھاپے کا خیال کرو.....'' شفیقہ خالہ کا دل سبطین میں پڑ گیا تھا۔ وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اس کے میکے سے اسے شہہ مل رہی تھی۔ ایسا فساد اگلی بار نہیں ہوگا اس کی کیا گارنٹی ہے اور اس نے بھی وہی رٹ پکڑی ہوئی تھی۔

''جانے بھی دو..... نیناں لڑکی ہے..... کب تک رہے گی..... آج نہیں تو کل اس کی شادی ہو ہی جانی ہے۔''

مگر بات گھوم گھام کر وہی سبطین کی صفر حیثیت پر آن رکی۔ سارا گھرانا نیناں کے ٹکڑوں پر پلتا تھا۔ اس کی شادی سے بگاڑ ہی پیدا ہونا تھا۔ اپنی زندگی خود جینے کے سبطین اور سعدیہ کے ارادے عروج پر تھے..... سبطین نے سعدیہ کو نوکری جاری رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔

میں نے لاکھ سر پھوڑا۔ اپنی ساری زندگی رگڑ کر بھی وہ اتنا نہیں بنا سکتے..... جتنی ماں، باپ کی ملکیت تھی..... سعدیہ عورت تھی، اولاد کے سلسلے چل نکلے تو کیسی نوکری اور کہاں کی خواری۔ کوئی پکی مضبوط نوکری ہوتی تو اتنے جھنجٹ پالتی بھی بھلی لگتی..... پرائیویٹ اسکول کی معمولی ٹیچر کی نوکری تھی..... اور یہ کہ باپ کی جاگیر میں جتنا حصے دار عبدالعزیز ہے اتنا ہی سبطین بھی ہے۔ یہ نکتہ سعدیہ کی سمجھ میں آیا نہ آیا سبطین نے ضرور اس نکتے کو پکڑ لیا۔ اپنے ناکارہ پن سمیت، سسرال میں پڑاؤ کے چند دنوں نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ پرائے در پر مفت کی روٹیاں کوئی کب تک کھلاتا اور کیوں کھلاتا۔ سعدیہ نے سسرال میں گنتی کے چند دن گزارے تھے اور ان چند دنوں نے اس پر اس گھر کا انتشار اور بگاڑ اچھی طرح واضح کر دیا تھا۔ سبطین کی صفر

حیثیت کی قلعی نکاح کی انگوٹھی کے مانند اتر گئی تھی۔ اور وہ جو کہا گیا ہے کہ تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے تو جہاں سبطین کے گھر کا انتشار و بگاڑ..... سبطین کے ناکارہ پن سمیت سعدیہ پر کھلا تھا وہاں سعدیہ کی مجبوریاں بھی کھل کر سامنے آئیں۔ اپنے میکے میں سعدیہ کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی تھی..... پیرالائزڈ ماں کی فل ٹائم دیکھ بھال کوئی معمولی کام نہ تھا۔ سعدیہ نے سسرال میں گنتی کے جو چند دن گزارے تھے ان میں یہ فل ٹائم کام سعدیہ کی بھاوج کے سر پر آپڑا تھا..... سو وہ جلتی پر تیل چھڑکنے اور سسرال چھوڑ کر مستقل پڑاؤ کا مطالبہ..... اک ضد پکڑ گیا تھا۔

سبطین نے اپنی بگڑی روش کو سدھار کر باپ کا دست راست بننے کے بجائے عبدالعزیز کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے والدین کے گوشۂ عافیت میں پناہ ڈھونڈلی۔ سسرال میں اس کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی..... سسر صاحب نے کہیں کہہ سن کر اس کی نوکری لگوا بھی دی تھی۔ مگر اس کے وہی شاہانہ مزاج اس تمام الجھاؤ، بکھراؤ اور بگاڑ کا سرا سبطین کے ناکارہ پن سے جا کر ملتا تھا..... جس کے سبب اس نے سعدیہ کو اس کے کردار کی خامی سمیت منظور کیا تھا..... مگر اس کو جوتی تلے دبا کر رکھنے میں ناکام ہو گیا تھا تو اپنی تند خوئی کے سبب شادی کے ابتدائی دنوں کا خمار اترتے ہی جو عود کر آئی تھی۔ حالات کے بگاڑ نے اس کے اندر زہر ہی زہر بھر دیا تھا۔

ان دونوں کے مابین کھینچ تان شروع ہوئی تو سبطین کے اندر خوابیدہ خلش کو زبان مل گئی۔ اس نے سعدیہ کے کردار کی بخی کو اچھال کر اس کی کردار کشی شروع کر دی تو سعدیہ کا دبنگ اور پاور فل ٹیملی کی جانب سے سبطین کی منہ زوریوں کے پتھر اینٹ بن کر پڑنے لگے۔ سعدیہ کی ٹیملی اب کسی قیمت پر مصالحت یا سمجھوتے پر آمادہ نہ تھی..... بات بگڑ کر عدالت تک جا پہنچی۔ سعدیہ کو جوتی تلے دبا کر رکھنے کا سبطین کا ارادہ الٹا جوتا بن کر اس کے منہ پر پڑ گیا تھا۔ اس کی ساری پھوں پھاں نکل گئی..... اس کی زندگی دوسری بار دو اور پر لگ گئی تھی۔ وہ بری طرح بکھرا تھا۔ دوسری بار اس کی زندگی کی ناکامی اس کی خامیوں کا حاصل تھی..... مگر کون مانتا..... وہ ٹوٹ کر ہار گیا تھا۔ مگر سعدیہ کے گھر سے اس کے سارے واسطے، ترلے واپس لوٹائے جا رہے تھے کہ وہ اپنی منہ زوری اور ناکارہ پن کے سبب اپنا بھروسا کھو بیٹھا تھا۔ شفیقہ خالہ بیٹے کی اجڑی بکھری حالت پر بلک اٹھی تھیں..... اسے اپنا ہوش تھا نہ بھوک پیاس کی خبر..... گھنٹوں گھر سے غائب رہتا..... یا تادیر بیٹھا خلا میں گھورتا رہتا۔ سعدیہ کی جانب سے ایک کے بعد ایک عدالتی نوٹس سبطین کی عدم موجودگی کا عذر کر کے بالا ہی بالا لوٹائے جا چکے تھے..... وہ کسی نئے دھچکے پر مزید بکھر اٹھتا۔ شفیقہ خالہ میرے سامنے بلک اٹھیں تو میں نے ان کی خاطر بگڑے ہوئے معاملے کو سلجھاؤ دینے کی اک آخری کوشش کے لیے سعدیہ کے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ سیدھے سبھاؤ عدالتی حکم نامہ میرے ہاتھ پر لا دھرا گیا..... یکے بعد دیگرے عدالتی نوٹس کی..... عدم وصولی پر یک طرفہ خلع کا فیصلہ سعدیہ کے حق میں دے دیا گیا تھا..... میں بے نیل و مرام لوٹی تو خانہ شفیقہ و سبطین میرے منتظر تھے۔

''یاد رہے میں نے تم سے کہا تھا ناں..... رشتوں میں خلوص و نیک نیتی نہ ہو تو رشتے کھوکھلے پڑ جاتے ہیں.....'' میں نے سبطین کو ملامتی نظروں سے تکا تھا۔ ''اور کھوکھلے رشتوں کا بوجھ..... کوئی کہاں تک گھسیٹ سکتا ہے؟''

میں نے خلع نامے کی کاپی شفیقہ خالہ کے ہاتھ میں تھمائی تو سبطین میرے قدموں میں بیٹھ کر روتا ہی چلا گیا۔

جہاں رشتوں میں گرہیں پر گرہیں پڑتی رہیں اور کھوٹ پر کھوٹ شامل ہو تو وہاں رشتوں کی ڈور مضبوط و دیرپا کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ بات اگر لوگ باگ سمجھ لیں تو خالہ شفیقہ کے گھر جیسے حالات کی نوبت ہی نہ آئے۔ میں اسے روتا بلکتا چھوڑ..... کر اپنے گھر کی طرف چل دی تھی کہ اپنے گھریلو معاملات کو بھی قابو میں رکھنا تھا۔

❁❁❁

فنا فی العشق

حمیرا نوشین

آفتاب جتنی آب و تاب سے چمکتا تھا اسی آب و تاب سے غلام دین کے گھر میں روشنیاں اتری تھیں۔ سرخ چمپا لگے دوپٹے میں رومیصہ کا ماہتابی چہرہ دمک رہا تھا، چھوٹے کانوں میں بڑے، بڑے کندن کے جھمکے ہلتے تو اس کے چہرے پر پڑتا عکس اسے اور بھی دلکش بنا دیتا۔

''سدا جوڑ قائم رہے میری دھی کا.....'' ارجنا سنگھ نے اس کے منہ میں موتی چور کا لڈو بھرا اور ہاتھوں میں چاندی کے کنگن پہنائے، ساتھ لگا کر دیر تک پیار کیا۔ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ لے کر چوما اور

سادھنا کے لیے جگہ خالی کی جو کب سے اسے گلے لگانے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

ساری لڑکیاں بالیاں، محلے کی خواتین، غلام دین کے بڑے سے آنگن میں جمع تھیں، سرما کی خوشگوار دھوپ میں سب کے چہرے خوشی کا تاثر لیے تھے۔ برآمدے کے ستون سے بیلے کی کلیاں لپٹی تھیں۔ تخت پوش پر مٹھائی کے تھال دھرے تھے، ساتھ ہی چوڑے نواڑی پلنگ پر رومیصہ کے سسرال سے آیا سگائی (منگنی) کا سامان سجا تھا۔

ایک طرف رومیصہ کے سسرال والوں کو دیے جانے والا سامان رکھا تھا، فخر دین کی سفید تہ بند، بوسکی کی قمیص، رومیصہ کی نندوں کے گوٹا کناری لگے سوٹ، ساس کا دوشالا، لڑکے کی بھاری سونے کی انگوٹھی، چاندی کے بٹن سبھی کچھ جگمگا رہا تھا۔

''بھابو جتنی سو ہنڑی (پیاری) ہماری دھی ہے اسی حساب سے رج (بہت زیادہ) پیار دینا!''

pklibrary.com

ارجنا نے عذرا کو باور کرایا۔

''زیادہ نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، دھی جب گھر میں قدم رکھتی ہے تو محبت پہلے اپنے پنجے جما لیتی ہے۔ اللہ وہ وقت لائے جب میری رانی میرے گھر میں رونق لگائے گی۔'' مصنوعی خفگی سے عذرا نے ارجنا کو ڈپٹا اور رومیصہ کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا تو نبیلہ کا دل اندر تک سرور پا گیا۔ رومیصہ ٹھنڈے برف ہاتھ چاچی کے ہاتھ میں دیے بس شرما کر مسکراتی رہی۔

عذرا نے اس کے چاندی جیسے دمکتے حسن پر سے نظریں ہٹا کر جلدی سے پیسے وار کر ساتھ کھڑی ڈومنی کی طرف بڑھائے، اس نے لپک کر تھامے۔

''خیر ہو میری رانی کی، نظر نہ لگے شالا وسدی رہے۔'' جیسے، جیسے اس کے ہاتھوں میں پیسے آتے جا رہے تھے ویسے، ویسے اس کی دعاؤں کے سلسلے طویل ہوتے جا رہے تھے۔

''چل بس کر اب، بڑی پیرنی بنی ہے تو..... آجا اب اپنے رنگ میں، لگا دے دو ٹھمکے، ہلا دے اپنے بھنبھے وجود سے اس گھر کے در و دیوار.....'' موہن سنگھ کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صحن کے بیچوں بیچ کھڑا کیا اور ڈومنی دوپٹا کس کر فوراً حرکت میں آ گئی۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے لڑکے کی تائی، چاچیاں، ہمسائیاں سبھی میدان میں اتر آئیں۔ ہنسی مذاق..... بے باک جملے..... پھبتیاں ماحول رنگین ہو گیا اور اپنے گھر کی چھت پر کھڑا رومیصہ کے گھر کو تکتا ابصار تصور کی آنکھ سے اس پیکر جمال کو تک رہا تھا، جس کے ہاتھ میں اس کے نام کی انگوٹھی آج سج گئی تھی۔

☆☆☆

سرخ چوڑیاں اس کی گوری کلائیوں میں کھنک رہی تھیں، ان کے چھن، چھن بجنے پر رومیصہ کا دل ہلکورے لینے لگا وہ چوڑیوں پر اپنا ہاتھ بار، بار پھیرتی اور مسکا دیتی۔

''اب بس بھی کرو ان پر ہاتھ پھیرنا، کیا سارا پارہ ہاتھوں سے ہی صاف کر دو گی۔'' سنبل، رومیصہ کے ساتھ ہی رضائی میں گھس گئی۔

''یہ پارہ پیار کا ہے اور پیار اتنا کچا نہیں کہ ہاتھ لگانے سے اتر جائے.....'' رومیصہ نے ایک بار پھر مسکرا کر ان پر ہاتھ پھیرا تو سنبل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''واہ جی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی، اُدھر ابصار بھیا تمہارے کاڑھے ہوئے رومال پر بار، بار ہاتھ پھیر کر ایسے مسکرا رہے ہیں جیسے محبوبہ کے مرمریں بدن پر ہاتھ پھسل رہا ہو۔'' فرحت اچانک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔

''شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے اگر اماں نے سن لیا تو.....''

''لو اماں نے سن لیا تو کیا اماں نے تو دیکھ بھی لیا ہے۔'' سنبل نے پھر اسے بتایا۔

''رومال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے؟'' اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔

''ارے نہیں رومال..... اس دن اماں نے تکیوں کے غلاف نکالنے کے لیے ٹرنک کھولا تو تمہارا چھپایا ہوا رومال ان کے ہاتھ لگ گیا مجھ سے پوچھنے لگیں کڑھائی تو یہ رومیصہ کے ہاتھ کی ہے پر اس پر لکھا کیا ہے۔

''تم نے بتایا تو نہیں کہ اس پر ان کا نام ہے.....'' رومیصہ کا دم خشک ہو گیا۔

''لو بتاتی کیوں نہیں، اب کیا تمہاری خاطر اماں سے جھوٹ بولنا شروع کر دوں.....''

''ہاں، ہاں ویسے تو، تو بڑی سچ کی پوٹلی ہے ناں، غیرت نہیں آئی تجھے..... بہن کا بھرم رکھ لیتی تو کیا جاتا.....'' رومیصہ نے سنبل پر مکوں کی برسات کر دی۔

''صرف یہی نہیں بلکہ جس دن تم ٹھٹرتی شام میں چچی کی طرف جا رہی تھیں اور اماں تمہیں ٹھنڈ کی وجہ سے روک رہی تھیں کہ مت جاؤ..... میں نے ہی تمہاری سفارش کی تھی کہ جانے دو اماں، ابصار بھائی کو رومال دینے جا رہی ہے، کتنے دن بعد تو وہ اپنے ننھیال سے آئے ہیں۔'' سنبل نے اسے مزید تپایا تو وہ جل کر خاک ہو گئی۔

فرحت اور سنبل اس کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنس رہی تھیں اور اسے یہ سوچ کر ہی شرم آ رہی تھی کہ اماں اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی۔

پتا ہے کہ تم دونوں ایک دوجے کو کتنا چاہتے ہو.....'' فرحت نے اسے مزید چھیڑا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

☆☆☆

غلام دین اور فخر دین دونوں سگے بھائی لدھیانہ کے ایک ہی محلے میں آباد تھے، ایک دوسرے پر جان چھڑکتے، دکھ سکھ کے ساتھی اور یہ دونوں بھائی ہی کیا پورا محلہ ہی ایک دوسرے کی محبت میں گندھا تھا۔ موہن سنگھ لکڑیوں کی ٹال کا مالک تھا..... روپیہ پیسہ گھر کے کونے، کونے میں مسکراتا تھا۔ چرن داس پورے محلے کے بال کاٹتا تھا، پورے دن میں دو چار آنے کمانے والا شام کو اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ ایسے بیٹھتا گویا کسی حویلی کا رہائشی ہو..... غلام دین یاری نبھانے کا ہنر جانتا تھا، سال بھر کے اناج کی بوریوں سے اس کا کچا کوٹھا بھر دیتا۔

فخر دین کے ساتھ رات کا کھانا کھاتا تو دوست دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے فخر دین باقی افراد کے لیے بھری ہانڈی بھیج دیتا۔ شام کو دوستوں کی بیٹھک سجتی دودھ پتی کے دور چلتے اور یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا کہ کون کس دھرم اور مذہب کا ہے۔ ایک دوسرے کی خوشیوں میں راگ الاپتے، غم پر روتے زندگی کے جھمیلوں میں مگن تھے۔

رومیصہ غلام دین کی پہلوٹھی کی اولاد تھی جو شادی کے آٹھ برس بعد دیکھنی نصیب ہوئی..... ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ اس کے بعد اس کے رب نے ایک اور بیٹی دے کر اس کی جھولی کو خوشیوں سے بھر دیا گو دل میں ایک خواہش ضرور مچلتی کہ رب سوہنا ایک بیٹا دے دیتا تو نسل آگے چلتی پھر سوچ پر لاحول پڑھ لیتا۔ رب کے بیٹیوں کے نوازنے پر شکرانے کے نفل ادا کرتا..... جب کبھی دل میں بیٹے کی ہوک اٹھتی تو چھوٹے بھائی فخر دین کے گھر کی راہ لیتا..... ابصار اس کے بھائی کا لختِ جگر، اس کو گلے لگا کر دل ٹھنڈا کر لیتا۔ فخر دین جب بڑے بھائی کو اس طرح بیٹے کے لیے ترستا دیکھتا تو فوراً ابصار کو اس کی گود میں بٹھا دیتا۔

''سنبھال اپنے پتر کو، ہماری تو ایک نہیں سنتا.....

غزل

نیند مشکل سے فقط ایک گھڑی رہتی ہے
طاق میں پھر مرے کمرے کے پڑی رہتی ہے

دل کی مسند پہ ہوئی جب سے حکومت تیری
عقل چپ چاپ سی کونے میں کھڑی رہتی ہے

جب کبھی کان میں جھک کر تو کرے سرگوشی
پھر بڑی دیر سماعت پہ..... گڑی رہتی ہے

ہجر کی ریکھا ہتھیلی میں کھدی ہے پھر کیوں
وصل کی چاہ بھی سینے میں گڑی رہتی ہے

نقش تیرے کبھی پھیکے نہیں پڑتے ہم دم
منظروں پہ تیری تصویر..... جڑی رہتی ہے

ایک واعظ جو ڈراتا ہے جہنم سے ہمیں
ہم وہ ضدی کہ نصیحت سے اڑی رہتی ہے

تُو صبا کو ہو میسر کبھی..... تھوڑا سا اگر
داستاں دل کی سنانے کو بڑی رہتی ہے

کاوش: صابٹ، لاہور

جب دیکھو چھت پر کھڑا گٹاریاں کھیلتا ہے۔ گلی ڈنڈے کا اس کو شوق، پر پڑھائی کے قریب جانا اس کو منظور نہیں.....'' باپ شکایتوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتا۔

غلام دین کا سینہ بھائی کی محبت پر فخر سے پھول جاتا، بھتیجے کو گلے لگاتا اور ہلکی سی چپت لگا کر کان پکڑوا دیتا۔

☆☆☆

کل رات سے چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ ہر شے جل تھل ہو گئی تھی، کچے آنگن میں دھرے گملے ابرِ رحمت سے کھل اٹھے تھے، یوں لگا نیا پیراہن لیا ہو، چرند پرند مستانی ہوا کے دوش پر لہک، لہک گانے لگے۔ لڑکیاں بالیاں چنریاں رنگنے لگیں۔ لبوں پر برسات کے گیت مچلنے لگے۔ لڑکوں نے بڑی نہر کا رخ کیا اور ماؤں نے چوکی چولہے سنبھالے..... رومیصہ دھانی رنگ کی چنری اوڑھے ہاتھ میں شکر بورا (چاول ابال کر اس پر دیسی گھی اور شکر کی تہ لگائی جاتی ہے) کی طشتری تھامے سہج،

سبک قدم اٹھاتی چاچی کے گھر جانے کو بڑھی، تیز موٹی بوندوں نے اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ نبیلہ نے کتنا ہی زور لگایا، ذرا صبر کرلے مینہ تھم جائے تو دے آنا مگر نہ جی اس کی ایک ہی ضد، ابھی گرم، گرم لے کر جاؤں گی، ٹھنڈا ہوجائے گا تو کھانے کا کیا سواد.....

''اماں نہ روک اس کو، جانتی ہے چاچی کی آڑ میں کس کو پروسنے جارہی ہے'' بہنبل نے اسے چھیڑا اور وہ جواب میں شرمیلی مسکان سجائے دہلیز پار کرگئی۔

سچ تو یہ تھا کہ ابصار کو گھی شکر بورا بہت پسند تھا، اگر ابصار نہ کھاتا تو اس کے خود حلق سے کیسے اترتا..... ہاتھوں میں طشتری تھامے وہ رسوئی کی طرف جانے لگی جب ہی سامنے بنے کمروں میں سے خوشبو میں نہایا ابصار نکلا۔ رومیصہ کو دیکھ کر اس کے لبوں پر بڑی گہری مسکراہٹ ابھری تھی۔

چاچی مالپورے بنانے میں مصروف تھی اور فرحت جان بوجھ کر کمرے سے باہر نہیں نکلی، وہ کھڑکی کی جالی میں سے اسے آتا دیکھ کر وہیں رک گئی تھی کیونکہ ابصار بھیا رومیصہ کو دیکھ کر شتابی سے باہر نکلے تھے۔ وہ چاچی عذرا کے ہاتھوں میں طشتری تھمانے کے لیے آگے بڑھی۔

''ابصار مٹھی کے ہاتھ سے برتن پکڑ لے، میرے ہاتھ سارے سنے ہوئے ہیں۔'' ماں کیسے بیٹے کے دل کی حالت سے خوب واقف تھیں اسی لیے خود تھامنے کے بجائے ابصار کو لینے کا کہہ دیا۔

وہ اس کے قریب کھڑا تھا بے حد قریب..... دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے، وہ اس سراپا کا نگاہوں میں جذب کرنے لگا، عذرا کی ان دونوں کی طرف سے پشت تھی۔

''واہ گھی شکر بورا لائی ہو میرے لیے.....'' طشتری پکڑتے ہوئے اس کا ہاتھ ابصار کی انگلیوں سے مس ہوا اور اس کا وجود ڈولنے لگا۔

''اماں نے کہا چاچی کو دے آؤ.....''

''تو پھر چاچی کو دے دوناں، مجھے کیوں پکڑائی۔''

ابصار نے لبوں میں مسکراہٹ دبا کر طشتری پھر سے اس کے نازک ہاتھوں میں پکڑا دی۔

''اماں نے سب کے لیے ہی بھیجا ہے، آپ کے لیے بھی.....'' بمشکل وہ مرے، مرے لہجے میں بولی۔

''تو یوں کہوناں میرے لیے لائی ہو۔'' اس نے پھر سے برتن پکڑتے ہوئے اس کی نازک انگلی میں پہنی انگوٹھی کو دھیرے سے چھوا اور شرارتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ رومیصہ گھبرا گئی۔ ہوا کے جھونکے دائیں بائیں سے گزر کر اس کے پیراہن سے شرارت کرنے لگے، اس نے سرکتا دوپٹا جلدی سے سر پر لیا۔

''چاچی میں اندر فرحت کے پاس جارہی ہوں.....'' وہ تیزی سے اس کے پاس سے نکلی تھی۔

مالپورے بناتی عذرا کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

''کیا راز و نیاز ہورہے تھے میرے بھیا سے؟'' وہ دہکتا انار چہرہ لیے دھپ سے مسہری پر گری تھی کہ فرحت نے اسے پکڑ لیا۔

''سنبھالو اپنے بھیا کو، ایک نمبر کا چھچھورا عاشق ہے.....'' اپنے دل کی حالت کو سنبھالتی وہ بڑی ادا سے بولی۔

''کیا سمجھاؤں تم ہی بتادو کہ اپنی منگ (منگیتر) کو محبت پاش نظروں سے دیکھنے کے بجائے نفرت بھری نگاہوں سے تکے، جہاں تم کھڑی ہو وہ منہ پھیر کر چل دے، کوئی چیز لے کر آؤ تو کھانے کے بجائے اسے واپس لوٹا دے، بے فکر رہو میں اپنے بھائی کو اچھی طرح سمجھا دوں گی۔ آئندہ وہ تمہارے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ تمہاری موجودگی میں وہ گھر سے کوسوں دور رہے گا۔'' فرحت آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر مسکراہٹ لیے اسے چھیڑنے لگی تو وہ بھی اسے گھورتی کھلکھلا دی..... اس کی ہنسی کے جلترنگ ابصار کے دل سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔

☆☆☆

مغرب کی نماز پڑھ کر دونوں بھائی باتیں کرتے گھر میں داخل ہوئے تھے اور صحن میں بچھی بان کی کھری چارپائی پر آمنے سامنے پالتی مار کر بیٹھے تھے۔

''پتا نہیں یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی ہے ان مسلمان رہنماؤں کو، اچھے بھلے برسوں سے رہ رہے ہیں، کوئی پریشانی نہیں، کوئی مسئلہ نہیں پھر پتا نہیں کیوں اپنے دیس کا خیال دماغ میں سما گیا۔'' غلام دین نے فخر دین کے سامنے اپنے خیال کا اظہار کیا تو اس نے بھی گردن ہلا کر تائید کی۔

''کیا ایسا ممکن ہے کہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہم یہاں سے نکل جائیں.....؟ کیا ہماری عقل ماری گئی ہے کہ اچھے بھلے گھر بار چھوڑ کر بے گھر ہو جائیں، یہ مال، ڈنگر، حویلیاں، کاروبار چھوڑا جا سکتا ہے؟ کبھی نہیں، میں تو مر کر بھی اس دیس سے نہ نکلوں.....'' فخر دین نے فیصلہ کن انداز میں گردن ہلائی۔

''بھائی جی فکر نہ کریں، بھلا کبھی تقریروں سے بھی کوئی ملک حاصل ہوا ہے، خالی نعرے لگانے اور جوشیلے لفظوں سے سوائے لوگوں کا وقت برباد کرنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' نبیلہ نے توے سے گرم، گرم پھلکا اتار کر چنگیر میں رکھا اور برآمدے میں کرسی پر بیٹھی رومیصہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ اس نے روٹیاں رومال میں لپیٹیں، رکابی میں گوشت کا سالن نکالا اور اتنی دیر میں سنبل دونوں بھائیوں کے بیچ دسترخوان بچھا چکی تھی۔ رومیصہ نے کھانا چن دیا۔ دونوں بھائی رغبت سے کھانے لگے۔ ''بھرجائی ایک طرح سے تو تم ٹھیک کہتی ہو پر اپنا مسلمانوں کا جو لیڈر ہے، بڑا بے باک ونڈر ہے، ایسی جوشیلی اور دلائل سے بھرپور تقریریں کرتا ہے کہ انگریز بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ میں نے خود اس کی تقریر سنی تھی، سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کیوں بھائی جی آپ بھی تو تھے ناں میرے ساتھ.....'' روٹی کے نوالے کو شوربے میں ڈبوتے فخر دین نے بھائی کی طرف دیکھا۔

''او تیرے کہنے پر میں چلا ضرور گیا تھا پر اس کی تقریر کا ایک لفظ بھی میں نے توجہ سے نہیں سنا تھا۔ ایسے بندے کو کیا سننا جو ہمیں ہمارے گھروں کو چھوڑنے پر اکسا رہا ہو۔'' غلام دین نے برا سا منہ بناتے ہوئے پانی کا کٹورا منہ سے لگایا۔

''بہت اچھا کیا سنبل کے ابا..... کیا پتا تمہارے دماغ پر اس کی تقریر کے لفظ اثر کر جاتے۔ بھئی میں نے تمہارا ساتھ ہرگز نہیں دینا تھا۔ میرے ماں جائے، چچیرے، ممیرے سب یہاں پر..... میں تو ان سے دور رہنے کا سوچوں بھی تو سانس رکنے لگتی ہے۔'' پھونکنی سے لکڑیوں کو ہوا دیتی نبیلہ پُرسوچ کر ہی اداسی طاری ہونے لگی تھی۔

''پھر جائی ہم سب یہاں خوش ہیں، سب ہمارے اپنے ہیں، ایسا خیال ہمارے کسی کے دل میں نہیں آئے گا۔''

''تمہاری بات تو ٹھیک ہے پر فخر دین، ابصار کو سمجھایا کر..... یہ جلسوں میں دیے اور پپو کے ساتھ اکثر جانے لگا ہے، روک اس کو..... بتا دے کہ ان جلسوں میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں..... جب ہم نے یہاں سے کہیں نہیں جانا تو پھر جلسے میں فضول باتیں سننے کا فائدہ.....''

''آپ فکر مند نہ ہوں بھائی، وہ ابھی بچہ ہے دوستوں کے ساتھ شغل میلے میں نکل جاتا ہے۔''

''ان جوان ہوتے بچوں کے ہی تو دماغ خراب کیے ہیں ان لیڈروں نے..... ان ہی کے دلوں میں تو آزادی کے جذبے جگائے ہیں، سب نوجوانوں کے دماغوں میں اپنے دیس جانے کا بھوت سوار ہو گیا ہے، ابھی وقت ہے سمجھا لے اس کو۔'' غلام دین نے دودھ پتی کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔

''میں سمجھا دوں گا، کسی وقت آپ بھی اس کے کانوں میں یہ بات بٹھا دیں کہ یہاں سے جانے کا سوچنا بھی مت..... مجھ سے زیادہ آپ کی بات مانتا ہے.....'' فخر دین کی بات پر غلام دین نے گردن ہلائی۔

اسی دم دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر پردہ ہٹاتا موہن سنگھ گھر میں داخل ہوا تھا۔

''آجا..... آجا موہن.....''

''لگتا ہے بڑی گوڑیاں گلاں (بڑی گہری باتیں) ہو رہی ہیں۔'' موہن سنگھ ساتھ والی چارپائی پر تہ بند سنبھالتا چڑھ کر بیٹھ گیا۔

''تو بھی شامل ہو جا ان باتوں میں..... یاروں سے کوئی بات چھپائی ہے ہم نے جو آج چھپائیں گے۔''

''بات تو تیری سولہ آنے سچی ہے۔'' موہن سنگھ نے سر ہلایا۔

''جا کڑیے پہلے روٹی لے آ..... آج تیری ماسی نے گونگلو (شلجم) پکا کے رکھ دیے ہیں، کسی ایک جی نے بھی منہ پر نہیں رکھے۔ پتا نہیں بھلی لو کے نوں گونگلو سے اتنا پیار کیوں ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولا تو رومیصہ مسکراتی ہوئی دودھ پتی کا پیالہ واپس لے گئی اور کھانا لگانے لگی۔

''بھائی جی گونگلو کھانے سے بڑھا ہوا پیٹ اندر چلا جاتا ہے، کبھی، کبھی کھالیا کریں.....'' نبیلہ نے دوپٹے کی اوٹ سے اس کے موٹے پیٹ پر ہنس کر چوٹ کی تو سب ہی ہنس دیے۔

موہن سنگھ نے غیر ارادی طور پر اپنے پیٹ کی طرف دیکھا اور خفیف سا ہنس دیا۔

☆☆☆

موسم گرما کی شام دھندلکوں میں ڈوب رہی تھی۔ صحن کے کونے میں بنے باورچی خانے میں عذرا کے ہاتھ سالن کی بھنائی کرنے میں ڈوئی کو مسلسل حرکت دے رہے تھے۔ فرحت کارنس پر لگے برتنوں میں سے اوندھے گلاس کے نیچے جمع کیے گئے سکوں کو گننے میں مگن تھی۔ ننھی ہل، ہل کر اپنا سبق یاد کر رہی تھی۔ عذرا نے ہنڈیا کی بھنائی کر کے ایک طرف رکھی اور کنستر میں سے آٹا نکال کر چھاننے لگیں۔

''اماں، روٹی میں بناؤں گی، بس آٹا گوندھ دیں۔'' فرحت کمرے میں سے ہی بولی۔

''جلدی باہر نکل آ تیرے ابا کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔'' وہ تیزی سے آٹا گوندھ رہی تھیں۔ جب ہی دہاڑ سے دروازہ کھلا اور فخر دین، ابصار کو گریبان سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تھا۔ تڑاخ سے دروازے کے دونوں پٹ بند کیے اور ایک ہاتھ سے کنڈی لگائی..... ابصار کو اس نے غصے سے بان کی کھری چارپائی پر اتنے زور سے پٹخا کہ چارپائی کی موٹی لکڑی کی پٹی سے اس کا سر زخمی ہو کر خون کی لکیر بن کے بہنے لگا۔

ابصار ابھی سیدھا ہو کر بیٹھا بھی نہیں تھا کہ فخر نے تابڑ توڑ تھپڑوں سے اس کا منہ سرخ کر دیا۔ فرحت اور ننھی سہم گئیں..... سکے فرحت کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر کھنکنے لگے، آٹا گوندھتی عذرا کے دل پر بیٹے کی یہ درگت بنتے دیکھ کر گھونسا لگا، وہ آٹے کی پرات وہیں چھوڑ (بھرے) ہاتھوں سے شوہر کو کھینچنے لگی۔

''کیا جان لو گے اپنی اولاد کی، آخر کیا قصور ہے میرے بچے کا.....؟'' بمشکل اس نے فخر دین کو پرے دھکیلا اور ابصار کو بانہوں کے حصار میں قید کیا۔ فرحت تیزی سے اپنے دوپٹے کو گیلا کر کے نم آنکھوں سے بھائی کا کان صاف کرنے لگی جبکہ گیارہ سالہ ننھی ابھی تک سہمی ہوئی کونے میں آنکھیں میچے بیٹھی تھی۔

''سمجھا لو اپنی اس اولاد کو..... یار دوستوں کے ساتھ بڑے نعرے لگاتا ہے اور اب تو پارٹی میں شامل ہو گیا ہے دن رات نعرے لگایا کرے گا۔

لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان

یہ کم عقل ہماری جانیں گنوانے کے درپے ہے۔'' فخر دین پھنکارا۔

''قسم خدا کی جب تک ... میری زندگی ہے حصول پاکستان کی کوشش میں لگا رہوں گا۔'' ابصار کا چہرہ تپ کر سرخ ہو چکا تھا وہ عذرا کی بانہوں میں سے بپھر کر نکلا۔

''ہاں لگا رہ کوشش میں..... تیری یہ کوششیں پاکستان نہ بنائیں ہماری قبریں ضرور بنا لیں گی، تمہیں تو یہ نعرہ لگانا چاہیے۔

لے کے رہیں گے سب کی جان
بٹ کے رہیں گے خاندان

دو چار یہاں مرمرا جانا اور دو چار بچیں گے، وہ ذلیل و خوار ہو کر پہنچ جانا اس پاک دھرتی پر..... جس کے خواب تم آج کل دن رات دیکھ رہے ہو۔'' غصے سے فخر دین کے منہ سے کف اڑنے لگا اور ابصار کی آنکھوں

سے چنگاریاں.....

وہ پاکستان جس کے لیے ابھی جدوجہد جاری تھی جو ابھی حاصل نہ ہوا تھا ابصار کو اس کے بارے میں یہ الفاظ تپا گئے۔

''ناامیدی میرے مذہب میں کفر ہے، پاک دھرتی کو حاصل کرنے میں اگر ہماری جانیں بھی چلی جائیں تو کیا غم ہے، ہزاروں کا خون بہہ کر اگر آزادی کا سورج روشن ہو جائے جس میں ہماری نسلوں کے چہرے تابناک ہوں گے تو ابا یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔''

ابصار کی بات سن کر فخر دین ایک بار پھر اس پر پل پڑا۔

''ہاں یہ سودا مہنگا نہیں ہے، ہمارا خون بہت سستا ہے جو تو گلیوں میں بہائے گا، بہنوں کی عزت گنوائے گا، ماں کو بیوگی کی چادر اوڑھا کے پھر آرام سے رہ لینا اس پاک زمین پر، خوشی کے شادیانے بجانا.....'' فخر دین نے اسے دھنک کر رکھ دیا، وہ کوئی بھی مزاحمت کیے بغیر مار کھاتا رہا، عذرا واسطے ترلے دیتی رہیں۔ دھان پان سی عذرا بیٹے کو چھڑانے کی کوشش میں ہلکان ہو گئیں..... باپ نے مار، مار کر ادھ موا کر دیا اور جب مار، مار کر ان کی اپنی سانس پھولنے لگی تو صلواتیں سناتے ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔

عذرا بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ کر رو دیں..... فرحت بھی خاموش بہتے آنسوؤں سے بھائی کے پاس آ بیٹھی، ماں جائے کو اس حالت میں دیکھ کر جگر کٹ رہا تھا، عذرا پھٹی، پھٹی آنکھوں کے ساتھ ابصار کے زخم سہلانے لگیں۔ ابھی تو پاکستان حاصل کرنے کا خواب آنکھوں میں سمایا تھا کہ امتحان کا وقت آ گیا، پہلے امتحان کا سامنا ابصار کو اپنے گھر میں ہی کرنا پڑا تھا۔

وہ رات آنکھوں میں یونہی کٹ گئی، ادھ گندھا آٹا پرات میں ویسے ہی پڑا رہا۔ ہنڈیا، چولہے کے پاس یونہی دھری رہی، سبھی کے آلو بھوبھل میں جل کر راکھ ہو گئے۔ کتنے شوق سے اس نے گرم راکھ میں آلو دبائے تھے کہ نمک لگا کر کھاؤں گی' یہ اس کا من پسند کھا جا تھا مگر وہ آنکھوں میں خوف و ہراس لیے وہیں دُبک کر سو گئی۔ فرحت نے اسے بمشکل اٹھا کر اپنے ساتھ لٹایا تھا۔

☆☆☆

رومیصہ تیز فالسئی رنگ کے کپڑے کو فریم میں لگائے ستارے ٹانکنے میں محو تھی۔ پاس ہی نبیلہ، سنبل کے بالوں میں تیل لگا کر کس کر چوٹی گوندھ رہی تھیں۔ چوٹی میں بل انہوں نے اتنی زور سے ڈالے کہ اس کی گردن کی رگیں کھنچ گئیں۔ وہ چیخ پڑی۔

''کیا ہے اماں، کیا سارے بال جڑ سے اکھاڑو گی؟''

''بیوقوف جب تک چوٹی میں بل مضبوطی سے نہ آئے بال کمزور رہتے ہیں۔ کس کر چوٹی گوندھنے سے بالوں کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔'' وہ اس کی چیخ کو نظر انداز کر کے مسلسل بالوں کی کسائی میں اضافہ کیے جا رہی تھیں۔

''سنبل تمہارے بال مضبوط کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے جو اماں ابھی تمہیں نہیں بتا رہیں۔'' رومیصہ نے فریم سے نظریں ہٹا کر سنبل کی طرف شریر نگاہوں سے دیکھا۔

''کیا وجہ.....؟'' سنبل کے ساتھ نبیلہ بھی متجسس ہوئیں۔

''یہی کہ کل کو تمہاری بے سرو پا باتوں اور اوٹ پٹانگ حرکتوں پر جب تمہاری ساس تمہاری چوٹی کھینچے گی تو بال مضبوط ہونے کی وجہ سے اکھڑیں گے نہیں۔'' رومیصہ کی ہنسی دالان میں گونجی تو گویا کسی ساز ندے نے سُر چھیڑ دیا ہو، سنبل نے اس کی بات سن کر غصے سے اس کے بازو میں زور سے چٹکی کاٹی..... نبیلہ دھیمے سے مسکرا دیں۔ رومیصہ اس کے چٹکی کاٹنے کو نظر انداز کر گئی۔

''سوچو ذرا جو ابھی تیل لگا کر اماں تمہارے بالوں کو مضبوطی سے نہ گوندھیں تو تم ساس کے دو چار بار چوٹی کھینچنے سے ہی گنجی ہو جاؤ گی۔ تصور کرو تم گنجی ہو کر کیسی لگو گی؟'' رومیصہ کھلکھلا رہی تھی اور سنبل پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

''دیکھوں ذرا تمہارے بال اماں نے کتنے مضبوط کیے ہیں کہ چاچی کے ہاتھوں تم کتنے دنوں بعد

گنجی ہوگی۔'' اس نے بھی جوابی کارروائی ہاتھوں سے کی۔ رومیصہ ہنستی رہی اور وہ کلستی رہی۔

اسی دم دروازے پر مانوس سی دستک ہوئی اور ساتھ ہی ڈیوڑھی میں مخصوص قدموں کی چاپ سے رومیصہ کا دل دھڑک اٹھا۔ آج کتنے دن بعد اس نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ ہر لمحہ دید کو ترستی نگاہوں کو جیسے قرار مل گیا تھا۔ یکبارگی اس نے نظریں اٹھا کر ابصار کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے چاہت کے سبھی رنگ سجا نظر آئے۔ رومیصہ کے ہاتھوں میں لرزش ہوئی اور فریم کیچپا گیا۔ ابصار کے لبوں پر آئی دبی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ آنکھوں میں مستی اس حسن کے مجسمے اور دل کی ملکہ کے لیے اور بڑھ گئی۔

''سلام تائی.....'' وہ نبیلہ کو سلام کر کے وہیں کین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سلام کا جواب روکھے لہجے میں ملا تو ابصار کو بالکل بھی اچنبھا نہیں ہوا۔ اسے ان سے اسی رویے کی امید تھی، سرِ راہ کئی بار کی ملاقات میں تایا کی سرد مہری کے مظاہرے سے وہ حالات کا اندازہ کر چکا تھا۔

''ابصار بھیا جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے.....'' سنبل ٹھنکی۔

''ارے بھئی ایسی بھی کیا خطا ہوگئی ہم سے کہ ہماری پیاری بہنا نے ہم سے نہ بولنے کا عہد کر لیا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر سنبل کی چوٹی کو اپنی انگلیوں میں بل دینے شروع کیے۔

پہلے اماں ان بالوں کی شامت لائی ہوئی تھیں اور اب آپ ان کے پیچھے پڑ گئے۔'' اس نے جھٹکے سے اپنی چوٹی کھینچی۔

رومیصہ فریم سائڈ پر رکھ کر اس کے لیے ستو کا شربت بنانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں چارپائیوں کے آخر میں کرسی پر ایسے بیٹھا تھا کہ رومیصہ جتنی بھی احتیاط سے گزرتی اسے چھو کر گزرنا پڑتا۔ نبیلہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھیں یہ ان کی ناراضی کا اظہار تھا۔ رومیصہ تذبذب کا شکار تھی، وہ چند ثانیے کھڑی رہی۔ سنبل اور ابصار دونوں نوک جھوک میں مصروف تھے بظاہر وہ سنبل سے بات کر رہا تھا مگر دھیان اس کا مکمل رومیصہ کی طرف تھا۔ وہ اس کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا، جب دیکھا کہ ابصار راستہ دینے کے بالکل موڈ میں نہیں ہے اس نے سنبل کو ٹہوکا دیا کہ مجھے راستہ دو۔

''میں نے کب راستہ روکا ہے تمہارا..... جس نے روکا ہے اس سے کہو.....'' وہ بدلہ لینے کے موڈ میں تھی۔

ابصار نے اس پر اپنی نگاہیں مرکوز کیں اور مسکرا اٹھا۔

رومیصہ نے خفگی سے سنبل کو گھورا اور ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر اٹھا دیا۔ ساتھ ہی چارپائی بھی پیچھے کھسکا دی۔ اب اتنی جگہ بن چکی تھی کہ وہ آرام سے وہاں سے نکل سکتی تھی مگر ابصار کو شرارت سوجھی اس نے تیزی سے پھر اپنی کرسی دونوں چارپائیوں کے درمیان کر لی۔ اب کی بار اس کے گزرنے کی راہیں مسدود تھیں۔ وہ گلابی ہونٹ کاٹتی انگلیاں مروڑتی وہیں کھڑی رہ گئی۔ سنبل دبی، دبی ہنسی، ہنس رہی تھی اور ابصار آنکھوں میں محبت کے دیپ جلائے اسے تک رہا تھا۔

''اماں میں ستو کا شربت بنانے جا رہی ہوں آپ پئیں گی؟'' اس کی بات پر نبیلہ نے کروٹ بدل کر نفی میں سر ہلایا تھا، ابصار کو فوراً اپنی نظروں کے زاویے تبدیل کرنے پڑے اور کرسی سائڈ پر کھسکائی۔ رومیصہ سائڈ سے ہو کر نکلنے لگی۔ اس کے دوپٹے کے پلو کو ابصار نے آنکھ بچا کر ہولے سے جھٹکا دیا تھا۔ اس کا وجود ہل گیا۔ شرم کی لالی چہرے پر جھلکنے لگی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باورچی خانے میں داخل ہوئی تھی۔ جس وقت وہ شربت لے کر آئی اماں اور ابصار دونوں کے چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے، وہ بھانپ گئی کہ پھر سے وہی موضوع زیرِ بحث ہے، وہ خاموشی سے شربت رکھ کر اندر کمرے میں چل دی اور کان باہر ہونے والی گفتگو پر لگا دیے۔

☆☆☆

رات کی تاریکی نے اپنے پر مکمل پھیلا دیے تھے، کہر زدہ راتوں میں سبھی اپنے کمروں میں مقید تھے۔ سناٹے کا راج تھا۔ روشنیاں گل کر دی گئی تھیں مگر ایک گھر میں اب بھی مکین جاگ رہے تھے۔ وقت جیسے،

جیسے گزر رہا تھا ابصار کی ٹینشن میں بے پناہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ آج کے جلسے میں اس نے تقریر کرنی تھی۔

''یقیناً سب جلسہ گاہ پہنچ گئے ہوں گے اور میرا.... بے صبری سے انتظار کیا جارہا ہوگا.....'' پپو اور دیما (ندیم) اس کا دو بار پوچھنے آچکے تھے اور ابا ہر بار جا کر انہیں نفی میں جواب دے آتے کہ'' دوپہر کا گھر سے نکلا ہے ابھی تک نہیں پہنچا میں تو خود اس کی طرف سے پریشان ہوں۔'' وہ بیچارے منہ لٹکائے واپس لوٹ جاتے۔

ابصار کمرے میں پریشانی کے عالم میں مسلسل انگوٹھے کی پشت کو اپنی پیشانی پر مار رہا تھا، دوسرے کمرے میں موجود عذرا اس کی بے تابی و پریشانی کا اندازہ کرسکتی تھیں مگر شوہر کی وجہ سے مجبور تھیں، بیٹے کا ساتھ دینے کا مطلب اس کی شامتِ اعمال..... نہ صرف اس کا بلکہ پورے گھر کا سکون آج کی رات غارت ہوجاتا۔ وہ اضطرابی کیفیت میں کروٹیں بدل رہی تھیں کہ ابصار دبے قدموں ماں کے پاس چلا آیا۔

''اماں، ابا کو سمجھائیں مجھے جانے دیں، سب میرا انتظار کررہے ہوں گے۔'' وہ اس کی بات سن کر اٹھ بیٹھیں۔

''میں مجبور ہوں بیٹا تمہارا باپ میری کب سنتا ہے۔ پھر سے ہنگامہ کھڑا ہوجائے گا، آج کی رات ہم سب کے لیے پھر امتحان بن جائے گی۔'' ماں نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔

چند ثانیے وہ کچھ سوچتا رہا پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ جھٹکے سے اٹھا... دہ اس کا ارادہ بھانپ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''نہیں میرے بچے باپ کے مقابل مت آنا..... آج کی رات گھر رہ لے، میں سمجھاؤں گی تیرے ابا کو، دیکھ ضد نہ کر.....'' وہ اس کے اٹھتے قدموں کی مضبوطی سے ہول گئی تھیں۔

''ماں جب امتحان کا وقت آہی گیا ہے تو پھر میں امتحان دینے کو تیار ہوں۔ ابا سے کہہ دیں میرے راستے میں حائل نہ ہوں.....'' وہ چلتا ہوا باپ کے سامنے سینہ ٹھونک کر کھڑا ہوگیا۔ فخر دین جو صحن میں موسم کی پروا کیے بغیر مسلسل چکر لگا رہا تھا اس کے آنے سے ٹھٹک گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ایک کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ایک کی آنکھوں میں کچھ کھودینے کا خوف تو دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پالینے کا عزم تھا، ابصار کی آنکھوں نے اس کو خوف زدہ کردیا تھا، وہ بیٹے کو باغی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے راستے سے ہٹ گیا اور ابصار دروازہ کھول کر لمبے، لمبے ڈگ بھر کر اندھیرے میں گم ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

عذرا نے فخر دین کے دل کو بدلنے کے لیے سیکڑوں دعائیں مانگی تھیں اور ایک دن ابصار نے باپ کا نرم رویہ دیکھ کر ان سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

''ابا کیا آپ کو نہیں لگتا کہ پاکستان بننے کی خوشی ایسی ہی ہے جیسے عرصے سے کرایے کے مکان میں رہتے، رہتے کوئی اپنے گھر کا عندیہ دے دے۔ اپنا گھر جہاں بلا شرکتِ غیرے رہیں، جہاں فرش خراب ہونے پر مالک مکان کا ڈر نہ ہو، چھت گر جانے کا خوف..... جو بس اپنا ہو اسے سجائیں، بنائیں یا گرائیں، ہمارے سروں پر مالک مکان کی تلوار نہ لٹکی ہو۔ یہ فرنگی ہمارے لیے اس ہندوستان میں مالک مکان کی ہی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے ہمیں اپنا غلام ہی تو بنا رکھا ہے اگر ہم غور کریں تو جگہ، جگہ ہمیں ان کی مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں نظر آئیں گی۔ یہ فرنگی کبھی اپنے دلوں میں اتنی وسعت نہیں رکھیں گے کہ ہمیں اپنے مقابل لا کھڑا کریں..... یہ ہمیں ہمیشہ اپنے ماتحت ہی دیکھنا چاہیں گے۔'' وہ بولتا جارہا تھا اور فخر دین آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جارہا تھا۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں ناں ابا.....؟''

باپ کی خامشی سے ابصار کو قدرے حوصلہ ہوا اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ کھڑا ہوگیا جیسے چاہ رہا ہو کہ ابا اس کی باتوں کی ابھی تصدیق کردیں گے اور اسے تصدیق مل گئی تھی۔ ابا کی آنکھوں میں اس نے واضح نمی دیکھی تھی اس نے ان کا ضمیر جھنجوڑ ڈالا تھا۔ باپ نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔

ضمیر کی ضرب میں اتنی قوت ہوگی آج سے پہلے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ عذرا نے باپ، بیٹے کو جو یوں گلے لگے دیکھا فوراً شکرانے کے نفل ادا کرنے دوڑیں۔ فرحت اور ننھی کے دل بھی یہ منظر دیکھ کر کھل اٹھے۔

☆☆☆

تحریکِ پاکستان نے زور پکڑ لیا تھا۔ ہندوستان کے کونے، کونے میں جلسے شروع ہوگئے، لہو گرما دینے والی تقاریر مسلمانوں میں جوش بھر دیتیں، جہاں مسلمانوں میں اپنے وطن کو دیکھنے اور جانے کا جوش بڑھ رہا تھا۔ وہیں ہندو اور سکھوں کے دلوں میں ہمیشہ ساتھ رہنے والے مسلمان بھائیوں کے لیے محبت کا جذبہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ غلام دین اور فخر دین نے یاروں کی یاری میں واضح فرق محسوس کیا تھا۔ فخر دین کے دل میں ابصار کے سمجھانے اور کچھ خود سوچنے پر اپنے وطن کی محبت کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی مگر بھائی کے ناراض ہو جانے کے خیال سے اظہار کرنے سے کتراتا تھا، ہاں اتنا ضرور تھا کہ اس نے ابصار کو جلسوں میں جانے اور تحریکِ پاکستان کے کاموں میں حصہ لینے سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ اس بات پر غلام دین، بھائی سے کھنچا، کھنچا رہنے لگا تھا اور اس کی طرف جانا بھی کافی حد تک کم کر دیا تھا۔

اس کے ہم نوالہ و ہم پیالہ موہن سنگھ کو کتنے ہی دن ہو گئے تھے اس کی بیٹھک میں رونق لگانی چھوڑ دی تھی۔ غلام دین خود ہی اس کی نال پر چلا آیا۔

''آؤ بھئی غلام دین بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں پاکستان بنانے کی، بڑی زور شور سے تحریک جاری ہے۔'' موہن نے سنگھ نے حقے کی نال ہٹا کر ناک سے دھواں چھوڑا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

غلام دین اس کے ساتھ پڑی کھاٹ پر بیٹھ گیا۔

''جو ہو رہا ہے ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ ہمیں تو بس اتنا پتا ہے کہ اپنے سنگی ساتھی، اپنے دیس کے باسی اور پرکھوں کی چیزیں چھوڑ کر کس کا یہاں سے جانے کو جی چاہے گا۔'' پرنا اتار کر غلام دین نے سر کے نیچے رکھا اور کروٹ کے بل لیٹ کر موہن سنگھ سے حقہ چھین کر منہ سے لگا لیا۔

''اچھا.....؟'' موہن سنگھ نے اچھا کو لمبا کیا۔

''تیرا بھتیجا تو بڑی تقریریں کر رہا ہے، اس پلید دھرتی سے نکل کر پاک دھرتی میں جانے کے لیے بڑا سرگرم ہے۔''

موہن سنگھ کی بات پر دھواں چھوڑتے ہوئے غلام دین نے چپ سادھ لی کہ اس کی بات سولہ آنے کھری تھی۔ جب سے ابصار نے پاکستان کی تحریک میں حصہ لیا تھا اس کے جگری دوست اٹھتے، بیٹھتے طنز کے نشتر ضرور چلاتے تھے اور وہ ہر بار ان کو ان کے ساتھ رہنے کا یقین ضرور دلاتا یہ اور بات کہ وہ اس کی بات کے جواب میں استہزائیہ مسکراہٹ سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچاتے۔

''یاد رکھنا غلام دین وقت آنے پر دیکھ لیں گے کہ تو یاری نبھاتا ہے یار شتے.....'' موہن سنگھ کے لبوں پر بڑی شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔

''دیکھ لینا، دوستی کے امتحان پر پورا نہ اترا تو نام بدل دینا۔'' غلام دین نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بڑے فخر سے کہا تھا۔

''نام تو تجھ پر غلام ہی سجتا ہے۔'' موہن سنگھ نے مروا سنگھ کو دیکھ کر ایک آنکھ کا کونا دبایا تھا۔ وہ بھی استہزائیہ مسکرایا تھا۔

غلام دین کا خون کھول اٹھا وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے وہاں سے سیدھا فخر دین کے گھر کا رخ کیا تھا۔ بھائی تو گھر پر نہ ملا البتہ اس سے مڈبھیڑ ہوگئی جس کی وجہ سے اس کے یاروں میں اجنبیوں کی باس آنے لگی تھی۔ وہ ابصار پر ابل پڑا۔

ابصار بھی اس کو اس کے یاروں کی اصلیت کھول کر بیان کرنے لگا۔

''تایا آپ عقل کے ناخن لیں..... آپ کیا سمجھتے ہیں یہ موہن سنگھ اور مروا سنگھ آپ کے لنگوٹیے ہیں، آپ سے محبت کرتے ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے، یہ مار آستین ثابت ہوں گے۔ اِدھر پاکستان بننے کا اعلان ہوگا اور یہ آپ کے گلے لگ کر ایسا خنجر گھونپیں گے کہ آپ کی تڑپ اور سسک، سسک کر مرنے کا تماشا ہنس، ہنس کر

دیکھیں گے مگر اس وقت آپ کے پاس سوائے دکھ اور پچھتاوے کے کچھ نہ ہوگا اور آپ جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان بن گیا تو لولے لنگڑے وہاں پہنچیں گے..... بے شک ہمارے بازو کاٹ دیے جائیں، ہماری آنکھیں کرپانوں سے نکال لی جائیں، ہماری گردنیں اتار دیں مگر قلب کو سکون تو ہوگا کہ ہم نے پاک دھرتی کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں گنوائیں۔ ہمارے بعد کی نسلیں اپنی سرزمین پر آزادی سے جی سکیں گی تو ہم مر کر بھی امر ہو جائیں گے۔"

"بس کردے..... بہت ہوگئی تیری تقریر....." تایا غلام دین نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے باز رکھا۔

"یہ تیرے کرتوت ہی ہیں، جو آج میرے لنگوٹیے مجھ سے کھنچے، کھنچے رہنے لگے ہیں، ورنہ جان بھی مانگوں تو دینے میں پل نہ لگائیں....."

"میری وجہ سے یہ آپ سے کھنچے، کھنچے نہیں ہیں بلکہ ان کے کھنچنے کا اصل مقصد وہ وجہ ہے جس کے نام پر اس ملک کو حاصل کیا جارہا ہے۔ ان کو کب گوارا ہے کہ ہم آزادی سے اپنی مسجدوں کی رونقوں کو آباد رکھیں، اسلام کے جھنڈے لہرائیں، مسلمان ملازمتوں پر اعلیٰ عہدے دار بنیں، یہ تو بس یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان ہندو بنیوں کے تلوے چاٹتے رہیں، ہماری لگامیں ان فرنگیوں کے ہاتھوں میں ہوں اور ہم کٹھ پتلیاں بنے ان کے ہاتھوں میں ناچتے رہیں۔ خوابوں کی دنیا سے نکلیں، حقیقت کی دنیا میں آئیں تایا جی، شکر کریں کہ ہمیں رب نے ایسا لیڈر عطا کیا ہے جو ہمیں ہمارا مقام دلا رہا ہے۔"

"ہونہہ لیڈر..... مقام....." غلام دین تنفر سے کہتا بیٹھک سے نکل گیا۔

ابصار نے تاسف سے گردن ہلائی تھی۔

☆☆☆

"وہی ہوا ناں جس کا مجھے ڈر تھا۔" فخر دین نے غصے سے مفلر اتار کر دور پھینکا۔

"کیا ہوا..... کس بات پر پریشان ہو؟" عذرا اس کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئی۔ فرحت نے کھانے کی ٹرے ابا کے سامنے رکھی تھی پانی کا گلاس لے آئی۔

"آج غلام دین بھائی دکان پر آئے تھے؟"

"وہ تو اکثر ہی آتے ہیں، اس میں ایسی پریشانی کی کیا بات؟"

"وہ وقت گزر گیا جب آتے تھے تو دل خوش ہوتا تھا۔ اب آتے ہیں تو رشتوں میں دراڑوں کی خبریں ہوتی ہیں۔"

"کیا مطلب.....؟"

"مطلب یہ کہ ابصار سے رومیصہ کا رشتہ ختم کرنے کی بات کررہے تھے۔" بجھے دل سے اس نے روٹی کا نوالہ توڑا۔

"کیا.....؟" عذرا کے دل کو ایک دم دھچکا سا لگا۔ "مگر کیوں.....؟"

"کیا تمہیں وجہ نظر نہیں آتی؟" فخر دین نے بھویں سکیڑ کر اسے گھورا تھا۔

"تمہارے بیٹے نے سب رشتوں کو مجھ سے دور کرنے کی ٹھان لی ہے، بھائی مجھ سے نظریں ملانا چھوڑ گیا ہے۔ محلے کے جن لوگوں میں ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا دیکھ کے رستہ بدل لیتے ہیں اور یہ سب تمہارے بیٹے کا کیا دھرا ہے....." انہوں نے غصے سے ٹرے پیچھے کھسکائی تھی۔ ماں کے اشارہ کرنے پر بنھی ٹرے اٹھا کر لے گئی۔

"بچپن کے رشتے اتنے جلدی نہیں چھوٹا کرتے..... تم دل چھوٹا نہ کرو۔"

"یہی بات تو میں تم ناقص عقلوں کو سمجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ جہاں بچپن، جوانی، خوشی غم سب گزارہ ہو اس جگہ کو اتنی آسانی سے چھوڑا نہیں جاتا۔"

اس کی بات پر عذرا نے فی الحال خاموشی اختیار کرلی تھی۔ اس وقت اس سے بحث کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

ابصار نے سنا تو اس کا دل یک دم سکڑ گیا۔ رومیصہ اس کی آنکھ کا خواب تھی، روشنی تھی، رومیصہ اگر اس کی زندگی سے نکل جاتی تو اندھیرے اس کی زندگی میں در آتے۔ وہ غصے سے پھنکارتا ماں، باپ سے پہلے خود تایا سے بات کرنے پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دی نہ تائی کو پکارا بس گھر میں داخل ہوگیا۔ شام کے سائے گہرے ہورہے تھے، دیواروں پر اندھیرا پھیل

رہا تھا۔ آنگن میں لالٹین کی پیلی روشنی اندھیرے کو پوری طرح چیرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

پورے گھر میں سناٹے کا راج تھا وہ قدموں کی دھمک پیدا کرتا گول محرابی کمرے کی طرف چلا آیا، قوی امید تھی کہ سب اسی جگہ جمع ہوں گے۔ دروازہ تھوڑا سا بھڑا (بند) تھا ہلکی سی دستک دے کر وہ اندر چلا گیا۔

تایا آتشدان کے قریب پیڑھی پر بیٹھے گہری سوچوں میں گم تھے۔ تائی اون کا گولا سلجھانے میں محو تھی۔ سنبل لحاف میں دُبکی تھی اور رومیصہ حسبِ معمول فریم ہاتھ میں تھامے کڑھائی کرنے میں مشغول تھی۔ پتا نہیں دن رات کیا کاڑھتی رہتی تھی، جب دیکھو ہاتھ میں فریم نظر آئے گا۔ ابصار نے ایک اچٹتی نظر رومیصہ پر ڈالی۔

وہ کمرے کے عین وسط میں کھڑا تھا۔ سب کا انہماک اس کی آمد سے ٹوٹ گیا۔

رومیصہ ماں کا اشارہ ملنے پر فریم رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

تایا کا منہ اسے دیکھ کر ایسے بنا گویا کونین کی کئی گولیاں چبالی ہوں۔

''تایا آپ نے ابا سے کیا کہا ہے؟'' وہ براہِ راست ان سے مخاطب ہوا۔

''کیوں، کیا اپنے باپ سے سن کر تسلی نہیں ہوئی جو مجھ سے پوچھنے آ گیا۔'' وہ پیڑھی سے اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''میرے منہ سے سننا چاہتا ہے تو پھر سن..... بڑوں نے رشتہ طے کیا تھا اور اب بڑے ہی اس رشتے کو ختم کر رہے ہیں تو پاکستان کو حاصل کر... وہاں جا کے بس..... میری بیٹی کوئی اتنی معمولی نہیں ہے کہ اسے رلتا دیکھوں..... گھر سے بے گھر ہو رہا ہے اور میری بیٹی کے خواب دیکھتا ہے۔'' ایک، ایک لفظ انہوں نے چبا کر ادا کیا تھا۔ ابصار کا سارا خون نچڑ کر چہرے پر آ گیا۔ کنپٹی کی رگیں پھول گئیں۔ نبیلہ ڈر سی گئی۔ اس نے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر سیٹی پر بٹھایا۔

''مجھے غیرت نہیں آتی، اس طرح منہ اٹھا کر بات کرنے چلا آیا۔ ماں، باپ کہیں پہلے ہی پاکستان تو نہیں پہنچا دیے۔'' تائی نے بھی طنز کا تیر چلایا تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''پاکستان تو ان شاء اللہ ہم سب اکٹھے ہی جائیں گے پر تائی ایک بات کانوں میں بٹھا لو، رومیصہ میری منگ ہے اور اپنی منگ کو میں یہاں چھوڑ کے جانے والا نہیں ہوں۔'' وہ جبڑے بھینچ کر بولا تھا۔

''ہوش میں رہ کر بات کر جاہل..... تو ہوتا کون ہے، میری بیٹی کو لے جانے کی بات کرنے والا.....'' غلام دین ایک بار پھر غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تایا رومیصہ میری منگ ہے اور میں اس رشتے کو اتنی آسانی سے ختم نہیں ہونے دوں گا۔''

''بکواس نہ کر، یہ کیا منگ، منگ لگا رکھی ہے، تو نے بھنگ تو نہیں پی رکھی۔ جا اپنے باپ سے جا کے پوچھ، میں نے یہ رشتہ اسی دن ختم کرنے کا کہہ دیا تھا جس دن تو نے پاکستان کا خواب آنکھوں میں سجایا تھا۔'' غلام دین غصے سے دہاڑا۔

باہر کھڑی رومیصہ کا دل کانپ اٹھا، سنبل نے ایک دم ڈر کر رضائی سے منہ باہر نکالا تھا اور باپ کو یوں دہاڑتے دیکھ کر سہم گئی تھی۔

''یاد رکھنا تایا! جو رشتے دلوں میں پنپ رہے ہوں انہیں ختم کرنا آسان نہیں..... اگر پاکستان کا خواب میری آنکھوں میں سجا ہے تو اپنی منگ کو پا لینے کا عزم بھی پختہ ہے۔'' ابصار نے بڑی بے باکی سے تایا کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔

''بے غیرت تیرے دیدوں کا پانی ڈھل گیا، بڑوں کے منہ کو آتا ہے۔'' تایا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

''آپ کو اس کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں..... اس نے تو غیرت بیچ کر پاکستان میں گھر خرید لیا ہے۔'' نبیلہ نے تضحیک سے کہہ کر غلام دین کو ایک بار پھر اس کے قریب سے ہٹایا۔ غلام دین کا وجود غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔

''ایک بات آپ سب لوگ یاد رکھنا، اگر اس رشتے کو ہلانے کا سوچا بھی ناں تو ابصار اس گھر کے

درودیوار ہلا دے گا۔'' وہ ان کے کانوں کو بم سے اڑاتا دروازے کو ٹھوکر مار تا نکل گیا اور کمرے کے نفوس اس کی جرأت پر انگشت بدنداں تھے۔

☆☆☆

رات کا پچھلا پہر اختتام کی طرف گامزن تھا۔ عذرا تہجد کے لیے اٹھی..... صحن میں لگے نلکے کو آہستہ، آہستہ تھوڑی دیر چلاتی رہی..... پانی کی موٹی دھار کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو گرم پانی آنا شروع ہو چکا تھا، پیتل کے لوٹے میں پانی بھر کر وضو کیا اور دبے قدموں سے برآمدے کا رخ کیا۔ اس نے ابصار کے کمرے میں مدھم سی روشنی پا کر کھڑکی کے کھلے پٹ میں سے جھانکا تو ابصار کو جاگتا پا کر پریشان ہوئی اور دروازہ کھول کر وہ اندر چلی آئی۔

''کیا بات ہے ابصار پتر تو ابھی تک جاگ رہا ہے، رات کو بھی دیر سے گھر آیا، نیند کیوں نہیں آرہی کیا پریشانی ہے بیٹے.....'' وہ فکرمندی سے بولی۔

پیشانی کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا مبادا بخار ہو..... ابصار نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

''کچھ نہیں ہوا اماں مجھے.....'' وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ماں کے گرد رضائی لپیٹی جو ٹھنڈ سے کانپ رہی تھی۔

''مگر چہرے پر تو پریشانی کے آثار نمایاں ہیں میں کیسے یقین کرلوں کہ میرا بچہ پریشان نہیں ہے۔''

وہ ماں سے رومیصہ کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا مگر کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھا مگر اب بات کرنا ضروری ہو گیا تھا رات کو وہ جس طرح سے تایا سے بات کر کے آیا تھا اسے یقین تھا کہ تایا پو پھٹتے ہی اس کے گھر آ کر پھٹ پڑیں گے۔

''اماں کیا واقعی تایا غلام دین میرا اور رومیصہ کا رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں یا محض دھمکی ہے؟'' اس نے ماں کی آنکھوں اور چہرے کو ٹٹولا، رات کو تایا کا رویہ دیکھ کر بھی اس کا دل یہ ماننے کو راضی نہ تھا۔ عذرا نے اس کی بات سن کر گہری سانس بھری۔

''بھائی غلام دین ہم سے زیادہ اس رشتے سے خوش نظر آتا تھا، تجھے دیکھ، دیکھ کر خون بڑھتا تھا اس کا، سگا بھتیجا، خوبرو کڑیل، بیٹی کی سگائی پر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا کہ اس کی رومیصہ اس کی نورِ نظر اس کی نظر کے سامنے رہے گی، چاچا کے گھر جائے گی تو ماں، باپ سے زیادہ الفت پائے گی مگر جب سے پاکستان بننے کا سنا ہے اور تمہارے یہاں سے چلے جانے کی خواہش دیکھی ہے تو حقیقتاً پریشان ہے، وہ ہرگز اپنا دیس چھوڑنا نہیں چاہتا اور نہ بیٹی سے دوری برداشت کر سکتا ہے۔''

''یہ دیس ان کا نہیں ہے اماں، فرنگیوں کا ہے یا پھر ان کے چمچوں ہندو بنیوں کا..... یہ دیس ہمارا نہیں ہے، ہمارا دیس وہ ہوگا جس کے لیے ہم لڑ رہے ہیں، جدوجہد کر رہے ہیں۔'' ابصار درمیان میں ہی بول پڑا۔

''میں جانتی ہوں میرے بچے مگر تمہارے تایا تو اسی کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں، ان کا بچپن، جوانی سب یہیں گزرا اب اس سے دوری کا سوچنا بھی ان کے لیے تکلیف دہ ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہے کہ پاکستان بنتے ہی ان کے لیے یہاں کتنے مسائل جنم لیں گے بس انہیں تو اس دھرتی سے عشق ہے۔ تیری تائی بھی شوہر کی ہم خیال ہے، وہ بھی یہ بات سمجھنے کو راضی نہیں، پر تو فکر نہ کر میں نبیلہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ ان کے رشتہ توڑنے سے کچھ نہیں ہوتا ہم نے تو جوڑا ہوا ہے ناں..... رومیصہ کی آنکھوں میں سالوں سے جڑے اس رشتے کی جو جھلک ہے نبیلہ ضرور کچھ سوچے گی۔ بیٹی کے دل کو ٹھیس پہنچانے سے پہلے ہزار بار سوچے گی۔ چل اب سو جا، نماز کو دیر ہو رہی ہے اپنے رب سونے کے سامنے تیری عرضی رکھتی ہوں کہ میرے بچے کے دل کی دنیا اسی طرح آباد رہے اسے کوئی گزند نہ پہنچے.....'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ سوچوں میں ہی گھرا رہا۔ ''اگر تایا نہ مانے تو پھر مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا نہ میں رومیصہ کو چھوڑ سکتا ہوں نہ رومیصہ کو یہاں چھوڑ سکتا ہوں..... وہ میری بھی ہوگی اور میرے ہمراہ بھی جائے گی۔ یہ میرا اپنے آپ سے وعدہ ہے۔'' اس کی آنکھوں کے پپوٹے جل رہے تھے۔ اس کے سامنے تایا کے گھر سے نکلتے ہوئے رومیصہ کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ تھا۔ اس نے تڑپ کر تکیے

کو بازوؤں میں زور سے بھینچ لیا۔

☆☆☆

عذرا اور فخر دین نے لجاجت سے نرمی سے گزرے وقتوں کے عہد یاد دلا، دلا کر اس رشتے کو قائم رکھنے کی استدعا کی تھی مگر غلام دین کی ایک ہی رٹ تھی۔

''تم رومیصہ اور ابصار کے رشتہ جڑے رہنے کی بات کرتے ہو، میں تو بھائی کے رشتے سے بھی اپنا دل خالی کر چکا ہوں۔ بہتر ہوگا بھر جائی کہ آئندہ اس گھر سے تم لوگوں کا کوئی تعلق نہ ہی رہے تو اچھا ہے، تم لوگ تو اپنے دیس چلے جاؤ گے مگر میں نے یہیں رہنا ہے، سب بھائی بند ہیں میرے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے یہاں آنے سے میرے ان رشتوں میں دراڑیں پڑیں۔''

فخر دین اور عذرا نے بند ہوتی سانسوں سے غلام دین کے یہ الفاظ سنے تھے۔ سگا بھائی محلے کے منہ بولے بھائیوں کے رشتوں کو اہمیت دے رہا تھا۔ منہ بولے بھائی بھی وہ جو اُن کے ہم منصب تھے نہ ہم مذہب۔ وہ دلوں پر منوں بوجھ لیے وہاں سے اٹھے تھے۔

عذرا کی نگاہیں کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی رومیصہ پر پڑی تھیں۔ اس کا دل کٹ گیا وہ ان آنکھوں کا دکھ اپنے دل پر محسوس کر رہی تھی۔ بیٹے کا سوچ کر کلیجا چھلنی ہوتا تھا۔

بچپن کی منگ چھوٹنا سنہرے خوابوں کا گلا گھونٹنا کوئی آسان نہیں تھا۔ دنوں میں ابصار کا چہرہ پیلاہٹ کا شکار ہوگیا۔ آنکھیں خوابوں کے دفن ہونے پر نوحے پڑھتی دکھائی دینے لگیں۔

فرحت بھائی کے دکھ پر نیر بہانے لگتی تو ننھی کو رومیصہ کے بھابی نہ بننے کا غم ستانے لگتا۔

''اماں چاہے کچھ بھی ہو جائے، رومیصہ میری بھابی ہے اور انہیں ہمارے گھر آنے سے کوئی روک نہیں سکتا، میں ابھی بھابو کو لے کر آتی ہوں، دیکھتی ہوں تائی کیسے روکتی ہیں اسے۔'' ننھی رشتوں کی اس بدلتی جنگ کو صحیح معنوں میں بھانپ نہیں رہی تھی، اس نے باہر کا رخ کرنا چاہا تو ابصار نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''جب تو جانتی ہے ننھی کہ رومیصہ تیری بھابی ہے تو بس پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ یہاں آئے یا اسی گھر میں رہے، بھابی وہ تیری ہی رہے گی۔'' ابصار نے زخم خوردہ دل کے ساتھ ننھی کی چوٹیوں کو پیار سے ہلایا تو وہ اس کا منہ تک کر رہ گئی۔ عذرا کے دل کے اندر تک سناٹا چھا گیا۔ دل آنے والے وقت سے ہول گیا پتا نہیں ابصار کیا سوچے بیٹھے تھا۔ کہیں بہو کو کھونے کے ساتھ بیٹا نہ کھونا پڑے۔ یہ سوچ ہی اس کو دہلا گئی۔

''اماں فکر نہ کر، تیرے بیٹے کو کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی کچھ ایسا کروں گا کہ ابا کو اور تجھے شرمندہ ہونا پڑے، آپ دیکھنا وہ وقت جلد آئے گا جب تایا خود منہ سے اعتراف کرے گا کہ میں غلطی پر تھا اور رومیصہ کو خود میرے حوالے کر دے گا۔'' بہت ٹھہرے، ٹھہرے انداز میں اس نے جملے ادا کیے اور تیزی سے دو، دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چھت پر چلا گیا۔ فرحت اور عذرا نے اس کے قدموں کی لرزش واضح محسوس کی تھی۔ جتنا وہ باہر سے مضبوط نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اندر سے بری طرح ہل چکا تھا مگر ماں، بہنوں پر اپنے کمزور دل کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

باپ کی بات سن کر رومیصہ کے بستر پر کانٹے اُگ آئے تھے، نیند پلکوں کو جوڑنے میں ناکام رہی..... بچپن سے جس خیال یار سے دل و ذہن مہک رہے تھے اس سے دوری کا تصور سوہان روح تھا۔ صبح جب باپ باہر نکلا..... وہ اور نبیلہ گھر کے ضروری کاموں سے فارغ ہوئیں تو اس نے شرم بالائے طاق رکھ کر ماں سے اس رشتے کو ختم نہ کرنے کا کہہ دیا۔

ماں اس کے منہ سے یہ بات سن کر ہق دق رہ گئی۔

''شرم کر کچھ، یہ رشتہ ہم نے جوڑا تھا اور ہم ہی توڑ رہے ہیں، نہ پہلے تیرے سے کسی نے پوچھا تھا اور نہ اب پوچھنے کا سوچا ہے۔ ماں، باپ کی دہلیز پر بیٹھی ہے تو ماں باپ کی وفادار بن..... یہ یاریاں نبھانے کا سوچنا بھی مت، جو دل میں کچھ ہے بھی تو کھرچ کے پھینک دے ورنہ باپ تیری جان لے لے گا۔'' نبیلہ

نے اس کے دل سے واقف ہوتے ہوئے بھی صاف لفظوں میں اسے سختی سے سمجھا دیا تھا۔ رومیصہ کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔

''پر کیوں اماں؟ یہ زیادتی ہے۔ لڑکی کوئی کٹھ پتلی ہے، جہاں دل چاہے موڑ لو۔ ماں باپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بچپن میں طے کیے گئے رشتوں سے محبتیں بھی دلوں میں پروان چڑھنی شروع ہو جاتی ہیں اور اس کی جڑیں پورے جسم میں پھیل جاتی ہیں۔''

سنبل نے رومیصہ کا زرد چہرہ دیکھ کر ماں کو سنایا۔

''تم چپ کرو، بڑوں کی بات میں ٹانگ مت اڑاؤ۔''

''بڑے جب چھوٹوں کے ساتھ زیادتی کر رہے ہوں تو پھر چھوٹوں کو لب کشائی کرنی ہی پڑتی ہے۔'' اس نے ماں کے ہاتھ سے لہسن کی پوتھی چھینی اور انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔

''زیادہ وکیل بننے کی ضرورت نہیں ہے، چل اٹھ اپنا کام کر..... ماں کے منہ کو آ رہی ہے۔'' اس نے غصے سے اس کے ہاتھ سے واپس لہسن کی پوتھی جھپٹی تو وہ تاسف سے ماں کو ایک ٹک دیکھنے لگی جو پھر سے اپنے کام میں مگن ہو چکی تھی۔

سنبل نے بہن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔ پتا نہیں ماں، باپ اتنے کٹھور کیوں ہو گئے تھے کہ بیٹی کی خوشیاں چھیننے کا قصد کر لیا تھا۔

☆☆☆

رات کی تاریکی نے اپنے پر پھیلائے اور وہ آخری نظر گھر کے سوئے مکینوں پر ڈالتی گھر سے کمرے سے نکلنے لگی، ماں کی چارپائی کے قریب قدم رک گئے تھے۔

''مجھے معاف کر دینا اماں.....'' اس کی پیشانی عرق آلود اور ہتھیلیاں پسینے سے نم تھیں۔ باپ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے پل بھر کو خوف نہ آیا کہ اگر اُن کی آنکھ کھل گئی تو اسے وہیں گھر کے کسی کونے میں زندہ گاڑ دیں گے۔ ابصار کی محبت نے اسے نڈر کر دیا تھا۔ اسے رشتوں کی ڈوری میں کسی خونی دھاگے کی باس آنے لگی تھی۔ اس نے ابصار کا ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سنبل کا اس نے ماتھا چوما تو وہ نم آنکھوں سے اس کے گلے لگ گئی۔ خالی ہاتھ اور محبت سے بھرا دل لے کر اس نے بابل کی دہلیز پار کی تھی۔ سنبل نے اندھیرے میں اس کے قدموں کو جانچنے کی کوشش کی تھی اور پھر بہتے آنسوؤں سے دروازے کی کنڈی لگا کر وہیں برآمدے میں کرسی پر ڈھے سی گئی۔

☆☆☆

رومیصہ کے بڑھتے قدم گو کہ بھاری ضرور تھے مگر اپنی چال پر مطمئن..... یقیناً ابصار میرے اس فیصلے سے بے پناہ خوش ہوگا اور مجھے اپنا بنانے میں پل نہیں لگائے گا۔ کپکپاتے لبوں اور لرزتے ہاتھوں سے اس نے چاچا کے گھر کی دروازے کی کنڈی بجائی تھی۔ اسے قوی امید تھی کہ دروازہ ابصار ہی کھولے گا کیونکہ اپنی مرادوں کو پا لینے کی تمنا میں وہ نیندوں کا ذائقہ ہی بھول چکا تھا۔

وہ جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے بازو سر کے نیچے رکھے سوچوں میں غرق تھا، دستک نے اس کی سوچوں میں رخنہ ڈالا، وہ دبے قدموں صحن میں چلا آیا دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے لکڑی کے دروازے کی جھری میں سے جھانکا، اندھیرے میں اسے باہر کھڑی شخصیت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

''کون.....؟'' اس نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

چند ثانیے خاموشی رہی اور پھر..... دروازہ کھولیں کی صدائیں سنائی دیں۔

رومیصہ کی آواز سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا تیزی سے اس نے کنڈی کھولی اور جھپٹ کر اس کو اندر کیا۔

''تم رات کے اس پہر۔ یہاں خیریت تو ہے؟''

''خیر کے لیے ہی تو آئی ہوں یہاں۔''

''کیا مطلب.....؟''

''اپنی امانت کو اپنے پاس رکھ لیں کہیں ایسا نہ ہو وقت بے ایمان تاجر کی طرح امانت کسی اور کے سپرد کر دے۔'' وہ دھیمی اور لرزتی آواز میں ٹھہر، ٹھہر کر بول رہی تھی۔

''امانت جب سچی اور کھری ہو تو وقت کی نبضوں

میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ خیانت کر سکے۔'' ابصار نے اسے بے اختیار کندھوں سے تھام کر جھٹکا دیا تھا۔ اسے رومیصہ سے اس حماقت اور دلیری کی توقع نہیں تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ اس کی محبت تھی اس کی سانسوں کی چلتی ڈوری کا سبب تھی مگر رات کے اندھیرے میں اس طرح اسے اپنانے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔

''تم ابھی جاؤ اور آئندہ ایسی حماقت نہیں کروگی۔ جانتی ہو حالات کیسے ہیں؟''

''ہاں جانتی ہوں حالات، جب ہی تو یہ قدم اٹھایا ہے۔''

''آئندہ ایسا قدم اٹھانے کی جرأت نہ کرنا ورنہ ہم ایک دوسرے کو کھو دیں گے۔'' سخت لہجے میں اس نے اسے سرزنش کی اور ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔

''چلو تمہیں گھر چھوڑ آؤں.....''

''میں کہیں نہیں جاؤں گی.....'' رومیصہ نے قدم مضبوطی سے جما لیے۔

''آپ سمجھتے کیوں نہیں، ابا پر خونی رشتوں سے زیادہ بچپن کی یاری حاوی ہو رہی ہے، مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کچھ ایسا نہ ہو جائے کہ ہمیں بعد میں پچھتانا پڑے۔'' اس کی لرزتی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں وہ وہیں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی، ابصار اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا تھا۔

''بات سمجھنے کی کوشش کرو، ایسا کچھ نہیں ہوگا تم صرف میری ہو، اس کے سوا اپنے ذہن میں کسی فضول خیال کو جگہ مت دینا..... چلو.....'' اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اٹھایا اور کھینچتا ہوا باہر لے جانے لگا۔

ایک دم رومیصہ کی چادر سر سے سرک گئی تھی گہرے سیاہ ریشمی بال کھل کر بکھر گئے تھے اور آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں۔ ابصار وہیں تھم گیا ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ اس کے ریشمی بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سنوار کر اس کی نم پلکوں پر لب رکھ دے اور رومیصہ کے چہرے پر چھائی ویرانی کو پل میں شگفتگی میں بدل ڈالے..... یہ وہی رومیصہ تھی کہ دن کے اجالے اس سے روشنی مستعار لیتے تھے، اب دل کی خوشی چھن جانے کے خوف نے اسے کیسا پژمردہ کر دیا تھا۔ ابصار کے دل کی دھڑکنیں سست پڑ گئیں۔ وہ رومیصہ جس کے لب ہمیشہ اسے دیکھ کر ساکت ہو جاتے تھے اور آنکھیں بولتی تھیں، آج محبت اور ہجر کے خوف نے اس کے لبوں اور قدموں کو طاقت بخش دی تھی۔

آنکھ اس کی زور رہی تھی اور دل ابصار کا کٹ رہا تھا۔ رومیصہ کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ، ٹوٹ کر زمین میں جذب ہو رہے تھے۔

''آپ دیکھ لینا یا تو یہ زمین میری محبت کے خون سے اپنی پیاس بجھائے گی یا پھر اپنی حدت کم کرنے کے لیے میرے آنسوؤں کو جذب کرنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔''

''اس دھرتی پر میرا خون بہے گا اور نہ تمہارے آنسو..... رومیصہ یہ دونوں چیزیں اتنی ارزاں نہیں ہیں کہ ان فرنگیوں کی زمین پر بہیں.....'' اس نے رومیصہ کا ہاتھ تھپتھپایا تھا اور رومیصہ نے ڈبڈبائی نظروں سے اس کے قدموں کا ساتھ دیا تھا۔

جس وقت وہ اسے چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا اس کے قدم من، من بھر کے ہو رہے تھے۔ دل وسوسوں و اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ رومیصہ کی آج کی اس جرأت نے اسے اندر سے ہلا دیا تھا۔ ''یقیناً تایا کچھ ایسا کرنے والے ہیں جو ہم دونوں کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔'' اس کے ماتھے پر لکیروں کا جال بن گیا۔ اسے آنے والے برے وقت سے بچنے کے لیے جلد ہی کوئی تدبیر کرنی تھی۔

☆☆☆

غلام دین کا رویہ اور باتیں یاد کر کے اس کے اندر بھانبھڑ جل اٹھے تھے، یہ وہی تایا تھے جو اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بھری دوپہر میں جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ امرود کے درخت پر چڑھا امرود توڑ، توڑ کر کھا رہا تھا اور دوستوں کے ساتھ مستی بھی جاری تھی کہ اچانک شاخ پر اس کا توازن قائم نہ رہ سکا اور وہ دھڑام سے نیچے زمین پر پکے امرود کی طرح گرا تھا، ویسے تو شاید چوٹ نہ لگتی کہ پکے پپیتے

کا مالک تھا مگر نیچے پڑے بڑے سے روڑے (آدھی اینٹ) پر کمر کے بل گرا تھا اور روڑا اس کی کمر کے مہرے میں بری طرح کھب گیا تھا۔ وہ درد سے دُہرا ہو گیا اٹھنا چاہا مگر کراہ کر رہ گیا۔ یار دوست باغ میں منشی سے حساب کتاب لیتے ہوئے غلام دین کو جلدی سے بلانے کے لیے دوڑے تھے اور وہ اس کے گرنے کی خبر سن کر ننگے پاؤں ہی دوڑ پڑا تھا اسے جو یوں درد سے تڑپتا دیکھا۔ تو اس کی اذیت خود پر محسوس کی۔

بچوں کی مدد سے کندھے پر ڈال کر فوراً حکیم مراد کے پاس لے کر پہنچا..... سیانا حکیم تھا دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ریڑھ کی ہڈی کھسک گئی ہے، مختلف دواؤں کے لیپ کرنے سے درد میں تو قدرے کمی آ گئی تھی مگر پورے دو ماہ جو اسے پھٹے پر چت لیٹنا پڑا تھا وہ ابصار کے لیے کسی سزا سے کم نہ تھا۔

تایا نے دن رات اس کی دلجوئی کی تھی، اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلاتے، رات دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہتے، کبھی جو وہ ضد کرتا تو وہیں اس کے پاس پڑ کر سو رہتے..... تائی دیسی گھی کی چوری، گاجر کا مربہ، پنجیری اور پتا نہیں کیا، کیا الا بلا اس کے لیے بنا کے لے آتی۔ چند سالہ رومیصہ اسے یوں پھٹے پر لیٹا دیکھتی تو افسردہ ہو جاتی اس کے جلدی سے ٹھیک ہونے کے لیے دعائیں مانگتی، ابصار اسے اپنے لیے اس طرح دعائیں مانگتا دیکھتا تو خود بھی اپنے لیے جلدی ٹھیک ہونے کی دعا کرتا۔

تایا اس کے سارے دوستوں کو اکٹھا کر کے لے آتے۔ جو اس کا دل بہلاتے..... دو ماہ ایسی سرعت سے گزرے کہ اُسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ ٹھیک ہو کر پھر سے درختوں پر جھولنے لگا۔

آج وہی تایا رومیصہ سے رشتہ ختم کر کے اسے تکلیف میں مبتلا کرنا چاہتے تھے۔ رومیصہ اس کی زندگی تھی، اس کے جینے کی امنگ تھی۔ اگر رومیصہ اس کی زندگی سے نکل گئی تو وہ توڑ دھے جائے گا۔

''نہیں تایا میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے..... وہ میرے دل کو اذیت کیسے بخش سکتے ہیں.....؟ جنہوں نے مجھے ہمیشہ ابا کی مار سے بچایا، وہ خود مجھے کیسے جیتے جی مار سکتے ہیں؟'' تایا کا روکھا رویہ اور زہریلے الفاظ اسے اب بھی جھوٹے لگ رہے تھے۔

''نہیں..... میرے تایا ایسے نہیں ہو سکتے، یہ میرا واہمہ ہے، میں سپنا دیکھ رہا ہوں..... آنکھ کھلے گی تو سب کچھ پھر سے پہلے جیسا ہو جائے گا۔ تایا خود رومیصہ کو میرے سنگ رخصت کریں گے۔'' وہ رات گئے تک اپنے دل کو طفل تسلیاں دیتا رہا اور انجانے خوف سے لرزتا رہا۔

☆☆☆

گھر کے در و دیوار پر عجب وحشت برس رہی تھی۔ ابصار مضطرب تھا، دل میں ایک طرف محبت کو پا لینے کی آنچ سلگ رہی تھی تو دوسری طرف وطن کو پا لینے کی جدوجہد جاری تھی۔

ایک محبت سے ذرا دھیان ہٹتا تو دوسری دل کو اکسانے چلی آتی، کئی دن سے تایا کی باتوں پر ذہن منتشر تھا تو گھر سے کم ہی نکل رہا تھا۔

دیپے (ندیم) نے دروازے پر دستک دے کر اسے پکارا تو ابصار اس کو اندر مردانے میں لے آیا۔ اس کے ساتھ پپو لنگڑا بھی تھا۔ اس کی ایک ٹانگ موہن سنگھ کے لڑکے سے لڑائی کے دوران ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا قصور اتنا تھا کہ وہ سفید لٹھے کا کپڑا لے کر اس پر گہرے ہرے رنگ کا روغن کر کے چاند تارا بنا کر روہن داس کو خوشی، خوشی دکھانے چل دیا تھا جو اس کا جگری یار تھا۔ ہر وقت ساتھ کھیل کود کر جوانی میں قدم رکھا تھا۔

وہ اس کے گھر بلا جھجک اندر چلا جاتا تھا، اس دن بھی یہی ہوا وہ بڑے فخر سے خوشی سے جھومتا موہن سنگھ کے آنگن میں جا کھڑا ہوا اور خوشی کے جذبات چہرے پر سجائے وہ صحن میں بیٹھے افراد کو اپنے ہاتھ سے بنا پرچم دکھانے لگا اس بات سے قطع نظر کہ سب آنکھوں میں چنگاریاں لیے اسے گھور رہے ہیں۔

''دیکھ روہن میرے دیس کا جھنڈا..... پاکستان جاتے ہی اپنی چھت پر لہراؤں گا اور جب ہم سب پاکستان چلے جائیں گے تو دیکھ تو ہم سے ملنے ضرور آیا کرنا۔''

''تیرے دیس تو جب جاؤں گا ناں جب تو

یہاں سے صحیح سلامت جائے گا۔'' روہن داس نے اس کا پھیلا کر دکھایا جانے والا جھنڈا اپنے ہاتھوں میں جھپٹ کر گول، گول مروڑا اور نفرت سے اسی کے پیروں میں پھینک دیا۔ پپو اس کی اس حرکت پر انگشت بدنداں تھا۔ اس پر جان چھڑکنے والا اسے ایسی نگاہوں سے گھور رہا تھا گویا اس کی جان ہی لے لے گا۔

''دیکھیں اماں جی..... سمجھالیں اس کو..... یوں میرے وطن کے جھنڈے کو نہ پھینکے۔'' جلدی سے جھنڈا اٹھا کر وہ روہن سنگھ کی ماں کے پاس چارپائی پر بڑے لاڈ سے بیٹھا اور اس کی شکایت لگائی۔

روہن کی ماں نے اس کا اپنی طرف بڑھا ہوا ہاتھ تیزی سے جھٹکا تھا۔

''کان کھول کر سن لے..... ماں ہوں میں صرف اپنے پتر روہن کی..... خبردار جو آئندہ مجھے ماں جی کہا۔ اور ماں تو تم نے اپنی تلاش کر ہی لی ہے۔ نکل کیوں نہیں جاتے یہاں سے..... جا کے لپٹ جاؤ اپنی پاک دھرتی ماں سے۔'' روہن کی ماں کے لہجے میں زہر بھرا تھا، وہ نخوت سے کہتی اس کے پاس سے اٹھی تھی۔

''روہن اسے باہر کا راستہ دکھا.....'' کمرے میں جاتے اس نے روہن کو باور کرایا۔

پپو حیران تھا کہ پل میں کیسے رویّے بدل گئے، محبت کی جگہ نفرت کس طرح ان کے دلوں میں بس گئی۔ وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ ذہن اس وقت حقیقت کو قبول کرنے سے سراسر انکاری تھا۔

''چل اٹھ کھڑا ہو، اپنا پلید وجود لے جا یہاں سے۔'' روہن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف دکھا دیا تھا صرف یہی نہیں اس کے جھنڈے کو پیروں میں مسل کر اس کی طرف اچھالا تھا۔

پپو کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہ اپنے جھنڈے کی بے حرمتی دیکھ کر روہن پر پل پڑا تھا۔ لاتوں، گھونسوں کی بارش کر دی تھی اس پر..... روہن نے پاس پڑا ڈنڈا اٹھا کر اس کی ٹانگ پر اتنی زور سے مارا کہ ہڈی کڑک گئی۔ دھکا دے کر روہن نے تھوکتے ہوئے دروازہ دھڑاک سے بند کیا تھا۔ پپو تکلیف کی شدت سے بے دم ہو کر گر پڑا تھا۔

☆☆☆

تحریک زور پکڑ گئی تھی۔ دن امید و یقین کی ہمراہی میں گزر رہے تھے اور پھر دعائیں مستجاب ہوئیں اور کوششیں رنگ لے آئیں..... ساری دنیا نے حیران و پریشان ہو کر نئی سلطنت بننے کا اعلان سنا تھا۔

اعلان ہوتے ہی مقدس و پاکیزہ مہینے میں جہاں مسلمان پہلے ہی رب کو راضی کرنے میں مصروف تھے اب سجدۂ شکر ادا کرتے نہ تھکتے تھے۔

ہندوؤں اور سکھوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ حالات کافی ابتر ہو گئے تھے۔ مسلمان اپنے گھروں سے سودا سلف لانے کے لیے نکلتے اور خنجر زنی کا شکار ہو جاتے..... داڑھیوں والوں کی تو دیکھتے ہی گردن اڑا دی جاتی۔ مسلمانوں کی پہچان کرنے کے لیے ہندوؤں نے ایک نیا ہی طریقہ نکالا تھا انہوں نے سڑکوں پر قرآن پاک کے اوراق پھیلا دیے تھے۔ (استغفراللہ) جو اُن سے بچ کر نکلتا یا اسے سمیٹتا وہ سمجھ جاتے کہ یہ مسلمان ہے کیونکہ کسی بھی مسلمان کی یہ غیرت گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح سے مسلمان ہونے کی نشان دہی ہوتے ہی اسے چھرا گھونپ دیا جاتا۔

ایسی خبریں جب ابصار سنتا تو اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے دل تڑپ اٹھتا اور ہندوؤں سے نفرت اور بھی بڑھ جاتی۔

پورے پنجاب کے حالات ابتر ہو گئے لوگوں نے ہجرتیں کرنی شروع کر دیں تو راستوں میں انہیں ان کے لہو کا غسل دے کر دفنایا گیا۔ مسلمانوں کی بند دکانیں لوٹ لی جاتیں اور لوٹنے والے بھی کون ہوتے جن پر پکا بھروسا تھا کہ یہ ہمارے جگری یار ہیں۔ ایک عمر ان کے ساتھ بسر کی..... مگر مسلمانوں کی یہ خام خیالی تھی۔ یاری کا یہ رشتہ علیحدہ ملک پاکستان بننے کی کوشش پر بوسیدہ ہوتا چلا گیا اور پاکستان بننے کے بعد تو اب ان کے درمیان صرف ایک ہی رشتہ تھا، پھن پھیلائے سنپولیے کا کہ موقع ملتے ہی ڈس لیا جائے..... ہندوستان کی سرزمین جہاں برسوں مسلمانوں کا راج تھا

اب انہی کے لیے تنگ کردی گئی تھی۔

رات کے سناٹے میں مسلمان کوچ کرنے کی سوچتے تو کرپانوں سے ان کے اعضا جسم سے الگ کردیے جاتے۔ دن میں بیل گاڑیوں پر پیدل بخوشی سفر کرنے کی ٹھان لینے والوں۔۔کو ان کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی غرقِ خون کردیا جاتا۔۔۔۔۔وہاں گلیوں میں نالیوں میں پانی کی جگہ خون بہہ رہا تھا۔ دریا خون کی لالی سے رنگین ہوگئے تھے۔

ماؤں نے اپنی خوب صورت بیٹیوں کے۔۔۔۔ بے داغ چہروں پر گرم سلاخوں سے چیچک کی طرح نشان بنا کر بھیانک کرڈالے کہ کسی فوجی کی شیطانی نظر ان پر نہ پڑے اور ان کی عزتیں محفوظ رہ جائیں۔ باپوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی لاڈلیوں کے گلے دبوچ ڈالے کہ دشمن کے ناپاک ہاتھ ان کو نہ چھوسکیں۔

☆☆☆

فخر دین کے گھر میں گندم کے دانوں سے مٹی کے بنے (بھڑولے) بھرے پڑے تھے پچھلی کوٹھڑی میں کتنی ہی بوریاں ایک دوسرے پر جمی تھیں۔ بھڑولے میں جب خالی جگہ بنتی، گندم کی بوری اس میں ڈال کر بھردی جاتی۔ عذرا کا دل بھر آیا پتا نہیں یہاں کتنے دن کا دانا پانی ہے اور اناج سے گھر بھرا پڑا ہے۔

''ان ہندو بنیوں اور آستین کے سانپوں کے لیے تو ہرگز یہ اناج چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ ہمارے رزقِ حلال سے ان کے پیٹ بھریں میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔''

وہ اس رزق کو ضائع بھی نہیں کرسکتی تھی۔ آخر کیا کریں.....؟ کئی دن کی سوچ بچار کے بعد فخر دین نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کرلیا۔ وہ منہ اندھیرے روزانہ چند بوریاں رحمت کے بیل پر لادتے اور بڑی نہر کی لہروں کے سپرد کردیتے۔

جس دن آخری بوری وہ پانی کے حوالے کرکے لوٹے تھے اس دن عذرا نے تشکر نظروں سے مجاری خدا کی طرف دیکھا۔

''اگر آپ اس کام میں میری مدد نہ کرتے تو ہمارے دشمنوں کے پیٹ اس سے بھرے جاتے۔''

''پتا نہیں البصار کی ماں یہ سب ہم نے صحیح کیا یا غلط.....؟ رزق کو ہر بار پانی کے سپرد کرتے رب سے سیکڑوں بار شرمندگی سے معافی مانگتا تھا۔'' فخر دین شرمندگی سے کہتا چارپائی پر پاؤں اوپر کرکے بیٹھ گیا۔ اور حقے کی ناب ہونٹوں سے لگائی۔

''رب ہمارے دلوں کو جانتا ہے، ہم نے رزق کو ناقدری سے بچایا ہے۔'' عذرا کا دل مطمئن تھا۔

''یہ تو تم نے ناقدری سے بچالیا اور وہ جو چاندی سے بھری ہنڈیا ہیں، کئی کلو سونے کا کیا...کروگی کیونکہ یہ سب تو اپنے ساتھ لے کر چلنا جان گنوانے کے سودے ہیں، ان کو کون سے کنویں میں ڈلواؤ گی؟''

حقے کا کش لے کر انہوں نے بیوی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

''اس کا بھی حل ہے میرے پاس.....''

''کیا.....؟''

''اپنی رومیصہ کو دے کر جاؤں گی.....وہ پہنے گی تو دل کو ٹھنڈ پڑے گی۔''

''رومیصہ کو اس گھر میں تو آنے کی اجازت نہیں تو کیا وہ ماں کی اجازت کے بغیر اتنا سونا لے، لے گی؟''

''سارا تو نہیں اپنے کنگن..... مالا اور بازیبیں تو ضرور دوں گی۔ یہ آج بھی اس کا ہے اور کل بھی..... اس سب کی وہی حقدار ہے۔ باقی کچھ ساتھ لے جانے کی تدبیریں کریں گے۔''

''پتا نہیں تم، کون، کون سی تدبیریں کیے بیٹھی ہو، یہ بھرا پُرا گھر کیسے بچا پاؤ گی ان لٹیروں کے ہاتھوں.....'' فخر دین الجھن میں تھا مگر عذرا نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس میں کوئی بھی چیز کسی ہندو، سکھ لیٹرے کو ملنے والی نہیں تھی۔

اپنی بچیوں کے جہیز کے لیے رکھے شنیل کے سوٹ، کھیس، رضائیاں سب بھیگی پلکوں سے انہوں نے نذرِ آتش کردیے۔

فرحت اور نبھی پاس کھڑی اپنے پسندیدہ کپڑوں کو سلگتے دیکھ رہی تھیں مگر نہ تو ان کے چہروں پر ملال تھا نہ ماں سے شکوہ.....ان کے چہروں پر سکون رقص کررہا تھا۔

''اگر موتی لال اور مرواسنگھ کی بیویاں ہمارے ساتھ اپنا رویہ صحیح رکھتیں تو سب کچھ ان کو دان کر جاتی۔ مگر وہ تو بدقماش نکلیں..... مجھے دیکھ کر ایسی نفرت سے گھورتی ہیں جیسے میں نے ان کا ادھار رکھ رکھا ہے، پلید نیاں نہ ہوں تو.....'' عذرا غصے سے ان کا نام لے کر پھنکاری تھی۔

☆☆☆

صبح کی سپیدی نمودار ہونے کو تھی..... ہر نئی روشن صبح رومیصہ کو محسوس ہوتا کہ یہ تاریکی چھٹ کر اس کے نصیب پر چھا جاتی ہے۔ ہر گزرتا پل اسے ابصار سے جدا کرنے کا خوف آنکھوں میں لے آتا، وہ سہم جاتی۔

کتنے ہی خوش فہم خوابوں کو سجائے وہ رات سے دن اور دن سے رات بسر کرتی کہ ابصار اسے یہاں سے آکر لے جائے گا مگر اس کا انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔

سنبل اس کی حالت دیکھ کر کڑھ کر رہ جاتی۔ ماں، باپ پر غصہ آتا کہ خونی رشتوں کو بھلانے اور بیٹی کی خوشیوں کو ختم کرنے کا پکا قصد کر رکھا تھا۔ سنبل نے ایک بار پھر اس کے ابصار سے ملنے کی راہ ہموار کی تھی۔ رومیصہ نے متشکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گلی میں قدم سرکائے تھے۔

عذرا نے اسے بھینچ کر گلے لگایا، ماتھا چوما۔ فرحت نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت کا اظہار کیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لیے ابصار کے کمرے تک چھوڑ کر آئی تھی۔

کتنی ہی دیر وہ دونوں وارفتگی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

''تم..... تم یہاں کیوں آگئیں.....؟ تایا، تائی کو پتا چل گیا تو تمہارے لیے مشکل ہو جائے گی اور میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔'' ابصار..... اسے کندھوں سے تھام کر کرسی تک لایا تھا۔

وہ بے دم ہو کر کرسی پر گری تھی۔

''کیوں..... کیوں کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ ایسا.....؟ آپ اس شے کے لیے مجھ سے دستبردار ہو رہے ہیں جس کو ابھی دیکھا نہیں..... جس پر پاؤں نہیں دھرے..... اس نے آپ کے دل پر ایسا قبضہ جمالیا، اپنی جڑیں اتنی مضبوط کر لیں کہ اس سے دور رہنے کا تصور بھی آپ کی روح کھینچ لیتا ہے اور جس کے ساتھ آپ نے اپنے بچپن سے لڑکپن اور جوانی کا سفر آنکھوں میں خواب سجائے گزارہ..... اس سے دوری آپ کو کوئی تکلیف نہیں دیتی۔ کیسے..... کیسے کر سکتے ہیں آپ ایسا.....؟ میں تو آپ کی محبت میں سب کچھ قربان کرنے کو تیار بیٹھی ہوں، آپ سے دور رہنے کا تصور ہی میری باقی زندگی کو نگل جاتا ہے۔ پھر آپ میں یہ تڑپ کیوں نہیں؟ کیوں مجھے اذیت دینے پر تلے ہیں۔'' رومیصہ سسک پڑی تھی۔ اور ابصار اس کے الفاظ سن کر ضبط کے کڑے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

الفاظ جیسے کھو سے گئے تھے۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے، ہر رات آنکھ صرف اس کا خواب بنتی ہے، بند پلکوں میں بھی وہ ہمیشہ رہتی ہے اور کھلی آنکھ سے بھی وہ اس کا سراپا دیکھتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اپنے دیس کی محبت میں وہ اپنی یہ محبت چھوڑ سکتا تھا اور یہ بات وہ اچھی طرح جان گئی تھی پھر کہہ کر اس کے دل کو مزید ٹھیس نہیں پہنچا سکتا تھا۔ سو چپ کا لبادہ اوڑھے اس کے سامنے اس کے نقش حفظ کرنے میں لگا تھا۔

رومیصہ کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور وہ ان کو پوروں میں جذب کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ اچھا تھا آج سب کچھ بہہ جائے۔

''ابصار آپ کے بغیر میری زندگی کے کشکول میں غم، اذیت کے سکوں کے نوحے ہوں گے، موسم بہاراں کی دلکشی مجھے کبھی اپنی طرف متوجہ نہیں کر پائے گی۔'' وہ پھر سے کرلائی تھی۔

وہ رومیصہ جس کے لب ہمیشہ ساکت ہوتے تھے اور آنکھیں بولتی تھیں..... آج محبت اور ہجر کے خوف نے اس کے لبوں کو طاقت بخش دی تھی۔ آنکھ اس کی رو رہی تھی اور دل ابصار کا کٹ رہا تھا۔ اس نے..... بے اختیار رومیصہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالوں میں تھاما تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اس کی آنکھوں میں اپنی شبیہہ دیکھتا رہا۔ ڈوبتا رہا اور ابھرتا رہا۔

''یہ دل تمہیں کبھی بھول نہیں پائے گا۔'' اس نے رومیصہ کا ٹھنڈا برف ہاتھ اپنے دل پر رکھا تھا۔ گرم آنسو ابصار کی پلکوں کی باڑھ توڑ کر رومیصہ کے ہاتھ پر گرا تھا۔ وہ تڑپ ہی تو گئی۔

ابصار کو مزید اس کا سامنا کرنے کا یارانہ نہ رہا تھا۔ وہ بند ہوتی سانسوں اور دل کے ساتھ اس کا ہاتھ چھوڑ کر تیز، تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔

رومیصہ ڈھے گئی تھی۔

''یہ دل تمہیں کبھی بھول نہیں پائے گا۔'' اس کے کانوں میں ایک ہی جملے کی بازگشت تھی۔

''کیوں..... ابصار کیوں.....؟ دل کے پاس رکھا ہے تو ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کا حوصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟'' وہ اپنے سینے کو سسکتی دھاڑیں مار کر روئی تھی۔

فرحت نے بہتے آنسوؤں سے اسے گلے لگایا تھا اور عذرا نے روتے ہوئے اس کی کلائیوں میں جڑاؤ کنگن ڈالے تھے۔

☆☆☆

غلام دین دل میں خوف اور ذہن میں وسوسوں کو جگہ دیے گھر سے باہر نہ نکلتا کیونکہ موہن سنگھ اور تارا سنگھ ان کے لنگوٹیے ان کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے..... غلام دین نے کئی بار ان سے سابقہ دوستی کی طرح ہنسی مذاق کرنا چاہا۔ مگر ان کی طرف سے بھینچے جبڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان کے رویوں سے ڈر گیا تھا۔ ذہن و دل میں بہت سے خدشات سر ابھارتے مگر وہ انہیں کچل دیتا۔

''نہیں..... نہیں..... میرے یار مجھ سے نہیں بدل سکتے۔'' وہ فوراً ذہن کی نفی کر دیتا مگر ہر آنے والا پل اس کے خدشوں کو یقین میں بدلنے کی گواہی دینے لگا۔

اس کے سنگیوں نے اس کا چین اور رات کی نیند حرام کر دی تھی۔ رات کے اکثر پہر انہیں ابصار کی باتیں سچی و کھری لگتیں۔

کتنا دور اندیش تھا ابصار..... آنے والے لمحوں اور ان ہندوؤں کی اوقات جان گیا تھا مگر بڑے ہمیشہ چھوٹوں کی نفی کرتے ہیں، اسے بھی اس وقت ابصار کی باتیں زہر لگا کرتی تھیں مگر اب پتا چلا کہ محلے میں ان ہندو سکھ دوستوں کے ساتھ رہتے، رہتے بال سفید ہو گئے مگر آج ان دوستوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ دشمن کے علاوہ ان کے بیچ کوئی شناسائی ہی نہیں.....

غلام دین نے کئی بار ارادہ کیا کہ ابصار کے گلے لگ جائے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر لے مگر شرمندگی اور ندامت نے اسے ہر بار روکے رکھا۔

☆☆☆

ننھی اسکول یونیفارم پہنے تیار کھڑی تھی وہ درجہ ششم میں تھی۔ عذرا نے بہتیرا اسکول جانے سے روکنا چاہا مگر اس کی ایک ہی ضد کہ ''جتنے دن یہاں پر ہیں اپنی سکھیوں کے ساتھ ہی پڑھوں گی۔'' عذرا نے مجبوراً ہار مان لی۔

وہ گلے میں بستہ جھلاتی اور ہاتھ میں مولی کے پراٹھوں سے بھرا اسٹیل کا ٹفن تھامے اسکول کے احاطے میں داخل ہوئی..... جماعت میں داخل ہو کر اس نے رنگولی کے بستے کے ساتھ اپنا کپڑے کا سلا بستہ ٹھنسایا اور بمشکل رنگولی کے ساتھ اپنے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اسے رچنا اور رنگولی کے درمیان یوں پھنس کر بیٹھنا پڑا تھا ورنہ سب کو پتا تھا کہ رنگولی کے بستے کے ساتھ کی جگہ خالی رکھی تھی کیونکہ وہ ننھی کی ہوتی تھی، کسی کی مجال نہ تھی کہ ننھی کے علاوہ کوئی اور اس جگہ کو پُر کر سکے۔ پھر آج یہ کیا ہوا؟ رنگولی اس کی طرف توجہ کیوں نہیں دے رہی۔ استانی جی سے رنگولی کو ہمیشہ اسی بات پر ڈانٹ پڑتی تھی کہ وہ پڑھنے کے دوران مسلسل ننھی سے کھسر پھسر میں لگی رہتی۔ کتنی ہی مرتبہ اس نے اس کی سزا پورا پیریڈ کھڑا ہو کر بخوشی کاٹی تھی مگر آج رنگولی اس سے بات کرنا تو دور کی بات..... دیکھنا بھی پسند نہیں کر رہی تھی۔ آخر یہ کایا پلٹی کیسے.....؟

''کہاں چلیں رنگی؟'' تفریح کے وقت رنگولی اس کے پاس سے اٹھ کر باہر جانے لگی تو ننھی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دیکھا اماں نے تیرے لیے مولی کے پراٹھے بنا کر دیے ہیں، چل آمل کر کھاتے ہیں۔''

وہ ٹفن کھولنے لگی..... رنگولی نے ایک جھٹکے سے اپنا

ہاتھ چھڑایا اور نفرت سے اس کے پراٹھوں کو دیکھ کر تھتکارا۔

''یہ مولی کے پراٹھے تم موسلوں (مسلمانوں) کو ہی ہضم ہوتے ہیں۔ تمہاری ماں کے پلید ہاتھوں کے یہ پراٹھے کھانا تو دور کی بات..... میں تمہارے ساتھ بیٹھنا اور کلام کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' حقارت سے کہتی وہ ذرا فاصلے پر کھڑی ہوگئی..... رچنا اور دیگر ہندو لڑکیاں استہزائیہ مسکرا رہی تھیں۔ ننھی اس کے رویے پر دم بخود تھی۔

''کیا کہہ رہی ہو رنگولی؟'' صدمے سے نقمن اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا ٹاٹ پر دونوں پراٹھے گر گئے۔

''جو تمہارے کانوں نے سنا۔''

''اور تم اب اسکول میں کرنے ہی کیا آئی ہو۔ اپنی دھرتی پر جا کر ہی کتابیں چاٹنا اگر یہاں سے صحیح سلامت پہنچ گئے تو.....'' نفرت اس کے ہر لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

یہاں تک بات رہتی تو پھر بھی قابلِ برداشت تھی مگر جماعت کی سب لڑکیاں جب اس کے ساتھ نعروں میں شریک ہوئیں تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''نکل کے رہیں گے موسلے
بکھر کے رہیں گے موسلے
ہند ہمارا ، ناپاک تمہارا
کٹ کٹ کے گریں گے موسلے''

اور پھر ننھی کے نازک ہاتھوں کی آہنی انگلیاں رنگولی کے چہرے پر نشان چھوڑتی چلی گئیں۔ جانے اس کے نازک وجود میں کیسے اتنی طاقت آگئی تھی کہ اس نے تھپڑوں کی بارش کر دی تھی اور اس بارش میں جو لڑکی اس کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھی جھٹکتی چلی گئی۔ حبیبہ اور بشریٰ نے اسے بڑی مشکل سے قابو کیا تھا۔

رنگولی مسلمانوں کے خلاف ہذیان بک رہی تھی۔ رچنا اور دیگر لڑکیاں اسے موسلی کہہ کر چڑا رہی تھیں۔ ننھی نے نفرت سے رنگولی کے تھپڑوں سے لال منہ پر تھوکا تھا۔

''تم کیا مجھ سے دور رہنے کی بات کرتی ہو، میں تمہاری شکل پر ہزار بار لعنت بھیجتی ہوں..... بھیا ٹھیک ہی کہتے ہیں تم ہندو دوست نہیں، آستین کے سانپ ہو اور سانپوں سے دور ہی رہا جائے تو اچھا ہے۔'' ننھی چلائی تھی۔

رچنا نے غصے سے اس کے بالوں کی چوٹی کو کھینچ کر بل دے کر گھمایا، ننھی چکرا کر گر گئی۔

رنگولی نے اس کے گرتے ہی اپنے جوتے کی نوک اس کے منہ پر لگائی تھی۔

''تم موسلے ہمارے جوتوں میں رہنے کے لائق ہو، ہم ہی پاگل تھے جو تمہیں کندھوں کے ساتھ لگا کر چلتے تھے۔'' رنگولی نے بھی نفرت سے اس کے منہ پر تھوکا تھا۔

ننھی نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اتنی زور سے اپنی طرف کھینچا کہ رنگولی سر کے بل گری تھی اور اس کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ سب لڑکیاں اس پر پل پڑتیں۔ بشریٰ اور حبیبہ اسے کھینچتی ہوئی وہاں سے لے کر دوڑی تھیں۔

☆☆☆

بشریٰ اور حبیبہ دونوں طرف سے اسے تھامے اس کے گھر لے کر داخل ہوئی تھیں عذرا، ننھی کو اس حال میں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

''کیا ہوا اس کو.....؟'' اس نے اس کے بکھرے بال اس کے کانوں کے پیچھے اڑسے۔

حبیبہ نے ساری رُوداد سنائی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے الجھنے کی؟'' فرحت نے غصے سے اسے ڈپٹا۔

''باجی میں اس سے نہیں الجھی تھی، اس نے خود مجھ سے پنگا لیا تھا۔''

''وہ ماں کے ہاتھوں کو پلید اور ہم مسلمانوں کو موسلا کہہ، کہہ کر چڑا رہی تھی۔ ہمارے پاک وطن کو ناپاک کہہ رہی تھی۔'' رنگولی کے الفاظ یاد کر کے ننھی کا چہرہ اب بھی سرخ ہو گیا تھا۔

''ہر کوئی اپنے ظرف اور اوقات کے مطابق بات کرتا ہے۔ ان ہندو تعصب پسند قوم میں اتنا حوصلہ اور برداشت ہی کہاں ہے کہ یہ ہمیں پرواز کرتا دیکھ سکیں..... اٹھو تم اندر آؤ..... اور حبیبہ، بشریٰ تم دونوں

گھر جاؤ۔ اب باہر مت نکلنا۔'' فرحت، ننھی کو اٹھا کر اندر لے گئی اور حبیبہ، بشریٰ اپنے گھر کو چل دیں۔ عذرا کے چہرے پر متفکر لکیروں کا جال بُنا تھا۔

''ننھی نے رنگولی سے پنگا لے کر اچھا نہیں کیا۔ اس کا باپ ڈپٹی کلکٹر ہے۔ وہ زندہ دفن کردے گا۔'' اسے کچھ کرنا تھا اور بہت جلد کرنا تھا۔ وہ تو شکر ہے ذرا دیر بعد ہی ابصار اور فخر دین آگئے۔ وہ بھی ننھی کی لڑائی کا سن کر پریشان ہوگئے تاہم ابصار نے ننھی کو اپنے ساتھ لگالیا۔

''شاباش میری بہادر بہن..... ان ہندو بنیوں سے دبکنے کی کوئی ضرورت نہیں..... اچھا کیا جو اس کو سبق سکھادیا۔''

''اور جواب رنگولی کا باپ ہمیں سبق سکھائے گا اس کا بھی سوچا ہے تم نے.....'' فخر دین نے غصے میں اپنا صافہ چارپائی پر پھینکا۔

''یہ سب تمہاری دی ہوئی شہ ہے، کیا ضرورت تھی ان کے منہ لگنے کی۔ اپنا وقت چپ چاپ گزارتے، آخر ہم نے یہاں سے چلے ہی جانا تھا۔ مگر نہ جی..... ان پر تو وطن کی محبت کا جذبہ سوار ہو چکا ہے۔ اپنا نہیں سوچیں گے کہ ہمیں اس کا کیا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔'' وہ غصے سے بولتا جارہا تھا۔ ویسے بھی وہ آج کل کچھ چڑچڑا سا ہورہا تھا وطن حاصل کرنے کی خوشی الگ..... بھائی کو چھوڑ کر جانے کا غم بھی اسے تکلیف دے رہا تھا۔

عذرا جلدی، جلدی کچھ ضروری چیزیں تھیلے میں اکٹھی کررہی تھی۔ انہیں یہاں سے ہر حال میں نکلنا تھا اور بہت جلد نکلنا تھا۔

''ابصار اٹھو..... دونوں بہنوں کو جلد سے جلد کسی قابلِ اعتبار و بھروسے والے دوست کے گھر چھوڑ کر آؤ۔'' عذرا نے تھیلا فرحت کے ہاتھ میں تھمایا اور ابصار کے ساتھ دونوں کو روانہ کرنے لگی۔

''رہنے دو..... ابصار کے سارے دوست رنگولی کے باپ بھائیوں کی نظر میں ہیں، میں تم سب کو منشی امیر کی بہن کے گھر چھوڑ دیتا ہوں پھر وہاں سے موقع دیکھ کر دبلی باجی شکورن کے پاس چلے جائیں گے اور

اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے

کہتے ہیں، ایک سبزی فروش اور کمہار نے مل کر اونٹ کرایے پر لیا، ایک طرف سبزی فروش نے ترکاری، دوسری جانب کمار نے اپنے برتن لادے۔ راستے میں اونٹ گردن اٹھا کر سبزی والے کی ترکاری کھاتا رہا۔ کمہار یہ دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا رہا کہ چلو میں تو نقصان سے بچا۔ جب منزل آئی اور اونٹ والے نے اونٹ کو بٹھایا تو وہ اس طرف کروٹ لے کر بیٹھا، جدھر کمہار کے برتن لدے ہوئے تھے۔ وہ آن کی آن میں ٹوٹ کر ڈھیر ہوگئے۔ دونوں نے اپنے، اپنے نقصان کا اندازہ لگایا تو کمہار کا نقصان زیادہ نکلا۔ اس وقت سبزی والا بولا۔

''بھیا! گھبراتے کیوں ہو، آئندہ دیکھو، اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔''

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

مرحوم شوہر کی یاد میں

سبھی ساتھ تھے میرے ہم سفر
ساری دنیا تھی میری ہم نوا.....
تجھے موت چھین کے لے گئی
تو جگ میں کوئی ہمارا نہ رہا
کل تک فدا تھے تیری اولاد پر سب
چچا، تایا، پھوپیاں.....
بند ہوتے ہی تیری آنکھیاں
تیرے بچوں سے ان کا کوئی رشتہ نہ رہا
انہیں پیار تھا تیرے مال سے
سو وہ ان کی دسترس میں رہا
پھر بھی نہ تو پریشان ہوا ے مسافرِ آخرت
تیرے اہل و عیال کے ساتھ ہے
وہ ذات جو کریم ہے
ہمیں کافی ہے اس کا ساتھ ہی
ہمیں کافی ہے اس کا آسرا.....

آہِ دل..... از: حدیث اختر، بہاول پور

پھر وہیں سے سب مل کر پاکستان کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ تم بس جلدی سے ضروری سامان سمیٹو.....''
فخر دین نے عذرا سے کہا۔

''میں ابھی کہیں نہیں جارہی..... میں نیچے... تہ خانے میں چلی جاتی ہوں..... اس کا بھاری دروازہ توڑنا آسان نہیں ہے تم بس ان کو محفوظ ٹھکانے پر چھوڑ دو..... میں کچھ سامان اکٹھا کر لیتی ہوں۔ پھر تم آ کر مجھے بھی لے جانا۔''

''مگر اماں اس طرح..... آپ کو اکیلا ہم کیسے چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔''

''تم میری فکر نہ کرو..... بس نکلنے کی کرو..... ڈپٹی کلکٹر کے بندے کسی بھی وقت ہمارے گھر پہنچ جائیں گے۔'' عذرا نے فرحت اور ننھی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باپ بھائی کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا۔

''تم بہنوں کو لے کر جاؤ، میں یہیں تمہاری ماں کے پاس ہوں.....'' فخر دین، بیوی کا ہاتھ پکڑ کر... تہ خانے کی طرف چل دیا۔

دونوں بہنیں بہتے آنسوؤں کے ساتھ چل دیں۔ ماں، باپ کو اکیلا چھوڑ کر وہ جانا نہیں چاہتی تھیں مگر حالات ہی کچھ اس طرح کے ہو گئے تھے کہ اکیلے ہی نکلنا پڑا۔ دل خوف سے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

☆☆☆

ٹھاکر رمیش کمار کا نازوں پلی بیٹی کو اس حال میں دیکھ... کر برا حال تھا۔ غصے سے اس کے حواس مختل ہو رہے تھے۔ وہ غصے سے کبھی مکا اپنے ہاتھ پر مارتا تو کبھی پاؤں کو فرش پر مضبوطی سے دے مارتا..... اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔

بس نہیں چلتا تھا کہ فخر دین کے پورے خاندان کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر ڈالے۔

اس کی بیٹی کا سر پٹیوں میں جکڑا تھا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر تھی گو کہ حکیم نے اسے ہر چند تسلی دی تھی کہ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں..... مگر وہ باپ تھا جس نے اسے کبھی پھول نہ مارا آج دشمنوں کے ہاتھوں زخم کھا کر پڑی تھی اور یہی بات اس کے دل کو نفرت و انتقام کی آگ سے بھر رہی تھی۔

حکیم نے اس کے بیٹوں کو آنکھ سے اشارہ کیا تو وہ دونوں باپ کو کندھے سے پکڑ کر باہر لے گئے۔

''ابا جی فکر کی کوئی بات نہیں ہے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' مہندر نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دی۔

''او کیسے چنتا (فکر) نہ کروں میری دھی کو خون میں نہلا دیا۔ دشمن نے ہمیں اتنا کمزور سمجھ لیا۔ ہماری ہی زمین پر ہمیں ہی آنکھیں دکھاتا ہے۔ سوں (قسم) رب دی، جب تک فخر دین کی دھی کے خون کو نالیوں میں نہ بہادوں اس کے ماس (گوشت) کو کتوں کو نہ کھلا دوں چین مجھ پر حرام ہے۔'' اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا وہ غصے سے کھڑا ہوا۔

''میں نے بندے بھیج دیے ہیں، ایک، ایک کو اپنے ہاتھوں سے ماریں گے ہم مل کر..... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ اپنی بہن کے خون کے ایک ایک قطرے کا بدلہ فخر دین کے گھر کے ایک، ایک بندے کی جان ہے باپو.....'' کرن، باپ سے زیادہ بپھرا ہوا تھا۔

''آپ گھر چلیں..... ماں جی پریشان ہیں..... رنگولی کو جلد ہوش آجائے گا۔ ہم دونوں اسے لے کر آتے ہیں۔''

اس نے باپ کو تسلی دے کر گھر کی طرف روانہ کیا اور خود پریشانی میں یہاں وہاں ٹہلنے لگا۔

☆☆☆

دل میں اندیشے اور خوف و ہراس لیے ابصار ننھی اور فرحت کو لیے لیے، لمبے قدم بھر رہا تھا۔ ابھی چند گلیاں ہی طے کی تھیں کہ غلام دین پھرتی سے انہیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ بجلی کی سرعت سے غلام دین ان کے قریب پہنچا اور ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا کہہ کر وہ انہیں پچھلی گلی سے اپنی ہمراہی میں اپنے گھر لے گیا۔

وہ تینوں دم سادھے غلام دین کے ساتھ کانپتے پیروں سے تایا کے گھر میں داخل ہوئے تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے، غلام دین انہیں اس طرح کیوں اپنے گھر میں لے کر داخل ہوا ہے۔

''ابصار پتر پریشان نہ ہو..... ننھی کی ڈپٹی کلکٹر کی بیٹی سے لڑائی کی خبر پورے محلے میں پھیل گئی ہے۔ ڈپٹی کلکٹر کے بندے تیرے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ تیرے تایا نے چھت پر سے دیکھا تھا۔ تب ہی تم لوگوں کی مدد کو پہنچے۔ وہ تو شکر رب کا کہ تم رستے میں مل گئے اور اس کے بندوں کی نظر تم پر نہ پڑی۔'' نبیلہ جلدی، جلدی تفصیل بتاتی..... انہیں اندر کمرے میں بنی کوٹھڑی میں لے گئی۔

وہ حیران و پریشان چہرہ لیے انہیں تک رہے تھے۔ غلام دین نے نگاہ چرالی۔

''میں غلطی پر تھا ابصار پتر..... ہمیشہ اپنے دل کو دھوکا دیتا رہا کہ یہ ہمارا دیس ہے، یار ہمارے ہیں، پر اب پتا چلا کہ یہ یار نہیں غدار ہیں۔''

تایا کے جواب میں ابصار نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا کہ تایا واقعی رشتہ نبھا رہے ہیں یا کوئی چال کار فرما ہے۔ ان کی آنکھوں کی نمی اور چہرے کے تاثر سے وہ فی الحال کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے فی الحال اپنی بہنوں کی حفاظت کے لیے ٹھکانا چاہیے تھا اور اسے یقین تھا کہ تایا اس کی جان تو لے سکتے ہیں مگر اپنی بھتیجیوں کی عزت کی حفاظت کی خاطر جان دے بھی سکتے ہیں کہ بیٹیاں تو وہ اس کی بھی تھیں مگر اسے پھر بھی کچھ سوچنا تھا یہاں سے نکلنے کی تدبیریں کرنی تھی۔ ان کی گھر پر غیر موجودگی پر محلے کے ہر فرد کا شک اسی گھر پر ہونا تھا کہ یقیناً وہ یہیں موجود ہیں..... اسے یہاں سے کسی بھی طرح نکلنے کا سوچنا تھا۔

''تم سب یہیں کوٹھڑی میں رہو..... میں ذرا باہر کی صورت حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں..... اندر سے کنڈی لگا لو..... چاہے کچھ بھی ہو جائے یہاں سے باہر نکلنے کی حماقت نہ کرنا۔'' غلام دین ان کو تنبیہ کرتا باہر نکل گیا۔ ابصار کی آنکھوں میں پریشانی ہلکورے لے رہی تھی اسے ماں، باپ کی فکر ہو رہی تھی۔ جو جی کڑا کر کے تہ خانے میں بیٹھے تھے۔

☆☆☆

غلام دین ابھی گلی کا موڑ مڑے ہی تھے کہ ان سے موہن سنگھ کا ٹکراؤ ہو گیا۔

''بڑی جلدی میں ہو غلام دین، کہاں چلے..... چہرے سے بھی پریشان لگ رہے ہو۔'' موہن سنگھ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکا تھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بس ذرا دکان سے سودا لینے جا رہا تھا۔

''اچھا..... اچھا..... گھر پر آئے مہمانوں کو چا پانی پلانے کا بندوبست کرنے جا رہے ہو۔'' موہن سنگھ خباثت سے مسکرایا تھا۔

غلام دین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

موہن سنگھ نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ غلام دین کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔

''او کیوں پریشان ہوتا ہے؟ ہم تو یاروں کے یار ہیں، یاد ہے؟ تو نے بڑے وثوق سے یاری نبھانے کا عہد کیا تھا۔ بس آج تیری یاری نبھانے کا وقت آ گیا ہے۔'' موہن سنگھ نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے غلام دین کی طرف دیکھا۔

''میں سمجھا نہیں.....''

''سمجھا دیتے ہیں کاکے کو.....'' اس نے پھر سے طنز کیا۔ غلام دین خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''ابصار اور اس کی بہنوں کو میرے حوالے کر دو..... ٹھاکر سے بھاری رقم بھی ملے گی اور تمہیں یہاں پر سکون سے رہنے کی جگہ بھی۔'' موہن سنگھ کی سرگوشی نے غلام دین کے کانوں پر بم برسایا تھا۔

''ت..... ت..... تم کیسے جانتے ہو کہ ابصار میرے گھر پر ہے؟''

''او چھڈ انہاں گلاں نو (او چھوڑ ان باتوں کو) یاروں کی ہر بات سے یار باخبر رہتے ہیں، تو کیا سمجھتا ہے ہم تیری طرف سے غافل ہیں، تجھے کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے ہم کیسے گوارا کریں گے۔''

غلام دین اس کی بات کے جواب میں کچھ دیر خاموش رہا اسے موہن سنگھ سے اتنی بڑی بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ یاری نبھانے کا امتحان اس طرح لے گا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا موہن سنگھ۔'' الفاظ بمشکل اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔

''اچھا.....'' اس نے اچھا کو لمبا کیا۔

''سوچ لو خوش قسمتی ہر بار دروازے پر دستک نہیں دیتی صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ ہے..... تم چاہو تو ایک ہاتھ بڑھا کر اپنے گھرانے کے لیے خوشیاں خرید سکتے ہو ورنہ.....''

''ورنہ کیا.....؟'' غلام دین کی سانس ساکت ہوگئی۔

''بچے تو نہیں ہو غلام دین..... ورنہ کا مطلب اپنے دماغ سے سوچو.....'' موہن سنگھ اس کے کاندھے پر تھپکی کی طرح ہاتھ پھیر کر آنکھوں کے ابرو کے اشارے سے بہت کچھ جتاتا اس سے دور چلا گیا۔

غلام دین کے جسم پر لرزہ طاری ہونے لگا..... کھڑا ہونا اور قدم اٹھانا محال ہوگیا وہ قدموں کو پوری جان سے گھسیٹتا گھر کی طرف چل پڑا۔ اسے ابصار، نصیحتی اور فرحت کو ہر حال میں یہاں سے نکالنا تھا۔ خود اس نے بھی یہاں سے جانے کی دل میں ٹھان لی تھی کہ جن کو وہ یار سمجھتا تھا ان کے دلوں میں ان سب کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ نبیلہ نے جلدی سے دروازہ کھولا تو اسے اس طرح حواس باختہ دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا رومیصہ کے ابا..... خیریت تو ہے؟''

''خیر نہیں ہے۔'' اس نے کوٹھڑی کی طرف رخ کیا۔

''ابصار کو ہر حال میں یہاں سے نکالنا ہوگا۔ موہن سنگھ کو پتا چل گیا ہے کہ وہ سب میرے پاس ہیں، اس نے دھمکی دی ہے۔'' بتاتے ہوئے اس کے لب کانپ رہے تھے۔

''ابصار تو یہاں سے نکل بھی گیا۔''

''کب.....؟''

''جب آپ باہر نکلے تھے ابصار بھی سب کو لے کر پچھلے دروازے سے نکل گیا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے میری ایک نہ سنی.....''

''شکر ہے.....'' غلام دین نے سکون کی سانس خارج کی۔

''کچھ بتا کر گیا ہے کہ کہاں گیا ہے؟''

نبیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''بس اتنا کہا کہ ان کو محفوظ جگہ پر چھوڑ کر میں یہیں آؤں گا۔''

''ہم..... تم ایسا کرو جلدی سے اپنا ضروری سامان باندھو..... رات کو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''اتنی جلدی..... مگر کیوں؟ ہمیں تو یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''کسی بھول میں نہ رہنا..... میں نے آج موہن سنگھ کی آنکھوں میں بغض، نفرت وحسد کی چنگاریاں دیکھی ہیں۔ اب احساس ہو رہا ہے۔ اسے ہم سے بھی بغض ہے اور ہمارے مذہب سے بھی..... کیونکہ پاکستان مسلمانوں نے اپنے مذہب کے نام پر ہی تو حاصل کیا ہے۔''

''پر کیسے.....؟ موہن سنگھ ہم سے کیسے نفرت کر سکتا ہے؟ ہم ایک جگہ پلے بڑھے ہیں، کھایا پیا، ہم نوالہ ہم پیالہ..... وہ ہمیں کیسے دھمکی دے سکتا ہے؟ ہمیں نقصان پہنچانے کا سوچ سکتا ہے۔ نہیں..... ہرگز نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' نبیلہ نفی میں سر ہلا کر جیسے خود کو تسلی دے رہی تھی۔

''اماں اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں مت دیں..... ارجنا خالہ کو ہمارے گھر آئے سو جیں کتنے دن ہوگئے؟ نہ کھانے کی چیز ہماری طرف آئی اور ہماری طرف سے گئی چیز کو انہوں نے ہمارے سامنے گلی کے کتوں کے آگے پھینکا تھا۔ آپ کو دیکھ کر گھر کا دروازہ تڑاخ سے بند کر لیتی ہے پھر بھی آپ چشم پوشی کر رہی ہیں؟'' سنبل نے ماں کے دل سے مبہم سی امید کو بھی ختم کرنا چاہا تھا۔ سب کچھ واضح تھا مگر وہ پھر بھی اپنے دل کو دلاسا دے رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے اشک روانی سے بہنے لگے اور ایک دم سینہ کوبی کرنے لگی۔

''تمہارا لکھ نہ رہے موہن سنگھ..... ہم نے تمہارے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا اور تم ہماری جان کے دشمن بن گئے ہو۔''

''صرف موہن سنگھ نہیں اس چرن داس نائی کا حال دیکھو..... جس کے گھر میں سال بھر کا اناج ہمارے گھر سے جاتا تھا۔ ہماری روٹیوں پر پلنے والا مجھے

دیکھ کر استراحت کرنے لگ جاتا ہے۔"

"بیڑا غرق ہو جائے تیرا چرن داس..... سارے ہی ہماری جان کے دشمن بن گئے۔" نبیلہ کے رونے میں روانی آ گئی۔

"اب یہ رونا دھونا بند کرو..... اٹھ کے بچیوں کے ساتھ ضروری سامان رکھو....."

"جانا کدھر ہے؟" اپنے آنسو پونچھ کر اس نے دلگرفتگی سے پوچھا تھا۔

"تمہارے چچیرے بھائی کی طرف چلیں گے، اُدھر کے حالات کافی بہتر ہیں، بس کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔" غلام دین آنکھوں میں فکرمندی لیے بولا تھا۔

"ابا جہاں کہیں بھی جائیں گے جان کو خطرہ ہی رہے گا، اگر جانا ہی ہے تو اپنے پاکستان چلیں۔" ہمت کر کے رومیصہ نے زبان کھولی تو غلام دین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی لہریں تھیں۔

"فی الحال تو تم لوگ سامان باندھو۔ پھر کچھ سوچتے ہیں۔"

"کچھ نہیں سوچنا، میں نے اپنا ہندوستان چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔" نبیلہ فوراً بولی تھی۔

"کم عقل عورت بحث میں پڑنے کے بجائے اس مختصر وقت میں ضروری سامان سمیٹ کر جان بچانے کی کوشش کرو....." غلام دین کی کہی بات پر وہ بہتے اشکوں سے پٹیاں کھول کر جائزہ لینے لگی کہ کیا کچھ لے کر جایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

سورج ڈھلنا شروع ہو چکا تھا، شام کی سیاہی اپنے پر پھیلانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ ٹھاکر کے نتھنے غصے سے پھول اور پچک رہے تھے۔ اس کے بندوں نے جب آ کر اطلاع دی کہ فخر دین کا گھر خالی پڑا ہے، وہ سب وہاں سے نکل چکے ہیں..... یہ سن کر وہ آگ بگولا ہو گیا، ہر طرف اپنے بندے دوڑا دیے۔ اسے ہر حال میں فخر دین کی بیٹی چاہیے تھی۔ وہ ابصار کے گھر کا ایک، ایک کونا چھان رہے تھے۔ مہندر اور کرن بھی ہمراہ تھے۔

"یہ موسلے ہوتے ہی ڈرپوک ہیں، کیسے ڈر کر بھاگے ہیں، اگر ہندوؤں سے پنگا لینے کی جرأت کر ہی لی تھی تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کرتے..... پر شوہدوں (بیچاروں) میں اتنی جرأت ہی کہاں؟" رمیش کمار نے نفرت سے چارپائی کو ٹھوکر ماری تھی۔

"کہاں جائیں گے اتنی جلدی؟ زمین کی پاتال میں سے نکال لاؤں گا اس کے خاندان کو....." مہندر نے اپنی رائفل کی نوک کو زمین میں گاڑا تھا۔ دفعتاً کرن کی نگاہ کمرے میں دیوار پر لٹکی لالٹین پر پڑی۔ اس نے لپک کر لالٹین اتاری تھی۔

قریب ہی طاق میں رکھی ماچس کو اٹھاتے ہوئے اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ ابھری تھی۔

"ان کو تو بعد میں موت کے گھاٹ اتاریں گے، پہلے ان کے ٹھکانے کو بھسم کرتے ہیں، سارے کمروں میں کرن لالٹین کا تیل چھڑک رہا تھا، مہندر نے اس کے ہاتھ سے ماچس لے کر تیلی جلا کر پھینکی تھی۔ چاروں اور آگ بھڑک اٹھی تھی۔

رمیش کمار نے مسکرا کر دونوں بیٹوں کی پشت پر ہاتھ مار کر ان کے اس عمل کو سراہا تھا۔ بھڑکتے شعلوں کو دیکھ کر ان کے دل کو سکون مل رہا تھا۔

"اب آپ گھر جائیں ابا جی، ہم دونوں اس کمینے کی بہن کو زندہ یا مردہ لے کر ہی آپ کے پاس حاضر ہوں گے۔" وہ باپ کو تسلی دیتے ہوئے وہاں سے عجلت میں نکلے تھے۔ رمیش کمار نے ایک بار پھر نفرت سے ابصار کے گھر کو جلتے دیکھ کر تھوکا تھا۔

☆☆☆

دروازہ اتنی زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا کہ لگتا تھا چند پل نہ کھولا گیا تو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ غلام دین کانپتے پیروں اور ہاتھوں سے دروازے تک پہنچا تھا اور دروازہ کھولا تھا۔ باہر ٹھاکر کے بیٹے اور ساتھ میں کچھ مونچھوں کو تاؤ دیتے آدمی کھڑے تھے۔

غلام دین کے دروازہ کھولتے ہی مہندر نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

"بول جلدی سے کہاں چھپایا ہے اپنے لگتے سگوں کو....." مہندر کی آواز میں ایسی غراہٹ تھی کہ اندر

رومیصہ، سنبل اور نبیلہ کے دل خوف سے سکڑ گئے تھے۔

''مم..... مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں؟ بے شک گھر کی تلاشی لے لو۔'' غلام دین ہکلا گئے تھے۔

''تلاشی تو ہم لے ہی لیں گے، یاد رکھنا اگر تیرے بھائی کے گھر والے نہ ملے تو چھوڑیں گے تجھے بھی نہیں.....'' مہندر نے ایک جھٹکے سے گریبان چھوڑا تھا۔ غلام دین گرتے، گرتے بچا تھا۔

''ارے مہندر بابو! یہ بیچارا تو بے قصور ہے..... وہ اس کے گھر پناہ لینے آئے ضرور تھے مگر اس سمجھدار نے ان کو نکال دیا تھا۔'' موہن سنگھ نے اچانک ہی نمودار ہو کر ان کو سہارا دیا تھا۔

''میرے ساتھ چلیں، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ابصار اپنی بہنوں کو لے کر کہاں چھپا ہے۔'' موہن سنگھ نے شاطر مسکراہٹ غلام دین پر اچھال کر مہندر سے کہا۔

غلام دین کا دم خشک ہو گیا تھا' اس کا مطلب موہن سنگھ اس کے گھر کی مکمل پہرے داری کر رہا تھا۔

''جلدی کرو پھر..... دیر کس بات کی ہے؟'' مہندر نے اسے جھٹکے سے اپنے آگے کیا تھا۔

''غلام دین تیرے بھائی کے گھر آگ بھڑک رہی ہے، شعلے ہواؤں سے باتیں کر رہے ہیں، لگتا ہے تیرے بھائی، بھرجائی تجھے مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔'' موہن سنگھ اس کے کانوں میں صور پھونکتا مہندر کے ساتھ چل پڑا تھا۔

غلام دین تڑپ اٹھا، وہ مردہ قدموں سے گھر کے اندر آیا تو یہ روح فرسا خبر سن کر ان تینوں نے اپنے سینے پیٹ ڈالے تھے۔

''ہائے یہ کیا ظلم ہو گیا رومیصہ کے ابا..... بھائی فخر اور بھابی عذرا تو اندر تہ خانے میں ہی تھے۔''

''ابا جلدی کچھ کریں..... ہو سکتا ہے آگ ابھی تہ خانے کے اندر تک نہ پہنچی ہو.....'' رومیصہ نے باپ کو باہر جانے پر اکسایا۔

غلام دین شتابی سے باہر نکلا تھا، اسے کچھ کرنا تھا اور بہت جلد کرنا تھا، وہ تیز، تیز قدم اٹھاتا فخر دین کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ دل وسوسوں و خدشوں میں گھرا تھا۔ بھائی، بھابی کو کھو دینے کے خوف نے اس کا دل منجمد کر دیا تھا۔ فخر دین کی گلی کے قریب پہنچتے ہی دھوئیں کے بادل پھیلے تھے، گلی میں لوگ اکٹھا ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے، مسلمانوں کے دلوں میں گھر کو نذر آتش دیکھ کر دکھ اور تاسف بھرا تھا اور دوسری قوموں کی آنکھوں میں استہزا تھا۔ جلتے گھر کا داخلی کواڑ شعلوں کی زد میں تھا۔ اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''اپنے بھائی، بھابی کو کیسے بچاؤں اب تک تو شاید اندر سب کچھ ہی ختم ہو چکا ہو۔'' اس نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھا تھا، آنکھوں میں آنسو بھرے وہ گلی سے نکلنے لگا۔ قدموں سے جان نکلنے کو تھی۔ دفعتاً کسی نے پیچھے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''چاچا فکر نہ کرو..... چاچا فخر اور چاچی عذرا بالکل خیریت سے ہیں اور میرے مامے کے گھر میں ہیں۔ ابصار مجھے جاتے ہوئے بتا گیا تھا، آگ کی لپیٹ میں آنے سے پہلے میں پچھلی گلی کے چھوٹے سے دروازے کو اکھاڑ کر نیچے تہ خانے میں داخل ہو گیا تھا اور انہیں بحفاظت اپنے مامے کے گھر پہنچا دیا ہے۔'' چہرے پر ہلکا سا رومال ڈالے وہ ابصار کا دوست دیبا (ندیم) تھا۔

''دیبے پتر تیرا کس منہ سے شکریہ ادا کروں..... تو ایک احسان اور کر..... کسی طرح اپنی بہنوں کو ان کی چاچی کے پاس پہنچا دے۔ موہن سنگھ کی آنکھوں میں، میں نے خون اور شیطانیت دیکھی ہے۔ ابصار سے کہنا اپنی امانت اپنے ساتھ لے جائے.....'' ان کے الفاظ آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''جو حکم چاچا آپ کا..... آپ گھر چلیں..... میں تھوڑی دیر میں آپ کے گھر تک پہنچتا ہوں..... پچھلے دروازے کے پاس آپ ان دونوں کو تیار رکھیں۔''

غلام دین نے صافے سے اپنے چہرے پر پھسلتے آنسوؤں اور آنکھوں کو صاف کیا تھا۔

''اور ہاں ابصار کا کچھ پتا ہے، وہ بہنوں کو لے کر کہاں گیا ہے۔ موہن سنگھ ٹھاکر کے بیٹوں کو لے کر گیا ہے، مجھے لگتا ہے اس نے ابصار کی پیروی کی ہے۔''

''کیا.....؟'' دیبے کا یہ سب سن کر رنگ فق ہوا تھا۔

''آپ گھر جائیں، میں ابصار کو دیکھتا ہوں۔'' وہ سرپٹ دوڑا۔ غلام دین ڈرے، سہمے گھر میں داخل ہوا تھا۔

شام سرمئی رنگ اوڑھ کر کالے گہرے ماتمی لباس میں لپٹ چکی تھی۔ دیے نے پوپلنگڑے کو غلام دین کے گھر سے رومیصہ اور سنبل کو دھیان سے اپنے مامے کے گھر لانے کا کہا۔ خود پپو اور دیے کے گھر والے سب اس کے مامے کے گھر جمع تھے، ارادہ تھا کہ کل کی ٹرین سے یہاں سے خاموشی سے نکل جائیں گے۔

دیے دل میں ابصار اور اس کی بہنوں کی حفاظت کی دعائیں کرتا بڑی نہر کے قریب منشی کے گھر کی طرف چل پڑا کہ ابصار نے ان کو وہیں چھوڑ کر آنے کا بتایا تھا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے منشی کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا مگر اندر سے جواب ندارد تھا۔

''چاچا منشی میں ہوں ابصار کا دوست دیا.....'' اس نے اپنی آواز پہچان کروائی۔

جھٹ سے دروازہ کھول دیا گیا۔

''دیے پتر ہم لٹ گئے.....'' چاچا منشی نے سینے پر دوہتڑ مارا تھا۔

''کیا ہوا چاچا خیر تو ہے؟''

''خیر نہیں ہے.....ابصار کی بہنوں کو ٹھاکر کے بندے اٹھا کر لے گئے ہیں۔'' روتے ہوئے منشی نے خبر سنائی تو دیا جیسے سانس لینا بھول گیا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا چاچا؟''

''موہن سنگھ نے مخبری کی تھی۔''

''ابصار کہاں تھا اس وقت.....؟''

''ابصار یہاں سے غلام دین کے گھر جانے کے لیے نکل چکا تھا۔ ہائے میں اس کی امانت کی حفاظت نہ کر سکا۔'' وہ پھر سے اپنا سر پیٹنے لگا۔

''کچھ اندازہ ہے وہ لوگ کس طرف گئے ہیں؟''

''وہ لوگ بڑی نہر کی طرف لے کر گئے ہیں انہیں.....'' منشی کا لہجہ کانپ رہا تھا۔

دیے نے مزید کچھ بھی سنے بغیر نہر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ وہ پوری طاقت سے بڑی نہر کی طرف جاتے رستے پر دوڑ رہا تھا۔

''یقیناً وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔'' بھاگتے، بھاگتے وہ ہانپنے لگا تھا۔

''پتا نہیں وہ کتنے لوگ ہوں گے اور میں ان ظالموں سے کیسے بچا پاؤں گا ابصار کی بہنوں کو۔''

دفعتاً اسے نسوانی چیخوں کی پکار سنائی دی۔ وہ دہل گیا تھا یہ تو منحی اور فرحت کی آواز تھی۔

آہستگی سے وہ آوازوں کے قریب ہوتا گیا۔

چاند کی مدھم روشنی میں اسے چند لمحوں بعد ہی روح فرسا منظر دیکھنے کو ملا تھا۔ منحی کو درخت سے باندھا جا رہا تھا اور فرحت کے سر سے چادر اتاری جا رہی تھی۔

اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ ٹھاکر کے دونوں بیٹوں مہندر اور کرن کے ساتھ دو بندے اور بھی تھے۔ اس سے قبل کہ کوئی شیطانی کھیل کھیلا جاتا..... دیے نے پاس پڑے دو بھاری پتھر اٹھا کر اللہ اکبر کی صدا لگا کر پیچھے سے کھینچ کر مارے تھے۔ نشانہ ٹھیک لگا تھا۔ دونوں آدمیوں کے سر سے خون فوارے کی طرح ابلا تھا اور وہ زمین پر تڑپنے لگے تھے۔ مہندر کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ دیے نے ان دونوں بھائیوں کو کچھ سمجھنے اور کرنے کا موقع دیے بغیر بجلی کی سرعت سے قریب پہنچ کر اپنے نیفے میں سے خنجر نکال کر کرن کے پیٹ میں گھونپا تھا۔ وہ بھی تڑپتا ہوا زمین بوس ہوا تھا۔ مہندر نے اپنی رائفل سیدھی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ چلاتا فرحت نے اس کی پیٹھ میں کھینچ کر لات ماری تھی۔ وہ جھٹکا کھا گیا تھا۔ رائفل دور جا گری۔ دیے نے چشم زدن میں رائفل اٹھائی تھی اور مہندر پر تان لی۔ اس نے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

فرحت درخت سے بندھی منحی کی جلدی، جلدی رسیاں کھولنے لگی۔

''مسلمانوں کا خون بہانا اور ان کی عزت پر ہاتھ اٹھانا تو نے اتنا ہی آسان سمجھ لیا تھا، اب اپنے ساتھیوں کے مرنے کا تماشا دیکھ اور اپنے حلق میں ان بیسر کار توسوں کے اترنے کا ذائقہ.....''

اس کی بات بیچ میں ہی رہ گئی تھی کیونکہ پیچھے سے جس آدمی کے سر میں پتھر لگا تھا اس نے اٹھ کر دیے کے

ہاتھ سے رائفل چھین لی تھی۔ اب وہ نہتا تھا۔ مہندر اور اس کا ساتھی شیر ہو گئے۔

''ہاہا.....'' مہندر ہنسا تھا۔

''اب دیکھ تیرے سامنے تیرے دوست کی بہن کی عزت کو کیسے تار، تار کرتا ہوں۔ اب تو تماشا دیکھ.....''

مہندر پر جنون سوار ہو چکا تھا، اس کے ناپاک ہاتھ ننھی کے بدن پر پھیل رہے تھے، ننھی چیخ رہی تھی۔ فرحت، مہندر کو پیچھے سے کھینچ رہی تھی۔ اس پر مکے برسا رہی تھی مگر مہندر کو ہوش ہی کہاں تھا۔

دیبے کی ریڑھ کی ہڈی میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ وہ شیر کی طرح پھر اٹھا تھا۔ ایک غیبی طاقت سے اس نے رائفل پر ہاتھ مارا تھا، رائفل اس آدمی کے ہاتھ سے نکل کر قریب گزرتی نہر میں جا گری تھی۔

اب دیبا مہندر پر پل پڑا تھا۔ مکے لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی تھی۔ مہندر کے ساتھی نے ننھی کو دبوچنا چاہا مگر اس نے جھٹکے سے ننھی کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ اسی اثنا میں فرحت نے کرن کے پیٹ میں گھسا خنجر کھینچ کر نکالا اور مہندر کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ مہندر کے ساتھی نے پھر سے ننھی کو اپنی طرف کھینچا تھا اور اسی کھینچا تانی میں ننھی نہر میں جا گری تھی۔

نہر میں زور کا چھپاکا ہوا اور ساتھ ہی فرحت کی درد میں ڈوبی چیخ ابھری..... دیبے نے ایک پل کے لیے آنکھیں میچی تھیں۔ اب وہ مہندر کے ساتھی پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک، ایک کو ٹھوکروں کی زد میں رکھا تھا۔ ان کے پیٹوں میں خنجر گھونپتا وہ ان کے منہ پر تھوکتا فرحت کو لے کر وہاں سے بھاگا تھا۔ فرحت وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھی۔ بار، بار نہر کی طرف لپکتی۔

لے کر بھاگ رہا تھا۔ فرحت روتی، ہانپتی، بمشکل اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

☆☆☆

کچھ راتیں اپنے جلو میں کرب، آہیں اور سسکیاں لے کر اپنے پر پھیلاتی ہیں۔ ہندوستان میں تو ویسے بھی آج کل ہر رات ایک امتحان گاہ بنی تھی۔ ماؤں کے کلیجے شق ہو رہے تھے تو کہیں سہاگ کے لٹنے پر ماتم ہو رہا تھا۔ فخر دین اور غلام دین کے گھر بھی ایک ایسی ہی رات نے پیچھا کیا تھا۔ جس میں نوحے تھے، سسکیاں تھیں۔

پپو، لنگڑا، رومیصہ اور سنبل کو دیبے کے ماموں کے گھر بحفاظت لے گیا تھا۔ رومیصہ، ماں باپ کو چھوڑ کر کسی صورت بھی جانے کو تیار نہیں تھی مگر غلام دین نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''تم قافلے کے ساتھ جاتے ہوئے ماری جاؤ..... یہ میں صبر کر لوں گا مگر موہن سنگھ کے ہاتھوں میری بیٹیوں کے ساتھ کوئی گھناؤنا کھیل کھیلا جائے یہ سوچ ہی مجھے مار دے گی۔ خدا کے لیے تم دونوں یہاں سے چلی جاؤ..... یہاں پر تمہاری عزتیں محفوظ نہیں ہیں..... فی الحال ہم بھی یہاں سے تمہاری خالہ شکورن کے شہر چلے جائیں گے اور پھر قسمت میں ہوا تو شاید پاکستان بھی آ جائیں.....'' روتے ہوئے غلام دین نے دونوں کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ نبیلہ نے بھیج کر بیٹیوں کو سینے سے لگایا۔ اور ایک پوٹلی رومیصہ کی مٹھی میں دبا دی تھی۔

دونوں بہنیں روتی وہاں سے نکلی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد غلام دین نے یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ نبیلہ کھڑی باندھے متورم چہرہ لیے تیار

سکھ یقیناً گہری نیند میں ہوگا۔ اس نے نبیلہ کو گھر سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ نبیلہ دھڑکتے دل اور [illegible] دہلیز پار کرنے لگی۔ غلام دین نے گلی میں جھانک کر دیکھا اور خالی گلی پا کر نبیلہ کا ہاتھ پکڑ کر [illegible]

ہاتھ سے رائفل چھین لی تھی۔ اب وہ نہتا تھا۔ مہندر اور اس کا ساتھی شیر ہو گئے۔

''ہاہا.....'' مہندر ہنسا تھا۔

''اب دیکھ تیرے سامنے تیرے دوست کی بہن کی عزت کو کیسے تار، تار کرتا ہوں۔ اب تو تماشا دیکھ.....''

مہندر پر جنون سوار ہو چکا تھا، اس کے ناپاک ہاتھ ننھی کے بدن پر پھیل رہے تھے، ننھی چیخ رہی تھی۔ فرحت، مہندر کو پیچھے سے کھینچ رہی تھی۔ اس پر مکے برسا رہی تھی مگر مہندر کو ہوش ہی کہاں تھا۔

دیے کی ریڑھ کی ہڈی میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ وہ شیر کی طرح بپھرا تھا۔ ایک غیبی طاقت سے اس نے رائفل پر ہاتھ مارا تھا، رائفل اس آدمی کے ہاتھ سے نکل کر قریب گزرتی نہر میں جا گری تھی۔

اب دیا مہندر پر پل پڑا تھا۔ مکے لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی تھی۔ مہندر کے ساتھی نے ننھی کو دبوچنا چاہا مگر اس نے جھٹکے سے ننھی کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ اسی اثنا میں فرحت نے کرن کے پیٹ میں گھسا خنجر کھینچ کر نکالا اور مہندر کی پیٹھ میں گھونپ دیا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ مہندر کے ساتھی نے پھر سے ننھی کو اپنی طرف کھینچا تھا اور اسی کھینچا تانی میں ننھی نہر میں جا گری تھی۔

نہر میں زور کا چھپاکا ہوا اور ساتھ ہی فرحت کی درد میں ڈوبی چیخ ابھری..... دیے نے ایک پل کے لیے آنکھیں بند کی تھیں۔ اب وہ مہندر کے ساتھی پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک، ایک کو ٹھوکروں کی زد میں رکھا تھا۔ ان کے پیٹوں میں خنجر گھونپتا وہ ان کے منہ پر تھوکتا فرحت کو لے کر وہاں سے بھاگا تھا۔ فرحت وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھی۔ بار، بار نہر کی طرف لپکتی۔

''میری ننھی..... میری ننھی کو بچا لو دیے.....''

وہ تڑپ رہی تھی۔

''بچایا ہی تو ہے اسے..... ان ظالم لٹیروں کے ہاتھوں..... اس وطن کی آزادی میں ننھی کی جان جانے کا دکھ اس کی عزت بچ جانے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ دیر نہ کرو..... ذرا ہی دیر میں ٹھاکر کے کتے ہماری بُو سونگھتے ہم تک پہنچ جائیں گے۔'' وہ بہت تیزی سے فرحت کو لے کر بھاگ رہا تھا۔ فرحت روتی، ہانپتی، بمشکل اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

☆☆☆

کچھ راتیں اپنے جلو میں کرب، آہیں اور سسکیاں لے کر اپنے پر پھیلاتی ہیں۔ ہندوستان میں تو ویسے بھی آج کل ہر رات ایک امتحان گاہ بنی تھی۔ ماؤں کے کلیجے شق ہو رہے تھے تو کہیں سہاگ کے لٹنے پر ماتم ہو رہا تھا۔ فخر دین اور غلام دین کے گھر بھی ایک ایسی ہی رات نے پیچھا کیا تھا۔ جس میں نوحے تھے، سسکیاں تھیں۔

پپو، لنگڑا، رومیصہ اور سنبل کو دیے کے ماموں کے گھر بحفاظت لے گیا تھا۔ رومیصہ، ماں باپ کو چھوڑ کر کسی صورت بھی جانے کو تیار نہیں تھی مگر غلام دین نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''تم قافلے کے ساتھ جاتے ہوئے ماری جاؤ..... یہ میں صبر کر لوں گا مگر موہن سنگھ کے ہاتھوں میری بیٹیوں کے ساتھ کوئی گھناؤنا کھیل کھیلا جائے یہ سوچ ہی مجھے مار دے گی۔ خدا کے لیے تم دونوں یہاں سے چلی جاؤ..... یہاں پر تمہاری عزتیں محفوظ نہیں ہیں..... فی الحال ہم بھی یہاں سے تمہاری خالہ شکورن کے شہر چلے جائیں گے اور پھر قسمت میں ہوا تو شاید پاکستان بھی آ جائیں.....'' روتے ہوئے غلام دین نے دونوں کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ نبیلہ نے بھینچ کر بیٹیوں کو سینے سے لگایا۔ اور ایک پوٹلی رومیصہ کی مٹھی میں دبا دی تھی۔

دونوں بہنیں روتی وہاں سے نکلی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد غلام دین نے یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ نبیلہ گٹھڑی باندھے مترنم چہرہ لیے تیار بیٹھی تھی۔ اپنے بھرے پرے گھر کو اس طرح چھوڑ کر جانا آسان نہ تھا اس کے لیے۔

غلام دین نے جب مکمل اطمینان کر لیا کہ موہن سنگھ یقیناً گہری نیند میں ہوگا۔ اس نے نبیلہ کو گھر سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ نبیلہ دھڑکتے دل اور روتی آنکھ سے دہلیز پار کرنے لگی۔ غلام دین نے گلی میں جھانک کر دیکھا اور خالی گلی پا کر نبیلہ کا ہاتھ پکڑ کر قدم دروازے

سے باہر رکھے مگر ان کے قدم گلی میں آگے بڑھ ہی نہ پائے۔ نبیلہ چیخ مار کر سینے پر دوہتڑ مارنے لگیں۔ غلام دین کے پاؤں اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔

چرن داس، نبیلہ کو کھینچ کر اندر لے گیا تھا۔ چھت پر موہن سنگھ پھندا لگائے بیٹھا تھا اور نہ جانے کب سے ان کے نکلنے کا منتظر تھا۔ غلام دین کا پھندا کستا جا رہا تھا اور اس کے قہقہے بڑھتے جا رہے تھے۔ غلام دین کی آنکھیں ابلنے لگی تھیں۔

موہن سنگھ نے یک دم رسی ڈھیلی کر کے چھوڑ دی تھی۔

غلام دین دھڑام سے زمین پر گرا تھا۔

موہن سنگھ اسے گھسیٹتا ہوا گھر کے اندر لے گیا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا، جان نکل رہی تھی۔ منہ سے عجیب آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ دونوں ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

''تیرا بیڑا غرق ہو جائے موہن سنگھ، چھپ کر وار کرنے والے..... سامنے آ کر کرتا تو تیری ہڈیاں اور پاس الگ، الگ نہ کر دیتے تو کہنا۔'' نبیلہ تڑپ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔

چرن داس نے اسے بانہوں کے حلقے میں لے رکھا تھا۔ وہ اس حلقے سے نکلنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

''بڑی اتھری ہے بھئی غلام دین تیری (گالی) آج اس کا اتھرا پن تیرے سامنے نکالیں گے ہم۔'' چرن داس نے نبیلہ کے ہونٹوں پر انگلی پھیری تھی۔ نبیلہ نے اس کے منہ پر تھوکا تھا اور اس کی انگلیاں دانتوں میں دبا کر چبا ڈالی تھیں۔

وہ بلبلا گیا۔ موہن سنگھ نے نبیلہ کی چوٹی کو اپنے ہاتھ پر بل دینے شروع کر دیے تھے۔

''اتنا غصہ..... اتنی پیاری شکل پر جچتا نہیں ہے رانی.....'' اس نے اپنا منہ نبیلہ کے چہرے کے قریب کیا تھا۔ مگر کوئی بھی جسارت کرنے سے پہلے وہ تڑپ اٹھا تھا۔ موہن سنگھ کی کرپان جو پاس ہی پڑی تھی اس کی پیٹھ میں گھونپ دی گئی تھی۔ چرن داس نے بہت پھرتی سے اپنا استرا نکالا تھا اور آنے والے پر حملے کے لیے بڑھا تھا۔ ابصار نے پھرتی سے سائڈ پر ہو کر اپنا بچاؤ کیا تھا۔

''اس دھرتی پر میرا نہیں تم دونوں کا خون بہے گا، اس پلید دھرتی کو تمہارے پلید خون کی اشد ضرورت ہے۔'' ابصار ستون کے پیچھے ہوا تھا۔ چرن داس نے اپنا وار خالی دیکھ کر فوراً ہی پاس کھڑی نبیلہ کے پیٹ میں استرا مار دیا تھا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔

ابصار کا خون کھول اٹھا۔ کرپان سے اس نے چرن داس کی گردن کو تن سے ہی جدا کر دیا تھا۔ موہن سنگھ نیم مردہ حالت میں پڑا تھا۔ ابصار نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی لگائی اور کرپان سے موہن سنگھ کی ٹانگوں کا قیمہ بنا ڈالا۔ اسے تڑپنے کے بھی قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''صبح جب تمہارے گھر اور محلے والے تمہاری لاشوں کو دیکھیں گے تو اتنا ضرور جان لیں گے کہ مسلمان بزدل نہیں..... تمہارے جیسے جسموں کو ریشہ، ریشہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔'' نفرت سے ابصار نے ان دونوں کی لاشوں کو ایک، ایک ٹھوکر رسید کی پھر وہ نبیلہ کی طرف متوجہ ہوا جو اپنے خون میں رنگی دنیا سے منہ موڑ چکی تھی۔ وہ اس گھر سے نکلنے کو تیار نہیں تھی اور یہی گھر اس کی موت کا سبب بنا۔

وہ اسے تاسف سے دیکھتا غلام دین کی طرف چلا آیا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر تایا کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر رو دیا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا ناں تایا جی..... یہ آپ کے دوست نہیں ہیں، یہ آپ کے دشمن ہیں..... موقع ملتے ہی یہ آپ کی جان لے لیں گے اور آپ کے تڑپتے، سسکنے کا تماشا ہنس، ہنس کر دیکھیں گے۔ کاش! آپ میری باتوں پر دھیان دے لیتے۔'' روتے ہوئے اس نے نبیلہ اور غلام دین کی لاشوں کو کھینچ کھانچ کر ایک جگہ اکٹھا کیا اور ان پر کپڑا ڈھانپ کر آخری نظر ڈال کر کنڈی کھول کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

وہ سب وہاں سے اسی وقت نکل گئے تھے..... قافلے صبح شام جانے کے لیے تیار تھے۔ اب یہ اس کی قسمت ہوتی کہ وہ منزل پر پہنچ جاتا یا راستے میں ہی اپنی سرزمین پر پہنچنے کی حسرت لیے ملک عدم پہنچا دیا جاتا۔

وہ سب ریڑھوں پر سوار تھے۔ جلد از جلد وہ ہندوستان کی حدود سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ٹھاکر کے آدمی یقیناً پاگلوں کی طرح انہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اس کے دو جوان بیٹوں کا خون ہوا تھا، بیٹی دماغ کی چوٹ کھائے پڑی تھی۔ ایسے میں اس کے دماغ کا پھر جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

''ریڑھا تیز چلاؤ بابو.....'' ابصار چیخ کر بولا تھا۔

''ریڑھے کے آگے جانور بندھا ہے پتر..... کوئی مشین نہیں..... دیکھ تو اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ اور وزن اٹھائے کیسے دوڑ رہا ہے۔'' بابو دین نے زخمی مسکراہٹ سے ابصار کی طرف دیکھا تھا، وہ خاموش ہو کر ہونٹ کاٹنے لگا تھا۔

''کاش! وہ اس ریڑھے کو پر لگا کر ہوا میں اڑاتا ہوا پاکستان پہنچ سکتا۔'' وہ سوچ کر رہ گیا۔

عذرا اور فرحت کی سسکیاں اسے اپنے دل پر محسوس ہو رہی تھیں۔ ننھی سے بچھڑ جانے کا غم اس کا بھی دل چیر رہا تھا۔

آنکھوں میں آئی نمی کو وہ بار، بار صاف کرتا، وہ تو کھل کر رو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے تو ایک ننھی کو کھویا تھا۔ رومیصہ تو اپنے، ماں باپ دونوں کو کھو کر جا رہی تھی۔

اس نے قصداً رومیصہ کو اس کے والدین کی موت کی خبر نہیں دی تھی۔ اچھا ہے اس کی امید بندھی رہے اگر امید ختم ہو جاتی تو شاید وہ بھی ختم ہو جاتی۔ کچھ دکھوں سے پردہ پوشی ہی جینے کا سبب بن جاتی ہے۔ دل کے قریب..... محبتوں سے بھرے، قدرت کے بنے رشتوں کی تکلیف اور لمحوں سے دوری ایسی ہی ہے جیسی تپتی بھٹی میں جھلستے بدن کی اذیت..... اور ابصار اسے یہ اذیت دینا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ فخر دین کو اس نے ساری بات بتا دی تھی۔ وہ منہ چھپا کر رو دیا تھا۔

اپنے جان سے پیارے رشتوں کو کھو کر یہاں سے جانا پڑ رہا تھا۔ کتنوں کے لہو کی قربانی دینی پڑی تھی۔ مال و اسباب تو ایک طرف رشتوں کو کھو دینے کا غم ان کی جان کھینچ رہا تھا۔

''ابا اس پاک سرزمین پر پہنچ کر اپنے پیاروں کو کھو دینے کا غم بھولے گا تو نہیں مگر ہلکا ضرور ہو جائے گا۔ پاکستان کی مٹی کی خوشبو سونگھیں گے تو دماغ سے ساری کلفتیں اور غم مٹ جائیں گے۔'' ابصار نے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔

ریڑھے چند لمحوں کو رکے تھے۔ شام ہونے کو تھی۔ پاکستان ذرا ہی دور تھا۔ خوشی سب کے چہروں پر رقص کر رہی تھی۔ پاکستان زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی تھی۔ کچھ جذباتی یہیں سجدۂ شکر ادا کرنے لگے تھے۔ اچانک پیچھے آنے والے قافلے میں سے کوئی سرعت سے نکلا تھا اور سرعت ہی سے ابصار پر حملہ کیا تھا۔ ابصار کا بازو کٹ کر ڈھلک گیا تھا۔ عذرا اور فرحت کی چیخیں نکل گئیں۔ رومیصہ بھی شرم بالائے طاق رکھ کر ابصار کی طرف لپکی تھی۔ دشمن نے پے در پے اس کے جسم پر کئی وار کیے تھے، ابصار مکمل زخمی ہو چکا تھا۔

رومیصہ نے ابصار کو بچانے کے لیے ہاتھ آگے کیا تو اس کی کلائی پر کرپان کا وار ہوا۔ کلائی لٹک گئی۔

فخر دین نے رومیصہ کو کھینچ کر جلدی سے کلائی کو سیدھا کر کے اس پر صافہ باندھ دیا تھا۔ سب نے اس شخص کو قابو کر لیا تھا اور کرپان اس کے ہاتھ سے چھین لی تھی۔

''تیرا کیا خیال تھا موسلے تو یہاں سے زندہ چلا جائے گا۔ میرے بھائی کا خون اتنا سستا سمجھ لیا تھا جس دھرتی پر جانے کے تو خواب دیکھ رہا تھا ناں تیرا یہ خواب پورا نہیں ہو سکے گا۔ تو ہماری اسی دھرتی ماں پر سسک، سسک کر مرے گا۔'' وہ نفرت سے بڈبڑاتا بک رہا تھا۔ وہ موہن سنگھ کا بھائی تارا سنگھ تھا۔ جانے کیسے اسے خبر ہو گئی تھی کہ اس کے بھائی موہن سنگھ کو ابصار نے مارا ہے۔

''تو کیا تو ہمارے ہاتھوں بچ کر نکل پائے گا؟ تو اسی گندی دھرتی پر مرے گا، تیری لاش کو کتے نوچیں گے، تیری بوٹیاں چیل کوے کھائیں گے۔''

دیے نے اس کا گریبان پکڑا تھا اور کرپان کے وار کر کر کے اس کے جسم کے اعضا بکھیر دیے تھے۔

''دیے، پپو جلدی کرو..... میرے پاس بہت کم وقت ہے، میں اس دھرتی پر مرنا نہیں چاہتا۔ بابو دین ریڑھا چلاؤ۔''

ابصار چیخ رہا تھا، اس کے بدن کے ہر عضو سے لہو بہہ رہا تھا۔ عورتوں نے اپنی چادریں، دوپٹے دے دیے تھے اس کے خون کو روکنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ مگر تمام کپڑے اس کے جوان خون سے تر بتر ہوتے جارہے تھے فخر دین اپنا سینہ پیٹ رہا تھا۔ اس کے زخموں کو چوم رہا تھا۔

عذرا، فرحت، رومیصہ اور سنبل نے رو، رو کر پورے قافلے کی عورتوں کو رلا دیا تھا۔ عذرا غش کھا رہی تھی، اس کا جوان اکلوتا بیٹا زندگی سے دور جارہا تھا۔ فرحت آسمان کی طرف نظر رکھ کر اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

رومیصہ کی آنکھوں سے سیلاب رواں تھا۔ سنبل اسے سنبھالتے ہوئے ہلکان ہورہی تھی۔

''مجھے چھوڑ کر مت جانا ابصار..... دیکھو میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمہارے سنگ جارہی ہوں..... خدا کے لیے مجھے تنہا نہ چھوڑنا۔'' ابصار نے اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا تھا۔

''تم نے میرا ساتھ نہ چھوڑا مگر مجھے تمہارا ساتھ نہ دینے کا دکھ بھی ہے اور خوشی بھی کہ مرتے دم میری آنکھوں کے سامنے میری رومیصہ اور میرے پاؤں میری پاک دھرتی پر..... تمہیں مجھ سے کی گئی ان سالوں کی محبت کا واسطہ مجھ سے بچھڑنے کا غم مت کرنا۔'' اس کی بات سن کر رومیصہ تڑپ کر سینہ مستی وہیں اس کے قدموں میں پڑ گئی تھی۔

''دیکھ، پپو، میرے یار.....! میں چلا جاؤں تو اس آنے والی نسل کو بتا دینا کہ اس پاک ٹکڑے کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے اپنے کتنے پیاروں کو کھویا تھا۔ کیسی کٹھنائیاں اٹھائی تھیں۔ غم کے کتنے بڑے پیالے پیے تھے۔ ان کو بتانا کہ کتنی بہنوں کے گلے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں گھٹے۔ کتنے ارمان رزق خاک ہوئے، کسی کی پلکوں پر ہمیشہ کے لیے آنسو سج گیا۔ کتنے جوان بدن برچھیوں، کرپانوں کے زخم سہہ گئے، کتنی ادھ کھلی کلیاں نہروں کو گلنار کر گئیں۔ تازہ کھلے پھول مٹی میں کس طرح روندے گئے۔ باپوں نے اپنے بیٹوں کے زخموں کو کیسے چاٹا۔''

''بس کر دے ابصار پتر بس کر دے۔ نہ ہمارا کلیجا چیر..... تو کہیں نہیں جاسکتا ہمارے ساتھ رہے گا۔'' فخر دین تڑپ رہا تھا۔

''بولنے دے ابا میرے پاس مہلت بہت کم ہے۔''

''اماں، ابا میرے جانے کا غم نہ کرنا۔ اس دھرتی کو پانے کی کوشش منانا۔ وعدہ کرو ان لاکھوں جوانوں کی خوشی میں شریک ہوں گے جو صحیح سلامت اپنے وطن پہنچ گئے۔'' ابصار نے ماں، باپ کے قدموں پر ہاتھ رکھ دیے تھے۔

عذرا اور فخر دین تڑپ اٹھے تھے۔ اللہ سے اس کی زندگی کی بھیک رو، رو کر مانگ رہے تھے مگر مہلت ختم ہو چکی تھی۔

ابصار نے ڈبڈبائی نظروں سے فرحت اور سنبل کو دیکھتے ہوئے اپنا کانپتا ہاتھ ان کے سر پر رکھا تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھ چکے تھے لوگ ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر تسلی دے رہے تھے۔

زخمیوں اور بیمار لوگوں کو کیمپ لے جایا جارہا تھا۔ بھوکے پیاسوں کو کھانا پانی دیا جارہا تھا۔ اور ابصار زخمی حالت میں سجدے میں پڑا اس مٹی کو چوم رہا تھا۔ جس پر آنے کے لیے اس نے بڑے صبر آزما لمحے دیکھے تھے۔

''میری دھرتی کو میرا سلام..... میری ماں دھرتی تو سدا سلامت رہے۔'' مٹھی میں مٹی لے کر اس نے اپنے پورے بدن پر ملی تھی۔ سوندھی سی۔ چہرے پر ملی تھی۔ اسی دم رضا کار اسٹریچر لیے اس کی طرف بڑھے تھے۔ اسے جلد از جلد اسپتال جانے کی ضرورت تھی۔ مگر ابصار نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا تھا۔

''نہیں..... خدا کے لیے مجھے چند لمحے دے دو اس مٹی پر آنے کی خوشی اور اس کی خوشبو کو محسوس کرنے دو۔''

رومیصہ کے جسم کی جان نکل رہی تھی۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔

''ابصار ایسا مت کرو..... اسپتال چلو..... تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ خدا کے لیے ہمیں یوں چھوڑ کر مت جانا۔''

''میں ٹھیک ہو گیا ہوں رومیصہ..... تم سب اپنا

خیال رکھنا۔'' اس نے تشکر سے آسمان کی طرف نگاہ کی اور پلکیں موند کر پُرسکون ہوگیا۔

اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور سکون بتا رہا تھا کہ اللہ نے اس کی قربانی قبول کرلی تھی۔

شہید تم سے یہ کہہ رہے ہیں
لہو ہمارا بھلا نہ دینا

☆☆☆

پاکستان بننے کی خوشی اپنی جگہ مگر جوان بیٹے کی جدائی کا غم فخر دین اور عذرا زیادہ عرصہ سہار نہ سکے سو راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

سنبل کی شادی پہ لنگڑے اور فرحت کی دیے سے ہوگئی تھی۔

رومیصہ، سنبل کی نگاہیں کتنا ہی عرصہ ماں، باپ کی آمد کی منتظر رہیں مگر پھر وقت کے ساتھ ان کی امیدیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی اماں کے نعرے بھی شروع ہوجاتے۔ سارا سال مست بنی اماں کا پاگل پن کافور ہوجاتا۔ آنکھوں میں سرخی اور نمی کے ساتھ ایک چمک نظر آتی۔

گلی کے سارے بچے جو عام دنوں میں اس کے پاگل پن کا مذاق اڑاتے تھے اور اس سے دور، دور رہتے تھے..... ان کے درمیان ایک مضبوط رشتہ استوار ہوجاتا۔

مائیں بچوں کو پکڑ، پکڑ کر گھر لے جانے کی کوشش میں ہلکان ہوجاتیں کہ'' کھانا کھالو..... ٹیوشن کا ٹائم ہوگیا، کپڑے بدل لو..... بابا آنے والے ہیں۔'' مگر وہ ہر پکار سے بے نیاز اماں کے کچے آنگن میں اس کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھے رہتے۔ اماں کے دائیں ہاتھ کی ہڈی (جو بازو اور ہاتھ کو آپس میں ملاتی ہے) اوپر کو اٹھی خاصی ابھری ہوئی تھی ہاتھ بھی ٹیڑھا تھا، بمشکل کسی چیز کو تھام پاتی۔ زیادہ تر بائیں ہاتھ سے کام لیتی۔

اماں کے دائیں ہاتھ کا زخم کا نشان اس مہینے میں ہرا ہوجاتا..... درد کی ٹیسیں اٹھتیں۔ اور وہ بے حال ہوجاتی۔

بچے ہاتھ دبانے لگے تو وہ جھریوں زدہ چہرے سے مسکرا کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتی..... پھر اُن کے ساتھ دھاگے پرلٹی سے جھنڈیاں چپکاتیں اور بچے پوری گلی، محلے اور گھروں کو جھنڈیوں سے سجا دیتے۔ اماں، گلیوں میں تالیاں بجا، بجا کر نعرے لگاتی۔

''لے کے رہیں گے پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان''

''اماں پاکستان تو بن گیا ہے اب تو یہ کہا کرو..... پاکستان..... پاکستان، میری پہچان پاکستان..... میرا ایمان پاکستان۔

''اچھا پاکستان بن گیا ہے؟'' بوڑھی آنکھوں میں حیرت در آئی۔

''تو پھر ابصار کدھر ہے.....؟ ننھی پاکستان کیوں نہیں آئی۔ اسے تو پاکستان دیکھنے کی بڑی چاہ تھی۔ سارے کدھر چلے گئے؟'' وہ اپنے ہاتھ کو زور، زور سے جھٹکے دیتیں۔

''بتا مجھے..... بتا مجھے.....''

ہاتھ کی ابھری ہڈی یک دم بین کرنے لگتی۔ آنکھ کا پانی کرلاتا..... ذہن پر کاری ضربیں لگانے لگتا۔

''ظالمو! ہم سب تو پاکستان آرہے تھے۔ میرے ابصار کو گاجر، مولی کی طرح کیوں کاٹ ڈالا، کیا قصور تھا اس کا؟ کیا ہمارا قصور آزادی طلب کرنا تھا؟

آؤ دشمنوں آکر دیکھو ہمارے پرچم پر بنے چاند تارے کو دیکھو..... ہمیں ہمارا وطن مل گیا۔ کیا ہوا؟ جو آزادی کی قیمت اپنوں کو کھو کر ادا کی۔ یہاں سب ہمارے اپنے ہیں۔

ابصار!
ننھی!
جلدی آؤ..... نعرہ لگائیں
ہم شاد ہیں..... ہم آزاد ہیں
ہم شاد ہیں..... ہم آزاد ہیں''

اماں رومیصہ کی آنسوؤں میں گھلی آوازوں میں محلے کے بچوں کی آوازیں بھی شامل ہوگئیں۔

❁❁❁

سیدۃ نسا العالمین حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ

فاطمہؓ کی طا میں سمٹی ہے طہارت اس طرح
جس طرح سے علم سارا ہے علیؓ کی عین میں

تمام تر حمد و ثنا اللہ رب العزت کے لیے ہے جو ہمارا مالک و خالق اور رازق ہے۔ وہ ایسا مہربان رب ہے جو صرف عطا ہی عطا ہے۔ اس کی صفتِ رحمت کا حال یہ ہے کہ خطا پر خطا کیے جاؤ اور معافی طلب کرو تو بخش دے وہ ستار بھی ہے اور غفار بھی۔ وہ علیم و خبیر بھی ہے۔

پروردگار عالم نے ہمیں ان گنت بیش بہا نعمتیں عطا کی ہیں۔ ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے محبوب نبی آقائے دو جہاں ﷺ کی صورت میں عطا کی۔

اللہ رب العزت نے حضرت محمد ﷺ کو فکر و بصیرت کا مرکز و محور بنایا پھر اس مرکز و محور سے کائنات کو مستفیض کرنے کے لیے اہلِ بیت اطہارؓ اور اصحابؓ وفا شعار کی صورت میں دو مبارک سرچشمے جاری فرمائے۔ جن کے فیض نے علم و عمل اور حکمت و آگہی کی مختلف نہریں جاری کیں۔ تو درود و سلام ہو پیارے آقا پر ان کی آلؓ پر اور ان کے اصحابؓ پر۔

☆☆☆

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ الفاظ جن کی عظمت کو بیان کرتے ہیں لیکن بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ الفاظ جن سے تقدس کی خیرات مانگتے ہیں۔ حروف جن کی طرف منسوب ہو کر رفعت آشنا ہوتے ہیں عظمتیں صبح شام ان کا طواف کرتی ہیں۔ حضرت سیدہ طیبہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا ایسے ہی عمل و جواہر کی خوب صورت مالا کا حسین ترین موتی ہیں۔ آپؓ عفت و حیا کا روشن فانوس ہیں۔ ایثار و قربانی کی ناقابلِ فراموش داستان ہیں، تربیتِ اولاد کے لیے مستند حوالہ ہیں۔ تلاوت قرآن پاک کی عہد ساز تاریخی حقیقت ہیں۔ جناب حوا کی پاک بیٹیوں کے ماتھے کا زیور ہیں۔ اسلام کی پاکیزہ اقدار کا بلند و بالا روشن مینار ہیں۔ خواتینِ اسلام کی عظیم رہبر ہیں۔ اور تربیت مصطفیٰ کا حسین گوہر ہیں۔ وہی مصطفیٰ کریم جو نگاہِ قدرت کا تارا ہیں۔ جو غربا و مساکین کا سہارا ہیں۔ جو اللہ کے محبوب ہیں۔ جن کے قدم ناز کو چوم کر مٹی کے ذرّے رشکِ مہر و ماہ بن جاتے ہیں۔ جن کے جسم پاک کا لمس پا کر آپ کی تربتِ اقدس کی خاک عرش معلیٰ سے زیادہ تقدس مآب ہو جاتی ہے۔ اگر ان کے جسم سے مس ہونے والی مٹی عرش معلیٰ سے افضل و اعلیٰ ہے تو وہ ہستی جسے آپؐ اپنے جگر کا ٹکڑا قرار دیں ان کی عظمت کا کیا عالم ہوگا۔

اللہ رب العزت نے اپنے محبوبؐ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنایا اور ہر جہان اس سے فیض پا رہا ہے۔ اس چشمۂ رحمت سے فیض کے دو مرکزی دھارے پھوٹ رہے ہیں ایک سیرت مصطفیٰ کا فیض..... اور دوسرا نبوت مصطفیٰ کا فیض..... سیرت کا تعلق ذات سے ہے اور نبوت کا تعلق صفات سے۔ نبوت کا سرچشمہ بعثت ہے اور سیرت کا سرچشمہ ولادت۔ نبوت کا پرتو امت ہے اور شخصیت کا پرتو اہل بیت..... یوں تو نبوت

محمدیؐ کا فیض تو ساری امت کے حصے میں آیا اور امت میں اہل بیت بھی شامل ہیں..... لیکن ذاتِ مصطفیٰؐ کا فیض صرف اور صرف اہل بیت کا مقدر ٹھہرا۔

حدیث مبارکہ ہے کہ...

''اے مسلمانو! میرے اہل بیت کی مثال تمہارے لیے حضرت نوحؑ کی کشتی کی ہے۔ جو بھی اس میں سوار ہو گیا بچ گیا اور جو رہ گیا ہلاک ہو گیا۔''

اہل بیت کی سرخیل و سالار بنت رسولؐ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ اس لحاظ سے حضور اکرمؐ کی شخصیت مقدسہ اور سیرت مطہرہ کے سارے فیوض و برکات کی امین اور وارث سیدہ کائناتؓ ہیں۔

سیدہ کو نسبت بھی ملی اور نسب بھی..... لوگوں میں یہ ہدایت باہر سے اتری اور سیدہؓ کے خمیر سے پھوٹی۔ لوگوں نے دین تبلیغ سے پایا اور سیدہ نے دین پرورش میں پایا..... ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ''میں نے حضرت فاطمہؓ سے بڑھ کر کسی کو جمال صورت کمال سیرت، حسن اخلاق اور نشست و برخاست میں رسول اللہؐ سے مشابہ نہیں دیکھا۔''

☆☆☆

سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کی ولادت کب ہوئی اس میں حتمی طور پر کچھ نہیں ملتا۔ ایک روایت میں جناب سیدہ پہلے سال نبوی جب آقاؐ کی عمر مبارک 41 سال تھی تب پیدا ہوئیں۔

دوسری روایت کے مطابق جناب سیدہ کی پیدائش بعثت نبویؐ سے پانچ برس پہلے ہوئی..... ان روایات میں زیادہ تر علما کرام اور بزرگوں کا خیال ہے کہ جناب سیدہ بعثت سے پانچ برس قبل پیدا ہوئیں..... جبکہ علمائے جعفریہ کے مطابق بعثت نبویؐ کے پانچ برس بعد ہوئی۔

سیدہؓ کی کنیت اور القابات میں سے ام ابیہا، ام محمدؐ زہرا، بتول، خاتونِ جنت، راضیہ، مرضیہ، طاہرہ، طیبہ، مطہرہ، راکعہ، ساجدہ، عذرأ زاہدہ، کاملہ، صادقہ وغیرہ بہت زیادہ مشہور ہیں جو آپؓ کی عظمت شان کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ان القابات میں سب سے زیادہ مشہور سیدۃ النساء العالمین ہیں..... ان القابات میں سے چند کی وجہ شہرت عرض ہے۔ دیگر ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔

☆ زہرا: علما کرام کے نزدیک مشہور لقب زہرا جس کے معنی چمکیلا، درخشاں و تاباں کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؓ کو عام عورتوں کے برعکس حسن و جمال میں یکتا ہونے کے سبب ملا۔

☆ طاہرہ: یہ لقب آپؓ کی طہارت و پاکبازی کی وجہ سے عطا کیا گیا۔

☆ طیبہ: یہ لقب بھی آپؓ کا بہت مشہور ہے اس کی وجہ بھی پاکبازی ہے، اسی لیے طیبہ طاہرہ کہا جاتا ہے۔

☆ مطہرہ: یہ منفرد لقب آپ کی عاداتِ کریمانہ اور نہایت اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے مشہور ہوا۔

☆ راضیہ و مرضیہ: یہ لقب اس وجہ سے مشہور ہوا کہ آپ اللہ کریم اور رسول کریمؐ کی رضا میں راضی تھیں یعنی ان کی مرضی ہی سب کچھ تھی۔

☆ بتول: یہ لقب آپ کو تمام خواتین پر ہر لحاظ سے فضلیت اور برتری کے اظہار کے طور پر دیا گیا۔ یعنی عام خواتین کے برعکس آپ ازلی پاک و پاکیزہ ہر آلائشِ دنیا سے منزہ و مبرا ہیں۔ آپ کی کبھی کوئی عبادت قضا نہیں ہوئی۔

☆ سیدۃ النساء العالمین: آپ کا یہ لقب سب سے زیادہ مشہور ہے کہ آقائے دوجہاںؐ کی حدیث مبارکہ ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں..... ان القاب کے علاوہ بھی آپ کے بہت القاب ہیں مگر ہم نے چند آپ کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔

جناب سیدہؓ تمام جہانوں میں پاک اور اعلیٰ و افضل انسانوں کی لختِ جگر تھیں۔ آپ کے والدین کریمین کی شان بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ آپ کے والد گرامی کی شان بیان کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اور مجھ کم علم، کم فہم ہستی کی تو اوقات ہی نہیں کہ آقائے نامدار، سرور کونین، فخر موجودات، سید الانبیا والمرسلین، شافع محشر، ساقی کوثر، خاتم النبین، شفیع المذنبین، محبوب رب العالمین، صاحب قاب قوسین، سید الثقلین کی شان بیان کر سکوں۔

بلاشک و شبہ آپؓ دنیا کے سب سے افضل و اعلیٰ

اور پاکیزہ انسان کی بیٹی ہیں، آپ کی والدہ وہ بابرکت ہستی ہیں کہ جنہوں نے آنحضرتؐ کی پہلی زوجہ محترمہ اور اہلِ اسلام کی پہلی ماں ہونے کا شرف حاصل کیا۔

جب سیدہ فاطمۃ الزہراؑ کی ولادت کا وقت قریب آیا تو حضرت خدیجہؓ نے ایک شخص کو بیگمات قریش کے پاس بھیجا کہ وہ میرے ساتھ تعاون کریں۔ مگر افسوس ان خواتین نے انکار کر دیا۔ جناب خدیجہؓ نے جب قریشی عورتوں کا یہ جواب سنا تو پریشان ہوگئیں۔ تب اللہ رب العزت کے حکم سے حضرت خدیجہؓ کے پاس پانچ دراز قامت بیبیاں تشریف لے آئیں۔ انہوں نے حضرت خدیجہؓ کو تسلی دی اور کہا آپ گھبرائیں نہیں ملکۂ عالم..... اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ کی خدمت کے لیے مامور کیا ہے..... جن میں حضرت بی بی سارہ (والدہ حضرت اسحٰقؑ) (جناب بی بی ہاجرہ والدہ جناب اسماعیلؑ)، حضرت بی بی مریم (والدہ حضرت عیسیٰؑ) حضرت بی بی کلثوم (خواہر موسیٰؑ) اور حضرت بی بی آسیہ (زوجہ فرعون)۔

تب شہزادیِ رسولؐ، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی گود میں تشریف لے آئیں۔ جناب سیدہؑ کے چہرۂ اقدس کے نور سے زمین منور ہوگئی۔

چند لمحے گزرے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت کی دس حوروں کو آپ کے غسلِ اول کے لیے بھیج دیا۔ وہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ کے حضور حاضر ہو کر نہایت ادب سے سلام عرض کرتیں مبارک باد پیش کرتیں پھر آپ کی گود سے سیدہؑ کو اٹھا لیتی ہیں۔ ہر ایک آپ کو طشتِ نور میں بٹھا کر آب کوثر سے غسل دیتی ہے پھر جنت کی چھوٹی سی عبا پہنا کر خوشبوؤں میں بسا ہوا رومال آپ کے سرِ اقدس پر باندھ دیتی ہیں۔ پھر حضرت خدیجہؓ کی گود میں دے کر عرض کرتی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی صاحب زادی کو پاکیزہ، طیب وطاہر اور برکت والی کہا ہے۔ پھر تمام مقدس بیبیاں آپ کو سلام عرض کر کے واپس چلی جاتی ہیں..... حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے چہرے پر سکون و بشاشت ہے آپ سیدہؑ کو دیکھتی جا رہی ہیں اور دل ہی دل میں مسکرا رہی ہیں۔

چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سرورِ کائنات تشریف لے آئے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے مسکراتے ہوئے عظیم بچی کو عظیم باپ کی گود میں دے دیا۔ حضور اقدسؐ نے صاحب زادی کو ہاتھوں پر اٹھایا اور پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا..... ”اے خدیجہ! تیری یہ بچی دنیا کی بزرگ عورتوں سے ہے۔“

باپ نے بیٹی کے چہرے پر اور بیٹی نے باپ کے چہرۂ پُرنور پر نگاہیں جما رکھی ہیں۔ کیف ہی کیف ہے..... جناب خدیجۃ الکبریٰؓ کا حجرۂ مقدس بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔

☆☆☆

سیدہؑ کی تمام حیات مقدسہ و مطہرہ مسلسل حزن و ملال، رنج و الم اور شدید مصائب میں گزری ہے تاہم بچپن کی عمر میں ان دُکھوں اور مصیبتوں کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے۔

ابتدا میں تبلیغ اسلام خفیہ طور پر ہوتی تھی جس سے مشرکین عرب گھبراتے تھے اور بدکتے تھے لیکن مشتعل نہیں ہوتے تھے جب جناب سیدہؑ کی عمر مبارک تقریباً ڈھائی سال کی ہوئی تو اس وقت اعلانیہ تبلیغ اسلام کا کام شروع ہو گیا۔ پھر اس کھلم کھلا دعوت کے نتیجے میں جو ہولناک مصائب حضورؐ کی مقدس ذات پر کفار عرب کی طرف سے توڑے گئے وہ بیان سے باہر ہیں۔ اندازہ فرمائیں کہ چند سال کی بچی کے سامنے جب ان کے مکان پر پتھر برسائے جائیں، ان کے باپ کے راستے میں کانٹے بچھائے جائیں، ان کے گھر میں غلاظت پھینکی جائے۔ عین نماز کے عالم میں گلے میں کپڑا ڈال کر اس قدر بل دیے جائیں کہ سانس رکنے لگے، اس وقت اس بچی کا کیا حال ہوتا ہوگا اور اس کے معصوم دل پر آلام کا وہ کون سا پہاڑ ہے جو نہ ٹوٹ پڑتا ہوگا۔

ایک دن حضور اقدسؐ کعبہ معظمہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے اور قریش ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا تم میں کوئی ایسا ہے جو فلاں قبیلہ سے ذبح کردہ اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے اور پھر جب محمد ﷺ سجدے میں جائیں تو ان کے کندھوں پر رکھ

دے۔

اس لمحے بدبخت عقبہ بن ابی معیط اٹھ کھڑا ہوا اس نے اونٹ کی اوجھ لاکر حضورؐ کے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دی۔ حضورؐ اس حال میں رہے۔ اور سر مبارک سجدے سے نہ اٹھایا۔ اور وہ سب کھڑے ہنستے رہے یہاں تک کہ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو کسی نے خبر دی وہ فوراً دوڑی آئیں اور آپ کی پشت مبارک سے وہ پلیدی دور کردی۔ الغرض پانچ، چھ سال کی بچی باپ کے ہر غم میں برابر کی شریک ہے۔ پھر شعب ابی طالب میں انتہائی تکلیف دہ حالات میں سال گزارے۔ پھر آقا کے چچا حضرت ابو طالبؓ اور پھر آپؐ کی رفیق حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا وصال ہوگیا..... سیدہؓ کو اپنی والدہ کی بے حد یاد آتی۔ اس ماں کی یاد جو اُن کے غم کو غلط کیا کرتی تھیں۔ ہر پریشانی کے وقت بیٹی کے لیے آغوش راحت کھول دیتی تھیں۔ جن کی گود میں سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو بے حد سکون ملتا تھا۔

پانچ برس کی سیدہ حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔ ماں کے ہاتھوں کی رکھی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہتیں کہ شاید اس طرح قرار آجائے۔

امام الانبیاؐ نے بھی جناب خدیجۃ الکبریٰؓ کی جدائی کے صدمے کو انتہائی شدت سے محسوس کیا سوائے دینی امور کی انجام دہی کے لیے آپؐ نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ تب آقا تبلیغ اسلام کے لیے طائف تشریف لے گئے۔ وہاں لوگوں نے آپؐ کا تمسخر اڑانا شروع کیا کوئی کچھ بک رہا تھا آپؐ نے ان کا تمسخر دیکھا تو ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔ آپ حق تبلیغ ادا فرما کر اٹھنے لگے تو ان لوگوں نے آپؐ کے پیچھے شہر کے اوباش لڑکوں کو لگا دیا۔ جنہوں نے آپؐ کو پتھر مارے جس سے آپؐ کے پیر مبارک زخمی ہوئے اور نعلین شریف خون سے بھر گئی..... پھر بھی آقا نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے وصال کے تھوڑے عرصے کے بعد سرکار دو عالمؐ نے حضرت سودہ بنت زمعہؓ سے عقد کر لیا۔ آپ بڑی نیک دل خاتون تھیں۔ وہ سیدہؓ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتیں۔ آپ کا غم غلط کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتیں مگر ماں کی یاد بیٹی کے دل سے محو نہ کر سکیں۔

☆☆☆

پھر آقا نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ یہاں کفر کی ایذا رسانیوں سے مکمل طور پر سکون حاصل تھا تاہم یہ اسلام کا انتہائی نازک ترین دور تھا۔ آپؐ دن رات فریضہ تبلیغ ادا فرماتے۔

مدینہ منورہ آئے تقریباً دو سال کا عرصہ گزر گیا امام الانبیاؐ جناب سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے نکاح مبارک کے متعلق اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام کے منتظر تھے۔ کیونکہ سیدہ سلام اللہ علیہا کے لیے کئی لوگ رشتے کا سوال کر چکے تھے۔ آپؐ کی خواہش تھی کہ اس رشتے کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔ اس لیے جو بھی اس رشتے کی آرزو کرتا آپ صاف جواب دے دیتے۔

ایک روز جناب حیدر کرار حضرت علی کرم اللہ وجہٗ مدینے کے نخلستانوں میں اونٹ چرا رہے تھے کہ جناب حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ آپؐ کے پاس تشریف لے گئے اور حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''علیؓ! آپ سرکار دو عالمؐ کی خدمت میں بنت رسول کے رشتے کی استدعا کیوں نہیں کرتے جبکہ کئی لوگ سوال کر چکے ہیں۔''

جناب حضرت علیؓ نے سنا تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رو کر فرمایا۔ ''یہ عظیم سعادت حاصل کرنے کی آرزو تو ہے مگر حیا مانع ہے۔''

طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت علیؓ کے گھر والوں نے ہی مشورہ دیا تھا کہ جناب رسول خداؐ سے سیدہؓ کے رشتے کا سوال کریں۔

آخر حضرت علیؓ، سرور کونینؐ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو گئے۔ پہلے نہایت ادب سے سلام عرض کیا پھر خمیدہ گردن حضورؐ کے سامنے بیٹھ گئے۔

آپؐ نے پوچھا..... ''علیؓ! کیسے ہو اور کیا چاہتے

ہو؟"

عرض کیا۔ "آقا! جو چاہتا ہوں وہ بیان نہیں کر سکتا۔" اتنی بات کہی اور شدتِ حجاب شرم و حیا کی فراوانی سے مولا مشکل کشا کے اعصاب کھنچ گئے اور چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا۔

آپؐ نے فرمایا۔ "علیؓ! مت گھبراؤ اور دل کی بات بلا جھجک زبان پر لے آؤ۔" حضرت علیؓ کو حضورؐ کی مشفقانہ گفتگو سے کچھ ڈھارس بندھی تو عرض کیا۔ "اے میرے آقا و مولا! علیؓ پر پہلے ہی آپؐ کے اس قدر زیادہ احسان ہیں کہ میں ان کے بوجھ تلے دبا پڑا ہوں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میری پرورش ہی آپؐ نے فرمائی ہے اور میری زندگی کی ہر سانس آپؐ کی عطا کی مرہونِ منت ہے۔"

پھر آپؓ نے شرماتے ہوئے جناب سیدہ کے رشتے کے لیے عرض کر دی۔ سرورِ کونینؐ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "علیؓ! اگر ہم تمہارا یہ سوال قبول کر لیں تو بتاؤ کہ تمہارے پاس میری فاطمہؓ سے نکاح کے لیے کون، کون سی چیز ہے؟"

جناب حضرت علیؓ نے حضورؐ کی یہ شفقت دیکھی تو شدتِ جذبات سے آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر بارگاہ رسول میں عرض کیا۔ "میرے آقا! آپؐ بھلی کے دنیاوی سامان کو علی سے زیادہ جانتے ہیں کہ علیؓ کے پاس ایک گھوڑا ہے، ایک زرہ اور ایک تلوار کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔"

امام الانبیاؐ نے فرمایا۔ "ٹھیک ہے تم یہیں بیٹھو ہم اپنی بیٹی فاطمہ سے پوچھ کر بتاتے ہیں۔"

حضرت علیؓ کو وہیں بٹھا کر آپؐ جناب سیدہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور جا کر فرمایا۔ "بیٹی علی نے تمہارے لیے نکاح کا پیغام دیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بھی یہی رضا ہے اور اللہ کا رسول بھی اس رشتے کو پسند کرتا ہے اب تم بھی اپنی رضا بتا دو تا کہ علیؓ کو یہ خوش خبری دے دی جائے۔" جناب سیدہؓ نے سنا تو حیا سے گردن جھکا لی اور نہایت خاموشی کے ساتھ ابا حضور کی خدمت میں کھڑی رہیں۔ آپؐ بیٹی کی خاموشی کو اس کی رضامندی جان کر واپس تشریف لائے اور حضرت علیؓ سے فرمایا..... "علی تمہیں مبارک ہو کہ تم اللہ کے رسول کے داماد بن رہے ہو....." حضرت علیؓ نے یہ خوش خبری سنی تو چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ پھر آپؐ نے فرمایا..... "علیؓ! تمہارے پاس سواری کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے اور تلوار تمہارا زیور ہے۔ لہٰذا تلوار اور گھوڑا مجھ تم اپنے پاس رکھو، ایک زرہ باقی ہے وہ ایسی چیز ہے کہ جس کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہے لہٰذا زرہ فروخت کر کے اس سے شادی کا سامان تیار کرو۔"

غرضیکہ وہ زرہ فروخت کر کے جو درہم آپؓ کو ملے وہ آپ نے آقا کی بارگاہ میں پیش کر دیے..... آپؐ نے ان میں سے کچھ درہم حضرت بلالؓ کو دے کر فرمایا کہ بازار میں جا کر خوشبو اور چھوہارے خرید لائیں۔

نہایت سادگی کے ساتھ تقریب نکاح منعقد ہوئی اور حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے ساتھ کر دیا گیا۔

خوشبو اور چھوہارے خریدنے کے بعد جو تھوڑے بہت درہم بچے اس سے نہایت ہی سادگی کے ساتھ دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا گیا۔ امام الانبیاؐ اگر چاہتے تو اپنی بیٹی کی شادی پر سونے کے پہاڑ خرچ کر سکتے تھے مگر انہوں نے ہمارے لیے آسان ترین راستے کا تعین کیا کہ جب اپنی بیٹیوں کی شادی کرنے لگو تو میری بیٹی کی شادی یاد کر لینا..... پھر تمہیں اپنی غربت پر رونا نہیں آئے گا۔

سیدہ فاطمۃ الزہراؓ اپنے والد کے گھر سے شوہر نامدار کے گھر تشریف لے آئیں۔ حضرت علیؓ کا گھر کیا تھا ایک کچا سا مکان تھا۔ جس میں مینڈھے کی کھال کی جا نماز پر کھجور کے پتوں سے بھرا ہوا تکیہ رکھا ہوا ہے۔ لکڑی کے ستون کے ساتھ ایک مشکیزہ اور ایک رومال لٹک رہا ہے۔ ایک کونے میں مٹی کے گھڑے پر پیالہ رکھا ہوا ہے بس یہ تھی مولائے کائنات حضرت علیؓ کی دنیاوی کائنات..... رسول کریمؐ کے گھر سے آیا ہوا سامان سمیٹتے

سے رکھ دیا گیا ایک کونے میں سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کھجور کی ایک چٹائی پر سمٹ کر بیٹھ گئیں۔

سرکار دو عالمؐ نماز عشا کے بعد بیٹی کے گھر تشریف لائے۔ دروازے پر دستک دی جناب ام ایمنؓ نے دروازہ کھولا۔ آپؐ اندر تشریف لائے تو سیدہ، بابا کے استقبال کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ جناب حضرت علیؓ بھی ان کی خدمت میں مؤدبانہ کھڑے تھے..... پھر حضور اقدسؐ نے خیر و برکت سے معمور اور محبت بھری دعاؤں کے بعد اپنی تقدس مآب بیٹی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''بیٹی میں نے تیرا نکاح دنیا کے سب سے بہتر شخص کے ساتھ کیا ہے۔ تیرا شوہر میرے خاندان میں بہترین شخص ہے۔ دنیا و آخرت کا سردار ہے۔ میری پیاری بیٹی خدا نے دو شخصوں کو مخصوص فرمایا ہے ایک تیرے باپ کو اور ایک تیرے شوہر کو لہٰذا اپنے شوہر کی فرمانبرداری اور اطاعت میں فرق نہ آنے دینا۔'' پھر آپؐ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا..... ''علیؓ! تمہیں مبارک ہو کہ تم رسول کی بیٹی اور دنیا کی بہترین عورت کے شوہر ہو۔ فاطمہ میرا ٹکڑا ہے اس کے ساتھ محبت و الفت کے ساتھ پیش آنا اور اسے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔'' پھر آپؐ نے دونوں کو فرمایا۔ ''میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔'' اور ایک پیالہ پانی کا لے کر اس پر دم کر کے کچھ پانی جناب زہراؓ کے سینہ مبارک پر اور جناب علیؓ کے کندھوں کے درمیان چھڑک دیا۔ اور باقی پانی پی لینے کا حکم دے کر دعائیں دیتے ہوئے واپس تشریف لے آئے۔

☆☆☆

صبح ہوئی تو سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے دروازے پر ایک سائل نے صدا دی۔ ''اے اہل بیت رسول! کپڑے کا سوال ہے۔'' بنت رسولؐ نے خیال فرمایا کہ اسے کون سا کپڑا عطا کیا جائے اور پھر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا حکم یاد آ گیا۔ ''یعنی تم ہرگز بھلائی کو نہیں پہنچو گے جب تک خدا کی راہ میں اپنی سب سے پیاری چیز خرچ نہ کرو۔'' (سورۂ آل عمران۔) سیدہؓ نے اپنے جہیز میں ملنے والی جو ایک اعلیٰ قسم کی قمیص تھی سائل کو عطا کر دی۔

سبحان اللہ یہ ہے بنت رسولؐ کا مقام دنیا کی کون سی عورت ہے جو اپنے جہیز میں ملنے والی سب سے اچھی چیز اللہ کے نام پر دے دے..... جبکہ اسے شوہر کے گھر آئے ہوئے پہلا دن ہو۔

منافقین مدینہ میں سے ایک شخص نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ ''اے علیؓ! آپ تو علم و فضل اور عرب کے شجاع ترین انسان ہو۔ بنت رسول سے نکاح کر کے تمہیں کیا حاصل ہوا؟ اس کو چھوڑ دے اور میری بیٹی سے شادی کر لے، میں شام ہونے سے پہلے، پہلے اپنے گھر سے تمہارے گھر تک سامان جہیز سے لدی ہوئی اونٹوں کی قطار کھڑی کر دوں گا۔'' جناب حضرت علیؓ نے فرمایا..... ہمیں خدا کی رضا کی ضرورت ہے دنیاوی مال و متاع کی نہ ہمیں حاجت ہے اور نہ ہم اس کی خواہش رکھتے ہیں.....'' اس ابلیس فطرت یہودی منافق نے سنا تو خاموش ہو گیا..... تب ہی اس وقت حضرت علیؓ نے صدائے سروش سنی کہ ''علیؓ سر اوپر اٹھا کر قدرت خداوندی کا نظارہ کرو۔ اور مشاہدہ کرو کہ بنت رسول کا جہیز کیا ہے اور ان کی قدر و منزلت کیا ہے؟'' جناب حضرت علیؓ نے سر اقدس اوپر اٹھا کر دیکھا کہ عرش و فرش کے درمیان جنت کی اونٹنیوں کی قطاروں کی قطاریں مشک و عنبر اور زر و جواہر سے لدی کھڑی ہیں اور ہر ناقے کے ساتھ ایک کنیز اور ایک غلام موجود ہے اور ندا آئی کہ یہ فاطمہ بنت محمد ﷺ کا جہیز ہے..... جناب حیدر کرارؓ نے اس جانفزا منظر کا مشاہدہ کیا تو اس منافق کی طرف سے منہ موڑ کر انتہائی مسرت کے عالم میں گھر لوٹ آئے..... گھر پہنچے تو حضرت فاطمۃ الزہراؓ پہلے ہی یہ منظر دیکھ چکی تھیں اس لیے حضرت علیؓ کے بتانے سے پہلے ہی فرمایا۔ ''علیؓ! کیا آپ مجھے بتائیں گے یا میں آپ کو بتاؤں؟'' تو حضرت علیؓ نے فرمایا..... ''آپ ہی بتا دیں.....'' تو آپ نے فرمایا..... کہ ''ایسے، ایسے ایک منافق نے آپ کو مشورہ دیا جس کا آپ نے انکار کر دیا..... تو اللہ

تبارک و تعالیٰ نے آپؐ کو میرے جہیز کا منظر دکھایا۔'' حضرت علیؓ نے فرمایا..... '' آپ ٹھیک فرماتی ہیں.....'' بنت رسول کی عزت کا اللہ تبارک و تعالیٰ کو کس قدر پاس ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا ایسا کوئی بھی موقع جس میں سیدہؓ کی عزت کا سوال آتا ہو تو اللہ تعالیٰ فوراً ہی ایسے اسباب پیدا فرما دیتے جن سے آپؓ کی عزت و عظمت پر حرف نہ آنے پاتا۔

☆☆☆

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ بنت رسول فاطمۃ الزہراؓ جیسی سلیقہ شعار عورت میں نے کوئی نہیں دیکھی۔ باوجود کم سنی کے جناب سیدہؓ نے صفائی کے لحاظ سے اپنے گھر کو جنت کا ٹکڑا بنا رکھا تھا گھر میں اگرچہ کچھ سامان زیادہ نہ تھا مگر آپؓ نے گھر میں موجود چند چیزوں کو انتہائی سلیقے سے سجا رکھا تھا۔ آپؓ اپنا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں بسر کرتیں اور اس کثرت عبادات کے باوجود آپؓ تمام امور خانہ داری میں پوری، پوری دلچسپی رکھتیں۔ گھر کا تمام کام کاج اپنے ہاتھوں سے سر انجام دیتیں۔ جنت کی عورتوں کی سردار سرکار دو عالمؐ کی محبوب ترین بیٹی گھریلو کام کاج میں بھی اس قدر مشقت برداشت کرتیں جس کا تصور کرتے ہوئے بھی دل پر چوٹ پڑتی ہے۔ آپؓ چکی پیستی تھیں، اس سے آپؓ کے ہاتھوں پر چھالے پڑ جاتے۔ آپؓ پانی کے مشکیزے بھر، بھر کر لاتیں، آپ کے کندھے زخمی ہو جاتے۔ آپؓ گھر میں جھاڑو لگاتیں جس سے آپ کا لباس گرد آلود ہو جاتا، آپؓ ہنڈیا کے نیچے آگ جلاتیں تو چولھے میں پھونکیں لگانے سے آپ کے کپڑے بھی خراب ہوتے اور دھوئیں کی وجہ سے آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے۔ شہزادیِ رسول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان تمام تر مشکلات و مصائب کو آپ نہایت خوشی اور پوری رضا و رغبت سے قبول فرماتیں کیسی بھی تکلیف ہو کیسی بھی مصیبت ہو آپؓ کی زبان پر حرفِ شکایت نہ آتا، آپؓ کے دل میں کتنا بھی گہرا غم کیوں نہ ہو اس کا اظہار چہرۂ اقدس سے ہرگز نہ ہوتا۔ خوشی کا وقت ہو یا رنج و ملال کی گھڑیاں آپؓ کے چہرۂ منور پر ہمیشہ ایک پُروقار معصومیت اور متانت کھیلتی نظر آتی اس قدر چھوٹی عمر میں بھی آپ کی نشست و برخاست، گفت و شنید اور چال ڈھال میں بزرگانہ وقار جھلکتا تھا۔ بچپن میں دوسرے بچوں کی طرح کبھی ضد نہ کی نہ کھیل کود میں حصہ لیا بچوں کو کھیلتے دیکھ کر کبھی دلچسپی نہ لی ان عادات کی وجہ سے سیدہ خدیجۃ الکبریٰ کو سیدہؓ سے بہت زیادہ پیار تھا۔ ابھی سیدہ کی عمر پانچ سال تھی تب سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ کے رشتے داروں میں کسی کی شادی تھی آپؓ نے خیال فرمایا لوگوں کے بچے اچھے، اچھے کپڑے پہنے ہوں گے یہی سوچ کر آپؓ نے سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے لیے دو جوڑے اچھے کپڑوں کے اور چاندی کے دو تین ننھے زیور بنوا لیے۔ شادی کی تقریب میں جانے کا وقت آیا تو آپؓ خوشی، خوشی کپڑے اور زیور بیٹی کو پہنانے لگیں تو سیدہ فاطمۃ الزہراؓ نے کہا..... ''امی جان! میں یہ کپڑے اور زیور نہیں پہنوں گی۔ مجھے تو وہی لباس اچھا لگتا ہے جیسا آپ اور میرے ابا جان پہنتے ہیں.....'' جناب خدیجۃ الکبریٰؓ نے بیٹی کی فقیرانہ طبیعت دیکھی تو سینے سے لگا لیا اور فرمایا۔ ''فاطمہؓ! تمہارے باپ نے سچ فرمایا ہے کہ ہماری بیٹی عظیم ہے اور تم واقعی عظیم ہو.....'' پھر ماں بیٹی سادہ لباس میں ہی تقریب میں شریک ہوئیں۔

سبحان اللہ! یہ ہے جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کا دنیا سے اظہارِ لاتعلقی اور فقر و استغنا کا مقام جو بچپن میں بھی پورے وقار کے ساتھ ظاہر ہو رہا ہے۔

عزیز قارئین! اس عظیم ہستی کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ اختر شجاعت کے اس روح پرور مضمون کا بقیہ حصہ ان شاء اللہ اگلے ماہ شائع کیا جائے گا۔

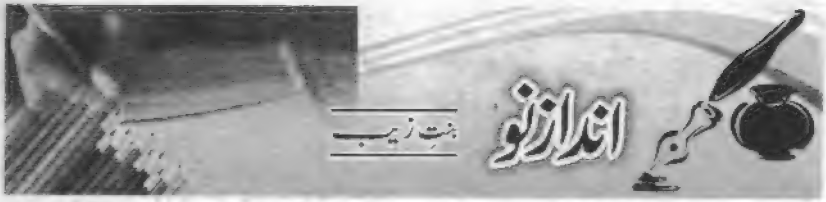
کرن انداز نو
بنتِ زیب

گلوکاری اور اداکاری میں یکساں
دسترس کا حامل منکسر المزاج

جنید خان

2000ء کے ابتدائی عشرے میں موسیقی کی دنیا میں قدم رکھنے والا نوجوان طالب علم، قلیل مدت میں موسیقی کی دنیا میں یوں چھا جائے گا، اس کا تو خود اس نے بھی تصور نہیں کیا ہوگا لیکن جنوں شاعر....

راہ عمل میں جذبۂ کامل ہو جس کے ساتھ
خود اس کو ڈھونڈ لیتی ہے منزل کبھی کبھی

خود انحصاری کی خواہش، اپنے اندر کے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے جنید خان نے موسیقی کا

pklibrary.com

انتخاب کیا اور پے در پے کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن موسیقی کے جنون نے تعلیمی سرگرمیاں قطعاً متاثر نہیں کیں۔ جنید نے mining میں بی ای کی سند حاصل کرنے کے بعد مارکیٹنگ میں ایم بی اے بھی کر لیا۔ شہر میں موسیقی کی محفلیں ماند پڑنے لگیں تو ٹی وی چینز پر کامیاب اداکاری کے جھنڈے گاڑ دیے۔ فلم کے بھی کامیاب اداکار قرار پائے۔ جنید کی نجی و فنی زندگی کی ترقی کا سفر تاحال جاری ہے۔ ہماری دعا ہے کہ جنید خان ایسے ہی لگن کے ساتھ اپنی خداداد صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے شاندار کامیابیاں حاصل کرتے رہیں، آمین۔ ہمارے سوال جنید کے اثبات و انکار مع جواز، نذر قارئین ہیں۔

❁ بچپن میں اپنی دُھن میں مگن رہتا تھا!

☾ جی! کہہ سکتے ہیں کیونکہ میں بہت کم گو تھا، سوشل اور شرارتی بھی نہیں تھا۔ خاموش بچہ تھا۔

❁ ریسلنگ سے بچپن میں بہت خوف آتا تھا!

☾ بالکل بھی نہیں۔ بہت شوق سے ایکشن فلم کی طرح دیکھ کر انجوائے کرتا تھا اور آج تک کرتا ہوں۔

❁ کتب بینی کا شوق بچپن ہی سے ہے!

☾ نہیں اور ابھی تک نہیں ہے، یہ عادت غلط ہے حالانکہ کتب نہ صرف علم میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ جس زبان میں کتاب پڑھی جائے اس پر دسترس بھی حاصل ہوتی ہے۔

❁ بے شک پڑھائی میں اچھا تھا لیکن لڑکپن میں کھیلوں میں جان اٹکی رہتی تھی!

☾ جی بالکل پڑھائی میں above average تھا۔ اسکول میں ہر قسم کا کھیل کھیلا لیکن نارمل بچوں کی طرح پڑھائی اور کھیل میں توازن بھی رکھا۔ نصابی کتب زیادہ پڑھتا تھا۔

❁ میری تخلیقی صلاحیتیں اسکول کے زمانے ہی سے ظاہر ہوگئی تھیں!

☾ جی! بچپن ہی سے اسکیچنگ کیا کرتا تھا، وہ بھی رفتہ رفتہ، رفتہ عمر میں اضافے کے ساتھ شوق بڑھا تو مزید پالش کیا۔

❁ فطرتاً محتاط پسند ہوں!

☾ جی بالکل ہوں اور زندگی کے ہر معاملے میں ہوں۔ خطرہ نہیں لیتا۔ جب ہی تو ایکٹنگ کیریر شروع ہونے کے اتنے برسوں بعد فلم کی۔

❁ خصلتاً رومان پسند ہوں!

☾ جی! یقیناً ہوں اور ہر فنکار اور تخلیق کار ہوتا ہے۔ اظہار میں مجھے مشکل ہوتی ہے۔

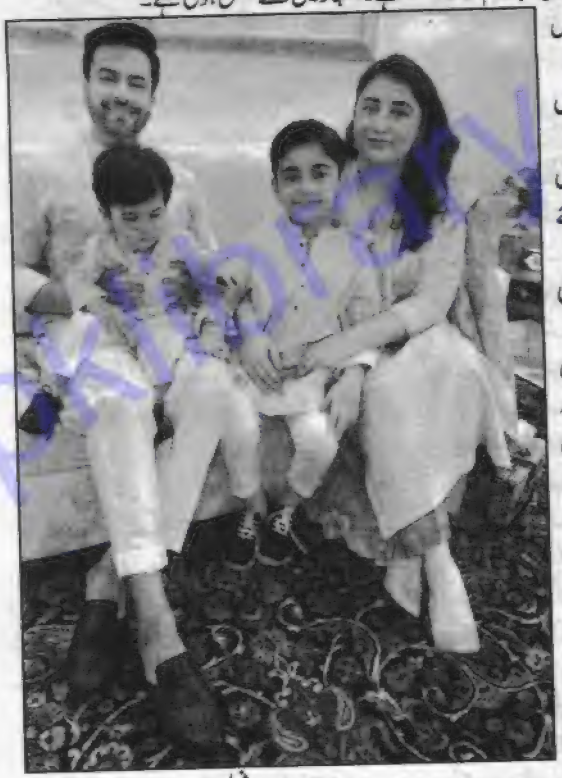

جنید خان اپنی خوب صورت فیملی کے ساتھ

❁ مزاجاً بہت نرم ہوں!

◯ جی بالکل ایسا ہی ہے۔ حقیقی زندگی میں بہت پُرسکون اور امن پسند نرم لہجے کا انسان ہوں۔

❁ طبعاً شیریں سخن ہوں!

◯ جی کہہ سکتے ہیں۔ میری عام گفتگو اس کا ثبوت ہے۔ جی میں خود بھی نرم گو ہوں اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتا ہوں۔

❁ عملاً برداشت کا مظاہرہ کرلیتا ہوں!

◯ جی! برداشت بہت ہے جو امی سے ورثے میں ملی ہے، میڈیا میں بھی لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اتنا صبر مجھ میں کیسے ہے.....

❁ حقیقتاً عاجزی وانکساری میری شناخت ہے!

◯ جی! الحمدللہ۔ تقریباً اٹھارہ، انیس سال سے شوبز میں ہوں لیکن کبھی خود پر مسلط نہیں کیا۔ اللہ نے جتنی بھی عزت دی خود کو زمین پر ہی رکھا۔

❁ رنگ برنگے ملبوسات میری کمزوری ہیں!

◯ کہہ سکتے ہیں۔ مجھے مختلف رنگ کے کپڑے پہننا اچھا لگتا ہے۔ فیشن کے جو ڈیزائن آج کل چل رہے ہیں اس میں رہتے ہوئے بھی میں رنگ پہن لیتا ہوں۔

❁ غصے میں آگ بگولہ ہوجاتا ہوں!

◯ نہیں! بہت کم غصہ آتا ہے، مشکل سے آتا ہے لیکن جب آتا ہے تو بہت آتا ہے لیکن بہت کم اظہار کرتا ہوں شور شرابے اور توڑ پھوڑ والا نہیں آتا۔

❁ دل اور دماغ کی جنگ میں ہمیشہ فاتح میرا دل ہی بنتا ہے!

◯ نہیں! دماغ کی جیت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ جذبات میں کیے گئے فیصلے اکثر ٹھیک نہیں ہوتے۔ دماغ سے سوچتا ہوں کہ جذبات کا فیصلہ درست ہے کہ نہیں کئی موقعوں پر دل بھی جیت جاتا ہے!

❁ اپنی سالگرہ پر سب سے زیادہ ہلا گلا میں خود ہی کرتا ہوں۔

◯ نہیں بالکل بھی نہیں! میرے لیے میری سالگرہ کا دن عام دنوں جیسا ہی ہے۔ البتہ گھر والے اہتمام کرلیں تو ان کے ساتھ انجوائے کرلیتا ہوں۔

❁ ہر کام نہایت اطمینان سے کرنے کا عادی ہوں!

◯ بالکل ایسا ہی ہے ہر کام بہت آرام اور سکون سے کرنے کا عادی ہوں۔

❁ خوش لباس بھی ہوں اور خوش خوراک بھی!

◯ صحیح بات ہے۔ مختلف قسم کے اچھے پکے ہوئے کھانے نعمت ہیں۔ جنہیں میں انجوائے کرتا ہوں۔ اچھا لباس پہن کر خود کو اچھا محسوس کرتا ہوں۔

❁ خود انحصاری کے جذبے نے میرے شخصی اعتماد میں اضافہ کیا!

◯ جی بالکل! خود انحصاری اعتماد دیتی ہے۔ انجینئرنگ کے تیسرے سال میں ہی اپنے میوزک کے ذریعے پروفیشنل لائف میں آگیا تھا تب میں نے دنیا دیکھی اور اسے جانا۔

❁ آرکیٹکٹ بننا میری اولین خواہش تھی!

◯ جی! امی کی طرف سے آپشن اچھا تھا اور اسکول میں میتھس بہت اچھا تھا۔ آرکیٹکچر ایک بڑا مجموعہ تھا جو ان دونوں اسکیل کو کرتا تھا۔

❁ جیسا دیس ویسا بھیس کا قائل ہوں!

◯ نہیں! لیکن منحصر ہے کہ آپ کس ریس میں ہیں۔ جو چیزیں مجھے نہیں کرنی چاہئیں وہ چاہے کہیں بھی ہوں دنیا میں، نہیں کروں گا۔

❁ بہت جلد دوستی کرلیتا ہوں!

◯ نہیں! میں بہت خاموش طبع آدمی ہوں اور ایسے لوگ دوسروں کی پہل پر انحصار کرتے ہیں۔

❁ اپنے جذبات پر بہ آسانی قابو پالیتا ہوں!

◯ بالکل! میں اپنے جذبات پر قابو پالیتا ہوں۔ بہت جذباتی ہو کر انسان اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے بھی اپنے آپ کو اور لوگوں کو بہت پڑھا اور سمجھا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے جذبات پر قابو پا لیتا ہوں۔

❁ زندگی! میں خوش دلی سے جیتا ہوں!

◯ جی! کوشش کرتا ہوں کہ مثبت سوچ رکھوں۔ جسم، دماغ اور جذبات میں توازن کا خیال رکھنے کی

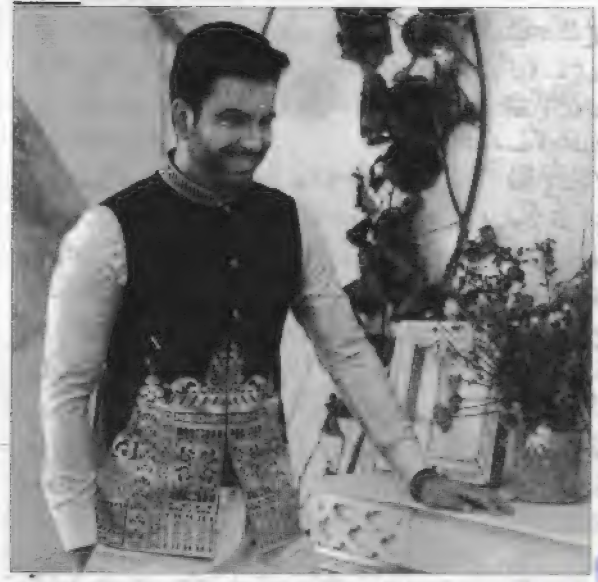

کوشش کرنی چاہیے۔ خود پُرسکون رہوں گا تو دوسرے بھی پُرسکون رہیں گے۔

❁ ابو کی اصول پسندی میری تربیت کا اہم جز ہے!

◡ جی بالکل! اصول پسندی اور ڈسپلن مجھے ابو سے ملا۔ وہ بھی بہت اصول پسند اور وقت کے پابند ہیں۔ یہ میری تربیت کا اہم وصف ہے۔

❁ محبت کرنا میں نے اپنی ماں سے سیکھا ہے!

◡ جی! جذباتی ہاتھ ماں کا ہے۔ پیار کرنا، خیال رکھنا، لحاظ رکھنا امی کی طرف سے زیادہ سیکھا۔

❁ زوجین کا ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے پسند کی شادی ضروری ہے!

◡ بالکل! شادی سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھنا، جاننا اور ملاقات بہت ضروری ہے۔ کھل کر بات کریں گے تو ایک دوسرے کے مزاج کا پتا چلتا ہے۔ میں نے خود بھی ایسا ہی کیا۔

❁ ازدواجی زندگی کے استحکام میں دلی تعلق سے بڑھ کر ذہنی ہم آہنگی اہم ہے!

◡ بالکل! دونوں چیزیں اہم ہیں لیکن ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے کیونکہ عمر بڑھتی ہے تو اس وقت companionship کا ہونا بہت ضروری ہے۔

❁ گھریلو امور میں آمنہ (شریکِ حیات) کا جتنا ہاتھ بٹاتا ہوں اس سے زیادہ کام بڑھاتا ہوں!

◡ نہیں بھئی۔ میں خوش نصیب ہوں کہ آمنہ گھر کے سارے کام سنبھال لیتی ہے۔ وقت پڑے تو گھر کے کام کر لیتا ہوں لیکن کام بانٹنے کے لیے، بڑھانے کے لیے نہیں۔

❁ میرے تجربے کے لحاظ سے آمنہ کامیاب ڈینٹسٹ ہے!

◡ جی بالکل! انسان کا کام کرنے کا مزاج بھی ہوتا ہے work ethic آمنہ کی اچھی ہے۔ اصول پسند ہے جو کسی بھی پروفیشنل انسان کے لیے بہت اہم ہے۔

❁ بدلحاظوں کو دنداں شکن جواب دینے میں آمنہ ایک پل بھی نہیں لگاتی!

◡ جی بالکل ایسا ہی ہے۔ آمنہ رشتوں کا پاس بہت رکھتی ہے تمیز سے پیش آتی ہے۔ لیکن جب کوئی حد سے تجاوز کر جائے تو جواب دینے میں بالکل بھی وقت نہیں لگاتی۔

❁ اولاد کی اعلیٰ تعلیم..... عمدہ تربیت کے بنا..... بے معنی ہے۔

◡ بالکل! تربیت بہت ضروری اور اہم ہے ماں باپ کے باہمی سلوک اور گفتگو کا اثر اولاد پر بہت پڑتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ عمدہ تربیت سونے پر سہاگا کے مترادف ہے۔

❁ حقوق العباد کا خاص خیال رکھتا ہوں!

◡ یقیناً! میں اس کو بہت اہم سمجھتا ہوں یہ میری

نیچر ہے، والدین کی تربیت ہے اور سب سے بڑھ کر اللہ کا حکم ہے جو میں بھی مانتا ہوں۔

❁ پیشہ ورانہ مصروفیات سے میری گھریلو زندگی سخت متاثر ہوتی ہے!

☾ نہیں! کبھی، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کام کے بوجھ کی وجہ سے فیملی کو وقت نہیں دے پاتا اس کا دورانیہ طویل نہیں ہوتا۔ بریک لے کر فیملی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا ہوں۔

❁ سوشل میڈیا پر نجی زندگی عیاں کرنا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے!

☾ جی! عوام اپنے پسندیدہ آرٹسٹ کی نجی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ میں اپنی نجی زندگی کو نجی زندگی کی حد تک اور کام کو کام کی حد تک رکھتا ہوں۔

❁ فنونِ لطیفہ کا ذوق وشوق امی کی وراثت ہے!

☾ جی بالکل یہ میری جینز میں آیا ہے کیونکہ امی فائن آرٹس میں گولڈ میڈلسٹ تھیں، مصورہ تھیں۔ میں خوش بخت ہوں کہ آرٹ کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔

❁ گانوں کی لائیو پرفارمنس کا اپنا ہی لطف ہے!

☾ جی! بالکل۔ موسیقی کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار وہ بھی لائیو پرفارمنس میں اس کا لطف اور عجیب تسکین ملتی ہے۔

❁ میں نے اپنے بینڈ ''ری کال'' کے پلیٹ فارم سے اپنا پہلا گانا ریلیز کیا!

☾ جی بالکل! ری کال بینڈ کے تحت میں نے پہلا گانا ''نشان'' ریلیز کیا جو کافی مقبول ہوا۔

❁ میرا پہلا گانا ''سب بھلا کے'' میرے موسیقی کے کیریر میں سنگ میل ثابت ہوا!

☾ بالکل! زندگی کے ایک فیز میں تھا جب میں نے خود کو سمجھایا کہ دھوکوں اور غلطیوں سے انسان سیکھتا ہے تب میں نے خود کو ہمت دلائی ''سب بھلا کر'' لکھا۔ اس کو بہت شہرت ملی۔

❁ زیادہ تر اپنے تخلیق کردہ گانے ہی گاتا ہوں۔

☾ جی! میرے گانے بیشتر گانے میرے ہی تخلیق کیے ہوتے ہیں۔ لیکن کافی میں نے دوسروں کے گانے بھی گائے ہیں۔

❁ محض قوتِ متخیلہ ہی نے نہیں بلکہ میری قوتِ مشاہدہ نے بھی مجھ سے کئی گیت تخلیق کروائے!

☾ بالکل! کیونکہ جذباتی آدمی اپنے مضبوط مشاہدے کو محسوس کر کے ہی بہتر اظہار کر سکتا ہے۔ میں نے بھی اس جذبے کے تحت کئی گیت تخلیق کیے۔

❁ ''پکار'' میرا بہترین راک سونگ ہے!

☾ پکار میرا پہلا پمپ ڈمپ ہیوی قسم کا راک سونگ تھا جو میرے دل کے بہت قریب ہے ہم بہت passion..... سے گاتے ہیں، راک ٹریکس میں سے کسی ایک کا انتخاب مشکل ہے۔

❁ مجھے اپنے راک اسٹار ہونے پر فخر ہے!

☾ جی! بطور میوزیشن میری زندگی بہت اطمینان بخش ہے۔ میں نے اس کے لیے بہت کوشش اور محنت کی۔ بیس اکیس سال کی عمر میں جب میں نے میوزک شروع کیا تب احساس ہوا کہ یہی وہ چیز ہے جو میری تکمیل کر رہی ہے۔

❁ امریکن گلوکارہ کے ساتھ گانے کا تجربہ بہت خوشگوار رہا!

☾ میری امریکن دوست Jennifer Jandis, ونڈرفل سنگر ہے ایک دوست کے کہنے پر میں نے اس کی آواز سنی تو اچھی لگی میں نے اور Jennifer نے ایک گانا مل کر لکھا کمپوز میں نے کیا۔ بہت اچھا رسپانس ملا پاکستان سے بھی اور امریکا سے بھی۔ گورے تو بہت حیران ہوئے سن کر کہ پاکستان میں بھی ایسا developed میوزک بنتا ہے۔ جو بین الاقوامی معیار کا ہو۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

❁ زندگی کی اہمیت پر تیار کردہ اپنا گانا بے حد پسند ہے مجھے۔

☾ بالکل میرے سارے گانے میری زندگی کے تجربات پر مبنی ہیں۔ کیونکہ اس میں میں نے اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات، جذبات واحساسات کو سمویا ہے!

❁ گلوکاری میری اولین شناخت ہے!

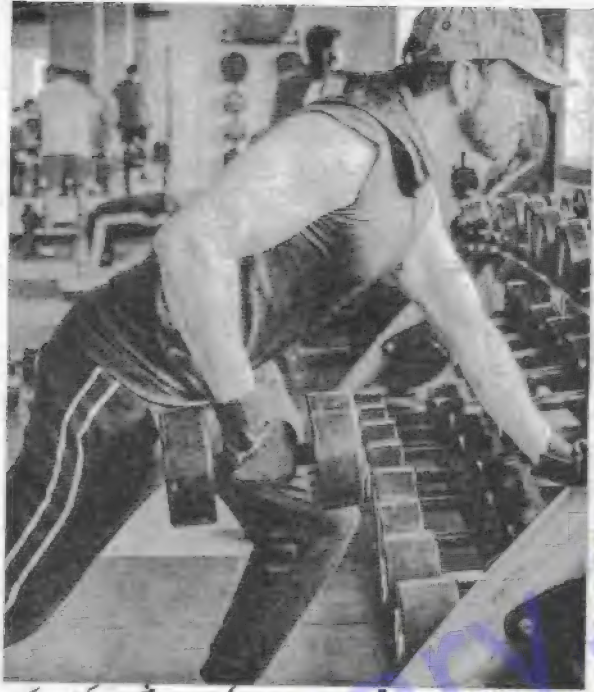

آج واقعی مجھے اپنے گلوکار ہونے پر بہت فخر ہے۔

❁ موسیقی کی دنیا میں کمال دکھانا چاہتا ہوں!

میرے لیے کمال دکھانے سے زیادہ اپنے باطن کا اظہار ہمیشہ اہم رہا ہے۔ میرا اظہار کمال نہ بھی دکھائے کوئی مسئلہ نہیں لیکن میری سوچ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔

❁ بھیگے موسم میں خوب گاتا ہوں!

جی بالکل اور یہ انسانی فطرت ہے کیونکہ بھیگے موسم میں مثبت جذبات ابھرتے ہیں اور خود بخود گانے کو جی چاہتا ہے۔

❁ میوزک وڈیو بنانے میں مجھے کمال حاصل ہے!

جذبات کو شاعری میں ڈھال کر موسیقی سے سنوار کر اس شاعری کی کہانی کو واضح شکل وڈیو دے گی۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ وڈیو کے ذریعے پیغام پہنچانے میں کامیاب رہوں۔

❁ گلوکاری کے عروج کے دور ہی میں یکا یک اداکاری شروع کردی!

جی! کیونکہ اس وقت میوزک چینلز تھوڑے سے پیچھے چلے گئے تھے۔ سکیورٹی ایشوز کی وجہ سے کانسرٹ ہونا تقریباً ختم ہوگئے تھے۔ میرا زیادہ دھیان اداکاری کی طرف ہوگیا۔

❁ اپنے پہلے ڈرامے کا پہلا شوٹ کرنے میں مجھے بہت دقت ہوئی!

جی! میوزک وڈیو میں اپنے خیالات کے اظہار کے ساتھ میوزک کی سپورٹ ہوتی ہے۔ ٹی وی اور چیز ہے اس میں اپنے آپ کو کسی کردار میں ڈھالنا ہے۔ میوزک کی سپورٹ پیچھے شوٹ کرتے ہوئے نہیں ہورہی ہوتی۔ تلفظ کا درست ہونا، تاثرات واضح ہونا، کیمرے کی گھبراہٹ دور ہونا، سامنے اداکار کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی کا ہونا یہ سب بہت اہم ہے، میوزک وڈیو میں اس طرح نہیں ہے، اس لیے شروع میں دقت ہوئی لیکن میں شکر گزار ہوں کہ مجھے ایسے ڈائریکٹر ملے جنہوں نے میری صحیح رہنمائی اور تربیت کی ایسے لوگ اور فنکار ملے جنہوں نے مجھے سپورٹ کیا تو میں بہتر سے بہتر سیکھ سکا۔

❁ اپنے ہر ڈرامے میں اپنے کردار پر میں بھرپور توجہ دیتا ہوں!

بالکل! ایک فنکار کو اپنے کردار کے بارے میں تفصیلی معلومات، مشاہدہ، ڈائریکٹر سے ہم آہنگی اور پھر کچھ منفرد ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے پوری طرح دھیان دوں ڈائریکٹر کے ساتھ بیٹھ کر جو وہ چاہتا ہے جو میں سمجھ رہا ہوں اس کے بیچ کا راستہ ہم نکال سکیں۔ جو وہ چاہتا ہے وہ میرے حساب سے بالکل مختلف ہے تو میری کوشش ہوگی کہ ڈائریکٹر کے وژن

کو فالو کیا جائے۔

❁ کسی بھی کردار کی ادائیگی سے پہلے متعلقہ کردار کا مشاہدہ و مطالعہ ضروری سمجھتا ہوں!

☺ بالکل! کہانی کو پڑھنا کردار کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنا، ماحول کو سمجھنا، ڈائریکٹر کے وژن کو سمجھنا یہ تمام چیزیں مل کر ہی ایک کردار ڈیولپ کرتی ہیں۔

❁ منفی کردار میں کھل کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہوں!

☺ جی! میں ہی کیا منفی کردار میں ہر اداکار کو کھلا مارجن ملتا ہے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے اور خود کو منوانے کا۔ مزہ آتا ہے اور سب ہی کو دلچسپ لگتا ہے۔

❁ اداکاری میں لہجے کے اتار چڑھاؤ کو بہت اہمیت دیتا ہوں!

☺ جی بالکل، مکالموں میں اتار چڑھاؤ بہت اہم ہے کہ کس لفظ میں کہاں زور دینا ہے، کہاں پر فوکس ہے مکالمے کے لحاظ سے خاص طور پر ٹون کا خیال رکھنا کہ بھاری ہے یا پتلی۔

❁ فنکار میں سیکھنے کی خواہش ہی اسے بڑا فنکار بناتی ہے!

☺ بالکل! اپنے اندر جب تک کمی نہیں ڈھونڈیں گے اسے بہتر کرنے کی کوشش نہیں کریں گے..... سیکھنے کی، آگے سے آگے بڑھنے اور بہتر سے بہتر کی خواہش اور لگن ہی کامیاب بناتی ہے۔

❁ چھوٹے بڑے سے مجھے فرق نہیں پڑتا کردار توانا ہونا چاہیے!

☺ یقیناً! میں نے ایسے کئی کردار کیے جو نائٹل کیریکٹر نہیں تھے لیکن کردار اچھے تھے جیسے خدا اور محبت میں مجھے اپنا کردار دلچسپ لگا، اس سے پہلے نہیں کیا تھا۔ کردار اچھا ہونا چاہیے۔

❁ مداحوں کی کثیر تعداد مجھے رومانوی کردار میں دیکھنا پسند کرتی ہے!

☺ جی بالکل میرے دیکھنے والے مجھے زیادہ تر سنجیدہ ریمیٹک کردار میں دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ مجھے اس کردار کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ پیار ہے ان کا۔

❁ بہت عمدہ کامیڈی کر سکتا ہوں!

☺ نہیں عمدہ کامیڈی تو نہیں کہہ سکتا لیکن کامیڈی کرتا ہوں گھر میں، دوستوں کے ساتھ۔ فلم میں کامیڈی کی ہے، کیسی کی ہے؟ یہ تو دیکھنے والے ہی بتائیں گے۔

❁ حرا مانی کے ساتھ اسکرین کیمسٹری میچ نہیں کرتی!

☺ نہیں بہت کرتی ہے کیونکہ حرا بہت جینون لڑکی ہے، فنی ہے۔ accomodating ہے۔ کام میں بہت فوکسڈ ہے میں بھی ریلیکس ہو کر کام کرتا ہوں۔

❁ ڈرامے کی کامیابی میں ہدایتکار اور اداکار کی ذہنی ہم آہنگی سونے پر سہاگا کے مترادف ہے!

☺ جی بالکل دونوں کی ذہنی ہم آہنگی بہت ضروری ہے کیونکہ جب ایکٹر ڈائریکٹر کا وژن سمجھ کر اس کی سوچ کے مطابق کام کرے گا تو اس کا کردار کھل کر سامنے آتا ہے۔

❁ ایک زمانہ تھا اپنے ڈرامے نہایت شوق سے دیکھا کرتا تھا!

☺ کبھی، کبھی دیکھتا ہوں اپنے ڈرامے، کچھ قسطیں ضرور دیکھتا ہوں کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا کام کیا؟ کیا کمی تھی؟ کیا چیز بہتر کی جا سکتی ہے؟

❁ چھوٹی اسکرین کی بہ نسبت بڑی اسکرین پر کام کرنے کے مواقع زیادہ ہیں!

☺ نہیں! چھوٹی اسکرین تو چل رہی ہے، چلتی رہے گی کام کے مواقع بھی کافی ہیں، بڑی اسکرین تو ویسے بھی بالکل بند ہو گئی اس میں کام کرنے کے مواقع کم ہیں، فلمیں بنتی نہیں۔

❁ ٹیم اور اسکرپٹ سے مطمئن نہ ہوں تو فلم سائن نہیں کرتا!

☺ بالکل ایسا ہی ہے۔ صرف اس وجہ سے بہت سال لگ گئے فلم سائن کرنے میں۔ کافی فلمیں آفر ہوئی تھیں لیکن ٹیم، اسکرپٹ اور کیریکٹر مجھے سمجھ نہیں آتا تو میں سائن نہیں کر پایا۔ اب سب میرے مطابق ہے تو میں نے فلم سائن کر لی۔

❁ اپنی پہلی فلم میں ڈانس کرنے کا تجربہ بہت خوشگوار رہا!

◡ بالکل! اس سے پہلے میں نے کسی اور میڈیم پر ڈانس نہیں کیا بہت اچھا تجربہ تھا۔ جس capacity میں کیا اپنے لحاظ سے بہت اچھا کیا۔ باقی دیکھنے والے بتائیں گے کیسا کیا۔

❁ فلم بن روئے میں مجھے اپنا کردار پسند نہیں آیا!

◡ نہیں! کردار ٹھیک تھا، ہم ٹی وی کے لیے جو عزت ہے اس کی خاطر کیا۔ یہ ہم ٹی وی کا میجر پروجیکٹ تھا۔ انہوں نے کہا میں نے کیا اور کردار کو نبھانے کی بہت کوشش کی۔

❁ موقع ملے تو ایکشن فلموں کا سپر اسٹار بن سکتا ہوں!

◡ بالکل! ایکشن ہم سب مردوں کو پسند ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے بھی ہیں اور ایکشن اسٹار بننا بھی چاہتے ہیں۔

❁ عاشقی 2 میں کام نہ کرنے کا سخت ملال ہے!

◡ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، جو چیزیں بھی ہوتی ہیں کسی نہ کسی سبب سے ہوتی ہیں۔ بالکل عاشقی جیسی فلم جو بڑی میوزک اور بینڈ تھی اگر اس میں کام کرتا تو مجھے بہت مزہ آتا..... کیونکہ میں خود میوزیشن ہوں یہ میوزیشن کی کہانی تھی۔ اس کے گانے بہت اچھے تھے، بدقسمتی سے نہیں ہوا لیکن اگر ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔

❁ زیادہ تر ایک سنجیدہ اداکار کے طور پر جانا پہچانا جاتا ہوں!

◡ ہاں جی بالکل۔ کیونکہ سنجیدگی میرے مزاج کا ایک حصہ ہے۔

❁ ماڈلنگ، اداکاری سے زیادہ مشکل کام ہے!

◡ نہیں! کوئی بھی شعبہ آسان نہیں ہے ہر شعبے کی اپنی، اپنی مشکلات ہیں۔

❁ ماڈلنگ کرنے میں لطف آتا ہے!

◡ جی بالکل ریمپ پر واک کرنے کا اپنا مزہ ہے وہ بھی ہم چکھ لیتے ہیں۔

❁ موسیقی ہو، ماڈلنگ ہو، شاعری یا اداکاری شہرت میرا مسئلہ کبھی نہیں بنی!

◡ جی الحمدللہ! شہرت کا چسکا کبھی تھا نہ ہوگا۔ میرا شوق اپنے اندر کا اظہار رہا ہے اور مختلف mediums میں اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

❁ عہدِ حاضر میں فنکاروں کی اچھی بری شہرت میں سوشل میڈیا کا کردار بہت اہم ہے!

◡ بالکل! بہت اہم ہے۔ اس کو آپ کیسے استعمال کرتے ہیں؟ کس طرح اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں یہ آپ کی سمجھداری اور صلاحیت پر منحصر ہے۔

❁ فنی سفر میں میری کامیابی میں قسمت کے ساتھ ساتھ میری لگن، ان تھک محنت کا بھی کردار ہے!

◡ جی! ہر چیز میں لگن اور محنت کا تو ہمیشہ ہی کردار ہوتا ہے۔ ان تھک محنت کے بغیر آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

❁ مداحوں کی تعریفیں سن کر پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے!

◡ انسانی فطرت ہے کہ اپنی تعریف اچھی لگتی ہے کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی اچھی لگتی ہے اور مداحوں کی تعریف ہی نہیں تنقید کو بھی اچھی طرح سے لیتا ہوں۔

❁ لاک ڈاؤن نے فنونِ لطیفہ کے تمام ہی شعبوں کو بہت متاثر کیا!

◡ جی بالکل لیکن شوبز انڈسٹری پھر بھی کسی حد تک بچی رہی کیونکہ ٹیلی ویژن چل رہا تھا، چینلز چل رہے تھے، بے شک پروڈکشن کم ہوئیں لیکن بند نہیں ہوئیں۔

❁ کورونا وبا نے میرا اندازِ فکر ہی نہیں کسی حد تک طرزِ زندگی بھی بدل دی!

◡ نہیں! اصل میں کورونا سے پہلے بھی میری زندگی بڑے منظم طریقے سے بسر ہو رہی تھی، اب بھی ہے۔ کام کر کے سیدھا گھر جانا، جم کرنا، وقت پر سونا اٹھنا، گھر والوں کو وقت دینا۔

❁ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے!

◡ نہیں! ایسا بالکل بھی نہیں ہے میری خواہشوں کی ایسی فہرست نہیں ہے جن کی تکمیل کے لیے زندگی لگا دوں۔ اللہ نے جو دیا اس کا شکر ادا کر کے اس سے لطف اندوز ہوا۔

❁ بھاؤ تاؤ کیے بنا خریداری کر ہی نہیں سکتا!

◡ نہیں، نہیں بالکل بھی نہیں ایسا زیادہ بھاؤ تاؤ میں نہیں کرتا۔ ہلکی پھلکی کوشش کرتا ہوں اگر مجھے لگ رہا ہے کہ اس میں زیادہ bargaining نہیں ہوگی تو میں مان جاتا ہوں۔

❁ خود انحصاری کا احساس بہت دل خوش کن ہوتا ہے!

◡ بالکل سیلف میڈ ہونے کا احساس بہت اچھا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے زندگی میں کافی وقت خود انحصاری میں گزارہ۔ اپنے پاؤں پر بہت جلدی میں کھڑا ہو گیا تھا، بہت young age میں والدین سے مالی مدد لینا چھوڑ دی تھی والدین نے بہت سپورٹ کیا بحیثیت اولاد یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنے والدین پر سے ہم جتنا بوجھ کم کر سکتے ہیں کرنا چاہیے۔

❁ تبدیلی کا عمل ہر انسان کے اندر سے شروع ہوتا ہے!

◡ بالکل، جب یہ ہمارے اندر سے شروع ہوگا تو آس پاس کے لوگ بھی ہم سے متاثر ہو کر تبدیل ہوں گے۔

❁ جارحانہ مزاج والے بیشتر افراد بہت صاف دل ہوتے ہیں!

◡ کسی حد تک درست ہے کچھ دانستہ جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر جارحانہ مزاج رکھنے والے اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔

❁ انسانی فطرت کا مشاہدہ انسان فہمی میں بہت معاون ہوتا ہے!

◡ بالکل خاص طور پر ایک آرٹسٹ کے لیے بہت اہم ہے۔ کیونکہ جب تک جذبات و احساسات پر ہماری گرفت مضبوط نہیں ہوگی ہم اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔

❁ خود خوش رہنے والے ہی اوروں کو سچی اور بھرپور خوشی دے سکتے ہیں!

◡ جی بالکل جب میں کام سے گھر آتا ہوں تو دن بھر کے مسئلے مسائل وہیں چھوڑ کر آتا ہوں کیونکہ وہ یہ غبار ڈیزرو نہیں کرتے۔ وہ مجھے انہیں نہیں دینا چاہیے میں خود خوش رہوں گا تو ان کو بھرپور خوشی دیتا ہوں۔

❁ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!

◡ بے شک کیونکہ وہ سچی ہوتی ہے تو اس کی طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن جس سے کسی کی دلآزاری ہو سکتی ہے اس کا اظہار نہ کریں۔ جس سے اخلاقی قوت بڑھے وہ ضرور ظاہر کریں۔

❁ جاگتی آنکھوں دیکھے جانے والے خواب تعبیر کی لگن میں مگن رکھتے ہیں!

◡ جی خواب جب تک نہیں دیکھے گا اسے پورا کرنے کے لیے جتن بھی نہیں کرے گا۔

❁ افواہ پھیلانے والوں سے خائف رہتا ہوں!

◡ جی بالکل کوشش کرتا ہوں کہ افواہ پھیلانے والوں سے بچ کر رہوں اور کسی کے بارے میں کوئی غلط بات مجھ سے نہ نکلے اور گردش پائے۔ دونوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

❁ بھرپور نیند اچھی صحت کے لیے بہت ضروری ہے!

◡ بالکل سونے جاگنے کا ایک وقت مقرر کر کے بھرپور اور نارمل نیند صحت کے لیے بے حد ضروری ہے۔

❁ میری نجی و فنی زندگی کا حاصل ہر معاملے میں ایمانداری، سچائی اور اخلاص نیت ہے!

◡ جی بالکل ایسا ہی ہے کہ نجی و فنی زندگی دونوں میں میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ fair رہوں، ایمانداری اور اچھی نیت کے ساتھ رہوں۔

❁ میرے مداح میرا اثاثہ ہیں!

◡ بالکل مداح ہر آرٹسٹ کا اثاثہ ہیں۔ اپنے مداحوں کی بہت عزت اور قدر کرتا ہوں۔ میں جو بھی ہوں ان ہی کی وجہ سے ہوں۔

❁ پاکیزہ بہنوں سے بس اتنا کہوں گا کہ.....!

◡ خوش رہیں، کوشش کیا کریں کہ مثبت سوچ، اچھا اخلاق بہت اہم ہے۔ دنیا بہت تلخ اور پریشان کرنے والی چیز ہے ہمیں اس میں سے اچھائی نکالنی اور پھیلانی ہے، برائی کو دبانا اور روکنا ہے۔

☆☆☆

پیار بھرا ایک رشتہ ہے برسات کے موسم سے

شائستہ زریں

بلاشبہ بارش اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو ہمارے لیے شفا بھی ہے اور دوا بھی۔ گرمی کی حدت اور حبس کی شدت کے بعد جب بادل جھوم کے آتے ہیں اور گھنگھور گھٹائیں برسنے لگتی ہیں تو دل، دماغ اور روح بھی تازگی محسوس کرتے ہیں۔ بارش کا برستا پانی رحمتوں کی نوید لاتا ہے لیکن ہمارے بلدیاتی اداروں کی نااہلی اور ناقص کارکردگی کے طفیل برسات میں جانی و مالی نقصان کی صورت وہ حشر برپا ہوتا کہ لوگ پریشان اور خوفزدہ ہو کر اپنا سوچے سمجھے خیر کی دعا مانگنے کے بجائے بارش سے پناہ مانگنے لگتے ہیں کیونکہ اب بارش ان کو بری معلوم ہوتی ہے۔ بقول شہزاد احمد شہزاد

میں کہ خوش ہوتا تھا دریا کی روانی دیکھ کر
کانپ اٹھا ہوں گلی کوچوں میں پانی دیکھ کر

ایسے میں خیال آتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے اپنے مخصوص و منفرد انداز اور نرالی لے میں طبیعت کو عجیب قسم کا گداز اور سرور بخشنے والے ساون کے گیت تخلیق کیے تھے، عہد حاضر میں اگر وہ ہمارے درمیان ہوتے تو برسات کے ہولناک نتائج اور تباہ کاریاں دیکھ کر ساون کے ایسے سُریلے گیت تخلیق کر پاتے جو سچے جذبوں کی مٹی سے گندھے محسوس ہوتے ہیں؟ دل مصر ہے کہ آپ اپنا رنگِ سخن کبھی تبدیل نہیں کرتے لیکن دماغ اس سے انکاری ہے۔ بارش کا کمال یہی ہے کہ چھوٹے بڑے مسائل کے باوجود ہر صاحب ذوق کو بھلی لگتی ہے کہ برسات سے ایک اپنائیت کا تعلق جو محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں دل بھی تفریح کا آرزومند ہوتا ہے اور بارش کے شیدائی اپنی، اپنی آرزوؤں، خواہشات اور سب سے بڑھ کر میسر سہولیات استعمال کرتے ہوئے بارش سے لطف انداز ہوتے ہیں۔ موسم ہے برسات کا اور اس سہانے سے درج بالا امور کے پیش نظر ہم نے سروے میں شریک خواتین سے معلوم کیا کہ

سوال ۱:: بارش کب بہت اچھی اور کب بہت بری لگتی ہے؟

سوال ۲:: اگر حضرت امیر خسرو عہد حاضر میں ہوتے تو ساون کے گیت کس رنگ میں تخلیق کرتے؟

سوال ۳:: آپ کے نزدیک بارشوں کی سب سے زیادہ پُرلطف تفریح کون سی ہے؟ خود آپ بارش سے کیسے لطف اندوز ہوتی ہیں؟

ریحانہ روحی
(شاعرہ)

۱: بارش کا نام لیتے ہی احساسات میں لطیف یادوں کی رم جھم ہونے لگتی ہے۔ جذبوں کی یہ ٹھنڈی، ٹھنڈی پھوار بوند، بوند برس کر یادوں کے حسین در وا کر دیتی ہے۔ مثلاً بچپن کے وہ دن جب ہمارے ماں باپ ہمیں بارش میں بھیگنے سے بچاتے تھے اور ہم ان سے چھپ، چھپ کر بارش میں نہا کر آخر کار بیمار پڑ جایا کرتے تھے اور جب کچی عمر کی دل افروزیاں بارش کے کینوس پر محبوب کا چہرہ پینٹ کرتی تھیں اور ہم ہزار بندشوں کے باوجود اس تصویر کو اپنی قوسِ قزح اوڑھنیوں میں ڈھانپ کر دیدار یار کی مستیوں میں کھو جایا کرتے تھے اور جب ہم اپنے سر کے سائیں سے پہلے ملن کے بعد ساون کی پہلی جھڑی میں اپنے مستقبل کے خواب بنتے تھے تو بارش بہت اچھی لگتی تھی۔ بارش تو اب بھی بری نہیں لگتی لیکن ہماری نااہل حکومت (معذرت کے ساتھ) کے ہاتھوں بارش کے بعد بارش کے پانی کو نہ سنبھالنے پر ہونے والی تباہ کاریاں اور بربادیاں بارش کے ذکر سے خوفزدہ کر دیتی ہیں۔

۲: بھئی یہ بات طے ہے کہ جناب امیر خسرو جس رومان پرور، آسودہ حال اور stress free

اور tension free اور عشق و محبت سے لبریز مستانہ گھٹاؤں کے ماحول میں جھوم، جھوم کر ساون کے گیت لکھ رہے تھے وہ اس عہد میں ہرگز، ہرگز ممکن نہ ہوتا بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ وال پر یہ پوسٹ لگاتے معذرت.....

''میرے چاہنے والوں مجھے معاف کرنا میں بوجوہ کورونا اس بارش میں بھیگتے ہوئے ساون کے گیت لکھنے سے قاصر ہوں۔ ہائے میرے ساون کے جھولے...

۳: میرے نزدیک بارشوں کی سب سے زیادہ پُرلطف، دل پسند اور دلنشیں تفریح آج بھی بارش میں بھیگنا ہے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو گاڑی میں بیٹھ کر سڑکوں پر بارش کو برستے ہوئے دیکھنا ہے اور سب سے کم سیرابی کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر بارش سے ہاتھ ملانا ہے' رہا سوال میرے لطف اندوز ہونے کا تو جواب میں میرے جون بھائی کا شعر حاضر ہے۔

میں بھی تو اس طرح بہلتا ہوں
اور سب جس طرح بہلتے ہیں

حنا دل پزیر
(ٹی، وی آرٹسٹ، شاعرہ)

۱: بارش جب تک ہوتی رہتی ہے تو بہت اچھی لگتی ہے جب نہیں ہوتی تو بہت بری لگتی ہے۔

۲: حضرت امیر خسرو دورِ حاضر میں ہوتے تو یقیناً اپنی

شاعری کو (rap) ریپ سانگ کا رنگ دے دیتے۔

۳: سب سے پُرلطف تفریح بارشوں میں اپنے گھر میں رہنا ہے کیونکہ کہیں اور ہوتے ہیں تو راستے میں پانی بھر جاتا ہے، آنا جانا مشکل ہو جاتا ہے تو اگر میں گھر میں ہوں تو زیادہ مجھے اچھا لگتا ہے ورنہ بھی بارش کے انتظار میں تڑپتی رہتی ہوں۔ جب بارش آتی ہے تو چائے بنا کر پی لیتی ہوں اور soft jazz (میوزک) سن کر بارش کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

فریدہ خان
(براڈکاسٹر)

۱: من کا موسم گر ہے اچھا سارے موسم اچھے ہیں

اسی طرح گرمی و سردی کی بارش کا بھی اپنا رنگ ہے۔ بچپن کی بارشوں کے مزے جو ہم نے کر لیے، آج ہمارے بچے جانتے تک نہیں، ہم کہ وہ لوگ جو قدیم اور جدید کے سنگم کے پروان چڑھتے لوگ ہیں عجیب سی کشمکش کا شکار ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو کیسے محسوس کروائیں کہ یہ بدلتی رُتیں کیا کہتی ہیں ان پر غور تو کرو ذرا، اس سوشل میڈیا کے طلسم سے باہر نکل کر تو دیکھو تو بس بارشیں بہت اچھی لگ رہی ہوتی ہیں، جب تک

کسی کی ٹپکتی چھت، کسی کی دوروٹی کا آسرا بن پانے کا خیال نہ آجائے۔ پکوان کی خوشبوؤں کے ساتھ کسی کا چولھا نہ جلنے کا دکھ رگ و پے میں سرایت نہ کر جائے، جب تک بارش اچھی لگتی ہے۔

۲: میرے خیال میں حضرت امیر خسرو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے، خصوصاً کراچی کے موجودہ حالات میں ساون جا بجا کچرے کے ڈھیر، شور شرابا، بے ہنگم ٹریفک بلکہ کھلے گٹر ٹوٹی سڑکیں۔

ان کی اس حسِ لطیف کو سخت اذیت میں مبتلا کر دیتیں یا پھر یا پھر وہ جدید ٹیکنالوجی کا مجبوراً استعمال کرتے ہوئے ساون گیت واٹس ایپ پر فیس بک پر اپ لوڈ کرتے اور پھر ہمارے بچے اور بچیاں خاص طور پر ٹک ٹاکران ساون کے گیتوں کا حشر نشر کرتے۔ میکے سے اماں سے بھیا کو بلوانے کی فرمائش کے بجائے باہر سے پزا منگوایا جاتا اور پزا کھاتے ہوئے سیلفیاں لی جاتیں اور جس طرح کی آج کل کی سیلفیاں لی جاتی ہیں وہ سب دیکھ کر حضرت امیر خسرو یقیناً حیران رہ جاتے اور سوچتے ساون ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ ایسے ساون کے لیے کیا شعر لکھوں؟ کیا گیت لکھوں؟

۳: بارشوں کی سب سے زیادہ پُرلطف تفریح میرے لیے بس بیتے دنوں کی یادیں ہیں اور ان یادوں میں گھر کر میں خود کو وہیں محسوس کرتی ہوں جہاں سے عمر رفتہ بہت جلد گزر گئی۔ یہ موسم یہ بارش محض بارش ہی نہیں ہوتی کسی نہ کسی یاد سے وابستہ، کسی نہ کسی احساس سے مشروط ہوتی ہے اور ہر بارش ہر ساون میں یادیں اور احساسات بڑھتے چلے جاتے

ہیں ان میں وقت، حالات اور عمر کے مطابق اضافہ ہوتا جاتا ہے، جیسے بچپن کی بارش، جوانی کی بارش، بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ، ساتھ یادیں اور احساسات اور شدید ہوتے جاتے ہیں۔ مجھے برسات میں وہ سرسبز منظر نہیں بھولتے جہاں چوٹیوں میں کڑاہیاں چڑھتی تھیں، دھواں اٹھتا ہوا اور اس دھویں کی مہک اور مٹی کی سوندھی خوشبو مل کر نہ جانے کیا نشہ طاری کرتی تھیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہر چیز اپنی اہمیت کھو رہی ہے۔ کہاں بارش میں پکوان ہوتے تھے بارش ہوتے ہی فوراً کڑاہیاں چڑھا دی جاتی تھیں، پکوڑے تلے جاتے تھے، سموسے بنتے تھے۔ کرنے والے اب بھی یہ سب کرتے ہیں لیکن وہ مزہ، وہ لطف، وہ احساس میرے خیال میں اب نہیں رہا، ہر چیز اس وقت مصنوعی لگنے لگی ہے ایسے میں بارشوں میں میری سب سے بڑی تفریح یادوں میں کھو کر گزری ہوئی بارشوں کو یاد کرنا ہے۔

شاہینہ رفیع
(آر جے)

ا: بارش کبھی مجھے بری لگی ہی نہیں ہمیشہ سے بہت اچھی لگتی ہے۔ کراچی میں بارش کم ہی ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے بچپن اور لڑکپن میں جو بارشیں دیکھی ہیں۔ یقیناً بڑی خوب صورت بارشیں ہوتی تھیں اور شاید کچھ تقاضائے عمر بھی تھا کہ ان بارشوں کو انجوائے کیا جائے تو بہت کیا۔ کراچی کے علاوہ پنجاب میں بارشوں کے موسم کا لطف بہت اٹھایا ہے۔ میں سمجھتی ہوں سب سے حسین بارشیں لاہور میں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن بارش کے بعد وہاں کا ماحول اچھا نہیں ہوتا، بہت گھٹن ہو جاتی ہے۔ کراچی میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بارش جب، جب ہوئی بادل برسنے کے بعد بھی اچھی لگی، اس بات سے قطع نظر کہ کراچی کی سڑکوں کا کیا حال ہوتا ہے۔

۲: میں سمجھتی ہوں کہ موسم، وقت، دکھوں اور دل کی بات کہنے کے لحاظ سے جتنا اپنے کلام کو امیر خسرو نے خواتین کے دل کے نزدیک رکھا ہے ناں شاید ہی ایسا کوئی کر سکتا ہے۔ برسات کے موسم میں وہ آج کے دور میں بھی صرف اور صرف رنگوں کی باتیں کرتے اور رنگوں میں سب سے بڑے رنگ محبت کی بات کرتے۔ خواتین کے دل میں کسی بھی رشتے اور تعلق کی بنا پر محبت کا طوفان برپا رہتا ہے کسی بھی رشتے اور تعلق کے لحاظ سے اب یہ ان کی اپنی پسندیدگی پر منحصر ہے تو امیر خسرو بھی خواتین کے لیے صرف اور صرف محبت بھرے گیت لکھتے کہ پردیس گیا سیاں جانے کب آئے گا تو کبھی لکھتے کہ میکے کی دہلیز پر برستی بارش کی بوندیں کیسے یاد آتی ہیں؟ میں سمجھتی ہوں وہی گیت تخلیق کرتے جو خواتین اور لڑکیوں کے دل کو جا کر چھو لیتے۔

۳: تمام گھر والے گھر میں موجود ہیں تو گھر کے آنگن، چھت یا ٹیرس پر سب کے ساتھ بارش کے پانی میں بھیگنا اور ساتھ ساتھ پکوان بنانا گرما گرم پکوڑے، حلوا، کچوریاں اور سموسے کھلانا اور کھانا سب سے بڑی تفریح ہے۔

صائمہ اکرم
(قلمکار، ڈراما نویس)

ا: اگر عہدِ رفتہ کو آواز دوں تو بارش کسی زمانے میں میرے دل کو بہت بھاتی تھی۔ یونیورسٹی لائف سے لے کر شادی سے پہلے تک بارشوں کو خوب انجوائے کیا۔ میں بارش کی ہلکی سی گن من میں اپنے گھر کی چھت پر برآمدے میں بیٹھ کر ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھی۔ شادی کے بعد اسلام آباد چلی گئی اور وہاں بارشوں کے بہت سے رنگ دیکھے۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر، مری کے بل کھاتے راستوں پر، نتھیا گلی کے دلکش نظاروں میں، ایبٹ آباد کی پُرسکون فضاؤں میں اور اس کے بعد جس بارش نے سب سے زیادہ مزہ دیا وہ تھائی لینڈ کے شہر بنکاک کی بارش تھی جو تقریباً روزانہ ہی .... ہوتی تھی۔ میں اور میاں اپنا، اپنا چھاتا سنبھالے روڈز پر بچوں کی طرح بھاگتے تھے لیکن اس کے بعد 2016ء کی آخری بارش پانچ اگست کو ہوئی جب میرے والد کو منوں مٹی تلے دفن کر کے آئے تھے۔ اس کے بعد بارش مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔

۲: اللہ نہ کرے حضرت امیر خسرو اس عہد میں زندہ ہوتے تو ہمیں ساون بھادوں بہت چلت ہے؟ اور اماں میرے باوا کو بھیجوری کے بجائے واٹس ایپ، سیل فون اور جدید ٹیکنالوجی میں رنگے ہوئے بے ڈھنگے گیت سننے کو ملتے۔ اس دور کی شاعری میں جو مٹھاس اور خوب صورتی ہے وہ موجودہ دور میں گلزار کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔

۳: ہمارے یہاں بارش اور پکوڑے لازم وملزوم ہیں' جب تک ہم اسلام آباد رہے بارشوں میں لانگ ڈرائیو کو خوب انجوائے کیا۔ میوزک کے ساتھ صاف ستھری سڑکوں پر گھومنے کا اپنا ہی نشہ تھا۔ سوندھی، سوندھی مٹی کی مہک دل ودماغ میں تازگی کا احساس بھر دیتی تھی۔ مجھے یاد ہے ہم لوگ اسلام آباد میں رہتے ہوئے اکثر پیر سوہاوا چلے جاتے تھے لیکن کراچی میں تو ایسا سوچنا بھی محال ہے۔ پچھلے سال کی بارشوں نے جو تباہی مچائی وہ ہم سب نے دیکھی اس لیے اس شہر میں رہتے ہوئے بارش کی دعا کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ چند گھنٹوں کی تفریح کے بعد گھنٹوں لوڈشیڈنگ کا عذاب اور پھر کیچڑ اور گندگی میں بارش کے ساتھ رومینس کرنے کی جرأت کم از کم مجھ میں نہیں۔

ثوبیہ خانم
(ٹی وی پروڈیوسر)

۱: جب بالکل فارغ ہوں تو اس سے اچھے طریقے سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے اور جب کہیں جانا ہو اور بارش کی وجہ سے نہ جا سکیں تو تھوڑا سا ناگوار گزرتا ہے۔

۲: آج کل ہوتے امیر خسرو تو بپ باپ یا ریپ (rap) ہی بناتے۔

۳: بھیگی بھیگی سڑکوں پر لانگ ڈرائیو پر جانا ہی پسند کرتی ہوں اگر ممکن نہ ہو تو دلنشیں موسیقی اور بلیک کافی کے ساتھ ٹیرس یا کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر لطف اندوز ہوتی ہوں۔

سدرۃ المنتہیٰ
(قلمکار)

۱: بارش ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہے لیکن جب بارش کی وجہ سے ہمارے شہر اور گلیوں کا نظام تھوڑا سا درہم برہم ہو جاتا ہے تو تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن بارش بنیادی طور پر بہت اچھی ہے اگر وہ اپنی بجلی نہ گرائے اور رحمت سے برستی رہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔

۲: عہدِ حاضر میں بھی وہ خسروی رنگ میں لکھتے جو اُن کا اپنا رنگ ہے، اصل رنگ ہے۔ میرے خیال سے ساون ان کے رنگ لکھتا؟

۳: بدلتے وقت کے ساتھ طریقۂ کار، خواہشات اور ردِّعمل بدل جاتا ہے۔ بچپن میں بارش میں نہانے اور بھیگنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ اب بارش کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ اس کو محسوس کر کے زیادہ لطف اندوز ہوتی ہوں۔

ثوبیہ ناز
(میچ میکر)

۱: مجھے بہت سی چیزیں صرف اس لیے پسند ہیں کیونکہ وہ میری امی کو پسند تھیں ان ہی میں سے ایک ساون کا موسم بھی ہے۔ بارش کی ابتدائی بوندیں جب کچی مٹی کو مہکاتی ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے جب یہ خبر ملتی ہے کہ حب ڈیم کے پانی ذخائر بھرنے لگتے ہیں تو بارش اچھی لگتی ہے بارش کبھی بری نہیں لگتی۔ صرف وہ نا اہل محکمے برے لگتے ہیں جن کی وجہ سے نظامِ زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بجلی، سیورج کا پانی سب کی تباہ حالی دیکھ کر شدید برا لگتا ہے۔

۲: اگر چچا امیر خسرو ہوتے تو کچھ یوں کہتے۔

کاہے کو بیاہا کراچی
یہاں موہے ساون ستائے
دن بھر لاگے گرمی
رات کو بجلی جائے
ہم تو بابل نہ ہی اے سی چلائیں
بجلی کا بل پھر بھی ہم کو ستائے

۳: سب سے پہلی اور روایتی تفریح تو پکوڑے ہیں۔ بارش ہو اور پکوڑے نہ بنائیں تو لگتا ہے گناہِ عظیم سرزد ہو

گیا ہے۔ میکے میں کافی کھلا صحن تھا تو وہاں آم کے شوقین بہن، بھائی بارانِ رحمت کے ساتھ، ساتھ آم سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔اب تو پہلی بوند گرنے سے پہلے ہی پاور بنک یو پی ایس کی بیٹری اور جنریٹر کا پٹرول چیک کرنے دوڑتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اب بالکل بھی بارش سے لطف اندوز نہیں ہونا چاہتی کیونکہ جس دن امی خالقِ حقیقی سے جا ملی تھیں، بہت ٹوٹ کر برسات ہوئی تھی۔

شائستہ الیاس
(ورکنگ وومن)

ا: بارش ہر دفعہ ہی اچھی لگتی ہے۔لیکن ہاں کچھ وقتوں میں ایسی جگہ رہائش رہی جہاں پکی چھتیں نہیں ہوتیں تو ایسے وقت میں بری لگتی تھی لیکن لفظ برا مناسب نہیں لگ رہا اس وقت امی دعا کیا کرتی تھیں یا اللہ تعالیٰ رحمت برسا۔یعنی بارش کسی کے لیے زحمت نہ بن جائے، بارش کسی کے لیے آزمائش نہ بن جائے کہ کسی کی چھت گر جائے۔ کسی کی فصلیں زیرِ آب آ جائیں۔ بارش ہر جگہ رحمتِ باراں ہی بن کر برسے۔جب بہت اچھی لگی تھی جب ٹور پر شمالی علاقہ جات گئی تھی۔ جہاں بھی بارش وہاں ہوئی بہت اچھی لگی، کالاش میں بارش مجھے بہت زیادہ رومینٹک، آئیڈیل بہت اچھی لگی۔ندیم کے جانے کے بعد میں بارشوں کو انجوائے نہ کر پائی۔ ان کی باتیں یاد آتی ہیں، میں ان میں گم ہو جاتی ہوں۔

۲: یہی کہتے۔ ایسا ساون برسائے آسماں
خطے میں ہو جائے امن واماں
برابر رنگ دھل کے مٹ جائے
ہو جائے ہر سو ایسا سماں

۳: پکوڑے اور گلگلے بنانا، چھت پر بارش میں نہانا۔

سسرال میں برسات کے پکوان بناتے ہوئے بہت مزہ آیا بارش ہوتے ہی میں اور میری جیٹھانی پلان بنانے لگتے ہیں کہ موسم کے لحاظ سے لنچ میں کیا پکائیں، بیسنی پراٹھے یا آلو بھرے پراٹھے، شام کی چائے کے لیے پکوڑے، گلگلے، کباب بنا لیتے ہیں۔ میرے لیے پُرلطف تفریح یہی ہے کہ چھت کی سہولت ہو تو بچے بڑے سب مل کر بارانِ رحمت میں نہائیں کہ بارش کے پانی سے بلائیں اور بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ پہلے میں بھی چھت پر بارش سے لطف اندوز ہوتی تھی لیکن فلیٹ سسٹم میں یہ سہولت نہیں تو پکوان بنا اور کھا کر ہی بارش کے مزے لے لیتے ہیں۔ باہر کے پروگرام بھی بنتے ہیں لیکن ساون کے سارے لطف ندیم کے بغیر بے لطف ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

قارئینِ کرام! سروے میں شریک تمام خواتین کے تاثرات پڑھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ بلاشبہ بارش دل میں ایک نئی امنگ، ترنگ، لگن، تڑپ اور طلب ہی کو جنم نہیں دیتی بلکہ خفتہ احساسات وجذبات کو بیدار کر کے عجب فرحت اور کیف بخشتی ہے۔لیکن وائے ناکامی جو بارش کے رنگ میں بھنگ ڈال دیتی ہے۔لیکن بارش کا مزہ کرکرا ہوتے دیکھ کر بھی اگر عہدِ حاضر میں امیر خسرو ہوتے تو یہی کہتے کہ

ماں میری دعا کرو ناں
دکھ کا ساون جلدی بیتے
سکھ نگری میں جیون بیتے
ساون بھادوں جب بھی آ
اپنے ساتھ بہاریں لائیں
بادل جب بھی گھر کر آئیں
جھولے ڈالیں خوشی منائیں
خسرو پیا کا کہا مانیں
ساون بھادوں رل مل گائیں (زرّیں)

سچ کہوں تو بارش کی رم جھم میں خود میری اپنی تفریح بھی بیتی یادوں کو اپنوں کے ساتھ دُہرانا ہے لیکن اس کے ساتھ، ساتھ برسات سے متعلق گیت سننے اور گنگنانے کا بھی اپنا ہی لطف ہے۔ برسات کے پکوان اس لطف کو دوآتشہ کر دیتے ہیں بارش کے پانی میں بھیگنا اسے محسوس کرتے ہوئے شعر گوئی کا الگ ہی حسن ہے۔۔دلی دعا ہے کہ بارش ہمارے لیے رحمتوں کا پیغام لائے اور اللہ بلدیاتی اداروں کے بااختیار افراد کو دیانتداری سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین بارش اہلِ زمین کے لیے آسمانی تحفہ ہے اور اس کی قدر دانی اس سے بھرپور لطف اٹھا کر ہی کی جا سکتی ہے۔

☆☆☆

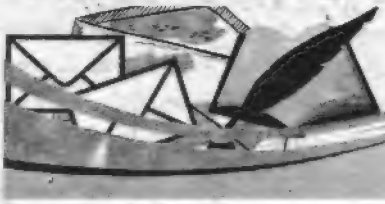

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:110

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

تمام حمد و ستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کُل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمۃ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ نہ صرف ہمارے وطن پاکستان بلکہ پوری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کردے، انسانیت کو امان ہو اور ہم بحیثیت مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں حقیقی معنوں میں بخشش و عنایات پائیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری پاکیزہ بہنو! سلام اور پُرخلوص دعائیں لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ جب تک آپ کے ہاتھوں میں شمارہ آئے گا تو عیدالاضحیٰ اگرچہ گزر چکی ہوگی لیکن پھر بھی ہماری طرف سے مبارک باد وصول کیجیے..... جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ عید ہمیں بہت بڑا پیغام دیتی ہے کہ قربانی صرف جانور کی نہیں بلکہ اپنی خواہشات کی قربانی بھی مطلوب ہے یقیناً ہماری پیاری بہنیں اس پیغام کو یاد بھی رکھتی ہوں گی اور عمل بھی کرتی ہوں گی۔ ساتھ ہی آپ سب کو جشن آزادی کی مبارک باد بھی دیتی چلوں کہ یہ آزادی حاصل کرنے کے لیے بھی بے شمار قربانیاں دی گئیں۔ اب ہم سب اہلِ وطن کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔

بہنو! آپ لوگوں نے جولائی کا شمارہ تو اب تک پڑھ لیا ہوگا اور میری اس بات کی تائید کریں گی کہ اس ماہ بیشتر کہانیاں بہت اعلیٰ میچ لیے ہوئے تھیں خصوصاً بشریٰ الطاف، ہما علی، نزہت جبیں ضیا، شیریں حیدر کی کہانیاں اور بھئی یہاں کس کا نام لوں اور کس کا نہیں کہ سب ہی رائٹرز نے کمال لکھا۔ اس دفعہ سینئر رائٹر عفت گل اعزاز نے بھی اپنی تحریر سے پاکیزہ صفحات کی رونق میں اضافہ کیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ بہت عرصے سے میں سلسلے وار ناول لکھنے والی اپنی رائٹرز کو مخاطب نہیں کرسکی ہوں تو اس دفعہ خصوصی طور پر یہ کہوں گی کہ تم لوگ بہت محنت سے اور بہت اچھا لکھ رہی ہو..... امید ہے دلشاد نسیم کی آمد بھی تمام پاکیزہ قارئین کو پسند آئی ہوگی۔ ان شاء اللہ خطوط کے ذریعے اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔ منفرد سلسلہ عورت کہانی تحریر کرنے والی فرحین اظفر نے جو گزشتہ کافی عرصے سے اپنی لاجواب تحریروں کے ذریعے پاکیزہ ٹیم کا حصہ بنی رہیں۔ اس سلسلے کی اپنی یہ آخری تحریر بھی بہت لاجواب لکھی۔ امید ہے فرحین تم آئندہ بھی ایسی ہی دلچسپ اور متاثر کن تحریروں کے ذریعے اپنی شمولیت جاری رکھو گی۔

بہنو..... مون سون کے موسم کا آغاز ہو چکا ہے تو آپ پوری احتیاطوں کے ساتھ اس خوب صورت موسم کو خوب انجوائے کریں اور فی الحال مجھے اجازت دیں۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی بشرط صحت و زندگی.....

اللہ نگہبان، دعا گو غذار رسول

ضروری اطلاع

قارئین عزیز..... نیوز پرنٹ کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ ایسے میں کاغذ کی دستیابی ناممکن حد تک دشوار ہو رہی ہے۔

ہمیں اپنے قارئین کے ذوقِ مطالعہ کا بے حد خیال ہے۔ آپ کا ہر دلعزیز پرچہ مقررہ وقت پر بک اسٹالز پر لانا ہے سو بحالت مجبوری ہمارے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا کہ صفحات میں کمی کردی جائے اور پرچہ وقت پر ہی آجائے تاکہ آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔ جتنا ممکن ہو سکا رسالے کو اسی انداز سے مرتب کیا گیا ہے بس کچھ مستقل سلسلوں کو وقتی طور پر روکنا پڑا۔ ان شاء اللہ اس بحران سے بھی آپ لوگوں کے تعاون سے ہم بخیر و خوبی نکل آئیں گے۔ آپ سب کی پُرخلوص دعائیں اور بھرپور ساتھ اس کڑے وقت میں یقیناً ہمارے لیے مددگار ہوگا۔

حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمیؑ اور تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارنین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ماہنامہ پاکیزہ سے گہری وابستگی رکھنے والی قاری بہن آسیہ عامر، کراچی خیر سے اب مصنفہ بھی بن چکی ہیں آج کل لاہور اپنے میکے گئی ہوئی ہیں۔ (اب آسیہ کوئی سفر کی کہانی بھی ساتھ لیتی آنا)

☆ درس و تدریس سے تعلق رکھنے والی پاکیزہ کی پرستار اور مصنفہ تنویر رؤف کی متاثر کن کتاب بعنوان زندگی خوب صورت ہے۔ 224 صفحات پر مبنی شائع ہوئی ہے۔ اس میں مصنفہ نے ایک استاد کی آپ بیتی کے ساتھ، ساتھ اپنی زندگی کے بیشتر بے حد خوب صورت یادگار اور سبق آموز واقعات قلم بند کیے ہیں۔ کتاب کا متن نہایت دلچسپی لیے ہوئے ہیں اور شروع سے لے کر آخر تک قاری سادہ زبان و بیان کے سحر میں جکڑا رہتا ہے۔ کتاب کا انتساب مصنفہ نے بہت جداگانہ انداز میں سانس ہوا، خوشبو اور خالق دو جہاں کے نام کیا ہے جس نے یہ خوب صورت زندگی عطا کی۔ کتاب کی قیمت صرف 500 روپے ہے اور کتاب کے حصول کے لیے اس نمبر پر 0300 2190973 رابطہ کرسکتے ہیں۔

پاک برٹش آرٹس ایک ادبی و فلاحی بین الاقوامی تنظیم ہے۔ جس نے تین سال قبل ناہید فاطمہ حسنین (ناہید عزمی) کو اپنا سندھ کوآرڈینیٹر مقرر کیا۔ اور اب ناہید عزمی کو ادبی و فلاحی خدمات کے نتیجے میں ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ آج کل ناہید عزمی اپنا ایوارڈ لینے لاہور گئی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی لاہور میں مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے ان کے اعزاز میں تقریبات اور شام منانے کا سلسلہ جاری ہے۔ (مبارک ہو ناہید)

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی، تبصرہ نگار، مصنفہ، سلمیٰ غزل آج کل اپنے بچوں سے ملنے امریکا گئی ہوئی ہیں۔ وہاں سے وہ باقاعدگی سے دعائیں، پیغام، سلام پاکیزہ بہنوں کو بھیجتی ہیں اور سب کی خیریت بھی دریافت کرتی ہیں، (سلمیٰ آپ ذرا اپنے سفر کی یادداشتیں بھی محفوظ کرتی رہیے گا۔ اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے، آمین)

☆ نعت خواں و مصنفہ سویرا فلک، کراچی کے صاحبزادے محمد حسان نے گزشتہ دنوں ایک نجی چینل پر بچوں کے پروگرام میں شرکت کی اور وہ بھی بحیثیت شیف..... (بہت خوب، اللہ تمہیں سویرا بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے، آمین)

سالگرہ مبارک

☆ جبین نیاز، نزہت اصغر، فصیحہ آصف خان، آمنہ حماد، انیلا عباس، معصومہ زہرا، نگینہ ضیا، فرح ریاض۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ مستقل قاری، تبصرہ نگار، شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور کے چھوٹے بھائی انعام خان کے لیے خصوصی دعائے صحت کی درخواست ہے کہ بھائی کی فکر میں فریدہ کی اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری و تبصرہ نگار اور نو آموز شاعرہ فرخندہ جعفری، گجرات کو بھی بہنیں ضرور دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل قاری، مصنفہ اور ہماری پیاری دوست ہما علی، اسلام آباد کی والدہ محترمہ کو ضرور دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ پچھلے دنوں آپ سب کے لیے اسلامی، اصلاحی اور اخلاقی مضامین مرتب کرنے والی پیاری سی ہستی اختر شجاعت کی طبیعت ہائی بلڈ پریشر کے باعث کافی ناساز رہی۔ الحمدللہ اب وہ بہتر ہیں اور اسی طبیعت خرابی میں انہوں نے رواں ماہ کا شمع ہدایت اسی محنت لگن اور خلوص کے ساتھ لکھا جو اُن کا خاصہ ہے۔ بہنیں اپنی خصوصی دعاؤں میں اختر بہن کو ضرور یاد رکھیں۔

☆ ہماری بزرگ قاری، مستقل تبصرہ نگار اور اپنی موثر شاعری سے قارئین کو محظوظ کرنے والی فریدہ ہاشمی نقشی، کراچی کی مکمل صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار فہمیدہ جاوید، ملتان کمر کے مہروں کی تکلیف میں مبتلا ہیں ان کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، مصنفہ عذرا آفتاب کی کمر میں ان دنوں کافی تکلیف ہے۔

☆ مصنفہ رعنا کوثر مقیم امریکا کی والدہ محترمہ کے لیے دعائے صحت کریں۔

☆ پاکیزہ بہنیں نگینہ ضیا بنگش، کراچی کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ پچھلے دنوں ان کی طبیعت کافی خراب رہی۔

بہنوں تمام مریضوں کی صحت یابی کے لیے دل سے خصوصی دعا کریں کہ جو اسپتالوں میں داخل ہیں یا پھر گھروں پر خصوصاً اس کورونا بیماری کی وجہ سے خرابیٔ صحت کا شکار ہیں۔ اللہ پاک سب کو صحتِ کلی عطا ہو، الٰہی آمین!

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری بہاول نگر کی پروین افضل شاہین کے نندوئی غلام حیدر خان پاکپتن میں انتقال کر گئے ہیں بہنوں سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

☆ اوستہ محمد، بلوچستان سے تعلق رکھنے والی پاکیزہ کی مستقل قاری اور نوآموز مصنفہ بختاور ابڑو کے والد محترم حاجی امام بخش ابڑو نے دائی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اللہ پاک مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اہلِ خانہ کو صبرِ عظیم عطا ہو، الٰہی آمین۔

☆ اس ماہ عذرا رسول کے بڑے بھائی مرزا نذر عباس کی اٹھارویں برسی ہے۔

☆ اس ماہ انجم انصار کے شوہر عبدالرب صدیقی کی پہلی برسی ہے۔

☆ عذرا رسول کی عزیز دوست اور پاکیزہ کی دیرینہ پرستار شائستہ اعجاز کے شوہر محمد اعجاز کی پہلی برسی کے موقع پر دعائے مغفرت اور فاتحہ خوانی کا اہتمام کیا گیا۔

☆ اس ماہ میری والدہ محترمہ کنیز صغریٰ کی برسی ہے۔

☆ مستقل پاکیزہ قاری و تبصرہ نگار، شاعرہ مصنفہ فصیحہ آصف خان، ملتان کی والدہ کی برسی اسی ماہ ہے۔

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل قاری و تبصرہ نگار، بہن حدیث اختر، بہاول پور کے بڑے بہنوئی خوشی محمد برضائے ربی انتقال کر گئے۔

☆ مصنفہ ریما نور رضوان، کراچی کی والدہ محترمہ انتقال کر گئیں۔ ریما نہایت غم میں ہیں، اللہ پاک ان کی والدہ کی مغفرت فرمائے اور ریما نور و اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا ہو، الٰہی آمین!

☆☆☆

بہنوں اب آیئے..... اپنے خطوط کی طرف.....

ﷺ تسمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ''آپ نے میرا افسانہ پھانس شائع کیا بہت شکریہ..... اس بار مکمل ناول بھیج رہی ہوں اگرچہ ناولٹ لکھا ہے، میرا خیال ہے مکمل ناول ہوگا کہ خاصا طویل ہے۔ عنوان ہے تحفہ..... اور یقیناً پاکیزہ کے قارئین کے لیے تحفہ ہی ثابت ہوگا۔ بڑے دل سے لکھا ہے۔ آپ بھی خوشی سے اور جلدی شائع کر دیں شکریہ۔ (جی ماہ ستمبر میں شامل اشاعت ہوگا ان شاء اللہ) اس بار تو پاکیزہ پر تبصرہ نہیں کر سکی کہ بہنوں کی محفل اور قانتہ کے انٹرویو کے علاوہ باقی ابھی پڑھا نہیں ہے۔ بہنوں کی محفل کا نیا انداز پسند آیا آپ کی باتیں اس سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ قانتہ کا انٹرویو صرف انٹرویو نہیں تھا اس میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ (جی بے شک) خدا اس کے قلم کو اور زیادہ زور دے کہ ہمیں شاہکار پڑھنے کو ملیں۔ آمین۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ)

ﷺ حمینا، کراچی سے آپی رسالہ زیادہ پڑھ نہیں پائی صرف چند کہانیاں پڑھیں جو دکھوں سے رقم کی گئی ہیں، جن میں عورت کہانی، آپا اور شریعت جرم ہے پڑھ کر اپنا دکھ اتنا بڑھا کہ اور نہ پڑھ پائی اس لیے اس بار تبصرے سے معذرت..... (تمہارے حالات پڑھے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہی کوئی بہتری کی سبیل نکالے۔ صبر اور دعا سے کام لو۔ ان شاء اللہ یہ مشکل دن بھی گزر جائیں گے)

ﷺ عظمیٰ مشتاق، نارووال سے۔ ''خیریت موجود خیریت مطلوب، دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد ہم پھر بہنوں کی محفل میں آدھمکے ہیں۔ (اچھا ہوا جلدی آگئیں) اس بار پاکیزہ خلاف توقع جلد مل گیا۔ عید سے پہلے عید ہوگئی جھٹ پٹ سارے کا سارا

پڑھ ڈالا ہے اب دوبارہ پڑھیں گے اگلے ماہ تک۔ یہ رنگ نہیں اترتا کیونکہ اب برسات میں تو اور رنگ لگے گا۔ نزہت جبیں کا اے دل نادان ٹین ایجر بچیوں اور خصوصاً ان ماؤں کے لیے آگہی ہے جن کی اولاد کے ساتھ ذہنی مطابقت نہیں ہوتی۔ آبلہ پا ہمارے معاشرے کی کہانی ہے۔ عورت کہانی آخری حرف ہی سے واقعی ابتدا سے انتہا تک کمال تھی۔ (مبارک ہو فرحین) عید ہم سب کی پڑھ کر اطمینان ہوا کہ بالآخر عورت ہی عورت کا آسرا بنتی ہے۔ بے درد پڑھ کر راشد پر ترس آیا۔ عائشہ تنویر کا نام ہی کافی ہے پسند آیا۔ فرح بھٹو کا افسانہ آخر تک اچھا لگا ہما علی نے خوب لکھا واقعی جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے، یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے، وہ خوشبو سی حمدان نے کمال مہارت سے حبہ کو تنبیہہ کی، شیریں حیدر کا انکل حقیقت سے قریب تر تھا۔ جب بات اپنے گھر پر آتی ہے تو ہی عزت اور غیرت یاد آتی ہے تم میری ہی رہنا، غزالہ کا آپا اچھا لگا، مریم کا جی لیں زندگی، پڑھا سکون کی آماجگاہ ہے یہ میکا..... شریعت جرم ہے پڑھ کر دکھ ہوا ایک معصوم بنت حوا زندگی کی بازی ہار گئی۔ معاشرے کی زبان کی کاٹ نے خاتمہ کر دیا۔ شاپنگ ہلکے پھلکے انداز کی نصیحت تھی۔ رحم دل بہنوں سے گزارش ہے کہ فریزر میں رکھا بھرا گوشت نکال کر پکائیں اور غریبوں کو کھلا دیں تاکہ فریزر بھی سکون کی سانس لے اور غریب بھی..... برا نہ منائیے گا....." (ارے پیاری بہنیں برا نہیں منا تیں..... تمہاری کہانی بھی لگ جائے گی قابلِ اشاعت ہو تو ضرور لگتی ہے چاہے دیر سے لگے)

سحر ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ "سب سے پہلے پاکیزہ کی پوری ٹیم کو بڑی عید کی عید مبارک قبول ہو۔ (خیر مبارک آمین) جولائی کا پاکیزہ دلکش ٹائٹل کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ البتہ سرورق کی حسینہ انگوٹھیوں کا اشتہار معلوم ہو رہی تھی۔ (ڈیزائن نوٹ کر لیں) اداریہ حسب معمول قابل توجہ باتوں کا مجموعہ تھا۔ عائشہ تنویر کا افسانہ نام ہی کافی ہے، فلسفیانہ قسم کا تھا۔ عجیب و غریب کہانی جو حقیقت سے بہت دور لگتی ہے اور انجام بھی متاثر نہ کر سکا۔ شائستہ زریں کا سروے مذاق میں بیوقوف بنانے کا مکمل دلچسپ تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ایک بار میں نے بھی رزلٹ والے دن اپنی دوستوں کو فرضی لسٹ بنا کر بھیج دی۔ جس سے کچھ دوست خوش اور کچھ اداس ہو گئیں۔ جن کے نمبر زیادہ لکھے وہ خوش ہو گئیں اور جن کے کم لکھے وہ اداس اور پریشان ہو گئیں۔ پھر بعد میں ان کا اصل رزلٹ بھیج دیا۔ مگر پھر بھی اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ عمل ٹھیک نہیں کیونکہ مذاق میں بیوقوف بنانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے جبکہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے مذہب میں تو یہ کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسروں کو صرف ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے تو یہ بھی ناپسندیدہ عمل اور گناہ ہے (درست کہا) گوشۂ ظرافت میں معروف مزاح نگار کرنل محمد خان کی کتاب بسلامت روی سے اقتباس پڑھنے کو ملے۔ مجھے صرف آخری اقتباس موٹی محبوبہ ایک طرح کا بونس ہے۔ متاثر کر سکا یعنی دانتوں کی نمائش پر مجبور کر سکا۔ جبکہ پہلے دونوں اقتباس سوا بند سو تھے۔ شمع ہدایت میں اختر شجاعت صاحبہ نے حقوق اولاد۔ حکم الٰہی پر مضمون لکھ کر تمام قارئین پر احسان عظیم کیا ہے کیونکہ اکثر افراد اپنی اولاد کے حقوق سے نابلد ہیں۔ بچوں کو دنیاوی تعلیم کے لیے بڑے ذوق و شوق سے تیار کر کے اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔ مگر دینی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور اولاد جب والدین کو حقوق کے سلسلے میں نظر انداز کرتی ہے تو پھر گلے شکوے کرتے ہیں۔ اختر شجاعت صاحبہ نے نوزائدہ بچے کے کان میں اذان دینے کا حکم تحریر کیا ہے تو اس سلسلے میں ایک مفتی صاحب کا فرمان بتانا چاہوں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ بچے کے کان میں اذان، نماز فجر والی دی جائے۔ (بہت خوب) مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ بچے کے کان میں اکثر عام اذان دی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مساجد میں نماز فجر میں نمازیوں کی تعداد کم ہوتی ہے..... اختر صاحبہ کے اس مضمون کے ذریعے حضرت بابا فرید الدین اور حضرت نظام الدین کی والدہ کے ناموں کا علم ہوا۔ اختر شجاعت صاحبہ یقیناً اس کے لیے مبارک باد کی مستحق ہیں جو ہر ماہ اتنی محنت اور عرق ریزی سے مضمون تیار کر کے پیش کرتی ہیں۔ اور قارئین کی دینی معلومات میں اضافہ کر کے اجر عظیم کی مستحق بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین) اور ان کے قلم میں اور بھی روانی عطا فرمائے۔ (پسندیدگی کا شکریہ) بزم میں اس بار بھی دلچسپ سوالات تھے اور

سانحۂ ارتحال

☆ مقبول و معروف مصنفہ محترمہ عنیزہ سید کے والد محترم سید منظور علی بخاری مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ مرحوم نیک اطوار کے مالک، صوم و صلوٰۃ کے پابند اور اپنے علاقے کی ایک ہمدرد اور معزز سماجی شخصیت تھے۔ ان کی وفات سے ان کے اہلِ خانہ سمیت تمام متعلقین غمزدہ ہیں، اللہ پاک مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ الٰہی آمین۔ ادارہ عنیزہ سید کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

جوابات تو بارہ مسالے والی چاٹ کا کام دیتے ہیں۔ میں اکثر گنگناتی ہوں... میں معیاری اشعار قارئین کے باذوق ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ اور پاکیزہ ڈائری کی تحریریں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ اپنا ارسال شدہ لطیفہ پڑھ کر اپنے ہی چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی۔ بہنوں کی محفل میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں شاید آپ کو وقت پر نہ ملا ہو یا پھر اس کی اشاعت کے لیے جگہ نہ بچی ہو۔ دیگر قارئین کے خطوط پڑھ کر ہی گزارہ کرلیا۔ (ارے دیر سے ملا پر چہ 16 کو تیار ہو گیا تھا) فریدہ جاوید فری کے بھائی اور شوہر کی ناسازِ طبیعت پر تشویش ہوئی ساتھ ہی سیمار رضا کی بھابی کی طبیعت کے ناساز ہونے کا پتا چلا اور لبنیٰ خیال کے بہنوئی، روحانہ اقبال کے شوہر اور عذرا آفتاب کے کزن کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اس کے ساتھ اجازت کی طلبگار رہوں۔ اس بار خط جلد تحریر کر رہی ہوں تاکہ آپ کو بروقت مل جائے کیونکہ اتنی محنت سے خط لکھا جائے اور پھر اس کو محفل میں جگہ نہ ملے تو دل اداس ہو جاتا ہے۔" (جی وہ خط بھی مل گیا مگر اب تو یہی لگتا ہے)

بھ نا ہید نعیم، ملتان سے۔ "میں عرصہ دراز سے بیمار ہوں لکھنا میرا لیے مسئلہ ہے اکتوبر 2020ء سے شدید بیمار ہوں۔ (اللہ آپ کو صحت سے رکھے پھر بھی ہمت جمع کر کے خط لکھا ہے شکریہ) 45 سال سے میں آپ کے بلکہ اپنے پاکیزہ کی قاری ہوں، آپ کی جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے "میں عشق ہوں" کب عامہ کی شادی ہوئی کب عمائم ہوئی، یہ سب کیسے ہوا مجھے سمجھ نہیں آسکا۔ (ارے ابھی سب سمجھ آجائے گا آپ ذرا غور سے پڑھیں) تو تاج محبت کا بہترین لگی، میں زیادہ نہیں لکھ سکتی میرے ہاتھ میں تکلیف ہے۔ ملتان کی گرمی ناقابلِ برداشت ہے۔ کہاں ایبٹ آباد کہاں ملتان آئندہ ہاتھ ٹھیک ہونے پر آپ کو کہانیوں پر تبصرہ ضرور لکھوں گی۔ (جی ضرور لکھیں) عذرا رسول بہن کو میرا سلام کہنا..... خط کافی مشکل سے لکھا اگر غلط لگے تو معاف کرنا" (عذرا آپی بھی آپ کی خیریت دریافت کرتی ہیں)

بھ یا کنیز کنول، پسرور سے۔ سرورق کی ماڈل ہما خان دوپٹے کے ساتھ پیاری لگ رہی ہے۔ حجاب کا اپنا ہی خوب صورت انداز ہوتا ہے۔ ماڈل نے ہلکا پھلکا میک اپ کیا ہے جس سے اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ اداریہ بجٹ اور عالمی مظالم کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ یعنی حالات حاضرہ کا بھرپور عکاس ہے۔ پسند آیا۔ اور سوچنے پر مجبور کر گیا۔ فرحین اظفر نے عورت کہانی ع عورت، ہم نام اچھی لگھی ہے۔ پاکیزہ کے مہمان اعظم فیاض اور اسد انور سے مل کر خوشی ہوئی۔ ان کی شادی بڑے خوب صورت انداز میں ہوئی اور محبت کو پانا بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے، اللہ جوڑے کو سدا سلامت رکھے۔ (آمین ثم آمین) افسانوں میں عیدی اور احساس ہی زندگی ہے پسند آئی..... شبینہ گل کی تحریر تو تاج محبت کا، بے حد اچھی لگی۔ فرح بھٹو کی تحریر چاہ کی راہ میں قابل تعریف ہے۔ باقی مستقل سلسلے تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔ شمع ہدایت کے کیا کہنے..... ہماری روحانیت کو تر و تازہ کر دیتا ہے یہ سلسلہ..... بزم پاکیزہ میں جگہ عنایت فرمانے کا شکریہ اور علامہ اقبال کے حوالے سے نظم کو شاملِ پاکیزہ فرمانے پر شکر گزار ہوں....." (آپ لوگوں کی نگارشات سے ہی پاکیزہ سجتا ہے)

بھ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ "اختر شجاعت صاحبہ کا کالم آج کل کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ معاشرے کی مادر پدر آزادی بلکہ ماؤں کی آزادی نے جو گل کھلائے ہیں اس کا اثر بالخصوص نوجوان طبقے پر پڑا ہے (جی ہاں) پاکیزہ ڈائری میں نگینہ ضیا بخش کا لکھا پسند آیا۔ ہمارے صدقات و خیرات صرف ماہِ رمضان تک محدود نہیں ہونے چاہئیں بلکہ سارا سال یہ خوب صورت عمل جاری و ساری رہنا چاہیے۔ (بالکل ٹھیک کہا) علامہ اقبال نے تو تصویرِ کائنات میں رنگ دیکھنے کی جو کاوش کی تھی، آج کے دور میں عورت اشتہار بن کر رہ گئی ہے۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ میری قوم کی بچیاں، بچے بس سحر خیزی کی عادت اپنائیں۔ بڑی عمر کے بزرگ تو یوں بھی عادی ہوتے ہیں جلدی جاگنے کے۔ کانوں میں فجر کی اذانیں آئیں تو سارا دن خوشگوار گزرتا ہے۔ (بے شک) باہر ملکوں میں ہم اذان کی آواز کو ترستے ہیں یہاں شکر اللہ کا کہ مسجدیں اس آواز سے گونجتی ہیں۔ میں اسکائپ پر اپنی بہو، بیٹے سے بات کر رہی تھی کہ اذان کی آواز آئی۔ میرے بچے نے اپنے بچوں کو بلایا آؤ سنو..... پاکستان میں اذان کی آواز آرہی ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ یہ پاک وطن ہمیں نصیب ہوا، آزادی سے زندگی گزر رہی ہے اللہ اس آزادی کو ہمیشہ قائم رکھے، آمین۔ سلسلے وار کہانیوں سے نبٹتے ہوئے آگے چل نکلے۔ کھٹی میٹھی عید سے متعلق، رمضان شریف سے متعلق افسانے اچھے لگے۔ کچھ سبق آموز بھی تھے۔ آج کل کی بچیوں کے لیے پاکیزہ ایک خوب صورت درس گاہ ہے، صرف بچیوں کے لیے نہیں بلکہ پختہ سال خواتین کے لیے بھی جنہوں نے اپنی بہوؤں کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔ (ارے کیا بات کہی بابا) بچیاں تو کچی عمر، کچے ذہن کی ہوتی ہیں، مائیں جو گھول کے پلا دیں وہی ان کی رول ماڈل ہوتی ہیں۔ گھر ایک گھر کو آباد پُرسکون رکھنے کے لیے صبر..... شکر ہی سے زندگی آرام سے گزرتی

ہے۔ اللہ تمام بیماروں کو شفا دے، آمین"۔ (بالکل ٹھیک کہا آخر بزرگ درگزر کریں گے تو جوان بھی سمجھ جائیں گے)

❁ حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ سے۔ "بہنو آج میں آپ سے ایک بات شیئر کرنے جارہی ہوں تبصرہ ان شاء اللہ اگلے ماہ..... رب کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر دنیا میں بھیجا ہے اور اسے انسانیت کا درس دے کر سب سے معتبر بنا دیا اور انسانیت کی خدمت کو اعلیٰ ترین عبادت قرار دیا۔ جو انسان اس مرتبے کو اپنا کر انسانیت کی خدمت کرتا ہے وہ نہ صرف اللہ کی نظر میں اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے بلکہ دنیا والوں کی نظر میں بھی باعزت ہوتا ہے..... ایسے ہی ایک عظیم انسان ڈاکٹر سہیل آصف ہیں جو نہ صرف ایک مستند ڈاکٹر ہیں بلکہ ایک مہربان اور ہمدرد دل رکھنے والے انسان بھی ہیں۔ یہ ہمارے علاقے تحصیل ٹیکسلا کے رہائشی ہیں۔ میرا ان سے واسطہ چند برس پہلے پڑا جب میں اپنے لاعلاج مرض میں مبتلا بیٹے کو لے کر ان کے پاس گئی..... وہ جس ہمدردی اور خلوص کے ساتھ میرے ساتھ پیش آئے اور ہر طرح سے میری مدد کا وعدہ کیا، وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ واقعی ایک مسیحا ہیں۔ انہوں نے میڈیکل تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے نہ صرف پاکستان بلکہ باہر کے ممالک سے بھی طب کی تعلیم حاصل کی ہے، ہر وقت نئی سے نئی معلومات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مالی لحاظ سے بھی مستحق لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ ایک نہایت قابل اور ہنس مکھ چہرے والے ڈاکٹر، لوگوں کو ایک فیملی کی طرح ڈیل کرتے ہیں۔ کورونا جیسی متعدی بیماری میں بھی اپنے مریضوں کا انہوں نے ساتھ نہیں چھوڑا اور ایس او پیز پر عمل کرتے ہوئے مریضوں کا علاج کیا۔ اللہ پاک ڈاکٹر سہیل آصف جیسے فرشتہ صفت مسیحا کو لمبی اور صحت مند زندگی عطا فرمائے، آمین۔" (یہ تو بہت اچھی بات ہے حمیرا اللہ پاک تمام معالجین کو ایسا ہی ہمدرد بنائے، آمین۔)

❁ مسرت عزت، شبقدر سے۔ "تو تاج محبت کا..... شبینہ گل نے بہت خوب صورت موضوع پر قلم اٹھایا اور نرسنگ کے شعبے سے تعلق رکھنے والی خواتین کی مشکلات اور مسائل کو اجاگر کیا کہ ان کو کیسی، کیسی نظروں اور کن، کن الزامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر ماہا نے اپنی ہمت اور حوصلے سے خود کو منوایا۔ تم ملے تو عید ہوئی کا موضوع پرانا تھا مگر حالات و واقعات دلچسپ تھے اس لیے بور نگ نہ لگی۔ آخری، اچھی تحریر تھی نشاط وقار نے بہت خوب صورت انداز میں سمجھا دیا کہ ہمیں ان مشکل حالات میں صرف اپنی خواہشات اور ضروریات کو نہیں یاد رکھنا چاہیے بلکہ مستحق لوگوں کے مسائل پر بھی نظر رکھنی چاہیے اور حتی الامکان ان کی مدد بھی کرنی چاہیے۔ (بالکل ٹھیک کہا مسرت) بچھڑے ہم سفر، شور، عید اور عیدی اچھی تحریریں اور دلچسپ بھی، میں عشق ہوں کو آپ فوراً سپنس ڈائجسٹ کے لیے شفٹ کروادیں پاکیزہ میں ذرا جچ نہیں رہی۔ عمامہ کا اتنا خطرناک انجام دل دہلا گیا۔ (اچھا بھئی یہ خوب کہا) ع عورت وہم نام..... واہ کیا بات ہے یعنی ایسا بھی ہوتا ہے اس دنیا میں..... (ارے کیا کچھ ہوتا ہے ارد گرد غور کرنے پر پتا چلتا ہے) تیرے آنے سے..... اسد عرف گولو کا احوال پڑھ کر بہت ہنسی آئی اور مزہ بھی آیا ہلکی پھلکی دلچسپ تحریر تھی ویسے یہ گولو نام ہے بڑا پیارا۔ چاہ کی راہ میں..... خوب صورت جارہی ہے تحریر اچھی ہے۔ اینڈ کا بے چینی سے انتظار ہے۔ (اب تو پڑھ لیا ہوگا ناں) میرا سارا زنگ اتار دو، پڑھنا شروع کر دو تو جیسے بندے کو جکڑ لیتی ہے یہ تحریر اور پھر اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ پاکیزہ کے باقی سلسلے بھی دلچسپ تھے۔ شمع ہدایت میں اس بار موضوع عورت تھا پڑھ کر بہت اچھا لگا، عورتوں کے لیے ہدایت کی بہت پیاری باتیں لکھی ہیں۔ اللہ ہم سب عورتوں کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے، آمین۔ انعم فیاض اور اسد انور سے ملاقات دلچسپ رہی حسن نکھارے، خوش ذائقہ، پاکیزہ ڈائری کی سب تحریریں دلچسپ تھیں۔ اب اختتام کرتی ہوں، تبصرہ شائع ہونے کی امید تو نہیں اس لیے کہ بہت لیٹ ہو گیا ہے اور اس کی وجہ پاکیزہ کا جلدی نہ ملنا ہے۔" (دیکھ لیں دو ماہ لیٹ تبصرہ آیا پھر بھی شامل اشاعت ہے، ہم ہر خط کو اہمیت دیتے ہیں اب جلد لکھنے کی کوشش کیجیے گا)

❁ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ "ماہ جون میں تبصرہ نہ دے سکی اس کی وجہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ میرپور آزاد کشمیر ضروری کام کے لیے گئی جونہی کار سے اتری تو دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ ماتھے پر چوٹ آئی۔ کافی خون نکلا۔ جگہ، جگہ چھوٹی موٹی چوٹیں آئیں مگر میرے مولا کا کرم ہوا کہ کوئی ہڈی نہ ٹوٹی۔ سب نے کہا کہ آپ صدقہ خیرات بہت کرتی ہیں۔ صدقہ انسان کو بڑی مصیبت سے بچاتا ہے تو میری تمام بہنوں سے درخواست ہے کہ کچھ نہ کچھ صدقہ ضرور کیا کریں۔ صدقہ ڈھال ہے۔ آپ سب کو بڑی عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ (اللہ پاک آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے۔ بے شک صدقہ رد بلا ہے) مجھے کچھ کہنا ہے مدیرہ نزہت اصغر صاحبہ آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ واقعی جب انصاف مٹ جائے تو برکت نہیں رہتی، ہمیں چاہیے کہ جہاں ہم دو گلاس پانی پیتے ہیں تو ایک گلاس کسی غریب کو دے دیں۔ یہ بھی صدقہ ہوگا۔ گھر کی موٹروں نے پانی نکالنا کم کر دیا ہے، پانی روز بروز نیچے جارہا ہے یہ نہ ہو اللہ نہ

کرے پانی زمین سے ہی نہ نکلے اس بات پر غور کریں رب سے گڑگڑا کر معافی مانگیں۔ پانی زندگی ہے، یہ نہ رہے تو زندگی بھی نہیں ہوگی اور نہ کوئی پانی پر لڑنے والا ہوگا۔ میرا سارا زنگ اتار دو..... افشاں آفریدی نے یہ ناول اتنی جان مار کر لکھا ہے کہ ہر کسی میں اتنی ہمت، طاقت اور علم نہیں ہوتا ہے اب بس تھوڑا سا زنگ رہ گیا ہے۔ (جی بالکل) افشاں آفریدی صاحبہ بہت مبارک ہو آپ نے جو بھی لکھا اچھا لکھا۔ آبلہ پا، فرحی نعیم..... کہانی بالکل حقیقت کے قریب ہے۔ تقریباً 90 فیصد گھروں میں یہی ہو رہا ہے مگر اس بات کو طول نہیں دینا چاہیے۔ اے دل ناداں..... نزہت جبیں ضیا بہت ہی سبق آموز کہانی ہے آج کل کی جوان نسل کے لیے..... ساری سوتیلی مائیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ دنیا میں ایسے، ایسے فراڈ ہو رہے ہیں کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا..... اس موبائل کے غلط استعمال سے بہت خرابیاں ہو رہی ہیں اللہ تعالیٰ بچوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (الٰہی آمین، درست کہہ رہی ہیں، بہن) نام ہی کافی ہے، عائشہ تنویر، کہانی سبق آموز بھی ہے اور مزاح بھی ڈائجسٹ کی وجہ سے صغریٰ بی بی کو اچھا گھر مل گیا اور دوسروں پر اپنی پڑھائی کی دھاک بھی بیٹھ گئی۔ چاہ کی راہ میں، فرح بھٹو..... ناولٹ کے دونوں حصے بہت سنوار کر لکھے ہیں، اچھی کہانی ہے۔ خواب غفلت سے جاگی ہوں ابھی، ہما علی..... آج کے دور کا انسان بے حس ہو چکا ہے، کوئی فوت ہوتا ہے تو لوگ افسوس کے بجائے اپنی، اپنی داستانوں میں مگن ہوتے ہیں جونہی جنازہ اٹھتا ہے تو کھانے پر ایسے ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے شادی ہو رہی ہو۔ تمام کہانیاں، ناولٹ اور دیگر تمام تحریریں بہت اچھے طریقے سے سنوار کر پاکیزہ میں ڈال دیں۔ ہر ماہ میری صحت کے لیے دعا کروانے پر شکریہ..... اللہ تعالیٰ تمام بیماروں کو شفا عطا کرے جو پیارے لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ تسنیم کوثر صاحبہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ جانیں سلامت رہیں ہر چیز مل جاتی ہے مگر جان نہیں۔ آپ کا لاکھ صدقہ کریں یا پیسے کسی غریب کو صدقے کے طور پر دے دیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

❁ نیر فہیم خان، کراچی سے۔ ''آپ نے میری میل اور خط کا جواب اتنے پیار سے دیا کہ انجم انصار آنی کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہی اپنائیت، وہی پیار، دل خوش ہوگیا۔ بچوں کے امتحانات کی وجہ سے رسالہ نہیں پڑھا۔ آپ کو یاد دہانی کے لیے میل کر رہی ہوں، میرے افسانے جو زیر مطالعہ تھے ان کے بارے میں بتا دیں..... میں منتظر ہوں۔'' (جی نیر یہی پاکیزہ کی خوبی ہے کہ آپ سب رائٹرز، ریڈرز ہمارے لیے قابل احترام ہیں، انجم انصار نے بہت اچھی طرح اپنی ذمے داری نبھائی، اللہ انہیں صحت سے رکھے، آپ کی تحریروں سے پاکیزہ صفحات سجتے رہیں گے جی قابل اشاعت ہیں)

❁ صبا آصف، کراچی سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے حسب معمول ہمیشہ کی طرح سوچ کے دروا کرتا ہوا بہت صحیح بات کہی آپ نے نزہت کہ قدرت نے اپنے خزانوں میں کمی نہیں کی مگر ہم انسانوں نے انہیں محدود کر دیا ہے اور موسموں کو زحمت بنا دیا ہے..... عذرا رسول کی باتیں ہم سے ہمیشہ کی طرح بہت اچھی اور بامعنی تھیں، انہوں نے بالکل صحیح کہا موبائل کا غلط استعمال خاص طور پر بچوں، بچیوں کے لیے انتہائی غلط ہے، اس سلسلے میں ایسے، ایسے تکلیف دہ واقعات سننے میں آئے ہیں، یہ سب میرے خیال میں والدین کی بے جا چھوٹ اور چشم پوشی ہے۔ واقعی رائٹرز کو ایسی کہانیاں لکھنی چاہئیں جس میں ان سب برائیوں کی طرف نشاندہی ہو، بہت شکریہ عذرا بہن، (جی بالکل ایسی تحریریں آج کی ضرورت ہیں) اتنے اہم اور تکلیف دہ مسئلے پر توجہ دلانے کا۔ سعدیہ ہما شیخ کو میری طرف سے چیئر پرسن مقرر ہونے پر، بہت، بہت مبارک باد..... اللہ تعالیٰ انہیں مزید اصلاحی کام کرنے کی توفیق دے اور ان اصلاحی کاموں میں کامیابی دے۔ افشاں آفریدی کے ناول میرا سارا زنگ اتار دو نے بڑا اچھا موڑ لیا۔ شیری اور زاویار کی شادی میں عکرمہ اور درکنون کی شرکت اور زاویار کو معاف کر دینے کا فیصلہ..... معاف کر دینے سے جس کو معاف کیا جائے اسے تو سکون ملتا ہی ملتا ہے لیکن معاف کر دینے والا بھی بہت سکون محسوس کرتا ہے۔ ہما علی کا افسانہ خواب غفلت سے جاگی ہوں ابھی ہمیشہ کی طرح بہت شاندار رہا بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ہم سب کچھ یاد رکھے ہوئے ہیں صرف مرنا ہی بھولے ہوئے ہیں، باقی افسانے بھی اچھے ہیں۔ ہما بیگ کی خوب صورت نظم دل کو چھو گئی۔'' (تبصرے کا شکریہ، آپ کی محبت کی قدر کرتے ہیں کہ چوٹ لگنے کے باوجود آپ نے وقت پر تبصرہ ارسال کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے۔)

❁ ثمینہ کوکب، ضلع جہلم سے۔ ''ہمیشہ کی طرح پاکیزہ کا جاذب نظر سرورق دل کو بہت اچھا لگا۔ دین کی باتیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی سے دل و روح کو سرشار کیا اور قیصرہ حیات صاحبہ کی اس بہترین کاوش پر ان کے لیے دل سے اجر عظیم کی دعا نکلی۔ بہت ہی خوب صورت و پُراثر اداریہ لکھنے پر نزہت اصغر صاحبہ آپ کو بہت مبارک ہو بھرپور طرز تحریر دلوں پر بہترین طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اختر شجاعت صاحبہ نے حقوق العباد..... حکم الٰہی بہت ہی پیارا لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد

کی صورت میں ایک بہت بڑی ذمے داری ہمارے سپرد کی ہے، دعا ہے کہ ہم اس ذمے داری کو اللہ پاک کے فضل وکرم سے بہترین طریقے سے ادا کرسکیں۔ بہت پیارا اور انمول موضوع چنا۔ اللہ پاک اختر شجاعت صاحبہ کو صحت وزندگی اور لمبی عمر عطا فرمائے اور وہ اپنی خوب صورت و پُراثر تحریروں سے ہمیں یونہی نوازتی رہیں، آمین ثم آمین۔ مذاق میں بیوقوف بنانے کا عمل شائستہ زریں صاحبہ کا سروے بہترین تھا۔ سروے میں شریک تمام شرکا کے خیالات بہت اچھے لگے۔ میرا سارا زنگ اتار دو، بہترین انداز میں آگے بڑھ رہا ہے اور پُرتجسس بھی ہے۔ میں عشق ہوں، بھی اچھا جارہا ہے۔ دلشاد نسیم صاحبہ کا صراط عشق کی پہلی قسط پڑھ کر لگتا ہے کہ ناول بہت زبردست طریقے سے اپنا مقام حاصل کرے گا۔ فرحین اظفر صاحبہ ع عورت ہی ہر ظلم بہت اچھا لگا۔ فرح بھٹو، چاہ کی راہ میں، دوسرا اور آخری حصہ اچھا لگا۔ خواب غفلت سے جاگی ہوں ابھی، ہما علی اور شیریں حیدر صاحبہ کا افسانہ انکل اچھا لگا کہ جب اپنے سر پر مصیبت پڑتی ہے تو پھر دوسروں کی مصیبت اور مشکل یاد آتی ہے، وہ خوشبوسی ایمیس جبار، مریم شہزاد، جی لیں زندگی، تسنیم منیر علوی، دکھ اوڑھتے نہیں اور بشریٰ الطاف شریعت جرم ہے، کے کیا کہنے..... عید ہم سب کی عنبرین ابدال..... نام ہی کافی ہے، عائشہ تنویر، آبلہ پا، فرحی نعیم، اے دل ناداں، نزہت جبیں ضیا، شانگ، فرحت جبیں اور نا ولٹ تم میری ہی رہنا، شاہین ملک اور بے درد، عفت گل اعزاز اور غزالہ عزیز صاحبہ، آپ سب افسانے و ناولٹ اپنے، اپنے مقام پر بہت بہترین اور سبق آموز تھے۔ کچھ باتیں اپنی بہنوں سے میں عذرا آپی کی باتیں اور نوجوان نسل کو صراط مستقیم دکھانے کی ہدایت اپنی تحریروں سے جو تمام لکھاری بہنوں کو کی گئی ہے لگتا ہے اپنے ہی دل کی آواز ہے، عذرا آپی اللہ پاک آپ کو صحت وزندگی ولمبی عمر عطا فرمائے اور آپ اپنے پاکیزہ رسالے کے ذریعے ہماری رہنمائی کرتی رہیں۔ پاکیزہ کے باقی تمام سلسلے روحانی مشورے، گوشہ ظرافت، خوش ذائقہ، پاکیزہ ڈائری، میں اکثر گنگناتی ہوں، حسن نکھارے، بزم پاکیزہ، خاص طور پر بہنوں کی محفل سب سلسلے بہت اچھے ہیں، اللہ پاک پاکیزہ بہنوں کی محفل میں سب بہنوں کو صحت وزندگی اور خوشیاں عطا فرمائیں، آمین۔" (بہت پیارے تبصرے کا شکریہ اور دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

بھ افتخار شوق، میاں چنوں سے۔" پاکیزہ تو خوب اچھا جارہا ہے، ایک سے ایک لکھنے والیاں بڑی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہیں؛ آج کل چھٹیاں ہیں اور مجھے بھی لکھنے کا جنون چڑھا ہوا ہے، ویسے تو آفیشل میٹنگز چلتی رہتی ہیں، (جی ضرور لکھیں) سو مصروفیت تو رہتی ہے، ہر ماہ پاکیزہ ذوق وشوق سے پڑھتی ہوں بلکہ میرے ملازمین، سارا اسٹاف، بہنیں، بھانجے، بھانجیاں بلکہ پورا میاں چنوں ہی میرے پاکیزہ سے عشق سے واقف ہے، (بہت خوب جناب) اور جس شمارے میں میرا نام نہ ہو تو بس یوں سمجھیں کہ پُرتکلف دعوت ہو اور بریانی نہ ہو ہاہاہا..... (کیا مثال دی ہے بھئی)۔ عذرا صاحبہ کا بہت شکریہ، ہمیں سراہتی ہیں اور کتاب کا بھی شکریہ ادا کیا۔ (عذرا آپی تو اپنے پاکیزہ مصنفین اور قارئین کی سب سرگرمیوں سے آگاہ رہتی ہیں) میری ایک تجویز ہے کہ ہر شہر میں پاکیزہ کے نام سے کوئی پوائنٹ بنادیں کہ پاکیزہ ہاسٹل، ریسٹورنٹ یا پھر کوئی ہر ماہ یا چھ ماہ میں ایک گیدرنگ جس میں دور والے بھی شریک ہوپائیں۔" (واہ کیا تجویز دی ہے سوچیں گے، پاکیزہ ٹیم اور سب بہنوں کو دعائیں۔" (بہت شکریہ افتخار پیارے سے خط کا)

بھ پروین الفضل شاہین، بہاول نگر سے۔" اس بار پاکیزہ جلد ہی مل گیا اس لیے آج دس تاریخ کو تبصرہ لکھ رہی ہوں، (اچھا ہوا ناں) سرورق پر سحر پیاری لگ رہی تھی۔ دین کی باتیں اور شمع ہدایت پڑھ کر روح کو سرشار کیا۔ مجھے کچھ کہنا ہے، میں باجی نزہت آپ نے درست فرمایا ہے کہ موسم گرما عروج پر ہے ایک طرف قدرت کی عنایات عروج پر ہیں اور دوسری طرف انسانی ناشکری کی انتہا ہے۔ آپی عذرا نے فرمایا کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے اس دور میں جہاں بہت سے اچھے کاموں کی تشہیر ہوتی ہے اور مسلسل ترغیب دی جاتی ہے اور وہاں برائیوں کی تشہیر بھی اپنے عروج پر ہے جو یقیناً ہم سب کے لیے انتہائی خطرے کی گھنٹی ہے، جی آپی جی..... ان شاء اللہ بہنیں اپنے قلم کی طاقت سے برائیوں کے خوفناک انجام سے ضرور آگاہ کریں گی (ہاں بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے) مذاق میں بیوقوف بنانے کا عمل اس سروے میں بہنوں نے دلچسپ واقعات سنائے جنہیں سن کر مزہ آگیا۔ پاکیزہ ڈائری میں سباس گل، ماہ نور، فصیحہ آصف خان، شازیہ ہاشم میواتی، فرخندہ جعفری، ساجدہ ظفر، حمیرا انجم وحید، میں اکثر گنگناتی ہوں میں ایمن زرناب، عرشیہ جنید، صبا نور، ماہین چغتائی رہیں، بزم پاکیزہ میں میمونہ اشرف اور جیہا کو انعامات ملنے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ فریدہ ہاشمی، تسنیم کوثر، میری نگارشات پسند فرمانے کا بے حد شکریہ..... میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت میں جگہ دے اور میری آپی فریدہ جاوید فری ان کے بھائی اور ان کے شوہر کو اور سب بیماروں کو شفا دے آمین۔" (بہت شکریہ مختصر تبصرے کا)

بھ نازنین آفریدی، پشاور سے۔" جولائی کا پاکیزہ میرے ہاتھ میں ہے۔ ہمیشہ کی طرح بہنوں کی محفل سے آغاز کیا۔ سب

کی خیریت پتا چلی، اچھا لگا، یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ کسی بہن کی طویل غیر حاضری پر عذرا آنٹی فکر مند ہو جاتی ہیں۔ (بالکل جی) یہ بہنوں سے ان کی محبت ہے۔ میری سالگرہ کی خبر آپ نے لگائی جنہوں نے مبارک باد دی۔ ان کی شکر گزار ہوں..... جمع ہدایت پڑھا۔ اس موضوع پر میں مضمون پڑھنا چاہتی تھی۔ حقوق اولاد پر اچھا لکھا تھا لیکن اختر شجاعت آنٹی مجھے بہت کچھ اس میں کمی محسوس ہوئی۔ ماں، باپ صرف یہ ہی جانتے ہیں کہ ان کے قدموں کے نیچے جنت ہے اور اس جنت کے حصول کے پیچھے بعض اوقات اولاد کو دنیا میں ہی پل صراط سے گزار دیتے ہیں۔ ان کو صرف یہ ہی دھمکی معلوم ہے کہ ''ورنہ میں دودھ نہیں بخشوں گی۔'' اور یہ دودھ بخشوانے کے لیے اولاد کس اذیت سے گزرتی ہے کیا اس کے لیے بھی کوئی وعید ہے، میری نظروں سے ایک ایسی لڑکی بھی گزری ہے جو اپنے گھر سے صرف اور صرف اپنی سگی ماں کے رویے، الزام تراشیوں اور بہتان طرازیوں کی وجہ سے بھاگ گئی تھی۔ کیا اولاد کو اس نہج پر پہنچا دینے کے لیے بھی کوئی باز پرس ہوگی؟ (اللہ رحم کرے) پچھلے دنوں امام کعبہ جناب سدیس عبدالرحمن صاحب کا ایک واقعہ نظر سے گزرا جس میں انہوں نے تنبیہ کی والدین کو کہ اولاد کے معاملے میں اللہ سے ڈریں۔ آج کل مائیں جانے کہاں، کہاں کی فرسٹریشن اولاد پر نکالیں گی۔ والدین، اولاد کو وہ محبت اور عزت نہیں دیتے جن کی وہ حقدار ہے اور جب حقوق کی بات آئے تو بس حقوق ہی یاد ہیں، بہت ساری بہنیں مجھ سے اختلاف کریں گی۔ ضرور کریں، یہ میری ذاتی رائے ہے جو کہ مشاہدے کی بنیاد پر ہے مگر بیٹا، بیٹی میں فرق بھی تو بہت عام بات ہے، باقی مستقل سلسلے بھی بہترین رہے، امید ہے اب جلد کسی رائٹر کا انٹرویو بھی پڑھنے کو ملے گا۔ (جی ضرور) ناولوں اور افسانوں کی بات کی جائے تو ..... میرا سارا رنگ اتار دو، ٹھیک وقت پر ختم ہو رہا ہے، درمکنون کا رنگ اتر گیا ہے اور اب زندگی کی طرف بھی لوٹ رہی ہے، شیریں آنٹی کا انکل تمام افسانوں میں مجھے بہترین لگا اور آپ نے جو کہا کہ ایک اور بڑی رائٹر کا ناول اسٹارٹ ہونے والا ہے، پاکیزہ میں..... مجھے تو شیریں حیدر ہی لگتی ہیں، شیریں حیدر آنٹی کا پوسٹل ایڈریس مل سکتا ہے۔ (آپ پاکیزہ کے ایڈریس پر خط لکھ سکتی ہیں) میں عشق ہوں، اف بہت بہترین، صرف اس کہانی کی وجہ سے مجھے پاکیزہ کا شدید انتظار رہتا ہے اور اب تو بہت حد تک کھل بھی گئی ہے۔ صراط عشق کی پہلی قسط ہے۔ فی الحال نہیں کہا جا سکتا ہاں مگر اس کا نام رقص جنوں ہی رہتا تو شاید زیادہ appealing رہتا۔ (ڈیئر ریڈرز کی بھی وجہ تھی) نزہت جبیں آنٹی کی کہانی بالکل ان کی پچھلی کہانی جو مئی میں شائع ہوئی تھی۔ اسی کا پارٹ ٹو لگی۔ وہی لڑکی کا ہواؤں میں اڑنا اور حقیقت سے سامنا ہونے پر واپس زمین پر آجانا۔ (دیکھو آج کل یہی ہو رہا ہے مگر یہاں سوتیلی ماں کے اچھے روپے اور سیکھلی کے دھوکے پر فوکس تھا۔) شاپنگ میں اچھا پیغام دیا گیا۔ واقعی کچھ لوگ ہلڈنگ کھڑی کرنے کو نہیں بلکہ پیٹ کی آگ بجھانے کو کماتے ہیں۔ کورونا کے حوالے سے بھی ایک تحریر نظر سے گزری..... اف..... تنگ آ گئے ہیں اب تو یہ کورونا سن، سن کر اللہ اس کو جلد ختم کر لے۔ (بیٹی دعا تو ہے مگر اس سے کس، کس انداز سے لوگ متاثر ہو رہے ہیں اس کا بیان بھی ضروری ہے) عفت گل اعزاز کی تحریر کے لیے کہوں گی کہ میں نے مرد شریف تو دیکھے ہیں مگر اس حد تک دبو اور کمزور نہیں جتنا راشد کو دکھایا گیا۔ رسالہ میں تقریباً پورا ہی پڑھ چکی ہوں، باقی کی تحاریر بھی کچھ مناسب اور کچھ شاید اس سے بھی بہت کم تھیں۔ بہر حال اگر فرداً فرداً ہر ناول اور افسانے پر تبصرہ کرنے لگوں تو شاید آپ کو چھاپنا مشکل ہو جائے۔'' (ہاں ٹھیک کہا باقی آئندہ لکھ لیتا۔ تبصرے کا شکریہ)

شفا سعید، کوئٹہ سے۔ ''جولائی کا پاکیزہ تین تاریخ کو مل گیا۔ (الحمدللہ) ٹائٹل پر موجود ماڈل سحر کی آنکھوں کا میک اپ پسند آیا۔ ماڈل نے ڈھیر ساری انگوٹھیاں انگلیوں میں سجا رکھی ہیں، مجھے وہ ٹائٹل بے حد پسند آتے ہیں جس میں ماڈل نے ہیوی جیولری پہنی ہو اور جو فیشن میں ان ہو۔ اس بار کا ٹائٹل ماڈل کی انگوٹھیوں کی وجہ سے پسند آیا۔ نزہت میم آپ نے پانی کے مسائل کے حوالے سے بات کی، میں سو فیصد متفق ہوں اور پانی جیسی انتہائی بنیادی شے سے بھی جو قوم محروم ہو اور مسائل کا شکار ہو تو اس قوم سے پھر یہ توقع کیسے کی جائے گی کہ وہ چاند اور مریخ پر بھی جائے گی جہاں باقی دنیا پہنچ چکی ہے۔ (جی یہی صحیح حقائق ہیں) اس کے بعد سب سے پہلے بہنوں کی محفل کی طرف دوڑ لگائی۔ میری ابھی تک عذرا میم سے بھی براہ راست بات نہیں ہوئی پر جانتی ہوں کہ وہ کتنی اعلیٰ شخصیت ہیں، ایک حسرت سی دل میں جاگتی ہے کہ ایک وقت آئے اور میں ایسی لکھاری بن جاؤں کہ میرا نام بھی عذرا میم جانیں اور میرا کام بھی اور پھر جس طرح وہ رائٹرز کے نام لے کر تعریف کرتی ہیں میری خواہش ہے میرا بھی نام لیں۔ (ضرور پوری ہوگی، اس کے لیے رائٹر بننا ضروری نہیں..... وہ اپنی قاری بہنوں کا بھی خوب محبت سے تذکرہ کرتی ہیں۔) یہ کیا کہہ دیا کہ افشاں آپی اور نایاب آپی دونوں کے ناولز ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ میرا تو پریشانی سے برا حال ہو جاتا جو اگر صراط عشق نہ پڑھتی۔ (ارے اب ایک ناول کو ختم تو ہونا ہوتا ہے، اب اس نئے ناول سے محظوظ ہوں) اس تحریر میں بہت کچھ ہوگا مگر مجھے پہلی ہی قسط میں سی ایس ایس اور اس سے جڑی بہت سی

باتوں نے مزہ دیا۔ مجھے ایسی کہانیاں بے حد پسند ہیں جس کے ہیرو اور ہیروئن بہت انٹیلکچوئل ہوتے ہیں۔ پہلی قسط میں دلشاد نسیم آپی کا اندازِ تحریر سو، سو لگا لیکن تحریر کا موضوع بہت جاندار لگا۔ پہلی ہی قسط نے توجہ حاصل کر لی ہے۔ (شکریہ، آپ کو پسند آیا) .... اس کے بعد میرا سارا زنگ اتار دو، پڑھا اور شہرین پر ٹوٹ کر پیار آیا کہ جس نے زاویار اور درمکنون کی بہتری کے لیے ایک قدم اٹھایا۔ عکرمہ اور شہرین کہانی کے دو خوب صورت کردار ہیں، افشاں آپی آپ کی کہانی کا موضوع اور درمکنون کا کردار تو لاجواب ہے ہی ساتھ کہانی کے مکالمے بھی بہت جاندار ہوتے ہیں میں بہت مس کروں گی آپ کے اندازِ تحریر کو..... (ان شاء اللہ افشاں آفریدی آئندہ بھی تحریر جلد ہی دیں گی) اس کے بعد میں عشق ہوں، پڑھی۔ عمامہ کے ہر دکھ پر میری آنکھیں ہی نم ہو جاتی ہیں، مجھے شام کا فیقہ سے شادی کا فیصلہ ہی غلط لگا جب وہ جانتا تھا کہ عمامہ بھی اسی گھر میں رہتی ہے تو اسے فیقہ سے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے نہ وہ فیقہ سے شادی کرتا نہ وہ سب ہوتا جو عمامہ کے ساتھ ہوا۔ عمامہ کا ہیرو ہی اس کی تباہی کی وجہ بنا۔ جبکہ عمائم پر قسمت مہربان ہے اس کا ہیرو بڑا سمجھدار اور حالات کو اپنے حق میں بدلنے والا بندہ ہے۔ نایاب جی ویسے تو آپ کی کہانی سو پر ڈو پر ہے لیکن کرن کی موت اور اب جامعہ کی طالبات پر ہونے والا دھماکا یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کے پیچھے کون ہے، آپ یقیناً وضاحت تو دیں گی آگے چل کر میرا تو تجسس سے برا حال ہے۔ (اسی دلچسپی سے پڑھتی رہو اور محظوظ ہوتی رہو) چاہ کی راہ میں از فرح بھٹو کہانی کا دوسرا حصہ بھی اچھا لگا گو کہ موضوع پرانا تھا مگر اندازِ تحریر نے اسے خوب صورت بنا دیا۔ ویلڈن فرح جی۔ عورت کہانی میں ع عورت ی یروشلم از فرحین اظفر کہانی بے حد پسند آئی۔ فرحین جی آپ نے عورت کہانی کے سلسلے میں یوں تو تمام ہی کہانیاں اچھی لکھی ہیں مگر کچھ میں آپ نے قسم سے کمال کیا ہے۔ عورت کی نفسیات پر اس درجہ عبور پر میں کبھی، کبھی حیران ہوتی ہوں کہیں آپ ماہر نفسیات تو نہیں ہیں؟ اور آپ کی ان تحریروں میں بعض جگہ اس قدر خوب صورت جملے تھے کہ جو دماغ کی گرہیں کھول دیتے ہیں۔ آپ کو کامیاب عورت کہانی کے سلسلے کو مکمل کرنے پر مبارک باد..... (جی بالکل، فرحین نے نہایت محنت اور دقیق مشاہدے سے اس سیریز کو مکمل کیا جس نے واقعی بہت پسندیدگی حاصل کی) ناولٹ میں یوں تو سب اچھے ہیں مگر مجھے آپا بے حد پسند آیا۔ اور افسانوں میں بھی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے مگر موضوعات کے اعتبار سے نام ہی کافی ہے از عائشہ تنویر بے حد پسند آیا۔ بعض اوقات روایتی کہانیوں سے ہٹ کر لکھی گئی کہانی بے حد ... مزہ دیتی ہے۔ نرگس ڈائجسٹ پڑھنے والی صغریٰ بی بی ہمیں بھی پسند آئی اور دوسری تحریر شاپنگ از فرحت جبین پسند آئی۔ میں پھر سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے تمام افسانے اور ناولٹ پسند آئے کیونکہ ہر رائٹر نے اپنا بیسٹ دیا ہے مگر بات پسند اور تقابل کی ہو تو مجھے وہ اچھے لگے ہیں جس کا میں نے ذکر کیا ہے، میں جانتی ہوں کہ تعریف مصنف کے لیے ٹانک کا کام کرتی ہے وہ اور بہتر کی طرف سفر کرنے لگتا ہے۔ (جی بالکل) اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ پاکیزہ میں انہی رائٹرز کی کہانیاں لگتی ہیں جو باکمال ہوتے ہیں۔ لہٰذا پاکیزہ جولائی کے شمارے میں جن، جن بہنوں کی تحریریں لگی ہیں سب کے لیے بہت داد اور دعائیں..... اس دعا کے ساتھ اجازت دیں کہ اللہ پاکستان کو ایسا بے مثال ملک بنا دے کہ جس کی مثالیں دشمن بھی دے اور ہم سب پوری قوم کو اس میں اپنا، اپنا حصہ ڈالنے کی توفیق دے۔" (بہت پیارے تفصیلی اور تجزیاتی تبصرے کا شکریہ آخر میں تم نے بہت پیاری دعا دی..... جو بھی اچھا لکھے گا قارئین پسند کریں وہ قابل تعریف ہے اس میں کسی پر کسی کو کوئی امتیاز نہیں سب ہی قابل ستائش ہیں الحمدللہ)

✍ فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی سے۔ "جولائی کا رسالہ مل گیا۔ ماشاء اللہ بہت خوب صورت معیاری رسالہ ہے۔ میرے خیال سے معیاری میں دو باتیں ضروری ہیں، رسالے میں گھر کے سارے افراد کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور ہو۔ اس سلسلے میں ترجمہ قرآن بھی موجود ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام گرامی بھی، روحانی مشورے بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر بہن اختر شجاعت کا پُرمغز مقالہ بھی۔ بہترین افسانے اور ناول بھی موجود ہیں جو کہ معیاری ادب کی دوسری خصوصیت پر پورے اترتے ہیں۔ یعنی کہانیوں میں کوئی مثبت پیغام ہو اور ہماری قابل تعریف بہنیں اپنے افسانوں کے ذریعہ بہت عمدہ پیغام دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ (بہت شکریہ پسندیدگی کا) افشاں آفریدی کے ناول میں پہلے تو عکرمہ کا کردار ہی بہترین معلوم ہوتا تھا مگر اب شہرین کا کردار بھی بہت اچھا لگا۔ شوہر کے دل کے سکون کے لیے پورے خلوص اور خاموشی سے کوشش کر رہی ہے۔ واہ..... نایاب جیلانی کا ناول اب سمجھ میں آنے لگا ہے، کہ یہ ماضی اور حال دونوں کی کہانی ہے۔ دلشاد نسیم کی شروعات بہت دلچسپ ہے، امید ہے کہ آئندہ بھی یہ ناول اچھے پیغامات لے کر آئے گا۔ بشریٰ الطاف نے کمال کا افسانہ لکھا ہے۔ واقعی اس معاشرے میں شریعت جرم ہے۔ باقی جو جی چاہے کرتے رہو۔ فرحین اظفر ہمیشہ، ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں اس بار بھی عورت کہانی میں ی یروشلم بہت اچھا لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کے دور میں بھی ایسا کیسے ہوتا ہے۔ اتنی سنگدلی

عورت کی اتنی بے حرمتی..... سب لوگ جانور بلکہ درندے بن گئے تھے، اُف..... فرحت جبین کی مختصر کہانی میں بہت خوب صورت، مثبت پیغام ہے۔ عنبرین ابدال کی کہانی بہت سبق آموز ہے، غزالہ عزیز کا آپا بہت اچھا لگا۔ کیسی آزمائشوں اور کڑی جدوجہد کی کہانی ہے۔ فرح بھٹو نے ناول کا انجام بہت اچھا کیا۔ ہاں انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے۔ ہما علی کا خواب غفلت آنکھیں کھول دینے والا افسانہ ہے، شیریں حیدر کا انکل پڑھ کر خوف سے دل کانپ گیا۔ ہمارا معاشرہ کس طرف جا رہا ہے۔ آمنہ جبار نے خوشبو کے بارے میں لکھا ہے۔ ایک ایسی بات کی طرف توجہ دلائی ہے جس پر بہت کم نظر جاتی ہے۔ عفت گل کے ناولٹ نے دل کو دکھی کر دیا۔ مریم شہزاد نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ میکے میں اگر عزت افزائی اور قدردانی ہو تو اس کا سارا کریڈٹ اس عورت کو جاتا ہے جس کو ہم بھاوج کا نام دیتے ہیں۔ حرا نے بہت خوب صورت پتے کی بات کی ہے۔ ماہ نور مغل کا نایاب ہیں ہم..... شگفتہ کا فیشن کے بارے میں..... ہما بیگ کی دعا غرض پاکیزہ ڈائری کی ہر چیز نہایت عمدہ ہے، اداریہ بے مثال ہے۔ اختر بہن نے اولاد کی تربیت کے بارے میں بہت بہترین الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔ خدا کرے مائیں عمل کریں۔ اور دین کی طرف توجہ دیں، آمین۔ میرا نام بھی نظر آیا بہت شکریہ اس عزت افزائی پر..... سب پیاروں کے لیے صحت کی دعا کرتی ہوں، ساری پاکیزہ بہنوں کے لیے نیک خواہشات اور سلام.....'' (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ ..... آپ اچھی شاعری کرتی ہیں تو نام تو آئے گا ناں)

ہیلو فہمیدہ فرخندہ جاوید، ملتان سے۔'' کافی دنوں بعد لکھ رہی ہوں تو سالگرہ سے شروع کرتی ہوں کہ سالگرہ نمبر کا سرورق ہر لحاظ سے لاجواب تھا اور تم نے بڑی محنت کی سالگرہ نمبر میں اور میرا مواد بھی لگایا (ارے آپ کی نگارشات اتنی اچھی جو تھیں)۔ میرا ذکر کیا اتنی شدید خوشی ہوئی۔ بڑی نوازش۔ اداریہ کا layout کا پسل والا انداز نیا اور پیارا لگا۔ شائستہ مناسب ہو تو اپنا سروے کا انداز بدل لیں ہاں شائستہ انٹرویوز تو اچھے کرتی ہیں۔ نزہت تم نے قانتہ کا انٹرویو اچھا لیا۔ مئی کا سرورق بھی لاجواب و پیارا سا اور جاذب سا اور اندر عنیزہ کی کہانی بھی اچھی لگی۔ زرتاشیہ نعمان رائٹر و تبصرہ نگار کو میرا سلام دینا اور کہنا فہمیدہ کی دعاؤں میں وہ شامل ہیں اور فہمیدہ، زرتاشیہ کی محبتوں کی مقروض ہیں ان کے دونوں افسانے مجھے بہت پسند آئے۔ جو مارچ اور جولائی میں لگے تھے (چلو زرتاشیہ خوش ہو جاؤ) معذرت پاکیزہ کے سلسلوں میں میری رائے کے مطابق کوئی نئی چیز کی تبدیلی کرو۔ (جی ضرور) نزہت محفل میں ایٹ لیسٹ ایک خط تو تبصرے والا تفصیل سے لگایا کرو جس میں ہر تحریر اور سلسلے پر تفصیل سے تبصرہ ہو۔ یہ نہیں کہ خط میں چند کہانیوں پر بول کر خط ختم (ارے فہمیدہ اتنے بڑے، بڑے خطوط تو لگتے ہیں پھر اور سلسلوں کو کہاں سے جگہ دیں ہر بہن کا تفصیلی خط نہیں لگ سکتا) پاکیزہ کے صفحوں کا رنگ برائٹ کروا دو اچھا کوالٹی کا صفحہ لگے۔ میرے خیال سے طباعتی شعبے پر غور کروایا جائے۔ (بجا فرمایا آپ کی شکایت نوٹ کر لی ہے) پاکیزہ کو ہر عمر کی خواتین پڑھتی ہیں تو ہر ایک کو اپنی پرانی یادوں میں دلچسپی ہوتی ہے کیوں ناں 1994ء کا پاکیزہ کا یادگار اور دلچسپ سلسلے'' مجھے یاد ہے ذرا، ذرا'' پھر سے شروع ہو جس میں ہر ماہ ایک بہن تفصیل سے بچپن، اسکول، کالج اور بعد کی یادیں ایک مضمون کی شکل میں بیان کریں۔ تو بتاؤ بہنوں کیا خیال ہے۔ نزہت یہ لائنز لازمی لگانا تاکہ بہنوں کی رائے معلوم ہو پھر تم شروع کرو۔ (چلو بھئی بہنوں فہمیدہ کی تجویز کیسی لگی؟)، دلشاد نسیم، صراط عشق، کی یہ پہلی قسط پسند آئی ہاں ارزش کا کردار اچھا لگا۔ نایاب اور افشاں نے تو لاجواب ناول لکھے ہیں اتنی وضاحت کے ساتھ۔ دل کر رہا ہے نایاب کا ناول ابھی ختم نہ ہو ہاں یہ عمامہ مر گئی تھی اور احتشام اور عائم کو ملانا نایاب اور پلیز اگلی بار بھی ایسے ہی آنا اور افشاں تم بھی۔ نایاب کے ناول سے تو دل ہے ابھی اور پڑھا جائے 19 ہی تو ہوئی ہیں قسطیں اور کوئی مسئلہ نہیں کہ اور رسالوں میں بھی تو طویل تحریریں چلتی ہیں۔ ہاں یہ خوبی پاکیزہ کی ہے اور رسائل کی طرح ہر ماہ چھوٹی سی قسط نہیں دیتا بلکہ زیادہ صفحے کی قسط دیتا ہے۔ (اور لوگوں کو پھر بھی قسط چھوٹی لگتی ہے) میری تو پسندیدہ نگہت سیما ہیں۔ نگہت آپ زیادہ پاکیزہ میں لکھیں۔ ہاں بزم پاکیزہ سچ کہوں تو میرے بنا ادھوری سجھے لگتی ہے کہ اور بہنیں کچھ زیادہ سادہ عام سوالات کرتی ہیں۔ تم نے بھی یاد نہ کیا کہاں گئی فہمیدہ کہ اتنے وقت تک کچھ ارسال نہ کیا (ارے تم اکٹھا اتنا کچھ بھیجتی ہو کہ وہ ہی لگتا رہتا ہے ناں) اور شبینہ نے تو تاج محبت کا لکھ کر کمال کر دیا اتنا معیاری ناول تھا مایا کی زندگی سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ماشاء اللہ ایسی تحریریں پاکیزہ کا فخر ہیں اتنے عام اور اہم مسائل شبینہ نے بتائے۔'' (پیاری فہمیدہ اتنا طویل خط تھا کہ دو دن تک میں پڑھتی رہی خیر تمہاری تجاویز قابل غور ہیں۔ ان شاء اللہ بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ اللہ پاک تمہیں صحت و سلامتی سے رکھے۔)

ہیلو مریم شہزاد، کراچی سے۔'' ماہنامہ پاکیزہ میں پہلی مرتبہ بہنوں کی محفل میں حاضری دے رہی ہوں۔ جیسے ہی معلوم ہوا کہ جولائی میں میرا افسانہ لگا ہے فوری طور پر پاکیزہ منگوایا۔ کیونکہ ہمارے علاقے میں جلد ہی منظر سے غائب ہو جاتا ہے اور پھر

ایک، ایک سے کہتے رہو اور کوئی لا کر نہیں دیتا جولائی کے شمارے میں سب سے پہلے اپنے افسانے کا دیدار کیا اس کے بعد ابتدا کی نزہت بھابی کی باتوں سے جو ہمیشہ کی طرح مختصر پیرائے میں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں (اُف اللہ بھابی کہہ کر تم نے تو دل جیت لیا مریم) نزہت جبین ضیا، اے دل ناداں پرانا موضوع تھا مگر بہت اچھے طریقے سے لکھا گیا۔ آبلہ پا فرحی نعیم کا خوب صورت افسانہ تھا۔ عائشہ تنویر کا نام ہی کافی ہے پڑھ کر بہت مزہ آ گیا۔ انکل کی کہانی جیسی کرنی ویسی بھرنی کے مصداق تھی۔ وہ خوشبو سی واقعی خوشبو بکھیر گئی۔ دکھ اوڑھتے نہیں۔ تسلیم منیر کا اچھا افسانہ ہے۔ میں نے بھی ایک ادھورا افسانہ لکھ رکھا ہے کالج کی سہیلیوں پر مگر اس کا اختتام نہیں آ رہا تھا اب دوبارہ کوشش کرتی ہوں۔ (ہاں جلدی کرو) شریعت جرم ہے اوری، یروشلم رُلا دینے والی کہانیاں تھیں، غزالہ باجی کے افسانے کے لیے کچھ بھی کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے وہ ہماری استاد، رہبر سب کچھ ہیں۔ شائستہ زریں کا سروے بھی بہترین تھا۔" (آپ کا افسانہ مل گیا ہے باری آنے پر شائع ہوگا)

سحر نخل سعدی آرائیں، بدین سے۔ "سب سے پہلے تو المیس جبار کی تحریر وہ خوشبوسی! خوشبو کی طرح دل و دماغ کو معطر کر رہی ہے۔ فرحت جبین کی شاپنگ بھی سبق آمیز پہلو لیے ہوئے تھی، میں سب سے پہلے بہنوں کی محفل پڑھتی ہوں اسے پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے ہمارے اردگرد باتیں ہو رہی ہوں۔ (اچھا ہے ناں خوب لطف لیا کریں) ایک بات کہنی تھی یوں تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن پھر بھی کہے دیتی ہوں پاکیزہ کی طرح اس ادارے سے ایک اور رسالہ آنا چاہیے جیسا کہ دلکش..... (ہاں دعا اور کوشش ہے اللہ پاک کی مہربانی شامل حال رہی تو آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔ ان شاء اللہ) وردہ بخاری آپ کی تحریر کا انتظار رہے گا۔ جانے کیوں آپ کا نام دیکھ کر حیا بخاری یاد آ جاتی ہیں..... (اللہ پاک حیا بخاری کے درجات بلند فرمائے آمین) امینہ عندلیب جی خط لکھا کریں ہم آپ کی دعاؤں کے مقروض ہیں! ایشل شادیان لوٹ آؤ پاکیزہ کے صفحات تمہارے نام اور کام کے منتظر ہیں۔ (جی بالکل ہم بھی پرانے بچھڑے ہوؤں کو پکار رہے ہیں)

سحر المیس جبار، اسلام آباد سے۔ "جولائی کا شمارہ اس بار کافی لیٹ ملا سب سے پہلے آفشاں آفریدی کی تحریر پڑھی جو بہت خوب صورتی سے ایک خوب صورت انجام کی طرف جا رہی ہے۔ عکرمہ کا کردار پڑھتے لگیں جورب نے ان کو عطا کیا ہے تو یقیناً ایک بہترین معاشرے کی تشکیل ممکن ہے۔ مرد کو نگران بنایا گیا ہے اور اس کی نگاہوں کی آلودگی ہی نسا کو آلودہ کر رہی ہے اور کبھی وہ لبرل ہونے کا دعویٰ کرتے جب اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے تو تو ام کے اعلیٰ عہدے سے ہٹا کر ڈیوٹ کے نچلے ترین درجے کا حقدار ٹھہرتا ہے پر افسوس تو ام کی یہ بے خبری۔ (یہی تو بات ہے ہر انسان کو اپنا، اپنا رتبہ پہچاننا چاہیے) میں عشق ہوں کو اگر آپ کئی بار بھی پڑھیں گے۔ تو ہر بار یہ تحریر پہلے سے بڑھ کر متاثر کرتی ہے (بہت اچھا کہا) باقی تمام سلسلے اور کہانیاں ہمیشہ کی طرح بہت اچھی تھیں۔ فہرست میں اپنا نام دیکھ کر دل بے اختیار سجدۂ شکر بجالایا تھا جزاک اللہ..... خیر اللہ پاک آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" (بہت شکریہ مختصر خط کا)

اس ماہ کی محفل برخاست کرنے سے پہلے چند گزارشات عرض کر دیں کہ جیسا کہ محفل کے آغاز میں ہم نے صفحات کی کمی کی وجوہات بتائی ہیں امید ہے کہ آپ سب کا بھرپور تعاون ہمارے ساتھ رہے گا۔ جہاں تک محفل کی بات ہے تو خطوط جامع اور مختصر ہوں تو بہت سی بہنوں کو جگہ مل جائے گی۔ کتنے خطوط تو لوگ ہی نہیں پاتے۔ ماشاء اللہ سرگرمیاں بھی ہوتی ہیں پھر بھی کسی کی کوئی خبر یا خط لگنے سے رہ جائے تو معذرت..... ماہ نومبر میں دلہن نمبر اور دسمبر میں محبت نمبر اور پھر جنوری میں سال نو نمبر ہے..... اس لحاظ سے اپنی نگارشات ارسال کریں۔ سب کی کہانیاں ہر ماہ نہیں لگ سکتیں۔ چار، چھ ماہ میں نمبر آ ہی جاتا ہے۔ ماشاء اللہ نئی لکھنے والیوں میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ یہ سلسلہ اسی طرح خوش اسلوبی سے جاری و ساری رہے اور ہم آپ کی تحریر کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرتے رہیں۔

پُرخلوص دعاؤں کے ساتھ اب اجازت..... خوش رہیے اور خوشیاں بانٹیے.....

خیر اندیش..... نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 110 EXT 021-35804200 , 021-35386783, 021-35802552

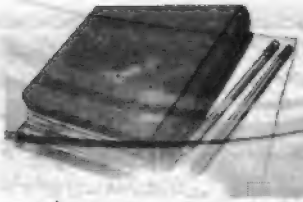

پاکیزہ ڈائری

آمنہ حماد

حمد باری تعالیٰ

نشاں اسی کے ہیں سب، اور بے نشاں وہ ہے
چراغ اور اندھیرے کے درمیاں وہ ہے
نمودِ لالہ و گل میں وہی ہے چہرہ نما
شجر شجر پہ لکھا حرف داستاں وہ ہے
جبینِ شمس و قمر اس کے نور سے تاباں
سنہری دھوپ ہی کیا، حسن کہکشاں وہ ہے
اسی کی ذات کے ممنون خدوخالِ حیات
کہ اور کون ہے صورت گرِ جہاں، وہ ہے
ہر اِک افق پہ اسی کا دوام روشن ہے
جو شے ہے فانی ہے، بس ایک جاوداں وہ ہے
اسی کی یاد لہو سے کلام کرتی ہے
ہے جس کے ذکر سے آباد شہرِ جاں وہ ہے
سکوتِ نیم شبی میں پکارتا ہوں اسے
کہ میں ہوں درد کی دستک، دراماں وہ ہے
زبانِ اشک سے مانگو دعائیں بخشش کی
بڑا رحیم، نہایت ہی مہرباں وہ ہے
اسی کی مدح میں لو دے رہے ہیں لفظ صبیح
سخن کا نور ہے وہ، لذتِ بیاں وہ ہے

کلام: صبیح رحمانی
پسند: ارم کمال، فیصل آباد

نعت رسولِ مقبول

اِک عشقِ نبیؐ ہے کہ بتایا نہیں جاتا
جو دل پہ گزرتی ہے سنایا نہیں جاتا
اس عشق میں قربت ہے محبت ہے نبیؐ کی
اِک جذب کا عالم ہے دکھایا نہیں جاتا
اس عشق کی گہرائی میں ہیں نور کی لہریں
جو روشنی دیتی ہیں بتایا نہیں جاتا
اِک عشقِ نبیؐ ہے جو کرے قلب کو روشن
آنکھوں کی یہ ٹھنڈک ہے دکھایا نہیں جاتا
اِک بار اگر ڈوب گئے عشقِ نبیؐ میں
پھر عشقِ نبیؐ دل سے مٹایا نہیں جاتا
ایک عشقِ نبیؐ ہے وہ خزینہ ہے میرے پاس
انمول خزینے کو چرایا نہیں جاتا
اللہ کی اطاعت ہو نبیؐ کی بھی اطاعت
ہر شخص سے یہ فرض نبھایا نہیں جاتا

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

دعائیہ کلام

در پہ مجھے بلا لو یا رسول اللہؐ
اپنا مجھے بنا لو یا رسول اللہؐ
میں گناہ گار ہوں میں خطا کار ہوں
میں ہر دم تیرے در کی طلب گار ہوں
جب کوئی مسافر جائے تیرے در پہ
ہوتی ہے اس پر رحمتوں کی بارش تیرے در پہ
ہو مجھ پہ بھی کرم تیری رحمت کا یارسول اللہؐ
بنالو مجھے اپنے در کا گدا یا رسول اللہؐ

دعا کی طلبگار: فرخندہ جعفری، گجرات

صبر کی فضیلت

حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”مومن کو جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، تھکاوٹ ہو یا غم یا بیماری یہاں تک کہ کوئی (بھی) جو اسے رنجیدہ کرے (غرضیکہ ہر قسم کا دکھ جس سے وہ دوچار ہوتا ہے) اس کے عوض اللہ تعالیٰ اس کی خطائیں معاف فرما دیتا ہے۔“ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ بہت ہی بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے دکھوں اور پریشانیوں کو ان کے

گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے۔ جب دل رنج و غم سے چور یا جسم درد و الم کی آماجگاہ بنا ہوتا ہے، اس وقت یہ یقین کہ جو کچھ ہم سہہ رہے ہیں، یہ ہمارے گناہ صاف کر رہا ہے۔ انسان کو صابر اور شاکر بننے میں بہت مدد دیتا ہے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سوال کرتے ہیں کہ "یا رسول اللہؐ! انسانوں میں سب سے زیادہ سخت آزمائش کس کی ہوتی ہے؟" آپؐ نے فرمایا کہ "انبیا کی پھر جو اُن سے کم افضل ہیں۔ پھر جو اُن سے کم افضل ہیں (نیز فرمایا کہ) انسان اپنے دین کی مضبوطی یا کمزوری کے حساب سے آزمائشوں میں مبتلا ہوتا ہے اگر وہ اپنے دین میں پکا ہوتا ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے دین میں کمزور ہوتا ہے تو اس کے دین کے مطابق ہی اس کی آزمائش ہوتی ہے۔

از: نازنین آفریدی، پشاور

ماں

خود خدا نے مثال دی تیری محبت کی
ماں میں تجھ پر قربان جاؤں
تیری ممتا کا کوئی ثانی نہیں
پوچھ ان سے جا کر وزیہ ماں کا درجہ
جن کی مائیں روٹھ جاتی ہیں
ابدی نیند سو جاتی ہیں
ماں میں تجھ پر قربان ہو جاؤں
چاہ کر بھی تیرا حق ادا نہ کر پاؤں
خدا سے ہے میری یہ التجا
ماؤں کو سلامت رکھنا، قیامت رکھنا

کاوش: وزیہ ظفر، چکوال

فرانس کا ایک سچا واقعہ

فرانس میں ایک بوڑھی خاتون گھر کی دہلیز پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی، واویلا کر رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ بیٹا اسے اولڈ ہوم لے جانا چاہ رہا تھا اور وہ رو، رو کر فریاد کر رہی تھی کہ اسے بے گھر نہ کیا جائے۔ پڑوس میں مراکش کی ایک مسلم فیملی آباد تھی۔ وہ شور سن کر باہر آئے اور احوال پوچھا۔ ضعیف خاتون کے بیٹے نے کہا کہ میرے بیٹے کو ایک کمرے کی ضرورت ہے سو ہم اماں جی کو اولڈ ہوم لے جا رہے ہیں اور یہ انکاری ہیں۔ مسلم فیملی کے سربراہ نے کہا کہ میں اماں جی کو اپنے گھر لے جا سکتا ہوں؟ بیٹا حیران ہوا اور خوشی سے اجازت دے دی کہ ہاں آپ لے جا سکتے ہیں ہماری ماں کو..... کچھ وقت گزرا بوڑھی خاتون خوش تھی اپنے نئے گھر میں اور پھر ایک روز اس نے اسلام قبول کر لیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اگر مسلمان ایسے ہوتے ہیں تو خدا کرے سارا فرانس مسلمان ہو جائے۔ اور یہ پروپیگنڈا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا یکسر غلط ثابت ہوا.....

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

غزل

ان کو غرور ناز سدا فیل کا رہا
اور مجھ کو انتظار ابابیل کا رہا
ظلم و جفا سے کر کے بھی برباد فصلِ گل
دعویٰ انہیں بہار کی تکمیل کا رہا
قطرہ بجھا سکا نہ گو صحرا کی تشنگی
صحرا کو بھی خیال کسی جھیل کا رہا
شب بھر میں قافلے تو وفاؤں کے لٹ گئے
راہبر کو انتظار ہی قندیل کا رہا
قابیل کا مذاق ہے تاریخ سے عجب
قاتل تھا پھر بھی بھائی وہ ہابیل کا رہا
اک سایۂ دیوار بھی اپنا نہ تھا نصیب
اور جذبہ اک جہان کی تشکیل کا رہا
لا نہ سکے زبان پہ فاروق دل کی بات
ہر وقت دل میں خوف ہی تذلیل کا رہا

شاعر: رائے امتیاز فاروق
پسند: ساجدہ ظفر، کمالیہ

پیارا وطن

چلو کہ آج وطن کو دیار کو سوچیں
وطن ہے اپنا اسی سبزہ کو سوچیں
اسی کے حسن کا چرچا تھا اک زمانے میں
بجھے چراغ کو اور خارزار کو سوچیں
زمین خون ہوئی ہے ستم گروں کے طفیل
اسی ستم کو دل زار، زار کو سوچیں
امیرِ شہر کوئی بھی باوفا نہ ملا

یا میں ہی دل سے اتر گئی؟

کاوش: فاطمہ شہزادی، لاہور

ہائیکو

کبھی، کبھی اچھا لگتا ہے
سب کچھ جان کر
انجان بننا

کاوش: فہمیدہ فرخندہ، ملتان

بری مرچیں

☆محبوب اپنی محبوبہ سے شادی والے دن یہی کہتا ہے۔ میں نے قبول کیا ایک بلا کو اس کی ساری بلاؤں کے ساتھ۔ جب زندگی شروع ہوتی ہے تو ساری بلائیں نازل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

☆☆☆

لڑکا: تمہارا نام کیا؟
لڑکی: دفع ہو۔
لڑکا: بہت ہی عجیب نام ہے۔

☆☆☆

شادی والے دن دولہا نے دلہن کو گلاب کا پھول دیا۔ دلہن بولی۔ مجھے یہ نہیں چاہیے، کوئی سونے کی چیز دو۔ دولہا۔ یہ لو تکیہ اور سو جاؤ۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

غم ہی غم تھے زندگی میں ہم سفر
دور تک خوشیاں نہ آئیں نظر
ہر طرف تھا اِک اداسی کا سماں
خشک آنسو تھے ہر صورت رواں
ایک طرف تو تھیں قسمت میں محرومیاں
اس پر دل کی آرزوئیں نامہرباں
باغ میں کوئل کی سن کر جب پکار
دل ہوا جاتا تھا میرا بے قرار
میں غزل گو اور تم جانِ غزل
میں ہوا تم جھیل میں ہنستا کنول
نغمۂ خوش رنگ میں تم ساز ہو
میں گیت ہوں اور تم مری آواز ہو

کلام: فریدہ جاوید فری، لاہور

چلو مگر اسی اجڑے دیار کو سوچیں
ہوائے سرد نے جس کا جمال چھین لیا
اسی نگار کے سولہ سنگار کو سوچیں
ہزار لب پہ دعائیں ہیں رات دن مخفی
وطن کے واسطے آؤ بہار کو سوچیں

کلام: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

منافقت

آن لائن انٹرویو میں میزبان خاتون نے مہمان شاعرہ سے سوال کیا "آج کل کے مشاعروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"مشاعرے تو فی زمانہ اکھاڑا اکیڈمی بن چکے ہیں جہاں پرچی چلتی ہے اور ایک دوسرے کے اشعار کا مکمل پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی اپنے ساتھ پتے ہمنوا نہیں لا سکتا تو وہ اچھی طرح پٹنے کے لیے تیار رہے کہ داد تو آج کل آپ کو آپ کے ساتھ آئے ہوئے ساتھی ہی دیتے ہیں، باقی اہلِ مجلس آپ کی باری پر منہ بند کر کے بیٹھے ہوتے ہیں کہ کہیں خدانخواستہ کہیں داد دینے کی بدعت نہ ہو جائے، آپ کے اچھے سے اچھے شعر کو بھی یوں ہی گزار دیا جاتا ہے اور اپنے بے جان اشعار کو بے شمار داد و تحسین سے نوازا جاتا ہے"، شاعرہ کا دل اندر ہی اندر احتجاج کرتا ہوا چیخ پڑا۔

لیکن شاعرہ بڑی تمیز سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"مشاعرے تو آج بھی ہماری درس گاہ ہیں جہاں جانے..... پڑھنے اور داد دینے کا سواد ہی الگ ہے جی.....!"

تحریر: شگفتہ شفیق، کراچی

پسند

پسند
تمہیں یاد ہے؟
تم اکثر کہا کرتے تھے
میرے ہاتھ پہ لگی مہندی
میری کلائی میں بجتی چوڑیاں
میرے کانوں میں لٹکتے جھمکے
میرے پاؤں میں کھنکتی پائل
تمہیں بہت پسند ہے
اب بتاؤ ناں کہ پسند بدل لی

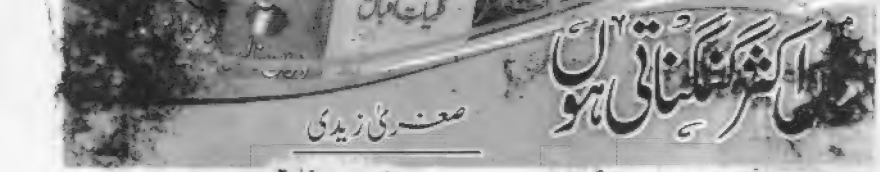

☆پروین افضل شاہین.....بہاول نگر
دل کی آنکھوں سے کام لیتی ہوں
ان کے دامن کو تھام لیتی ہوں
دور ہوتی ہیں مشکلیں ساری
جب محمدؐ کا نام لیتی ہوں

☆شہلا نواز.....لاہور
یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا
کس طرح میری روح ہری کر گیا آخر
وہ رہر جسے جسم میں کھلتے نہیں دیکھا

☆ماہ نور خان.....بہاولپور
اندھیرے میں تھے جب تک زمانہ ساز گار تھا
چراغ کیا جلا دیا، ہوا ہی اور ہوگئی

☆فریدہ افتخار.....اسلام آباد
عشق دریا ہے، جو تیرے وہ تہی دست رہے
وہ جو ڈوبے تھے، کسی اور کنارے نکلے
دھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں اگاتا کیسے
شاخ پھوٹی تھی کہ ہمسایوں میں آرے نکلے

☆سعدیہ.....بنوں
کبھی مل بھی جاتے تو پوچھتے
بھلا کیوں یہ ایسی کمی رہی
مری شانِ غم بھی جدا رہی
نہ کبھی کسی سے کہی سنی

☆ثوبیہ راجپوت.....سیالکوٹ
چاندنی چار سو تھی جو نکھری ہوئی
بے سبب ہی تھے گل یوں مہکنے لگے
اس نے دیکھا جو پھر مسکرا کے مجھے
مرے سارے گلے بھی تو دھلنے لگے

☆کنول.....ضلع قصور
جو کھو چکی ہو زمانے کی دھول میں کب سے
گئے سمے کی وہ برسات اچھی لگتی ہے

☆زرینہ خان.....بہاولپور
دل درد کی کوئی کتاب لکھے گا
سنتے ہیں کہ سارے ہی عذاب لکھے گا
کانٹے ملے ہیں ان سے ہر اک پھول کے بدلے
دلِ وحشی مگر ان کو گلاب لکھے گا

☆حنا خواجہ.....فیصل آباد
اپنی انا کے ساتھ، ساتھ وہ بھی ہوا تھا ہم سفر
لیکن وہ جب جدا ہوا سرد ہوا کا شور تھا

☆یاسمین کنول.....پسرور
نکل کے گھر سے ہر اک شخص دربدر ٹھہرا
خدا کا شکر کہ ہم لوگ اپنے گھر میں ہیں

☆راحت صبور.....فیصل آباد
جب لوگ ہی جذبوں کی تو قیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دل چیر دیتا ہے لہجے کا روکھا پن
کرتی ہے زباں وہ کچھ جو تیر نہیں کرتے

☆فرخندہ جعفری.....گجرات
ہر اک شکل کی تہ میں چھپی ہوتی ہے راحت بھی
شبِ تاریک کے دامن سے ہوتی ہے سحر پیدا

☆ماہین مسعود.....ٹوبہ ٹیک سنگھ
مجھے کانٹا چبھے اور تیری آنکھوں سے لہو ٹپکے
تعلق ہو تو ایسا ہو، محبت ہو تو ایسی ہو

☆ساجدہ ظفر.....کمالیہ
کہیں دھرتی نہاتی ہے لہو دریا کی موجوں میں
کہیں بارود کی بارش ہے انسانی ریاست پر
ستارے اشک بن کر بٹ گئے معصوم بچوں میں
فرشتے ہنس رہے ہیں ابنِ آدم کی سیاست پر

☆ساجدہ پروین.....فیصل آباد
سنگ دل ہے وہ تو کیوں اس کا گلہ میں نے کیا
جبکہ خود پتھر کو بت، بت کو خدا میں نے کیا
کیسے نامانوس لفظوں کی کہانی تھا وہ شخص
اس کو کتنی مشکلوں سے ترجمہ میں نے کیا
☆عرشیہ جنید.....کراچی
غم میں اوروں کے تم خفا نہ رہو
مان لو آگ یہ پرائی ہے
جو اندھیروں سے جیت جاتی ہے
وہ ہی امید جگمگائی ہے
☆ایمن زرناب.....ٹوبہ ٹیک سنگھ
آج سچ بولتے رہنا کوئی آسان نہیں ہے
لوگ تو لوگ ہیں، آئینے مکر جاتے ہیں
☆فریدہ جاوید فری.....لاہور
خوب صورت ہیں آنکھیں تیری
راتوں کو جاگنا چھوڑ دے
خود بخود نیند آ جائے گی
تو مجھے سوچنا چھوڑ دے
☆میمونہ اشرف.....فیصل آباد
تیری محبت میں یہ کیسا احساس ہے
کہ تو دور رہ کر بھی میرے دل کے پاس ہے
میں تیری تمنا کو دل سے مٹاؤں کیسے
تو سمندر ہے اور مجھے تیری پیاس ہے
☆عروبہ ناز.....کوٹلی
ہر اِک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نہ جانے ہم ہیں دوبارہ کہ یہ دوبارہ ہے
☆روحی صبا.....کراچی
دستار کے بل گن کے جہاں ملتی ہو عزت
اس شہر میں تو قیر سخن کار عجب تھی
☆نازنین آفریدی.....پشاور
عجب اصول ہیں اس کاروبارِ دنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اتارا ہے
☆حمنیٰ قندیل.....کمالیہ
کبھی کھولا گھر کا دروازہ تو سامنے تھی منزل
کبھی منزل کے آنے میں زمانے بیت جاتے ہیں
اِک پل میں ٹوٹ جاتے ہیں عمر بھر کے رشتے
وہ رشتے جو بنانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
☆کائنات عبدالحلیم.....میرپور خاص
بے نام مسافت ہی مقدر رہے تو کیا غم
منزل کا تعین کبھی ہوتا ہے سفر سے
نکلے ہیں تو رستے میں کہیں شام بھی ہو گی
سورج بھی مگر آئے گا اس رہ گزر سے
☆فصیحہ آصف خان.....ملتان
بانٹی تھی جس نے عام معافی کی خود نوید
وہ راتوں رات شہر اماں سے نکل چکا
آنکھوں نے بھی یہ جان لیا ہے کہ کوئی شخص
اک خواب تھا کہ عرصہ جاں سے نکل چکا
☆صائمہ نواز ڈوگر.....کمالیہ
یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت
وگرنہ ترک تعلق کی صورتیں تھیں بہت
دریدہ پیراہنوں کا خیال کیا آتا؟
امیرِ شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت
☆جینا.....کراچی
لوگ یوں ہم فقیروں کو
جینے کی سزا دیتے ہیں
آگ سے جب نہیں جلتے
تپتے حرفوں سے جلا دیتے
☆افتخار شوق.....میاں چنوں
بارش کی دعاؤں میں کمی آنکھ کی مل جائے
جذبے کی کبھی اتنی رفاقت بھی بہت تھی
کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی
☆حرا.....میرپور خاص
مری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
ابھی روشنی ابھی تیرگی، نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا
☆☆☆

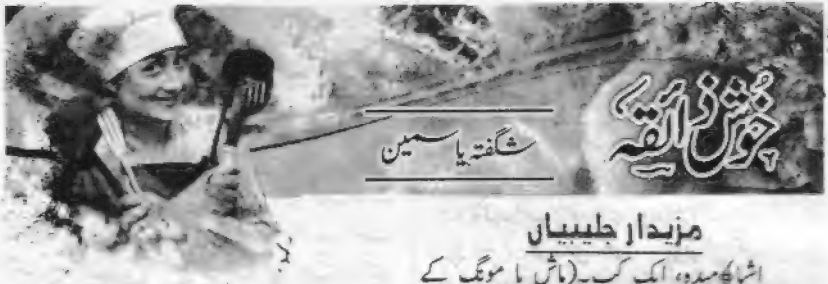

خوش ذائقہ

شگفتہ یاسمین

مزیدار جلیبیاں

اشیا: میدہ، ایک کپ۔ (ماش یا مونگ کے باریک آٹے کی بھی بنائی جاسکتی ہے) شکر، ایک کپ۔ بیکنگ سوڈا، دو چٹکی۔ گھی، تلنے کے لیے۔

ترکیب: میدے میں تھوڑا پانی ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ (پکوڑے کے آمیزے کی طرح) پھر ڈھک کے چوبیس گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

چاشنی بنانے کے لیے شکر میں ایک تہائی کپ پانی شامل کریں۔ شکر گھل جائے تو دو منٹ تک پکائیں۔ تار نہیں بنانا بس تھوڑا چپکنے والا شیرہ ہو۔ اب اس میں آپ زرد رنگ شامل کر دیں۔ میدے کے مکسچر میں بیکنگ پاؤڈر شامل کریں اور اچھی طرح پھینٹ لیں۔ کوئی بھی نوزل والی بوتل لے لیں یا کون کی طرح بنی ہوئی تھیلی بھی ملتی ہے نوزل کے ساتھ..... کڑاہی میں تیل گرم کریں اور اس آمیزے کو نوزل والی تھیلی میں ڈال کر گرم تیل میں جلیبی کی شکل دینے کے لیے گھماتے رہیں جیسے آپ نے جلیبی بنتے بازار میں بھی دیکھی ہوگی۔ اچھی طرح سنہری مائل ہو جائے تو چاشنی میں ڈال دیں۔ دو سے تین منٹ بعد جالی میں اتار لیں۔ مزیدار خستہ جلیبی تیار ہے۔

بسکٹ کیک

اشیا: چاکلیٹ بسکٹ، کریم والے بارہ، بارہ کے دو پیکٹ۔ دودھ، دو کپ۔ نمک، چٹکی بھر۔ میدہ، دو چمچ۔ بیکنگ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب: بسکٹ سمیت تمام اشیا (دودھ کے ساتھ

میں 180c پر بیک کر لیں۔ بیس سے پچیس منٹ تک کے لیے۔

آسان چاکلیٹ کیک تیار ہے۔

گوشت کے ذائقے پسندیدہ

اشیا: ثابت سفید زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ ثابت سیاہ زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ خشخاش، ایک کھانے کا چمچ۔ بھنے ہوئے چنے، دو کھانے کے چمچ۔ ثابت کالی مرچیں، چھ عدد۔ لونگیں، تین عدد۔ چھوٹی الائچی، چھ عدد۔ (یہ تمام مسالے باریک پیس لیں) پسندے، ایک کلو۔ پسا ہوا کچا پپیتا، دو کھانے کے چمچ۔ دہی، ایک پیالی۔ پسا لہسن، ادرک، ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز، دو عدد درمیانہ (باریک پیس لیں)۔ ہرا دھنیا، پودینہ ایک، ایک گڈی (چوپ کر لیں)۔ ہری مرچ، ۴ عدد (چوپ کر لیں)۔ لیموں، دو عدد۔ ہلدی، ایک چائے کا چمچ۔ پسی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب: پسندوں کو لکڑی کی ہتھوڑی سے تلا کر لیں۔ ایک پیالے میں پسندے، لہسن، ادرک، پسا ہوا مسالا، لال مرچ، ہلدی، آدھی ہری مرچیں، پودینہ اور آدھا ہرا دھنیا پیس لیں اور پپیتا، نمک، لیموں اور دہی ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز لال کر لیں، اس میں آدھی پیاز نکال کر اخبار پر

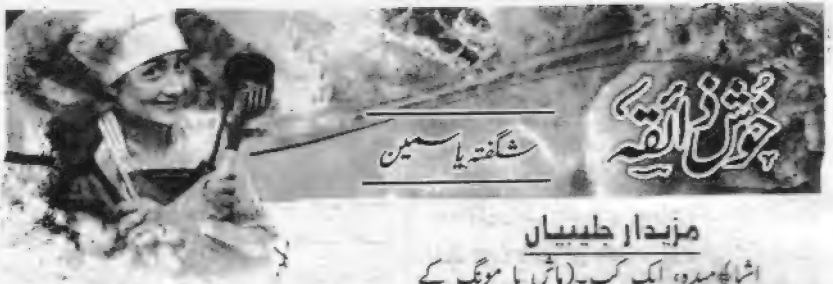

مزیدار جلیبیاں

اشیا: میدہ، ایک کپ۔ (ماش یا مونگ کے باریک آٹے کی بھی بنائی جاسکتی ہے) شکر، ایک کپ۔ بیکنگ سوڈا، دو چٹکی۔ گھی، تلنے کے لیے۔

ترکیب: میدے میں تھوڑا پانی ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ (پکوڑے کے آمیزے کی طرح) پھر ڈھک کے چوبیس گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

چاشنی بنانے کے لیے شکر میں ایک تہائی کپ پانی شامل کریں۔ شکر گھل جائے تو دو منٹ تک پکائیں۔ تار نہیں بنانا بس تھوڑا چپکنے والا شیرہ ہو۔ اب اس میں آپ زرد رنگ شامل کردیں۔ میدے کے مکسچر میں بیکنگ پاؤڈر شامل کریں اور اچھی طرح پھینٹ لیں۔ کوئی بھی نوزل والی بوتل لے لیں یا کون کی طرح بنی ہوئی تھیلی بھی ملتی ہے نوزل کے ساتھ..... کڑاہی میں تیل گرم کریں اور اس آمیزے کو نوزل والی تھیلی میں ڈال کر گرم تیل میں جلیبی کی شکل دینے کے لیے گھماتے رہیں جیسے آپ نے جلیبی بنتے بازار میں بھی دیکھی ہوگی۔ اچھی طرح سنہری مائل ہوجائے تو چاشنی میں ڈال دیں۔ دو سے تین منٹ بعد جالی میں اتار لیں۔ مزیدار خستہ جلیبی تیار ہے۔

بسکٹ کیک

اشیا: چاکلیٹ بسکٹ، کریم والے بارہ، بارہ کے دو پیکٹ۔ دودھ، دو کپ۔ نمک، چٹکی بھر۔ میدہ، دو چمچ۔ بیکنگ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب: بسکٹ سمیت تمام اشیا دودھ کے ساتھ بلینڈ کرلیں اور ایک پیالے میں نکال لیں۔ ایک پین کو پہلے سے گریس کرکے رکھ دیں۔ اس پر بٹر پیپر لگادیں اور پہلے گریس کرکے ہلکا سا میدہ چھڑک دیں۔ اب اس میں یہ مکسچر ڈال دیں۔ اب اسے پہلے سے گرم کیے گئے اوون میں 180c پر بیک کرلیں۔ بیس سے پچیس منٹ تک کے لیے۔

آسان چاکلیٹ کیک تیار ہے۔

گوشت کے ذائقے پسندیدے

اشیا: ثابت سفید زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ ثابت سیاہ زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ خشخاش، ایک کھانے کا چمچ۔ بھنے ہوئے چنے، دو کھانے کے چمچ۔ ثابت کالی مرچیں، چھ عدد۔ لونگیں، تین عدد۔ چھوٹی الائچی، چھ عدد۔ (یہ تمام مسالے باریک پیس لیں) پسندے، ایک کلو۔ پسا ہوا کچا پپیتا، دو کھانے کے چمچ۔ دہی، ایک پیالی۔ پسا لہسن، ادرک، ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز، دو عدد درمیانہ (باریک پیس لیں)۔ ہرا دھنیا، پودینہ ایک، ایک گڈی (چوپ کرلیں)۔ ہری مرچ، ۴ عدد (چوپ کرلیں)۔ لیموں، دو عدد۔ ہلدی، ایک چائے کا چمچ۔ پسی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ تیل، حسب ضرورت۔

ترکیب: پسندوں کو لکڑی کی ہتھوڑی سے پتلا کرلیں۔ ایک پیالے میں پسندے، لہسن، ادرک، پسا ہوا مسالا، لال مرچ، ہلدی، آدھی ہری مرچیں، پودینہ اور آدھا ہرا دھنیا پیس لیں اور پپیتا، نمک، لیموں اور دہی ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ دیگچی میں تیل گرم کرکے پیاز لال کرلیں، اس میں سے آدھی پیاز نکال کر اخبار پر پھیلا دیں، باقی پیاز میں مسالا لگے پسندے شامل کرکے دیگچی ڈھانک دیں اور گوشت گلنے تک پکائیں، پانی خشک ہوجائے تو بھون لیں۔ تیل اوپر آجائے تو بچی ہوئی ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ کاٹ کر تلی ہوئی پیاز سے سجا کر

پیش کریں۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسپی کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

بنارسی کباب

اشیا: بغیر ہڈی کا گوشت، تین کلو (پسند سے بنالیں) سرخ پسی مرچ، ہلدی، حسبِ ضرورت۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پیاز، لہسن، ادرک، پسا ہوا تین، تین کھانے کے چمچ۔ سرسوں کا خالص تیل، ایک پیالی۔

چٹنی کے لیے: املی، اِک چھوٹا پیکٹ۔ (گودا نکال لیں) پودینہ، ہرا دھنیا، نمک، لال مرچ، حسبِ ضرورت۔ گول لال مرچ، چھ سے آٹھ عدد۔ کالی مرچ، ایک چائے کا چمچ اور آدھی چمچ شکر ملا کر پیس لیں۔ پیاز لچھوں میں کاٹ کر برف ملے پانی میں ۱۵ منٹ ڈبو کر نکال لیں اور اس پر لیموں نچوڑ لیں (۵ پیازوں کے لچھوں پر ۱۰ درمیانے لیموں) اس پر ہرا دھنیا، چھوٹی ہری مرچ تھوڑی سی کتر کر ڈال دیجیے۔

بارچوں میں درج بالا تمام مسالے ہاتھوں سے مل کر کم از کم چھ گھنٹے تک رکھ دیجیے۔ اس کے بعد مٹی کے تیل سے کوئلے دہکائیں ایک، ایک چپٹی سیخ پر (وہ سیخ جو دونوں جانب سے لپیٹ سکے) پسند سے پرولیں۔ کم از کم دس سیخیں پرو کر رکھ دیں جب کوئلے اچھی طرح دہک جائیں ایک پیالی میں ذرا سا کوکنگ آئل اور ایک چمچہ ساتھ میں رکھ لیں یا کسی چمچ کے سرے پر صاف کپڑا باندھ لیں تاکہ کباب سینکنے کے دوران ان کبابوں پر تھوڑا سا تیل بھی لگاتے جائیں (گوشت میں سرسوں کا تیل اس لیے لگوایا ہے کہ کباب سوندھے اور خستہ بنیں اور بار، بار اوپر سے تیل نہ لگانا پڑے) چھ، سات گھنٹے بعد کباب تلنے شروع کریں۔ چٹنی اور پیاز کی سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

از: آسیہ عامر، کراچی

بیسنی بھنڈی

اشیا: بھنڈی، آدھا کلو۔ بیسن، آدھا پاؤ۔ سفید زیرہ، خشک و سبز دھنیا تھوڑا سا، سبز مرچ، دو سے تین عدد۔ انار دانہ، ایک چمچ۔ نمک، سرخ مرچ، حسبِ ذائقہ۔ ادرک، باریک کٹا ہوا ایک چمچ۔ تیل، ایک پیالی۔

ترکیب: تیل فرائی پین میں ڈال کر گرم کریں اور بھنڈی چھوٹے، چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر گرم تیل میں ہلکا سا فرائی کرلیں۔

بیسن میں سبز مرچ، سبز دھنیا، باریک، باریک کاٹ کر ملا لیں۔ نمک، انار دانہ، زیرہ اور خشک دھنیا، حسبِ ذائقہ، سرخ مرچ ڈال کر تھوڑا سا پانی ڈال کر پتلا پیسٹ بنالیں اور اس میں بھنڈی ڈبو کر پھر پکوڑوں کی طرح کڑاہی میں تل لیں۔ مزیدار بیسنی بھنڈی تیار ہے۔ گرمیوں میں اتنی پیاری، پیاری سبزیاں ہیں، کرلے مزیدار بنتے ہیں، بھنڈی، ٹنڈے ہیں، شملہ مرچ، اروی، پھلیاں، گھیا کدو، گھیا توری، خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اتنی پیاری، پیاری سبزیاں ملی ہیں، آپ کوشش کیا کریں کہ سبزیوں کی زیادہ سے زیادہ ڈشز بنائی جائیں۔ جو یقیناً مزیدار ہوگی۔

از: سنبل ملک، شاہدرہ لاہور

میرٹھ کا قورمہ

اشیا: گوشت، ایک کلو۔ کٹی ہوئی پیاز، ایک پاؤ۔ تیل یا گھی، ایک پاؤ، دہی، ایک پاؤ۔ لہسن کا پیسٹ، تین کھانے کے چمچ۔ ادرک باریک کٹی ہوئی، دو کھانے کے چمچ۔ گرم مسالا، چھوٹی الائچی۔ حسبِ ذائقہ۔ جائفل، جاوتری، پسی ہوئی دو کھانے کے چمچ۔ نمک، مرچ اور دھنیا، حسبِ منشا۔

ترکیب: تیل میں پیاز لال کر کے پیس لیں اور اُسے دہی میں ملا کر رکھ دیں، اب تیل میں گرم مسالے، الائچی اور کٹی ہوئی ادرک ڈال کر پھر گوشت ڈال دیں اور اسے بھون لیں۔ گوشت بھون کر لہسن کا پیسٹ، نمک، جائفل، جاوتری، مرچ اور دھنیا ڈال کر پکنے دیں جب گوشت گل جائے تو اس میں دہی اور پیاز کا پیسٹ شامل کردیں تھوڑی دیر پکنے دیں اور جب تمام چیزیں یکجان ہوجائیں تو قورمہ تیار ہے۔ اس میں تھوڑا سا کیوڑا ڈال دیں اور گرم گرم نان سے کھائیں۔

از: عرشیہ جنید، کراچی

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ممتی قندیل.....کمالیہ

سوال ﴿ کون سی جلن زیادہ بری ہے.....معدے کی یا دوسروں کی ترقی اور خوش حالی کی؟

جواب ﴿ معدے کی اپنے لیے دوسری جلن دوسروں کے لیے بری ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ ساجدہ پروین.....فیصل آباد

سوال ﴿ خون کے رشتے اور خلوص کے رشتے میں سے کون سا زیادہ پائدار ہوتا ہے؟

جواب ﴿ خلوص بھرے خون کے رشتے۔

☆ پروین افضل شاہین.....بہاول نگر

سوال ﴿ بقرعید پر عیدی کیوں نہیں ملتی؟

جواب ﴿ کیوں تمہیں بکرے کے لیے گھنگرو اور سہرا لینا ہے۔

سوال ﴿ میرے میاں جانی پرنس افضل شاہین ہر بقرعید پر مجھ سے ہی چھوٹی، چھوٹی بوٹیاں کیوں بنواتے ہیں؟

جواب ﴿ تم اتنے سالوں سے ان کے دل و دماغ و جگر کی اتنی اچھی بوٹیاں جو بنا رہی ہو۔

سوال ﴿ میرے میاں جانی کہتے ہیں کہ اس جشنِ آزادی پر میں تمہاری آنکھوں میں ڈوبنا چاہتا ہوں، وہ کیسے؟

جواب ﴿ شرم سے۔

☆ شاہینہ مسعود.....ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال ﴿ جانوروں کو ذبح کرنا سنتِ ابراہیمؑ ہے اور نفرتوں کو ذبح کرنا کس کی سنت ہے؟

جواب ﴿ یہ بھی اللہ والوں کی سنت ہے، وہ نفرتیں پالتے نہیں تھے صرف محبتیں بانٹتے تھے۔

سوال ﴿ جو لوگ مطلب نکالنے کے لیے پاؤں پکڑ لیتے ہیں وہ مطلب نکلنے کے بعد گردن کیوں پکڑ لیتے ہیں؟

جواب ﴿ پاؤں پکڑنے پر دوسرے کو ان کی گردن پہلے ہی پکڑ لینی چاہیے تاکہ اپنی کی نوبت نہ آئے۔

☆ فہمیدہ جاوید.....ملتان

سوال ﴿ ساون نمبر، ساگرہ نمبر، عید نمبر پاکیزہ میں آتے ہیں پاکیزہ میں ڈائن یا چڑیل نمبر کب آئے گا؟

جواب ﴿ جواب تو بہت سے ہیں.....چلو جانے دو۔

سوال ﴿ ساون میں بارش آتی ہے، ہوا میری نیلی ساڑی کا پلو لہراتی ہے، میرے ہاتھ میں پکوڑوں کی ٹرے ہے اور کس کی کمی ہے تم بتاؤ.....؟

جواب ﴿ چٹنی کی۔

سوال ﴿ بکرا منڈی میں اس پیارے سے، گورے، گورے سے، نشیلی آنکھوں والے بکرے کو دیکھ کر کیا یاد آیا؟

جواب ﴿ بیچارے محبوب کو ایسے یاد کرو گی۔

میری خواہش تھی گول مٹول سا خوب صورت سا بکرا گھر آئے اور میاں کالی موٹی تازی بھینس کیوں لے آئے؟

جواب ﴿ جواب کچھ پہلے والے سے ہی ملتا جلتا ہے.....کیا خیال ہے لکھ دوں.....

سوال ﴿ کن باتوں پر اُن کے اور میرے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے؟

جواب ﴿ کھری، کھری باتوں پر۔

☆ راحت صبور.....فیصل آباد

سوال ﴿ مہمانوں کے آگے رکھے برتن واپس لے جاتے ہوئے مختصر سفر میں نمکو کا پھکا مارنا کون سی آرٹ ہے؟

جواب ﴿ چنگا مار آرٹ۔

سوال ﴿ بھاڑ میں جانے کے لیے رکشا ٹھیک رہے گا یا ٹیکسی؟

جواب ﴿ تم پیدل، پیدل چلی جاؤ بلاوجہ کرایہ لگاؤ گی۔

☆ میمونہ اشرف.....فیصل آباد

دوسروں کے لیے آسمان بننا بہتر ہے یا ''آس'' اور ''ماں'' بننا بہتر ہے؟

جواب ﴿ دونوں۔

سوال ﴿ جن کی دال نہیں گلتی وہ سبزی کیوں نہیں پکا لیتے؟

جواب ﴿ سبزی ملتی جو نہیں۔

☆ ساجدہ ظفر.....کمالیہ

سوال ﴿ امیر آدمی کو غصہ آئے تو کہتے ہیں صاحب کا بی پی ہائی ہوگیا۔ اور غریب آدمی کو غصہ آئے تو کہتے ہیں اس کا دماغ خراب ہوگیا۔ یہ تضاد کیوں ہے؟

جواب ﴿ امیر کے پاس دماغ جو نہیں ہوتا۔

سوال ﴿ کسی کو مکھن لگانا ہو تو گائے کا ٹھیک رہے گا یا بھینس کا؟

جواب ﴿ تم اونٹنی کے دودھ کا نکلوا لو آج کل بڑی مانگ ہے۔

☆ صائمہ نواز.....ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال ﴿ پیار جھوٹا نکلے تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور پیار سچا نکلے تو بعد میں چھ عدد بچوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، آخر بندہ کرے تو کیا کرے؟

جواب ﴿ چھ میں سے تین کو سنبھال لے.....کچھ تو بیلنس ہو۔

سوال ﴿ لوگ عزت کی روٹی کمانے میں لگے ہیں، کوئی عزت کا سالن کیوں نہیں کماتا.....؟

جواب ﴿ اس کے لیے بے عزتی کے مسالے بھی تو برابر کے چاہیے ہوتے ہیں۔

☆ ساجدہ پروین.....فیصل آباد

سوال ﴿ اگر چھینک آئے تو کہتے ہیں کوئی یاد کر رہا ہے لیکن اگر چھینک آتے، آتے رک جائے تو کیا سمجھنا چاہیے؟

جواب ﴿ اسے تمہارا کوئی قصور یاد آگیا تو تمہیں یاد کرنا چھوڑ دیا۔

☆ تسنیم کوثر.....کراچی

سوال ﴿ کہتے ہیں سچ کڑوا ہوتا ہے تو جھوٹ پھر میٹھا ضرور ہوتا ہوگا اور اب آپ ہمیں سچ کو میٹھا اور جھوٹ کو کڑوا بنانے کا نادر نسخہ بتائیں؟

جواب ﴿ سچ ہمیشہ میٹھا ہی ہوتا ہے اب یہ تو چکھنے والے کے ذائقے کی حس ہے۔

سوال ﴿ یہ مصیبت کورونا دنیا سے کب ختم ہوگا، دل پریشان رہتا ہے، کوئی اچھا سا حل بتائیں؟

جواب ﴿ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرو اور اختیار کرو۔

سوال ﴿ سنا ہے ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے مگر کون سی عورت ماں، بہن، بیوی، بیٹی آپ بتانا پسند کریں گی؟

جواب ﴿ باشعور باافہم، ہمدرد، خیر خواہ جس رشتے میں بھی ہو۔

سوال ﴿ غور کیجیے آج کل لوگوں میں حسد، جلن، بغض بہت زیادہ ہوگیا ہے، آخر کیا، کیا جائے کہ لوگ ان سب علامات سے بچے رہیں؟

جواب ﴿ یہ ہر زمانے میں تھا، آج سوشل میڈیا نے عام کر رکھا ہے۔

سوال ﴿ آج کل جو حالات ہیں تقریباً ہر بندہ پریشان ہے بتائیں.....ذہنی سکون دل کا سکون وغیرہ کے لیے آخر کیا تدبیر اختیار کریں؟

جواب ﴿ پاکیزہ میں مزے، مزے کے سوال کرو بس اور کیا۔

☆ حمنیٰ قندیل.....کمالیہ

سوال ﴿ گھڑی وقت بتاتی ہے، وقت لوگوں کی اوقات بتاتا ہے۔ لوگ کیا بتاتے ہیں؟

جواب ﴿ گھڑی کی قیمت۔

☆☆☆

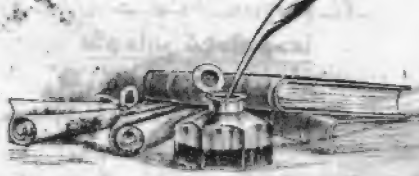

ادارہ

روحانی مشورے

دعا مانگنے کے آداب

خدا کی بارگاہ میں اپنی ضرورت اور حاجت رکھنے سے پہلے اس کی حمد وثنا کیجیے۔ پھر دو رکعت نفل بھی پڑھ لیجیے اور دعا کے اول وآخر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھنے کا بھی اہتمام کیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''جب کسی شخص کو خدا یا کسی انسان سے ضرورت و حاجت پوری کرنے کا معاملہ درپیش ہو تو اس کو چاہیے کہ پہلے وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھے اور پھر خدا کی حمد وثنا کرے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام بھیجے (اس کے بعد خدا کی بارگاہ میں اپنی ضرورت بیان کرے)'' (ترمذی)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت ہے کہ بندے کی جو دعا خدا کی حمد وثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام کے ساتھ پہنچتی ہے، وہ شرف قبولیت پاتی ہے۔ حضرت فضالہؓ فرماتے ہیں کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آیا، اس نے نماز پڑھی اور نماز کے بعد کہا۔

''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' خدایا! میری مغفرت فرما۔

آپ نے یہ سن کر اس سے کہا کہ تم نے مانگنے میں جلد بازی سے کام لیا۔ جب نماز پڑھ کر بیٹھو تو پہلے خدا کی حمد وثنا کرو۔ پھر درود شریف پڑھو پھر دعا مانگو۔ آپ یہ فرما ہی رہے تھے۔ کہ دوسرا آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھ کر خدا کی حمد بیان کی۔ درود شریف پڑھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''اب دعا مانگو، دعا قبول ہوگی۔'' (ترمذی)

۱۷۔ خدا سے ہر وقت اور ہر آن دعا مانگتے رہیے۔ اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کی فریاد سننے سے کبھی نہیں اکتاتا۔ البتہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خاص اوقات اور حالات ایسے ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان مخصوص اوقات اور حالات میں دعاؤں کا خصوصی اہتمام فرمائیں۔

رات کے پچھلے حصے کے سناٹے میں جب عام طور پر لوگ میٹھی نیند کے مزے میں مست پڑے ہوتے ہیں، جو بندہ اٹھ کر اپنے رب سے راز و نیاز کی گفتگو کرتا ہے اور مسکین بن کر اپنی حاجتیں اس کے حضور رکھتا ہے تو وہ خصوصی کرم فرماتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''خدا ہر رات کو آسمانِ دنیا پر نزولِ اجلال فرماتا ہے یہاں تک کہ جب رات کا پچھلا حصہ باقی رہ جاتا ہے تو فرماتا ہے کون مجھے پکارتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں، کون مجھ سے مانگتا ہے کہ میں اس کو عطا کروں، کون مجھ سے مغفرت چاہتا ہے کہ میں اسے معاف کروں.....'' (ترمذی)

جمعہ کی مخصوص ساعت میں جو جمعہ کا خطبہ شروع ہونے سے نماز کے ختم ہونے تک ہے یا نماز عصر کے بعد سے نماز مغرب تک ہے۔

اذان اور تکبیر کے درمیانی وقفے میں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اذان اور اقامت کے درمیانی وقفے کی دعا رد نہیں کی جاتی۔'' صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقفے میں کیا دعا مانگا کریں۔ فرمایا یہ دعا مانگا کرو۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ

ترجمہ: خدایا میں تجھ سے عفو و کرم اور عافیت وسلامتی مانگتا ہوں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

قرآن کی جامع دعائیں

رحمت و مغفرت کی دعا

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ (الاعراف)

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا۔ اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کھائے تو ہم یقیناً تباہ ہو جائیں گے۔''

بلاشبہ اگر خدا انسان کے گناہوں کو معاف نہ کرے اور

اپنی بے پایاں رحمت سے نہ نوازے تو وہ تباہ ہو جائے گا۔

فلاح دارین کی جامع دعا

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

"اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔"

صبر و ثبات کی دعا

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۝

"پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمارے قدموں کو مضبوط جمادے اور کافروں پر فتح یاب کرنے کے لیے ہماری مدد فرما۔" (البقرۃ ۲۵۰)

شیطان کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا

رَبِّ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ O وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ (المومنون:۹۷،۹۸)

"پروردگار! میں شیطان کی اکساہٹوں سے تیری پناہ میں آتا ہوں بلکہ اے میرے پروردگار! میں اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے قریب پھٹکیں۔"

پروردگار عالم سے دعا کریں کہ یہ قرآنی دعائیں..... ہماری زندگی میں عملی طور پر شامل رہیں۔

☆☆☆

یوں تو روز مرہ زندگی کے لیے بہت مسنون دعائیں ہیں جو ہر مسلمان کو ازبر ہونی چاہئیں۔ آج ہم چند دعائیں بتا رہے ہیں ان میں سے اکثر اسکولوں میں بچوں کو یاد کرائی جاتی ہیں۔

سفر میں کسی جگہ اترنے کی دعا

(۵۷) حضرت خولہ بنت حکیمؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جب کوئی اثنائے سفر کسی جگہ اترے اور یہ دعا کرلے۔

اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ

ترجمہ: میں اللہ کے کلمات تامہ کی پناہ مانگتا ہوں اس کی مخلوقات کے شر سے۔

تو جب تک وہ وہاں سے روانہ نہ ہو جائے اس کو کوئی چیز ضرر نہیں پہنچائے گی۔

کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنا

(۵۹) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو شروع میں بسم اللہ کہہ لے اگر کہنا بھول جائے اور میں بعد میں یاد آئے تو یوں کہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ ترجمہ: اللہ کے نام کے ساتھ شروع میں بھی اور آخر بھی میں

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کی دعا

(۶۰) حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ کہتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا پلایا، اور ہمیں مسلمان بنایا۔

کھانا کھلانے والے کے لیے دعا

(۶۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانا کھلانے والے کو یہ دعا فرمائی ہے۔

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَھُمْ فِیْمَا رَزَقْتَھُمْ وَاغْفِرْ لَھُمْ وَارْحَمْھُمْ

ترجمہ: خداوندا! تو نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں برکت عطا فرما اور ان کے گناہ بخش دے اور ان پر رحم فرما۔

نیا میوہ یا پھل دیکھنے کی دعا

(۶۲) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ جب پھل کا نیا میوہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا تو اسے اپنی آنکھوں پر پھر اپنے ہونٹوں پر رکھ کر یہ دعا فرماتے۔

اَللّٰھُمَّ اَرَیْتَنَا اَوَّلَہٗ فَاَرِنَا اٰخِرَہٗ

ترجمہ: خداوندا! تو نے ہمیں فصل کا پہلا میوہ دکھایا ہے ہمیں اس کا آخری میوہ بھی دکھا۔

اس کے بعد آپ وہ پھل اپنے پاس کسی چھوٹے بچے کو عنایت فرما دیتے۔

اس طرح اپنے بچوں کے ساتھ پاس پڑوس کے بچوں کو بھی ضرور یاد رکھیں۔

نوٹ: (یہ دعائیں صحائے ستہ میں سے لی گئی ہیں)

☆☆☆

Dr. Willmar Schwwabe
Germany
From Nature. For Health.

برسوں سے قائم، اعلیٰ ترین معیار---
شوابے ہومیوپیتھی
میں بے مثل

شوابے ہومیوپیتھک سنگل ریمیڈیز
ہومیوپیتھی میں بہترین

German Imported in Original Pack

ہومیوپیتھی میں دوا کا مستقل اعلیٰ معیار ان کی غیر معمولی افادیت کا سبب بنتا ہے۔
ڈاکٹر ولمار شوابے، جرمنی کے برسوں سے قائم اعلیٰ ترین معیار کی وجہ سے ان کے قائم کردہ مقام کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں۔

شوابے اپنے تمام ادویاتی پودے جرمنی میں واقع اپنے نباتاتی باغات میں 100% قدرتی طریقے سے کاشت کرتا ہے۔ اعلیٰ ترین معیار یقینی بنانے کے لیے غیر معمولی تحقیق کی بنیاد پر جدید طریقہ کار کے ذریعے دنیا کی بہترین ہومیوپیتھک دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔

دوا سازی کا تمام تر عمل جی ایم پی معیارات اور پابندی کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق انجام دیا جاتا ہے اور اس طرح تیار کردہ دوائیں جرمنی سے تمام دنیا بالخصوص پاکستان کو برآمد کی جاتی ہیں۔

Importer:
Dr.Hamid
General Homoeo (Pvt.) Ltd.

Karachi, Phone: 021-32211895 www.drhamid-schwabe.com Lahore, Phone: 042-36291603

شوابے
ہومیو کلینک

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

ریاح

کلثوم.....سیالکوٹ

یہ مسئلہ میرے بیٹے کے ساتھ ہے۔ 9 سال کا ہے۔ اس کو گیس پرابلم ہے۔ سارا دن گیس خارج کرتا ہے۔ اور گرمیوں میں صبح نہار منہ یا ناشتے کے بعد الٹی کر دیتا ہے۔ تمام گرمی اس کا یہ مسئلہ رہتا ہے۔

جواب: بچوں کو سوتے وقت دودھ نہ پلایا کریں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Carboveg 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں دو مرتبہ دیں (صبح و شام) 15 دن بعد حال بتائیں۔

ریوماٹائیڈ آرتھرائیٹس

رضوانہ.....فیض آباد

ڈھیر ساری دعاؤں کے بعد عرض ہے کہ 40 سال ہو گئے ہیں کہ میرے جوڑوں میں درد رہتا ہے جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ میرے ہاتھوں کی انگلیاں ٹیڑھی ہونے لگ گئی ہیں۔ اب تو مکمل ہاتھ ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔ ہاتھوں سے میں کوئی کام بھی نہیں کر سکتی۔ بوڑھی ہو گئی ہوں مگر کتابیں پڑھنے کا ابھی بھی بہت شوق ہے۔ بچپن سے رسالے پڑھنے کا شوق ہے۔ میری نظر بھی کمزور ہے۔ ایک آنکھ کا آپریشن کروایا ہے دوسری آنکھ کا ابھی کرانا ہے۔ سالوں سے یہ حالت ہے کہ کچھ دور تک چلتی تھی تو تھک جاتی تھی، کسی اونچی جگہ پر بیٹھ جاتی تھی، نیچے بھی نہیں بیٹھ سکتی کہ گھٹنے ٹیڑھے نہیں کر سکتی تھی پھر آہستہ آہستہ یہ ہونے لگا کہ نچلے دھڑ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

ستمبر 2021ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____

پتا: _____

_____

جواب: اللہ آپ کو صحت دے آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Ptk-73 15Rhus toxi قطرے ہر 3 گھنٹے بعد لیں، Calc.Carb-30Kali. Phos-30 کے 7،7 قطرے دن میں 4 مرتبہ لیں، تین ماہ بعد طبیعت سے دوبارہ مطلع کریں۔

بلغم و تیزابیت

سرور.....لاہور

میرے تین مسئلے ہیں۔ میرے سینے پر سارا سال بلغم کا جماؤ رہتا ہے جو کہ سردیوں میں شدت اختیار کر جاتا ہے۔ سینے کے درمیان کی ہڈی جو گلے سے نیچے آتی ہے اس میں بہت درد رہتا ہے، سینہ پھیپھڑے جکڑے رہتے ہیں۔ ناک، کان، منہ، گلا، ہاتھ پاؤں سب خشک رہتے ہیں اور ناک کان ہر وقت بند رہتے ہیں۔ میں ایک کمپنی میں مکینک ہوں 12 گھنٹے کی ڈیوٹی ہے سارا دن کام میں مصروف رہتا ہوں۔ رات کو گھر آ کر کبھی نہا کر اے سی کے نیچے لیٹتا ہوں جس کے اثرات سردیوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلے بھی ریشہ بلغم رہتا تھا لیکن اس سال شدت اختیار کر گیا ہے۔ B.P بھی اکثر ہائی رہتا ہے، خشکی بھی اتنی ہے کہ سر پر تیل لگاؤ تھوڑی دیر بعد غائب ہو جاتا ہے۔ صبح جب سو کر اٹھتا ہوں تو آنکھیں ریشہ کی وجہ سے بھاری ہوتی ہیں۔ میرے جانے کا سارا راستہ دھول مٹی والا ہے جہاں ہر وقت دھول مٹی رہتی ہے۔ صبح سات بجے جو ناشتا کرتا ہوں اس کے بعد رات 8 بجے کھانا کھاتا ہوں۔ بعض دفعہ دوپہر میں بھوک لگتی ہے تو پانی پی کر بھوک ختم کر لیتا ہوں۔

میری طبیعت گرم مزاج اور حساس ہے، ریشہ ختم کرنے کے لیے کوئی گرم دوا یا غذا کھالوں تو معدے میں گرمی ہو جاتی ہے۔ معدے کے لیے کوئی ٹھنڈی دوا یا غذا کھالوں تو ریشہ بڑھ جاتا ہے۔ غذا بھی ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتی یا تو قبض ہو جاتا ہے یا پھر غذا ایسے ہی نکل جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی جلتے رہتے ہیں۔ کھانے پینے کا شوقین ہوں لیکن ڈر کر بہت احتیاط سے کھاتا ہوں۔ بعض

SCHWABE

دفعہ اتنی کمزوری ہو جاتی ہے کہ ہاتھ پاؤں میں جان نہیں رہتی۔ معدہ بہت کمزور ہو گیا ہے تین ٹائم کا کھانا قبول نہیں کرتا۔ مجھے گیس کی بھی بہت شکایت ہے بعض دفعہ گیس دل کو چڑھتی ہے جس کی وجہ سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ غصہ بھی مجھے بہت آتا ہے لیکن جتنی شدت سے غصہ آتا ہے اتنی ہی تیزی سے میں برداشت کر لیتا ہوں۔

جواب: رات کو مت نہایا کریں یا پھر اے سی نہ کھولیں۔ معدے کو 12 گھنٹے خالی نہ چھوڑیں اور اس کو فل بھی نہ کریں۔ غذا آہستہ آہستہ چبا کر کھایا کریں، کھانے کے ساتھ یا فوراً بعد چائے، کولڈ ڈرنک اور پانی استعمال نہ کریں، کم از کم 2 گھنٹے بعد پانی پیا کریں۔ گرم، ٹھنڈا اور ٹھنڈا گرم نہ کریں، کھانا متوازن کھائیں اور ایک وقت میں ایک ہی قسم کا کھانا کھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Bismutem Pentarkan Ptk 16 ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں اور Sticta Pentanrkan Ptk 82 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Viscum Pentarkan Ptk 89 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں اور ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

پیریڈز کا مسئلہ

سمرین.....لاہور

میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا تھا۔ مجھے دے اور پیریڈز کا مسئلہ تھا جس کا آپ نے مجھے جواب دیا تھا اور مجھے دوائیاں بھی تجویز کی تھیں۔ میں وہ اپنا سوال اور آپ کی بتائی ہوئی دواؤں کے نام کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ میں وہ دوائیاں استعمال کر رہی ہوں لیکن ان سے مجھے بہت خشکی ہو گئی ہے۔ ناک، منہ، کان، سر سب بہت خشک ہو گئے ہیں۔ چہرے پر دانے بھی ہو گئے ہیں۔ اب مجھے دو مہینے بعد Periods ہوئے ہیں۔ برائے کرم

.....آپ میری رہنمائی کریں کہ میں ڈاکٹری ادویات چھوڑ دوں اور ہومیو پیتھک دوائیاں شروع کر دوں کیونکہ اب میرا معدہ اتنی دوائیاں برداشت نہیں کرتا۔ مجھے ایسی دوائیاں بتائیں جو خشکی نہ کریں اور میرے اندر طاقت بھی آجائے بعض دفعہ بہت کمزوری ہوجاتی ہے۔

جواب: آپ نے اپنی کیفیات کے بارے میں بیان نہیں کیا جن کے لیے ادویات تجویز کی تھیں۔ جو ایلو پیتھک ادویات آپ استعمال کر رہی ہیں یہ ان کے سائیڈ ایفکٹ ہیں یقیناً ان کو چھوڑ دیں۔ Ptk 60 کا استعمال جاری رکھیں ساتھ میں Pulsatilla 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں تین مرتبہ اور Sticta Pentarkan 82 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور ایک ماہ بعد پھر حال بتائیں۔

پسینے کی زیادتی

شفیق.....حیدر آباد

میں ایک طالبعلم ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میرے ہاتھوں اور پیروں پر پسینا آتا ہے۔ اب تک بہت علاج کروایا حکیموں، ڈاکٹروں اور ہومیو پیتھک لیکن فرق نہیں پڑا۔ اب تھک ہار کر 4 سال سے علاج چھوڑ دیا ہے۔ پسینے میں گرمیوں میں شدت زیادہ ہوتی ہے لیکن سردیوں میں بھی پسینا آتا ہے مگر گرمیوں کی نسبت کم۔ بعض اوقات دل کی دھڑکن بھی تیز ہوجاتی ہے اور ساتھ میں پورے جسم میں کپکپی بھی طاری ہوجاتی ہے اور اس وقت پسینا بھی شدت پکڑ جاتا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے کوئی بھی کام اعتماد سے نہیں کر پاتا۔ برائے کرم کوئی مستقل علاج تجویز کیجیے۔

جواب:۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Carb 200 ایک خوراک یعنی 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈالیں اور دو دن بعد Iodium 30 کے 5، 5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ کیفیت سے مطلع کریں۔

لیکوریا و بریسٹ

رمشہ ریحان.....ابوظہبی

مجھے لیکوریا کی شکایت ہے اور کافی عرصے سے ہے۔ پیریڈ سے پہلے اور بعد میں زیادہ ہوتی ہے اور جلن بھی ہوتی ہے۔ دوسرا مسئلہ میرے بریسٹ کی نشوونما کم ہوگئی ہے۔

جواب: آپ کا وزن تھوڑا زیادہ ہے اس کو کم کریں، میٹھی چیزیں، کولڈ ڈرنکس، آئس کریم، مرغن چیزیں، برگر، پیزا۔ نہ کھائیں۔ ایک گھنٹے کی ورزش روزکریں۔ متوازن غذا کھایا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں 3 ماہ کے لیے اس کے بعد حال بتائیں۔ Sepia-30, Bovista30,Sabal Serr-30, Cal.Carb-30 کے 7، 7 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

ناک کا مسئلہ

ریحانہ.....ساہیوال

مجھے نومبر سے جب اسموگ ہوئی تھی رات کو کافی زیادہ چھینکیں آتی تھیں۔ اس کے بعد زکام شروع ہوا تو میں نے زکام کی کوئی دوا نہیں لی۔ میں نے زکام کے ساتھ کپڑے بھی دھوئے کبھی ٹھنڈے اور کبھی گرم پانی سے۔ میرے زکام کے ساتھ سانس کا مسئلہ ہوگیا۔ میں نے Nebulize کرلیا۔ اس کے بعد ناک میں دائیں طرف گوشت سا ہوگیا اور اس سائیڈ سے سبز رطوبت نکلتی رہتی تھی پھر ایک رات وہ شاید سانس کے دوران ناک کے اوپر چلا گیا جب سے میری ناک میں سونگھنے کا مسئلہ ہوگیا ہے۔ میں نے کافی ڈاکٹرز کو چیک کروایا ہے وہ کہتے ہیں کہ الرجی ہے۔ الرجی سے ناک بلاک ہوگئی ہے جب میں کوئی دوا بھی استعمال کرتی ہوں تو شروع میں کافی اثر ہوتا

pklibrary.com

15 Pentarkan- Ptk-81 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ، ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

میڈیا کے بداثرات

عامر خان.....برمنگھم

محترم ڈاکٹر صاحب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اندرونی طور پر بے حد کمزور ہوں۔ آج تک کسی ڈاکٹر کو چیک اَپ نہیں کرایا۔ مہربانی فرما کر میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں۔ جس سے میری ازدواجی زندگی اچھی گزر سکے۔ تازیست دعاگو رہوں گا۔

جواب: اللہ ہمیں بچے سے جوان کرتا ہے تو ہمیں عقل سے نوازتا ہے۔ جو نوجوان عقل رکھتے ہیں وہ جذبات، خواہشات کو کنٹرول کر کے اپنے آپ کو مختلف فیلڈ میں منوا لیتے ہیں۔ بصورت دیگر وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اپنے اندر صبر، برداشت و قناعت کا جذبہ پیدا کرو، تمہارا مستقبل اور وطن عزیز کا مستقبل سنور جائے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک استعمال کرو پھر حال بتاؤ۔ Staphisegria-200 کے پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں ہفتہ میں ایک مرتبہ جبکہ Damiana Pentarkan-40 کے 15 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ کھانے کے بعد لیں۔

وزن بڑھ گیا

نرما.....ٹوکیو

میری بیٹی موٹاپے کا شکار ہے۔ پیریڈ صرف دو دن کھل کر ہوتے ہیں۔ ٹانگیں بہت موٹی ہیں۔ اسے بھوک بھی بہت لگتی ہے۔ اس کی کلاس فیلوز بھی اسے احساس دلاتی رہتی ہیں کہ آپ کمر کے اوپر سے بالکل ٹھیک ہو لیکن کمر سے نیچے بہت پھیلی ہوئی لگتی ہو اور یہ حقیقت بھی ہے۔

جواب: آپ کی بیٹی کو بھوک بہت لگتی ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ وہ کھاتی کیا ہیں اور کتنا کھاتی ہیں۔ بھوک ہے لیکن آہستہ آہستہ پھر وہی سچویشن ہو جاتی ہے۔ اب میں نے جس ڈاکٹر سے چیک کروایا ہے وہ کہتے ہیں کہ آپریشن کروالیں، میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ پلیز میرا مسئلہ حل کریں آج کل میں الرجی کی ادویات لے رہی ہوں اور ساتھ نیزل اسپرے استعمال کر رہی ہوں۔ دونوں نے شروع میں کافی اثر کیا لیکن بعد میں خوشبو کم ہو جاتی ہے۔ صبح اور رات کو تو ناک بند ہی رہتی ہے۔ سی ٹی اسکین رپورٹ بھیج رہی ہوں پلیز میرا مسئلہ حل کر دیں۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cinnabaris Pentarkan Ptk 31 کی دو گولیاں دن میں تین مرتبہ لیں اور ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

پٹھوں میں درد اور کھنچاؤ

ناہید .....کالام

عرصہ 6 سال سے پٹھوں میں کھنچاؤ کی شکایت ہے، دو سال پہلے ڈاکٹر کا علاج بھی کروایا، وقتی افاقہ ہوتا ہے اب حالت یہ ہے کہ گردن، ٹانگوں بازو میں شدید کھنچاؤ ہے، ہاتھ پاؤں میں کڑلیں پڑتی ہیں، نماز بھی نہیں پڑھی جاتی، روزانہ دبوانا پڑتا ہے تب کہیں رات گزرتی ہے، کولھے اور پسلیوں کے نیچے 10 منٹ چلنے سے درد شروع ہو جاتا ہے۔ اب تو میں تکیہ بھی نہیں رکھتی کہ گردن اکڑ جاتی ہے۔ بلڈ پریشر رہتا ہے اور گیس بھی ہوتی ہے۔ اب سر میں درد بھی رہتا ہے۔

جواب: جتنا پیدل چل سکتی ہیں چلیں، تیز مرچ مصالحے اور مرغن کھانوں سے بچیں، Urea, Uric Acid ESR CBC Lipid profile اور HbA1C,Calc.Vit-D, کرائیں۔ اس وقت تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Carbo Vege Pentarkan- Ptk-22 ایک گولی دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ نگلیں، Rhus toxi Pentarkan- Ptk-73 ایک گھونٹ سادہ پانی میں 11 قطرے دن میں 4 بار لیں۔ Spigelia

لگنے کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہے۔ (1) تھائرائیڈ غدود کی خرابی، (2) ڈپریشن (3) پیٹ کے کیڑے (4) ایک وقت میں پیٹ بھر کر کھانا نہ کھانے کی عادت (5) ہر وقت تھوڑا تھوڑا کچھ کھاتے رہنا (6) تیزابیت (7) شوگر وغیرہ۔ کھانا ایک وقت میں مکمل پیٹ بھر کر کھلائیں۔ خصوصاً صبح کا ناشتا بھرپور ہو اور دوپہر کا کھانا اچھا ہو لیکن رات میں کھانا ہلکا پھلکا ہو۔ ورزش کرائیں، کھانے میں میٹھا اور چکنائی نہ ہو، تلی ہوئی اور بھنی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Calc-Carb-200 ہر ہفتہ ایک خوراک 5 قطرے آدھے کپ پانی میں، اس کے بعد دوسرے دن سے Thyroidinum30, Amonium Mur-30 اور Fucus vers30 کے 7، 7 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

جسمانی کمزوری

تبسم بتول.....دبئی

ڈاکٹر صاحب میں اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں بیماریوں کا ڈھیر بن گئی ہوں۔ میری آنکھیں بھی پیلی ہوگئی ہیں۔ لیکوریا بھی زیادہ ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ ٹانگوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ بھوک بہت لگتی ہے۔ سردی اور گرمی بھی بہت لگتی ہے۔ دل تیز تیز دھڑکتا ہے۔ سانس پھولتا ہے۔ کندھے کے پٹھے کمزور ہوگئے ہیں ذرا سا بھی وزن نہیں اٹھا سکتی۔ پیٹ باہر نکل آیا ہے۔ روز بروز موٹی ہوتی جارہی ہوں۔ معدہ بھی خراب رہتا ہے۔ سر ایک دم چکرا جاتا ہے۔ بہت چکر آتے ہیں، کمر میں درد رہتا ہے۔ سر کے بال جڑوں سے نکلتے ہیں اور اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ بلڈ پریشر لو رہتا ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے کوئی ایسی دوا بتائیں جس سے میرے مسئلے مسائل حل ہو جائیں کیونکہ میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں اپنی صحت کے بارے میں۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc. Carb-200 ہر ہفتہ ایک دفعہ 5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر لیں۔ Kali Phos-30, Gelsemium-30, Nat. Mur-30 اور Sepia30, Ferr. Phos-30 کے 7، 7 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھا گلاس پانی میں ڈال کر لیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

نسوانی حُسن

راملا.....فیصل آباد

میں پاکیزہ کی ایک سال سے قاری ہوں جس طرح آپ لوگوں کے مسئلے حل کر رہے ہیں اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں 5 سال سے لیکوریا کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ جب تک علاج جاری رکھوں ٹھیک رہتی ہوں ورنہ پھر بیمار ہو جاتی ہوں۔ اس بیماری کی وجہ سے میں کمزور ہوگئی ہوں۔ میرا نسوانی حُسن نہ ہونے کے برابر ہے۔ برائے مہربانی میرے مسئلوں کے لیے دوائیں تجویز کر دیں۔

جواب: آپ نے لیکوریا کی تفصیل نہیں لکھی کہ یہ آپ کو کب، کس مقدار میں، کس رنگ کا ہوتا ہے، کب سے ہوتا ہے؟ بریسٹ شادی یا بچے کی پیدائش کے بعد کم ہوئے، تفصیلاً لکھیں پھر آپ کو صحیح دوا تجویز کی جائے گی۔

☆☆☆

Dr.Willmar Schwabe Germany
Available at All Medical & Homoeopathic Stores
شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی